

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224183

UNIVERSAL
LIBRARY

دارالاشاعت بیت برائے ایداد و باہمی محدود آباؤ کن ۹۱

کا

عبدالحمید و محبت
ماہوار علمی ادبی

مکتبہ

ملک

عبدالقادر سروری ام الانی

شکرا

عمر پور

سید محمد امجد

مجلہ مکتبہ

RECEIVED. 1951

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیلہ امداد باہی محدوود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جز ہوگا۔

منظر احتیاط پرچہ بذریعہ شفیقٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول

نہو تو پہلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے گی۔

قیمت سالانہ (۱۵۰) سہ محصول ڈاک منگی چھ ماہ کے لئے (۵۵) فی پرچہ ۶

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (۵۵) نصف کیلئے (۲۵)

اور چوتھائی کے لئے چھ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲٪ ہ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت منظم محلہ مکتبہ ابراہیمیلہ

امداد باہی شیشین روڈ مید در آباد کن سے کیجئے۔

مجلد مکتبہ

جلد (۴) بابتہ ماہ آذر ۱۳۳۹ ف م اکتوبر ۱۹۲۹ء نمبر (۱)

تصاویر

(۱) علی عادل شاہ ثانی (۲) قطعہ (۳) سید مظفر علی خاں آسیر (۴) احمد نواز جنگ جہاں درغانی

فہرست مضامین

الف	س - م	شذرات	۱
۱	جناب ابو الکار محمد بنیض محمد صاحب صدیقی بی اے	چاند کی سیہ	۲
۶	جناب عابد مرزا صاحب بیگم	کلام بیگم	۳
۸	جناب ناصر	قبرستان کا شیطان (فائدہ)	۴
۱۳	جناب محمد سراج الدین صاحب طالب ایم آر اے	سوانح میر عالم کا ایک باب	۵
۲۶	جناب محمد عبدالوہاب صاحب	حرارت کے نظریے	۶
۴۰	جناب محمد معین الدین صاحب	سپیرا (فائدہ)	۷
۴۶	جناب محمد نصیر الدین خاں صاحب ام لے (اڈنبرا)	عنفت (نظم)	۸
۴۷	جناب بشارت علی صاحب	ادب اور شخصیت	۹
۵۱	جناب ابو الفیاض عمر عبدالکریم صاحب گل	نیرنگ زبان (نظم)	۱۰
۵۲	سید محمد ام - لے	سید مظفر علی خاں آسیر	۱۱
۵۶	جناب محمد اقبال صاحب صدیقی اقبال	پردہ قدرت (نظم)	۱۲
۵۷	ڈاکٹر رائنڈر ناتھ ٹیگور مترجمہ غلام رسول صاحب	تیانگ (فائدہ)	۱۳
۶۳	عمر یافنی	باددہ دکن (ہمت حیدر آبادی)	۱۴
۷۰	جناب اقبال الدین احمد صاحب صدیقی	جزیرہ موت (فائدہ)	۱۵
۷۲	جناب صفی (اوزنگ آبادی)	عسندل	۱۶
۷۳	س - م	تفہیمیں	۱۷

ب شذرات

چوتھی جلد کے آغاز سے مجلہ کتبہ میں جو مصوری اور منوی تبدیلیاں کی گئی ہیں وہ امید ہے کہ ناظرین کی پسندیدگی حاصل کریں گی۔ شکر ہے کہ مجلہ کتبہ اپنی زندگی کی تین منزلیں ستر کر کے چوتھی منزل میں قدم رکھنے کے قابل ہوا ہے اور اگرچہ عامیانہ مذاق کی اس میں کوئی چیز نہیں تاہم موجودہ عالمیانہ مذاق کے طوفان نے تیزی کے باوجود مجلہ کتبہ خاص عالم ایک خاص مقبولیت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہر منقسم اس میں کہ اپنے ارادوں کے موافق کام نہ کر سکے لیکن گذشتہ جلد کے مضامین کی نہرست پر جو اس نہر کے ساتھ منسلک ہے ایک سرسری نگاہ دلتے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ باوجود کئی طرح کی دشواریوں کے مجلہ کتبہ نے پچھلے چھ مہینے میں جو مواد پیش کیا ہے اور جس قسم کی خدمت اردو ادب کی انجام دی ہے وہ اگر اندیش کی منتھی نہیں۔ سہی! توفیق ایزدی شامل حال ہے تو چوتھی شش ماہی کا کام سابق سے زیادہ قابل قدر ہو سکے گا۔

باد وہ دکن کے عنوان۔۔۔ دکن کے مشاہیر شعرے قدیم کے جواہر ریزوں کو جو ہماری غفلت سے طاق نیاں کی زینت بنے ہوئے تھے، اجاگر کرنے کی جوشی کی جا رہی ہے اس کو اہل ذوق نے بے حد پسند کیا اور گزشتہ سہ ماہی میں اس کا پھر مقدم کرنے میں کوتاہی کی اور بعضوں نے اس کو طرح طرح کے مخالفانہ رنگوں میں پیش کیا لیکن سنجیدہ مذاق اور صاحب ذوق حضرات سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ دکن کے قدیم ادبی دوروں میں کوئی عہد بھی اعلیٰ پیداوار سے خالی نہیں اور نہ صرف قطب شاہی اور عادل شاہی زمانے کی شعر و شاعری اس قابل ہے کہ اس کی تحقیق و تلاش کی جائے بلکہ آصف جاہی عہد کے آغاز سے لیکر موجودہ زمانے تک کے دکنی شاعروں کے کارنامے ہر طرح کی قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔ نہ صرف ادب بلکہ ہر شعبہ زندگی میں ہم اپنے ماضی کو سیکھ کر فزائوش کر کے ترقی کرنے کی امید نہیں کر سکتے۔ ہر دور اپنے سابق دور کا براہ راست نتیجہ اور پیداوار ہوتا ہے۔ ماضی سے ہماری غفلت ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ ہمارا موجودہ ادبی دور ترقی و ترقی کے مقابلے کے رجحانات سے دور اور پست درجہ کا ہے۔ اگر ہم اپنے ماضی سے وابستہ ہوتے اور اس کو ائمہ فرائد بنا لے تو ہمارے متاخر ادیبوں کے کارنامے زیادہ رفیع اور ستم بالشان ہوتے ہم صاف طور پر اس کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ باد وہ دکن کے عنوان سے محض یہ مقصد ہے کہ دکن کے قدیم شاعروں میں جو اعلیٰ پایہ ہستیاں گزری ہیں ان کے صحیح حالات اور کارنامے ارباب ذوق کے آگے پیش کریں اور ان اوراق پارینہ سے جو شیں بہادرت ادب برآمد کی جاسکتی ہے اس کو منظر عام پر لے آئیں اس نمبر سے یہ تمام مباحثہ ہے کہ جس شعر و شاعری کو پیش کیا جائے اس کے متعلق تمام مواد ایک ہی نمبر پر ختم ہو جائے تاکہ ایک ہی جگہ پر سب کی سب باتیں ہو۔

ڈاکٹر اربند زماںہ کی یاد اور خرابی صحت کے ادب کی خدمت گزاری میں نوجوانوں کی استعداد رکھتے ہیں ایک عرصے سے آپ کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ آپ بیرون ہند جا کر اپنے گراں پایہ لکچروں سے یورپ کو مستفید کریں تاہم آپ نے اس کا ارادہ فرمایا نہیں کیا۔ آئندہ موسم بہار میں یورپ جانے والے ہیں۔ فرانس، جرمنی اور اٹلی کی جامعات اور علمی مجلسوں کی دعوت پر ملل کئی تقاریر کریں گے۔ آج کل آپ کلکتہ میں مقیم ہیں مگر یہاں بھی ایک ایسی تصنیف میں مشغول ہیں جو اگر جلد ملل ہو جائے تو یقیناً

کہ اس سال کے شہکاروں میں پیش قیمت اضافہ ہوگی۔ ایک سادہ سنجی ڈرامہ ہے اور ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ اس کے پائیدار کو پہنچنے کے بعد اپنی نگرانی میں اسٹیج بھی کریں۔ اس سے بنگال کی ادبی کانفرنس کی صدارت کرنے کی بھی استعداد مائی گئی ہے۔ حکومت بڑودہ نے بھی ایک سلاہ تعاریف کے لئے مدعو کیا ہے۔ جو ان بہت بوڑھے ڈاکٹر نے ان کاموں کی تکمیل کا ارادہ کر لیا ہے۔ خدا کے کہ ان کے ارادے پورے ہوں اور ہندوستان کے اس مشہور عالم ادیب کے فیوض سے صاحبان ادب خارج خواہ استفادہ کریں۔

یورپ اور امریکہ اپنی روز افزوں ترقی اور شائستگی سے تعلیم میں جو نئی تحریکیں اور توجہ کر رہے ہیں وہ ہندوستان میں دور دست اور غیر ترقی یافتہ ملک میں بڑے تعجب کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ سینا فلم کے ذریعہ تعلیم و تربیت کے انصرام کی ایک خاص کوشش کی جا رہی ہے اب یورپ کے تعلیمی اور اعلیٰ صحایف میں یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ مشرولیم فلکس جو امریکہ میں فلموں کے ایک اتحاد ہیں تعلیم میں ایک انقلاب عظیم کی سعی کر رہے ہیں۔ وہ اٹھارہ لاکھ پونڈ کے سرمایہ سے آئندہ پچیس برس میں بولنے والی فلموں کے ذریعہ بانی تعلیم جاری کرنے کا کام کریں گے انھوں نے کئی ماہرین تعلیم کو ترسیل سابقہ کرنے کے لئے مامور کر رکھا ہے اور وہ باور کرتے ہیں کہ اس طریقہ سے مدرسہ کا آدھا وقت بچ سکتا ہے۔ بغیر افیہ کی تعلیم کیلئے ان کا مجوزہ طریقہ خاص طور پر موزوں ہو کیونکہ بانی تعلیم کے ساتھ زیر مطالعہ مالک کی حقیقی تصویریں بھی دکھائی جائیں گی۔ ابھی ان کے تجربات کو برطانوی ماہرین تعلیم نے قبول نہیں کیا بلکہ ان کا تو یہ خیال ہے کہ یہ بولنے والی فلمیں ملے ملک میں تعلیمی گراموفونوں کی طرح زیادہ مقبولیت حاصل نہ کریں گی۔ بعض دیہات میں سینما کے ذریعہ تعلیم دینے کی کوشش کی گئی تھیں مگر ناکام ثابت ہوئیں۔ برطانوی ماہرین تعلیم کو اس طریقہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ بولنے والی فلم کی تعلیم کے مصارف کثیر کے علاوہ یہ طریقہ انفرادیت کو تباہ کر دیتا ہے اور بچوں کو احدی بنا کر اندھیرے میں بٹھا کر رکھے گا حالانکہ تعلیم جدید کا تمام تر رجحان جہاں تک ہو سکے صحاب اور کھلی ہوا دنیا کرنے کی طرف ہے۔

کچھ روز قبل دہلی میں بین الاقوامی کانفرنس کی دوسری میقات منعقد ہوئی تھی۔ سیر اسکسٹی لارڈ ارون نے اس کا افتتاح کرتے ہوئے جو منادانہ خطبہ دیا اور جامعات ہند کو جو مفید مشورے اور اعلیٰ ہدایتیں کی ہیں وہ امید کرنی چاہیے کہ ارباب جامعات کے گوش گزار ہو کر نہایت عمدہ نتائج پیدا کریں گی۔ ہندوستان کی جامعات کے باہمی تعلقات جو مجلس بین الاقوامی کی صورت میں متشکل ہوئے ہیں یہی کے پتہ دیدہ ثمرات ہیں کہ اب ہماری جامعات ایسے متعدد مسائل پر جو سب پر یکساں یا کم و بیش اثر انداز ہوتے ہیں باہمی غور و خوض اور حل کرنے کی کوشش کرنے لگی ہیں۔ اس وقت اس مجلس کی (۱۸) ہندوستانی یونیورسٹیاں رکن ہیں۔ دوسری کانفرنس میں مجلس کے زیر اہتمام منعقد ہوئی بہت سے ایسے مایاں پیش ہوئے جن کا تعلق تقریباً تمام یونیورسٹیوں سے ہے ایسے مایاں میں خاص طور پر قابل ذکر بے روزگاری اور جامعات کی جامعات تعلیم میں رزٹش جہانی اور جوہی نصاب کی شرکت ہندوستانی جامعات کی طبی اسناد اور انکی قد رسانی اور جامعاتی اور ثانوی تعلیم کا تعلق نکال کر س کے اراکین نے ان ضروری اور اہم مباحث پر غور کیا اور متعدد قراردادیں پاس کیں۔ اگر متعلقہ جامعہ اور خود جامعات ان قراردادوں کو عملی جامہ پہنائیں تو بہت جلد ہماری رفتار ترقی دگنی ہو جائیگی۔ ملکہ بے روزگاری اور جامعات کے نسبت کانفرنس نے یہ سفارش کی ہے کہ ہر ایک جامعات اپنے طیلانیوں

اور تعلیم یافتوں میں ملازم اور غیر ملازم افراد کی تعداد اپنی ملازمتوں اور پیشوں کی نوعیت وغیرہ کے اعداد و شمار فراہم کر کے مجلس میں الجامعات میں ارسال کرے جہاں اس پر غور و غوض کے بعد کوئی مناسب تجویز نکالی جائیگی یہ مسئلہ آج کل جیسا کہ ہو جا رہا ہے اسکے مد نظر اس کی تفصیل فوری چاہئے۔ تاکہ موصولہ سواد پر غور کر کے ایسی تجویزیں نکالی جائیں کہ ہماری یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ شہرہ جات زندگی کے اہل ثابت ہوں اور حکومت ملک اور اپنے لئے یار نہ بنیں۔

نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر اس کانفرنس میں جامعہ عثمانیہ کی طرف سے نمایندہ تھے۔ آپ نے اپنی تقریر میں ملکی زبان کو ذرا تعلیم بنانے کی پر زور حمایت کی اور اس سلسلہ میں جامعہ عثمانیہ کی شاندار کامیابی اور اردو کے ذریعہ علوم و فنون جدید کی تعلیم دینے کی عملی مثال پیش کی۔ اس سلسلے میں جامعہ عثمانیہ کی تیار کرائی ہوئی کتابوں اور انکے ساتھ دائرۃ المعارف کی مطبوعات کی نمائش بھی کی گئی دہلی کے قدیم دفتر متعین کے پاس ایک شاندار شامیانہ میں علمی فتوحات رکھی گئی تھیں۔ مولوی عبدالرحمن خان نصابہ صاحب کلہ جامعہ عثمانیہ جو اس کانفرنس میں نمایندہ جامعہ عثمانیہ کی حیثیت سے شریک تھے اور مولوی غیاث الدین صاحب ناظم دارالترجمہ اور خود نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے لاہور اور ان کے سربراہ ہند اور کانفرنس کے تمام ممتاز ارکان کو ان کتابوں کی سیر کرائی

اس نمبر میں چار تصاویر پیش کیے جا رہی ہیں۔ پہلی سلطان علی عادل شاہ ثانی ۱۲۸۳ھ کی ہے یہ عادل شاہی بادشاہان پنجاب میں اردو شاعری کا سب سے زیادہ سرپرست بادشاہ گرا ہے اسکے عہد حکومت میں اردو شاعری نے بڑی ترقی کی سب سے پہلے اسی نے اردو گو شاعر نصرتی کو ملک الشعر کا خطاب یا تھا وہ خود بھی اردو کا شاعر تھا اور شاہی تخلص کرتا تھا۔ معاصر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ابوالمعالی نام ایک شخص اس کا کلام جمع کرنے پر مامور تھا اس وقت تک اس کا کلام کہیں دریافت نہیں ہوا۔ ڈاکٹر سید محمد الدین قادری ام لہ پے پی ایچ ڈی (لندن) کو ڈاکٹر ابوالنور بونہوٹی کے کتب خانے میں ایک بیاض میں و مرقعے لے ہیں جنکا مصنف شامی ممکن ہے کہ ایسی کے انکار طبع سے ہوں۔ اس بیاض میں دوسرے عادل شاہی شاعروں کے مراثی بھی ہیں اس کے عہد کے دکنی شاعر وہاں نصرتی کے علاوہ جو قصیدہ غزل اور رزم و بزم کی شمولیاں لکھتے ہیں بڑا مسلم الثبوت استاد تھا شاہ ملک آمین شامی مرزا اور اباعی مشہور ہیں۔

دوسری تصویر طلب شامی عہد کے مشہور خطاط زین الدین علی کے خطی و جلی نسخ خط کی ایک مصلی ہے۔ خطاط نے بادشاہ کی کئی غزل لکھی ہے اور ایسی دیدہ زیب ہے کہ باوجود کھنگنی کے نظر کو طراوت بخشی ہے اسکے اصل کیلئے ہم مولوی غلام نیر الدین صاحب ناظم آثار قدیمہ بریلو تیسری تصویر شامی مظفر علی خاں سیر مرحوم کی ہے جس کے ساتھ تفصیلی مضمون بھی ہے چوتھی تصویر مولوی محمد احمد صاحب دنواب احمد نواز جنگ بہادر (فاتی مرحوم کی ہے یہ حیدر آباد کے ایک مشہور شاعر اور معزز کمیٹی صرف خاص مبارک کے محمد انجی متعدد غزلیں شمالی ہند اور دکن کے علمی اہل اور گلدستوں میں شائع ہوئی ہیں۔ مجاہد مکتبہ میں ان کا کلام اکثر ان کے فرزند مولوی عبدالباقی صاحب ام لہ سے لیکر شائع کیا گیا ہے۔ مرحوم کے لایق فرزند ان کا کلام ترتیب سے لکھے ہیں اور قریب میں یہ ادبی تحفہ اہل ذوق حضرات کے آگے پیش کیا جائے گا۔

چاند کی سیر

چاند میں کس قسم کی زندگی پائی جاتی ہے

(از جناب ابوالکارم رفیع محمد صاحب صدیقی بی۔ اے)

قدیم زمانہ ہی سے انسان کو چاند سورج اور دیگر سیاروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق رہا ہے بالخصوص ازمنہ ناضیہ کے عرب اس فن میں کمال رکھتے تھے اور ان کی سادہ آنکھ وہ سب کچھ دیکھتی تھی جس کو آج دور میں سے دیکھا جاتا ہے تاہم خالی آنکھ اور دوربین میں بہت بڑا فرق ہے! بہر حال پہلے زمانہ کے لوگوں کو علم ہنیت سے خاص شغف تھا چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے بے شمار اعلیٰ تحقیقات کا سنگ بنیاد رکھا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کے یہاں یہ بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ قدیم زمانہ کے لوگ بہت زیادہ توہم پرست واقعہ تھے چاند اور سورج کے فوائد سے مرعوب ہو کر انھوں نے پہلے پہل انھیں پوجا شروع کر دیا۔ ان کی توہم پرستی کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص ان کے مذہبی عقاید (خواہ وہ کس قدر بوسیدہ ہی کیوں نہ ہوں) کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالتا تو لوگ اسے موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھتے تھے چنانچہ مثال کی طور پر یونان کے فلسفی انکزیگورس کا واقعہ سن لیجئے۔ ایک دفعہ جب اس نے یہ بیان کیا کہ چاند فی الحقیقت کوئی دیوتا نہیں ہے بلکہ سورج اور دیگر اجرام سماوی کی طرح وہ بھی ایک سیارہ ہے تو یونان کی دنیا اس کے خلاف ہو گئی اور اس جسم کی سزا میں اس کے لئے موت کا فتویٰ صادر ہوا اگرچہ اس کے دوست پگلیس نے اس کی حد درجہ طرفداری کی تاہم اسے بھل گئے ہی تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ چاند سورج کے حالات معلوم کرنے میں حد درجہ دچکسی لیتے تھے مگر اعتقاد کی ضروری نے انھیں اپنی معلومات میں اضافہ کرنے سے محروم کر دیا اسی وجہ سے اس علم میں نمایاں ترقی نہ ہو سکی۔ تب تک چل کر لوگوں نے اپنے اعتقادات کی کمزوریوں کو محسوس کیا اور رفتہ رفتہ چاند اور سورج کے متعلق مفید معلومات حاصل کی جانے لگیں اور آج ہم اپنی تحقیقات کی بنیاد پر چاند اور سورج کا ایک سرسری خاکہ کھینچ سکتے ہیں۔

چاند کے متعلق مختلف دور کے لوگوں کے مختلف خیالات ہیں، انکزیگورس کا خیال تھا کہ چاند صرف ایک جرم سماوی ہی ہے بلکہ ایک ایسی دنیا بھی ہے جہاں ہم جیسے انسان بود و باش کیا کرتے ہیں، یہ غلط ہے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ چاند ایک مردہ دنیا ہے بلکہ وہاں ایک دوسرے قسم کی زندگی پائی جاتی ہے اسکے بہت زمانہ بعد جان ولکن (۱۶۱۴ تا ۱۶۸۷ء) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چاند مردہ دنیا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی زندگی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس زمانہ میں ہوائی جہاز یا فوارہ وغیرہ کا سان و گمان بھی نہ تھا تاہم اس نے

یہ پیش گوئی کی تھی کہ انسان نہ صرف جہازوں میں بیٹھ کر سمندروں کو پار کریں گے بلکہ وہ دن قریب آنے والا ہو جبکہ لوگ ہوائی سواریوں میں بیٹھ کر فضا میں چکر لگایا کریں گے اور چاند کا بھی سفر کیا کریں گے۔ جرمنی کے ماہر علم ہیت نے ایک صدی قبل اپنے خیال کو اس طرح پر ظاہر کیا تھا کہ چاند میں ہم جیسے ذی روح آباد ہیں ان میں اور ہم میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے فی الوقت نہ تو ہم اس خیال کو غلط ٹھہراتے ہیں اور نہ اس کو بالکل صحیح تصور کرتے ہیں، اس کی توہم آگے چل کر تصدیق کریں گے مگر سائنس کے متعلق تو اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی معمولی اور بھٹی دور بین سے مدد لیکر چند پیشینہ اور کارآمد نتائج اخذ کئے ہیں اور بعض صورتوں میں تو وہ ہماری رہبری کرتے ہیں۔ مختلف علمائے اس قسم کے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن جب تک کہ ہم خود اس کی تحقیق نہ کر لیں کوئی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تحقیق کس اصول کی تحت کرنی چاہیے۔ چاند کے متعلق وہاں عاکرہم راست طور پر تو کوئی معلومات حاصل نہیں کر سکتے نہ ہماری موجودہ قوتیں اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان مہم کو سرانجام دیں ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ کہ موجودہ ذرائع علم کی مدد سے چاند کے طبعی حالات کا مطالعہ کر کے نتائج مستنبط کریں اور پھر دیکھیں کہ یہ حالات کہاں تک حیات انسانی کے مہیا ماننی ہیں اس سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ آیا چاند میں حیات انسانی یا کسی اور قسم کی زندگی کا امکان ہے بھی کہ نہیں؟

چاند کے طبعی حالات

خالی آنکھ سے بھی اگر ہم چاند کا مشاہدہ کریں تو ہمیں اس پر چند سیاہ دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ گلیلیو اور کپلر وہ دونوں نے ان کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان میں سے بعض دھبے سمندروں اور بعض پہاڑوں کو تعبیر کرتے ہیں اگرچہ چاند ہمارے کرہ ارض کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہے لیکن اس پر ایسے بلند اور عظیم الشان پہاڑ واقع ہیں کہ کرہ ارض کا بلند سے بلند پہاڑ بھی ان کی ہمسری کا دھولے نہیں کر سکتا۔ چاند کے پہاڑوں کی چوٹیاں ہندوستان کے سرنگھلیک پہاڑ ہمالیہ اور ہماچل کے سب سے اونچے پہاڑ تاک کنٹے کی چوٹیوں سے کہیں زیادہ بلند ہیں، اگر ایورسٹ کی چوٹی تین ہزار فٹ بلند ہے تو چاند کے پہاڑوں کی چوٹیوں کی بلندی ۳۶ ہزار فٹ کے قریب ہے۔ چاند میں ایسے تقریباً چالیس سے زیادہ پہاڑ موجود ہیں ان پہاڑوں کے متعلق فلمیورین لکھتا ہے کہ ”یہ ابدی روشنی کے پہاڑ ہیں“ کیونکہ ان کی چوٹیاں اس قدر بلند ہیں کہ ان پر ہمیشہ روشنی رہا کرتی ہے۔ پہاڑی سلسلہ چاند گہن کے موقع پر نہایت درجہ وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے یہ کوہستانی زنجیریں دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں اور اکثر صورتوں میں ایک وسیع میدان کو گھیرتے ہیں ایسے میدانوں کو فسیل دار میدان کہا جاتا ہے۔ ان ہی فسیل دار میدانوں میں سے ایک میدان گلے ویس ہے جس کا طول ۴۳ میل اور رقبہ ۱۶ ہزار مربع میل ہے۔ بلندی ستر ہزار فٹ کے قریب ہے۔ گلے ویس سے بہت کم ایک دوسرا فسیل دار میدان ہے جس کا نام ٹانچو ہے اس کا قطر ۵ میل اور بلندی ۱۱ ہزار فٹ ہے۔

اس سے منور شاعین نکلتی ہیں جو بدر کے وقت دکھائی دیتی ہیں ان دو کے علاوہ کئی اور فضیلا درمیان ہیں مثلاً گنڈنڈی، کوپرنیکس، افلاطون، ہیر، ڈوٹس اور ارسطو وغیرہ پروفیسر کمرنگ کے بیان کے مطابق نظر آنے والے پہاڑوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہے۔

یہ چاند کے ایک سو کا حال تھا۔ دوسرے سو کے تعلق ہم کچھ ایسا زیادہ نہیں جانتے اس لئے کہ ہم چاند کے صرف ایک ہی حصہ کو دیکھ سکتے ہیں کیونکہ چاند کا صرف ایک ہی سو زمین کی جانب رہتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ قطبی مدت میں چاند اپنے محور کے گرد گھومتا ہے اتنی ہی مدت میں وہ زمین کی اطراف گردش لگا لیتا ہے جس کی وجہ سے اس کا صرف ایک ہی حصہ ہماری جانب رہتا ہے اور دوسرے حصے کا ۸۸ فی صدی حصہ کبھی کبھی ہمارے سامنے آ جاتا ہے بنا بریں چاند کے دوسرے سو کے تعلق ہم تفصیلی معلومات پیش نہیں کر سکتے۔

چاند سے نکلنے والی جو الاکھی شعاعیں

طاقتور دو برہمن سے مشاہدہ کرنے کے بعد اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ چاند کی سطح سے مختلف قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں ان شعاعوں کو جو الاکھی شعاعیں کہا جاتا ہے پروفیسر کمرنگ نے یہ بتلایا کہ ٹائیچو سے نکلنے والی شعاعیں سفید ہوتی ہیں ان کو معمولی دو برہمن سے بھی دیکھا جاسکتا ہے بدر کے روز تو خالی آکھ سے بھی وہ شعاعیں نظر آتی ہیں۔ کوپرنیکس نکلنے والی شعاعیں زرد ہوتی ہیں ٹائیچو کی اطراف ایک لالہ ہوتا ہے اور کوپرنیکس کی اطراف کچھ بھی نہیں۔ یہ محکمہ آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہے۔

بحر کرائس کے مغرب میں ایک منہر کا س (crater) پر اکس نظر آتا ہے یہ بہت آب و تاب سے چمکتا ہے اور اس میں انفکاسی طاقت بھی بہت زیادہ ہے۔ انفکاس برف یا گہری وجہ سے ہوتا ہے پروفیسر کمرنگ نے کاس تھیٹالس کے ڈھلوان پر چند سفید وجہ مشاہدہ کئے جو قمری یچینے کے پہلے ۹ دن تک نظر آتے ہیں۔ ان کے متعلق وہ کہتا ہے ”چاند کی احتیاط کے ساتھ تحقیق کرنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تقریباً چاند کے اندر کے نصف سے زیادہ کٹوس کے اندرونی ڈھلوان پر سفید وجہ دکھائی دیتے ہیں ان کی اہل وجہ برف کی موجودگی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ چاند پر آبی بخارات ہوں گے جس کی وجہ سے زراعت کا امکان درست معلوم ہوتا ہو“ لیکن دیگر ماہرین علم ہیت اس بات کو غلط ٹھہراتے ہیں چنانچہ پروفیسر کمرنگ اپنے ایک مضمون ”عام فہم علم ہیت“ میں اس خیال کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے فیزکس دو سر ماہر علم ہیت جس کی شخصیت مسلم ہے کسی قدر خود رانی کے طور پر بیان کرتا ہے کہ ”ہم تمام (۹) ماہرین علم ہیت اس بات پر متفق ہیں کہ چاند میں لازمی طور پر کوئی زندگی نہیں پائی جاتی وہ ایک ایسی دنیا ہے کہ جس میں نہ تو زراعت ہی ہو سکتی ہے اور نہ ہوا ہی کا وہاں وجود بقول ایک عالم کے چاند ایک ایسی دنیا ہے جہاں نہ تو کوئی موسم ہے اور نہ کسی جاندار شے کا وجود“ برخلاف اس کے

پروفیسر کمزنگ جن کی زندگی کا بیشتر حصہ چاند کی تحقیقات میں گزرا ہے اس خیال کے خلاف ہیں اور اپنی محقیقات کی بناء پر اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ چاند میں زندگی پائی جاتی ہے۔ پروفیسر کیمیل فلیوریٹن مشہور ماہر علم ہیت، پرفسور موصوف کا ہم نوا ہے وہ لکھتا ہے کہ ”پروفیسر کمزنگ کا خیال درست ہے کہ علم المناظر کی ارتقائی صورت ماہرین علم ہیت کو اس کا ذکر دیگی کہ آیا چاند میں زندگی موجود ہے یا وہ ایک مردہ دنیا ہے، چاند کو اب تک ایک برفانی دنیا خیال کیا جاتا تھا..... پروفیسر کمزنگ کی طرح میں نے بھی کئی ایک تجربے کئے اور چاند کی بے شمار تصویریں لیں جن کے گہرے مطالعہ سے نباتات کی موجودگی کا پتہ چلا اس کی سطح پر بے شمار سیاہ دھبے دکھائی دیتے ہیں جن سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ چاند میں بڑے زبردست جنگل ہوں گے۔۔۔۔۔ یہ ممکن ہے کہ وہاں حیوانی زندگی کا وجود نہایت عام ہو اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو حیوانی زندگی کا نشانہ بنی ہو“

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہو گا کہ طبعی حالات کو معلوم کر کے کس طرح قیاسات قائم کئے جاسکتے ہیں۔ ذیل میں ہم اور دیگر طبعی حالات بیان کر کے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ جہاں حیات انسانی کیلئے نئے چیزوں کا ہونا ضروری ہے وہ یہ ہیں:-

۱۔ پانی
اب ہر طبعی حالات کی تحت اس امر کا اندازہ لگائیں گے کہ آیا یہ لوازمات زندگی دماغ دستیاب ہوتے
بھی ہیں کہ نہیں اگر ہوتے ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم چاند کو ایک مردہ دنیا تصور کریں۔
چاند پر کے منور دیبھے

یوں تو چاند پر بے شمار سفید اور منور دھبے دکھائی دیتے ہیں لیکن سب سے زیادہ منور دھبہ اسطرگاسٹ جو طوفانی سمندر کے بازو واقع ہے اس کا قطر ۱۵ میل ہے وہ کھربا کی مانند سفید اور بے حد منور ہے۔ اس کی روشنی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی ہے اس کے منور ہونے کے دو وجوہات ہو سکتے ہیں (۱) یا تو اس حصہ میں برف ہے (۲) یا اس حصہ میں زبردست انعکاسی طاقت کا گار پتھر موجود ہے لیکن پروفیسر آرڈلیو وڈرنے اس کا بہت حاصل کر کے یہ معلوم کیا ہے کہ نہ تو اس میں برف ہے اور نہ گار پتھر بلکہ گندھاک ہے۔

اب رائے سوال باقی کہ اگر اسطرکس میں گندھک ہے تو آخر وہاں برف بھی موجود ہے کہ نہیں؟ اکثر ہیئت وال اس بات پر اتفاق نہیں کرتے کہ چاند میں پانی موجود ہے اس لئے کہ چاند کی سطح پر بادل کی علامات مفقود ہیں۔ یہ سچ ہے لیکن بعض کٹوس کے مخروطات پر سفید کنظر آتا ہے یہ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کی سطح سے آبی بخارات تو نکلتے ہیں لیکن کچھ تو دھوپ کی شدت اور کچھ دن کے لانا ہونے کے باعث اڑ جاتے ہیں۔

یارات کے لیے ہونے کی وجہ سے جم جاتے ہیں اس میں تو کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ چاند کی سطح پر برف موجود ہے کیونکہ اس کے اکثر حصے نہایت ہی آب و تاب سے چمکتے ہیں۔ کپار سنو پہلی مرتبہ یہ بتایا کہ چاند کی سطح پر پانی برف کی صورت میں موجود ہوتا ہے جو ۲۵۴ یوم کی قمری رات کے دوران میں جم جاتا ہے۔ ایم ڈی نان ایل کا خیال ہے کہ نہ صرف پانی بلکہ ہوا بھی جم جاتی ہے پروفیسر کرائگ نے چاند پر برفانی طوفان کے مظاہر مشاہدہ کیے ہیں اس کا بیان ہے کہ زمین کی طرح وہاں برف گرتی نہیں بلکہ برف نشانی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض کنوس سے جو گیس نکلتی ہیں برف کے ننھے ننھے قلموں کی شکل میں جم جاتی ہیں اور کنوس کی اطراف گردش کرنے لگتی ہیں ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ اب برفانی رقبہ کچھ ایسا زیادہ وسیع نہیں ہے بلکہ چاند کے قطبی منطقوں میں برف کے نشان پائے جاتے ہیں جہاں پر زراعت نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ ان بیانات کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ چاند کی سطح پر برف کا وجود ضرور ہے۔

قمری نباتات

فلاطون اور دیگر فیصل دار میدانون کے اندر برف کی مانند سفید دھاریاں دکھائی دیتی ہیں جن کے بازو یاہ رقبے ہیں یہ سیاہ رقبے کبھی دکھائی دیتے ہیں اور کبھی نہیں اسی بنیاد پر پروفیسر کرائگ نے اپنا خیال اس طور پر ظاہر کیا تھا کہ یہ بہت ممکن ہے کہ فیصلہ دار میدان فلاطون پر اس قسم کی دوسری تبدیلی جو ہر مہینہ احتیاط کے ساتھ مشاہدہ کرنے والے کو نظر آتی ہے نباتات کے اگنے کی وجہ ہو۔ یعنی یہ کہ جب زراعت ہوتی ہے تو یاہ دھبے دکھائی دیتے ہیں اور بعد میں کچھ نہیں اس قبل کے واقعات اس، ارسطارکس، گریمالڈی اور انفانسس پر بھی مشاہدہ کئے گئے ہیں۔

ماہر علم ہٹ کلین نے بجائے سیاہ دھبوں کے بنزدھبے مشاہدہ کیے ہیں۔ پروفیسر کرائگ نے بھی گریمالڈی کی سطح پر بنزدھبے کی علامات مشاہدہ کیں اور انفانسس پر بھی اس قسم کے بنزدھبے پائے گئے، ان تمام باتوں سے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ چاند میں نباتات اگتی ہیں۔

قمری نباتات کے متعلق متعدد ماہرین علم ہٹ مثلاً ظہورین، کاریگی انٹیٹوٹ کے جیافیکل لائبریری کے مشہور و معروف ڈاکٹر سی این فز، پروفیسر نتوخی ایگینی اور کاسمو پالین نیوز سروس کے نمائندہ مٹرو لیم پارک نے تحقیقات کی ہیں، ان سب کو ہم اس مختصر مضمون میں بیان نہیں کر سکتے ہیں البتہ چند کے خیالات درج کرتے ہیں۔

پروفیسر ایگینی کا خیال ہے کہ چاند میں بڑی بڑی نہریں ہیں جن کے بازو زراعت ہوتی ہے چنانچہ اس کا بیان ہے کہ ارسطیس کے اندرونی حصہ کا رنگ خارجی حصوں سے زیادہ زرخیز ہے۔

کرتا ہے کہ یہ نہر کی وجہ ہے۔ علاوہ ازیں اسی سلسلہ میں اس نے ایک شکست نامیہ حصہ بھی شامہ کیا اور جو زرعی حصہ کو تعمیر کرتا ہے۔

مشر و لیم پارک نے مونٹ لونی کی رصد گاہ میں مذکورہ بالا شہادت کی تصدیق کر کے پروفیسر پکرننگ کے شہادت کا ثبوت دیا ہے بہر حال بہت سے لوگوں نے پروفیسر موصوف کی مخالفت بھی کی ہے لیکن اس نے نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اپنی تحقیقات کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور اسے دل کی کھینچائی تصدیق ہوتی جا رہی ہے۔

چاند کا کرہ ہوائی

پروفیسر پکرننگ نے چاند کا ایک فوٹو گراف لیکر یہ ثابت کیا ہے کہ چاند کا کرہ ہوائی ہے اگرچہ کہ چاند کے کرہ ہوائیہ کی کثافت کرہ ارض کے کرہ ہوائیہ کی کثافت کا آٹھ ہزارواں حصہ ہے تاہم کسی صورت میں بھی اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چاند کے کرہ ہوائی کا دوہزار ثبوت یہ ہے کہ جب چاند جیسا کہ اکثر باہرین علم ہئیت کا خیال ہے زمین کا ایک حصہ تھا جو ۶ کروڑ سال قبل اس سے جدا ہو گیا تو یہ تسلیم کرنے میں کون امر مانع ہے کہ جس وقت چاند زمین سے جدا ہوا ہے اس کے ساتھ کرہ ہوائیہ کا ایک حصہ بھی چلا گیا ہوگا۔ اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ چاند کی کیت چونکہ بہت کم ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی قوت جاذبہ بھی کم ہوگی۔ ایسی حالت میں کرہ ہوائیہ کے سالمات کس طرح برقرار رہ سکتے ہیں؟ ان کی رفتار کو قوت جاذبہ روک نہیں سکتی، یہ سچ ہے لیکن بعض بھاری گیسوں مثلاً آرگن، کریٹن اور زرن وغیرہ سطح چاند پر کبھی ہیں۔ البتہ ٹائڈ روجن اور آکسیجن کا آزاد حالت میں پایا جانا ناممکن ہے ان دونوں کا آمیزہ پانی بھی اس حالت میں نہیں رہ سکتا۔ مگر منہرہ شکل میں رہ سکتا ہے لیکن اگر یہ گیس خارج بھی ہوتی ہیں تو کونوں سے نکلنے والی گیسوں سے اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے کرہ ہوائی برقرار رہتا ہے۔

چاند کی تپش

چاند کی سطح پر کی تپش کے متعلق مختلف لوگ مختلف انیال ہیں۔ لیکن ان سب میں پروفیسر وی کا خیال مستند ہے اس کے بیان کے مطابق تپش ۲۰۰ م سے لیکر ۱۰۰۰ م تک بڑھتی گھٹتی رہتی ہے (۱۰۰-۲۰۰) م پر پانی جوش کھانے لگتا ہے اور ۲۰۰ م پر جم کر برف بن جاتا ہے (۱۰۰۰-۲۰۰) م پر برف بجھ کر حرارت آفتاب سے چھل کرتا ہے اس کا ۱۰۰۰ م فی صدی منعکس کر دیتا ہے اور بقیہ ۴۰۰ م فی صدی جذب کر لیتا ہے ان حدود کے اندر زندہ مخلوقات رہ سکتے ہیں اس کا نام سے چاند میں زندگی کا پایا جانا قرین قیاس ہے۔

ان تمام باتوں کے معلوم کر لینے کے بعد ہم اب قیاس لگا سکتے ہیں کہ آیا چاند ایک مردہ دنیا، یا اس میں کسی قسم کی زندگی پائی جاتی ہے۔ واقعات کی سخت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چاند میں ادنیٰ قسم کی نباتات اگتی ہیں اور ادنیٰ قسم کی حیوانی زندگی پائی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ دنیا جس کو ہم روحانی طور پر مردہ سمجھتے ہیں طبعی طور پر مردہ نہیں ہے۔ چاند کو مردہ دنیا ہرگز نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ جو آفتاب ہماری زمین پر چمکتا ہے وہ اس پر بھی ضوئیاں ہے۔ یہ ہماری معلومات اور ذرائع علم کا تصور ہے کہ ہم اس کے حالات کا پورے طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے لیکن اسے دن کی منت نئی تحقیقات سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور ہر طریقہ سے ہمیں اس بات کا ثبوت مل رہا ہے کہ چاند مردہ دنیا نہیں بلکہ اس میں ایک قسم کی ادنیٰ زندگی پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب اس میں پانی ہوا اور شمس موجود ہے تو پھر وہیں وہاں زندگی کے وجود کو ماننے میں کون امر مانع ہے؟

کلامِ بیگم

(از جناب عابد مرزا صاحب بیگم)

سو نامرا۔ آباد سدا سوت کا گھر تھا	میں نے جو تھیں دل دیا یا اس کا مٹھا
پہونچے نہ جہاں وہم وہاں تیرا گزرتھا	واری گئی تجھ پر تو ملک تھا کہ لبشر تھا
اک قطرہ تھا انسان پڑا پیٹ میں جس وقت	روتا ہوا جب گود میں آیا تو بشر تھا
صدقے گئی اللہ نے پروان چسٹہ حایا	سچ پوچھو تو یہ میری ماؤں کا اثر تھا
برسات میں سدا صحن بڑی تکلیف اٹھائی	تم کیوں نہیں آئیں اجی خالی میرا گھر تھا
میں جاتی ہوں میکے نہ رہی ہوں رہوگی	اب تک جو دیا ساتھ یہ میرا ہی جگر تھا
کرتی تھی ادھر کام ادھر دیکھ رہی تھی	لے چھو کر اس وقت ترا دھیان کو مٹھا
جھک مار کے پھر کیوں مجھے تم بیاہ کے کا	رہنا ہی تھیں گھر میں نہ منظور اگر تھا
معراج کی شب سنتی ہوں اچھ میں اچھیں	تھا ہم کا پردہ یہ ادھر تھے وہ ادھر تھا
ملنے کے لیے کل مرے گھر آئیں جو بیگم	کچھ نفع تھا ارے اٹھانہ کچھ میرا ضمیر تھا

قبرستان کا شیطان

(از جناب: یاسر)

آٹار پر ہماری سیکلیں خاصی زقار سے چل رہی تھیں۔ اور پوڈر لمپ کی تیز روشنی میں فاصلہ ہی سے شریک پر کا مجمع ہمیں نظر آگیا میں سمجھ گیا کہ رات کے بارہ بجے کے بعد شہر کے باہر فتح دروازہ سے اس قدر دور قبرستان کے کنارے اتنے آدمیوں کا پایا جانا ایک غیر معمولی بات ضرور ہے۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا۔

حیدر: ”دیکھنا میرے بریک ٹھیک طور پر کام نہیں دیتے ذرا تم ہمیں سے اپنی گھنٹی زور سے بجانی شروع کر دو“ ارے میاں تم بڑے سست ہوتے جا رہے ہو سیکل کیا ہے ایک کٹھارا بن گئی ہے نہ بریک برابر نہ گھنٹی درست اور اگر رام لال لمپ نہ لگائیے تو نہ معلوم کیسے اتنی اندھیری رات میں جہاں نما سے تپ باز اپسوخ سکتے۔ اگر تم میرے یہاں دعوت میں آتے اور قذیل ساتھ نہ ہوتی تو سمجھتے ہو میں بھی اسی طرح مروت سے کام لیتا“

میں حیدر کی وقت بے وقت کی نصیحتوں کا عادی ہو گیا تھا اور اکثر اس کی باتیں ہوا پر اڑا دیتا اس وقت مجھے اس کی پروا بھی نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہاں بالکل قریب کوئی کلال خانہ بھی نہیں کہ یہ سمجھوں کہ یہ وہاں سے اٹھ آیا ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ تمام لوگ غلوٹش نظر آتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ یہ لوگ نشہ کی حالت میں ہوں، ساتھ ہی یہ بھی نظر آتا کہ کسی میت کو دفن کرنے آئے ہوں۔ آخر اگر بجلی کا گولہ نہ منگا سکتے تو کم از کم کوئی قذیل تو ساتھ ہوتی۔ میں اسی سوچ میں تھا۔ حیدر اپنی فلسفانہ گفتگو کے غائباً خود ہی خبے لے رہا تھا اور اس کی گھنٹی ہمارے در جانب کے قبرستانوں کے گہرے سکوت میں خلل ڈالتے جا رہی تھی کہ ہماری سیکلیں اس خاموش اور عجیب و غریب مجمع کے قریب پہنچ گئیں۔ میں تو چاہتا تھا کہ بچکر بازو سے بھل جاؤں۔ مگر جلا حیدر سے اتنی محبت ہو سکتی تھی۔ خدا کا بندہ کئی گز کے فاصلہ ہی پر سیکل سے اتر گیا۔ مجھے بڑا غصہ آیا پست مہمت اور مولویانہ طبیعت رکھنے والوں سے میں اسی لیے جلتا ہوں اگر حبیب میرا محسن ہے ہر جماعت اور مجھ سے زیادہ محنتی اور سبقتوں کے پورے نوٹ جمع کر لینے والا نہ ہوتا

تو شاید ہی میں اس کا دوست رہتا اور اس کے ساتھ سیکل پر نکلنا گوارا کرتا اب جو ذات بزرگ سیکل سے اترے تو لگے مجھے بھی بچانے کے غمی تھیں میت کا بھی لحاظ نہیں۔ ٹھرو سیکل سے اُترو! مگر پہلے آدمی کو اتنا خیال نہیں رہا کہ میرے بریک درست نہیں اور سیکلیں اتار چل رہی ہیں بھلا میں اس کی طرح کیسے فوراً اتر سکتا تھا۔ میرے لیے جمع کے پیچھے سے بچکر نکل جانا ہی آسان تھا اور اسی خیال میں بڑھ رہا تھا کہ حیدر نے ایک کر میرا پھللا ٹکڑا کر ڈکڑ لیا۔ اس کا ادھر لگا تھا کہ ادھر میرا بیانس بگڑ گیا۔ اور میری سیکل کا اگلا چاک جمع کے کسی شخص سے جا گرایا۔ اب میری گاڑی بغیر کسی کوشش کے ٹھہر گئی۔ مگر کس طرح؟ میرے جسم کا ایک طرف کا حصہ بالکل زمین سے ہم آغوش تھا اور سیکل میرے پاؤں پر۔

جب ذرا سنبھلا تو پہلے ہی لمحہ میں ان مولوی صاحب سے معافی چاہی جنہیں میرے اگلے چاک نے ضرر پہنچایا تھا اور پھر حیدر کی طرف جو اس وقت میری سیکل زمین سے اٹھا رہا تھا عقبہ دیکھ کر کہا: تمہاری بجواس تھیں اتنا موقع تو ہے کہ دیکھو آیا میت ہے بھی یا نہیں۔ (پھر مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر) کیوں مولوی صاحب آپ فرمائیے یہاں کوئی میت ہے؟ یہ ذات شریف صرف اس خیال سے کہ یہاں کوئی لاش دفن کی جا رہی ہے۔ خود سیکل سے اتر پڑے اور مجھے بھی بچکی طرح کھینچنا شروع کیا۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے آپ کو عمدہ انگریز نہیں دمی! وہ تو بے چارے بھلے مانس تھے کہ چپ کے ہو گئے۔ میں ان کی صورت شکل ڈویل ڈول سے تو متوقع تھا کہ کچھ نہیں تو کم از کم ایک دو گالیاں بھی مجھے دیدیتے مگر مجھے حیرت ہوئی جب میری توقع پوری نہیں ہوئی اب میں سمجھا ہوں کہ مولوی صاحب کی نسبت میرا جو ایک عام خیال ہے اس میں مجھے کچھ تو تبدیلی کرنی پڑے گی۔ میں حیدر کو اس کی اس حماقت پر اور ڈانٹنا چاہتا تھا مگر میرے مخاطب مولوی صاحب نے نہایت دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔

”خیر میاں جوانی میں دوست اسی طرح بے تکلفی سے پیش آتے ہیں۔ آپ نے یہ خوب پہچانا کہ یہاں کوئی لاش نہیں ہے۔! واقعی ہم لوگ میت کے ساتھ نہیں آئے ہیں بلکہ ہمارے محلے کے پہلوان میاں رمضان کی بہادری اور نڈر پن کا امتحان ہو رہا ہے آپ شاید کسی اور محلے کے رہنے والے ہیں اور آپ کو نہیں معلوم کہ اس قبرستان میں ایک کمرہ ہے جہاں ڈولے (مردوں کو لیجانے) کے سہتے ہیں اور جہاں دفن کرنے سے پہلے قبر وغیرہ کے تیار ہونے تک لاشوں کو بھی رکھا جاتا ہے اس کمرہ میں سے گزشتہ طاعون کے بعد سے راتوں کو خوفناک آواز سن آنے لگی ہو۔ یہ لوگ

اس قبرستان کے چھپے چکنی پورہ میں رہتے ہیں اور ہمارے محلے کے اکثر آدمیوں نے یہ آوازیں نہیں
 صبح اٹھارے میں اس کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں صبح کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آ رہا تھا تو مجھے بھی
 رمضان کے شاگردوں اور دوستوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میاں بیچ تو یہ ہے کہ میں نے
 خود اب تک کوئی آواز نہیں سنی۔ البتہ میرے گھر کی ماما کہتی تھی کہ وہ رات میں کام سے واپس جاتے
 وقت کچھ ڈراونی آوازیں ضرور سنی ہے میں آنا ضرور کہوں گا کہ میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ
 انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ اس کمرے میں شیطان ہے۔ غرض میں نے جو واقعہ تھا ان لوگوں
 سے بیان کر دیا مگر رمضان ہے بڑے دل کا آدمی۔ اکثر محرم کے زمانے میں کئی کئی سو کی ٹکڑیوں سے
 ہمارے محلے کے چند لڑکوں کو لے کر لڑا اور کامیاب واپس آیا اب جو اس شیطان کا قصہ نا طیش میں
 آگیا وہ کہتا ہے کہ اس نے کبھی اس شیطان کی آواز نہیں سنی اور اس کو ان قصوں پر یقین نہیں آتا۔
 لیکن جب دیکھا کہ محلے والے مانتے نہیں تو بلکہ اٹا اس کو بیوقوف بنا رہے ہیں تو اس نے آج رات
 کو بارہ بجے اس کمرے میں جا کر بتائے۔ اور یہ جو لوگ غلط قصہ مشہور کر رہے ہیں ان کی قلعی کھول دینے
 کا دعوائے کیا چنانچہ اسی دعوے کو پورا کرنے کے لیے وہ دیکھئے ابھی قبرستان میں داخل ہوا ہے۔
 میں مولوی صاحب کی اس گفتگو کو بے چینی اور حیرت کے ساتھ سن رہا تھا اور ابھی وہ
 رکنے بھی نہ پائے تھے کہ سوال کر بیٹھا کہ لیکن مولوی صاحب آپ لوگوں کو یہ کیسے معلوم ہو گا کہ رمضان
 کمرے میں داخل ہوا تھا کیا محلے والوں میں سے کوئی اور شخص بھی ساتھ جا رہا ہے؟
 اچھی خباب کسی میں اتنی ہمت کہاں کہ بیٹھے بٹھلے اپنی آپ ہلاکت کرے ہم لوگوں نے
 بہت سوچنے کے بعد تصفیہ کیا کہ رمضان کو ایک خاص کیلادیا جائے جسے وہ اکیلا کمرے کے اندر
 دیواریں میں لٹکا کر بٹھو کے اور جس کو ہم دوسرے دن صبح کو جا کر...
 گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ کسی شخص نے مولوی صاحب سے کہا کہ دیکھئے دیکھئے رمضان کو
 نہیں سچ گیا ہے۔ کیلا بٹھو کئے کی آواز آرہی ہے۔

اس اثنا میں میرا غصہ پانی ہو گیا تھا اور اب میں نے حیدر سے جو مجھ سے زیادہ محیرت تھا
 اور ایک بیوقوف کی صورت بنائے ہوئے دونوں باتوں میں دو سیکیٹیں سنبھالے کھڑا تھا۔ اپنی
 سیکل لیتے ہوئے آہستہ سے کہا: "ٹھیک تو یہی دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ مگر غنی ہم کو چلنا چاہیے را"
 زیادہ ہوتی ہے مجھے سبق کی تیاری۔

حیدر صاحب نے ہرگز نہ کرنے یا یا تھا کہ ایک زور کی آواز آئی ٹیکر لٹے اور اس کے سنتے ہی ہماری

ا اطراف کے مجمع میں سنسنی پیدا ہو گئی لیکن حالت یہ تھی کہ ہر شخص کے ہونٹ کانپ رہے تھے کسی کی زبان سے ایک لفظ تو نکلتا ! دو منٹ تک چپکے رہنے کے بعد میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ آواز تھا لبا اس کمرے ہی سے آئی؟ وہ خاموش کیوں ہو گیا۔ مولوی صاحب تو بت تھے کھڑے ہو گئے حیدر ذرا میرے قریب آ کر کہنے لگا میاں یہ تو کوئی اہم اور دلچسپ واقعہ معلوم ہوتا ہے (پھر مولوی صاحب سے) کیوں حضرت آپ اتنے سہمے ہوئے کیوں ہیں؟

اجی جناب بات نازک ہو گئی۔ خداوند کریم اپنا فضل کرے شیطان والا قصہ بالکل صحیح نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کی کو اپنے غرور اور حماقت کی سزا علی شیطان نے اس کو اہل کے پھندے میں پھنسا لیا۔ حیدر تو خیر میں سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا مولوی صاحب آپ رمضان کی آواز تو دیجئے اور پوچھیے کہ بس نے پکڑا ہے اور وہ کیوں نہیں آتا؟ مگر مولوی صاحب تو گئے آیتیں اور وظیفے پڑھتے نہ معلوم کیا کیا پڑھتے تھے۔ قریب کے ایک نوجوان نے جو ڈیل ڈول سے ایک پہلوان بھی معلوم ہوتا تھا رمضان کی تین چار صدائیں لگائیں مگر جب کوئی جواب نہ آیا تو ہر شخص ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگا اور پھر میری سیکل کی قندیل کے قریب آ کر یہ رائے مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کیا جائے اور تھوڑی دیر انتظار کرنے کے بعد۔

اکثر دل کی یہی رائے تھی کہ گھر دل کو واپس چلے جانا چاہیے۔ علی الصبح اٹھ کر سب مل کر کمرے میں جا کر دیکھیں گے کہ آخر رمضان کی کو ہوا کیا۔

میں نے جب دیکھا کہ یہ طے پا رہا تو خود ہی ذل ڈینے کی جرات کی اور کہا کہ آپ لوگ اگر اجازت دیں تو میں بھی کچھ کہوں۔ بات یہ ہے کہ ہم لیتے زیادہ آدمی ہیں۔ ہم کو کچھ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ہمارے یہاں سیکلوں کی قندیلیں بھی موجود ہیں خصوصاً اس پوڈیمپ کی روشنی میں تو ہم کو ہر چیز دکھائی دے گی بہتر یہ ہے کہ سب مل کر اس کمرے میں چلیں اور دیکھیں کہ رمضان کی کو ہوا کیا ہے۔ اس نپے خن کیوں ماری اور پھر خاموش کیوں ہو گیا۔

میں اپنی تقریر جاری رکھتا اگر حیدر گھڑی گھڑی میری شروانی پیچھے سے کھینچے نہ دیتا اور آگے بازو آ کر کان میں یہ نہ کہتا کہ غنی دیوانے ہوئے ہو؟ یہ شیطان کی کارگزاری معلوم ہوتی ہے۔ کلج میں ذرا فلسفہ کیا لے رکھا ہے کہ بڑی بہت بھی آگئی۔

مجھے حیدر کی ذہنیت پر ہنسی آئی کہ بی لے کا طالب علم اور اب بھی بھوت پریت کے قہور کا اس قدر قائل مگر میں جانتا تھا کہ وہ اپنے ماحول کے معتقدات سے اور ہمارے کابجوں کے اکثر طلبہ کی

طرح اپنی استبدادی تربیت اور پکچین کے اثرات کا شکار ہے۔ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس سے کچھ نہ کہوں بلکہ اپنے جاہل دوستوں ہی کو اکاؤں تاکہ وہ اپنے استاد پہلوان کو بچاویں۔ غرض میری آدمے گھنٹے کی جوشیلی تقریر کے بعد رمضان کی چند فوجانہ شکر دوں کی ہمت بندھی اور وہ یوں اٹھے کچھ ہی ہو چلے جناب ہم آپ کے ساتھ اس شیطان کے کمرے میں چلیں گے۔

یہ سنتے ہی میری کھل گئیں اور جھٹ اپنی اور حیدر کی دونوں سیکڑوں سے قندیلیں نکال لیں پوڈر لمپ اپنے ہاتھ میں لیا اور دوسری قندیل مجمع میں سے ایک فوجانہ کو دنیا چاہتا تھا جو ذرا پس پیش نظر آ رہا تھا کہ حیدر نے میرے ہاتھ سے چھین لی اور کہا کہ چلوں تمہارے ساتھ چلتا ہوں غرض آدمے کے قریب آدمی ہمارے ساتھ ہو گئے اور یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ حیدر آبادی غول اتنے بھی بزدل نہیں ہیں جتنا میں انھیں خیال کرتا تھا۔ چند ہی لمحوں میں ہم قبرستان میں چل رہے تھے اور ابھی دس منٹ بھی نہیں چلنے پائے تھے کہ میرے برابر کے پہلوان نے ڈرتے ڈرتے کہا دیکھئے کمرہ نظر آگیا۔ ذرا آہستہ چلیں۔

میں نے اپنے لمپ کی روشنی اور بھی تیز کر دی اور اس کاؤچ کمرے کی دروازے کی طرف کرکے بڑھنا شروع کیا۔ جب ہم ذرا قریب پہنچے تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک قومی الجشہ آدمی کا دھڑا اور ایک ہاتھ دروازے میں سے باہر نکلا پڑا ہے میں نے پوچھا کیا رمضان پہلوان یہی ہے جواب کی امید میں جب پیٹھ پٹ کر دیکھتا ہوں تو وہ مجمع جو ساتھ تھا اس میں سے اس وقت صرف چند گنتی ہی کے آدمی رہ گئے ہیں اور وہ بھی جھگی بلیوں کی طرح سمٹے سمٹے پھر رہے ہیں میں نے حیدر کو ڈانٹا کہ تم سے تو اتنا خوف زدہ ہونے کی توقع نہ تھی۔

غیبت یہ ہوا کہ حیدر نے جو مرد بکر ذرا فارتیز کی باقیماندہ ہمارا ہی بھی آگے بڑھنے لگے اور تھری دیر میں میرے ساتھ ہو گئے۔

میں اگر اس وقت تک جرات دکھا رہا تھا لیکن جب کمرہ قریب آگیا اور پہلوان کا جسم دکھائی دیا تو میرے پیر بھی لڑکھڑانے لگے۔ میں سمجھا کہ یہ شاید میری زندگی کے بھی آخری ہی لمحے ہیں مگر جب دیکھا کہ حیدر اور چند فوجانہ میرے برابر آگئے ہیں تو از سر نو ہمت بندھی اور دل کر کے جو کمرے کے دروازہ میں بڑھا تو دیکھا کہ پہلوان نے دیوار میں جو کیلا ٹھوکا ہے تو بد اتفاق سے اس کی شیروانی کا دامن بھی اس میں آگیا اور پھر واپسی کی جلدی میں جب اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کو اندک کی طرف کھینچ رہا ہے تو وہ بدحواس ہو گیا اور پھر اندھیرے کی وجہ سے یہ نہ معلوم کرسکا کہ خود اسی نے پانچ دامن دیوار میں آگیا۔

سوانح میر عالم کا ایک باب

(از جناب محمد سراج الدین صاحب طالب بم آرائے یں)

ہمارے کرم فرما مولوی سراج الدین صاحب طالب نے نواب میر عالم مرحوم دیوانہ کی سوانح عمری لکھی ہے جس کے بعض اجزاء مجلہ مکتبہ (جلد ۲ نمبر ۲ و جلد ۳ نمبر ۲ و ۳) میں طبع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب "پریس" کو جا چکی تھی اور نو صفحے چھپ بھی گئے تھے لیکن دوران طباعت میں جناب مولف کو میر عالم کا خود نوشت "روزنامہ" مل گیا تو نظر ثانی کر کے از سر نو "سوانح حیات" مرتب کرنے پڑے۔ "تصنیف و تالیف" کا یہ باب میر عالم کی خالص علمی زندگی سے متعلق ہے امید کہ علم دوست حضرات اس کو دل چسپی سے پڑھیں گے۔ (مجلہ مکتبہ)

تصنیف و تالیف

میر عالم جہاں اپنی خوبیوں اور بھلائیوں سے متصف ہیں وہاں علمی دنیا میں مولف یا مصنف کی حیثیت سے بھی شہور ہیں یوں تو کئی کتابیں ان کے نام سے موسوم ہیں لیکن ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ نہ میر عالم کی تصنیف ہیں نہ تالیف بلکہ ان کے اصل مصنفین نے ان کی خوشنودئی خاطر کے لیے ان کے نام سے منسوب کر دیا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ میر عالم علم سے خود بخوبی رکھتے تھے اور علم و اصحاب کو نیک علمی مشورے دیتے تھے وہ شرفارسی کے لکھنے میں جس طرح ماہر تھے۔ اسی طرح فارسی نظم کے لکھنے پر بھی قادر تھے ان کے شعر کے نمونے ان کے فحشات سے ملتے ہیں اور نظم کے بعض نمونے ہم نے قبل ازیں حسب موقع بیان کر رکھے ہیں۔ ان کے علاوہ اور جو کچھ ہیں ان کا ذکر اسی باب میں مناسب مقام پر کیا جائے گا۔

میر عالم کی جتنی تصنیفات اب تک دریافت ہوئی ہیں ان میں سے صرف تین چار ایسی ہیں جو حقیقتاً ان کی ذاتی محنت کا نتیجہ ہوتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) مصباح العارفین نام ایک رسالہ لکھا ہے جو عبادات میں ہے اس میں نماز شب کے طریقے میر عالم نے بیان کیے ہیں اس کتاب کے دیباچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیشتر ایک کتاب نماز شب ہی کے بیان میں انہوں نے تالیف کی تھی لیکن وہ تحریر آداب و ترغیب و تہذیب اور

بعض تحقیقاتی مسائل کی وجہ سے کسی قدر طویل ہو گئی تھی اور عام فہم نہیں رہی تھی اس لیے اس کو مختصر کر کے انھوں نے اس رسالے کو لکھا اور اس کے نقش اول کے مثل اس رسالے کو بھی ایک مقدمہ و تین فصول اور ایک خاتمہ پر مرتب کیا ہے چنانچہ دیباچے کی عبارت ذیل سے واضح ہوگا۔

”ابا بعد چوں دریں ایام ساعته چند از عمر سراپا طلب صفت نوشتن سطرے چند شد در بیان نماز شب و ہنگام تحریر آداب و تطہیر ترجمہ اذکار عنان اشہب قلم بے اختیار از دست رفتہ بود ای تحقیقاتی اوقات کہ در غور فہم ہمہ کس نبود لاجرم بخاطر فائز رسید کہ ثانیاً آل رسالہ را مقبے مختصر نمائیم کہ مثل باشد بر بیان آداب و در کمال اختصار و ترجمہ ضروری الفاظ اذعیہ و اذکار..... و اس مختصر مانند رسالہ اول مرتب است بر یک مقدمہ و نہ فصل و یکٹ خاتمہ۔“

اس رسالہ کی تالیف ۱۲۸۰ھ میں ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ازاد کے زمانہ بیکاری میں جہاں انھوں نے خدا پرستی کے اور کام کیے وہاں مذہبی رسائل بھی تصنیف یا تالیف کر کے سعادت حاصل کی۔

۲۔ زیارت عاشوراء۔ ایک مختصر رسالہ اور لکھا ہے جو زیارت عاشورہ کی ترکیب میں ہے۔ اس کی وجہ تالیف تمہیداً یہ بیان کی ہے کہ زیارت حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بڑے فضائل ہیں جن کا اظہار حیطہ تحریر و تقریر میں ممکن نہیں بعض زیارتوں کے اوقات و احوال لکھنے کا خیال ہوا کہ لوگوں کو سفر و حضر پر بھی زیارت کے لیے آسانی ہو اس رسالے کو پانچ فصول پر تقسیم کیا ہے جو یہ ہیں۔

۱۔ فصل اول زیارت عام ۲۔ فصل دوم اوقات زیارت ۳۔ فصل سوم زیارت عاشورہ ۴۔ فصل چہارم زیارت اربعین ۵۔ فصل پنجم زیارت جامعہ میسر۔ عبادات کے ان رسائل کے نسخے نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہیں اور ہماری نظر سے گزے ہیں۔ ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عالم پر ہدیت غالب تھی اور ان مذہبی رسائل کے مدون کرنے کی مہلت ان کو اس وقت ملی جبکہ وہ گوشہ عزلت میں بسر کر رہے تھے۔

۳۔ مثنوی میر عالم۔ میر عالم کو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی بعض کتب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ میر عالم کا فارسی دیوان مرتب و مکمل تھا لیکن وہ مفقود ہے ان کی شاعری کا نمونہ جو ہم تک پہنچا ہے فقط ایک مثنوی ہے جو غلام حسین جوہر صاحب تاریخ ماہنامہ کے بیان کے مطابق ماہ نقیہ کے سرایا میں انھوں نے نظم کی ہے

لہ ماہ نقیہ فی راج کندی لڑکی تھی جس کی بہن بہتاب بی رکن الدولہ میر موسیٰ خاں کے یہاں تھی۔ اس کا نام حبیبہ ابائی تھا اور ماہ نقیہ خطاب غفران تاج محل سے و اس شریف لانے کے بعد اس کو اس خطاب اور نوبت اور خطا میں سے سرفراز کیا گیا یہ درباری ہوائت سے تھی۔ ضروری جو غلیس کا بھائی تھا جو میر عالم سے ایک ہزار روپے انعام یا فی حق صاحب کمال خواہر ملحق جواب تھی اس کا دیوان معدوم ہے

سلاست و صفائی کے اعتبار سے مثنوی بہت شستہ ہے اس کی نسبت غلام حسین خاں جو ہر اپنی کتاب ماہ نام میں لکھتے ہیں۔

”نظم مثنوی در وصف سراپائے آں سر و جو بیار دلبری در بحر محنون بفساحت محاور
تصنیف فرمودہ اند چنانچہ اکثر اشتہار دارد

اس مثنوی کے جلد دو سو اسی شعر ہیں اس میں ماہ لقا کا سراپا ہے اور کچھ داستان جن عشق اس میں شک نہیں کہ یہ مثنوی اسی زمانہ میں مشہور ہو گئی ہوگی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ زبان ملیس اور شستہ تھی اور کلام میں آمد و بے ساختگی اور موافق مذاق زمانہ تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ میر عالم جیسے شخص کی کہی ہوئی تھی اور پھر ماہ لقا جیسی ہر دلغیرز کے لیے کہی گئی تھی۔ ماہ لقا کو جب یہ مثنوی ملی ہوگی تو خود اس نے اپنی منجنت کے لیے اس امر کی کوشش کی ہوگی کہ لوگ اس سے واقف ہو کر اس کی قدر کریں کہ یہ بھی ایک ایسے فرد روزگار کی مدد ہے یہاں ہم یہ تسلیم کیے بغیر نہ ہیں گے کہ اس مثنوی سے حقیقتاً ماہ لقا کے نام و نمود میں اور چار چاند لگ گئے۔

ماہ لقا اور میر عالم کا تعلق اس امر کے متعلق کہ میر عالم اور ماہ لقا کے تعلقات کیسے تھے اس کے ہوا خواہ غلام حسین خاں جو ہر نے ان الفاظ میں خاص روشنی ڈالی ہے۔

(الف) ”میر عالم بہادر اکثر می فرمودند کہ تمیزی بر سائی فہم و زکاوت طبع و جدت مزاج و زمرہ تلامذہ خود مثل ماہ لقا ندیدہ ام با وصف این ہمہ متانت و اقتدار و فضیلت بہومی و مصاحبت این ماہ لقاے زہرہ نوای اختیار می داشتند و مصاحبت این گل گلزار رعنائی تخم انتعاش در فرزند طابرت می کاشتند“

سلا غلام حسین خاں صاحب تاریخ ماہ نامہ شاعر تھے اور جو ہر تخلص کرتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علم و عرفان سے واقف نہیں تھے اور باوجود عدم واقفیت کے وہ اپنے قارئین کو شایہ یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ علم و عرفان سے بھی واقف ہیں اور اسی فن سے انھوں نے مثنوی مذکور کے متعلق لکھا ہے کہ ”در بحر محنون بہ فصاحت محاورہ تصنیف فرمودہ اند۔ عروض میں کوئی بحر سنائی کی نہیں ہے البتہ جن نام ایک زحاف تو ہوتا ہے یہ رکن کے اس تغیر کا نام جو اس کے دوسرے ساکن حروف کو گرانے سے پیدا کیا جاتا ہے جیسے رکن فاعلن سے دوسرا حرف ساکن (الف) اگر اگر فعلن بنالینا جس رکن میں یہ زحاف واقع ہو اس کو رکن محنون کہتے ہیں مثنوی کو ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بحر نہج مدس انوہ یا انوم مقبوض مخدوف میں ہے جس کے شمار کی تقطیع مفعول مفاعیلن فاعلن فاعلن سے ہوتی ہے جس کی اہل دانش سے میں مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن ہے ۱۲

(ب) ”چند ابائی (ماہ لقا) اکثر بہ مصاحبت (میر عالم) اختصاص یافت چوں فرج میر عالم بہادر قدردان اہل کمال بود و در فصاحت و بلاغت و نظم و نثر گوی سبقت از حسان و محبایان می ربود مصاحبت و مجالست این لطیفہ گو سے حاضر جواب را از جملہ انتعاش و شگفتگی گل خاطر پیدا در اختصار طریق استبدادی داشت و اکثر صحبت شعر و نظم و نثر در میان بود۔ میر عالم بہادر کاشد بہ زبان فصاحت تر جان می فرمود کہ مجلس باتمیز و تمیزی بایں جدت طبع و رسائی فہم شکل ماہ لقا کم دیدہ شد“

صاحب ماہ نامہ کے اس کلام سے ایک امر متنبہ ہوتا ہے کہ میر عالم شاعر ہونے کے علاوہ شاعر گر بھی تھے چنانچہ اس جملہ سے ”تمیزی بہ رسائی فہم و ذکاوت طبع و جدت فرج در زمرہ مآذہ خود مثل ماہ لقا دیدہ ام“ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرخ شمس گوائی میں علاوہ ماہ لقا کے میر عالم کے اور شاگرد بھی تھے لیکن ان کے نام معلوم نہ ہو سکے اور نہ اصلاح سخن کے طریق روشنی میں آئے اس شنوی کے آغاز میں ایک رباعی لکھی ہے اور اس سے پیشتر یہ مصرعہ بطور عنوان لکھا ہے (ع)

افسون خون عالم است ایں “ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (عالم) تخلص کیا کرتے تھے تخلص عام، خطا میر عالم کا جزو ہے جو ان کو (سلسلہ) اس وقت ملا تھا جبکہ ان کی عمر تقریباً ۲۷ سال تھی اور شاعری کا شغل اس سن سے قبل کا ہے اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خطاب سے پہلے کچھ اور تخلص کرتے تھے۔ اور خطاب پانے کے بعد انھوں نے اس کو بدل دیا اور عالم تخلص کرنے لگے۔ اشعار شنوی یہاں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شنوی کے آغاز و اختتام کے چند اشعار نقل کیے جائیں تاکہ ان سے میر عالم کی شاعرانہ طبیعت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

اے ماہ سپہر روتائی سرتاپا سے تو دلربائی
اے مردم دیدہ محبت سرتا قدمت طلبم الفت
اے جلوہ فروش جان ضیاء اے غمرہ متاع و اعشہ بار
تاروے ترا بہ من نمودند دہائے بلا بہ من کشودند

تاراہ سخن بہ من کشودی را بہ یہ غموشیم نمودی
گفتار غموشی تو با ہم در شعلہ فشانید با ہم
کز شمع زبان زبانیہ آفرود یا قوت لببت بخاموشی خوش

اے حسن تو دلربائی عشق آئینہ خود نمائی عشق
تا من تو ناختم بد دل عشقت رہ عشق متصل زد
از شوق تو شمع جان چاہو از گدگ من میاں چو بونہ
شہر تو میاں نہ بر زبانم سوز تو نہاں بہ من فرجام

۷
 لے باد صبا توئی دفایغ آگاہ خبر راحت و رنج
 بیماری تو شفا ہے جان با غم خواری تو دوائے جان
 از راه وفا دے گزاری بر منزل ماہ من گزاری
 یکے ز کرم تو ایسے فاکش شرح ہجراں کہ کردہ گوش
 رازے کہ بگوش دل شنیدی رائے کہ عیاں حبشیم پیدی
 پنہاں پنہاں گوش آن ہا القصہ گو قصہ کو آہ
 یہ رقیات میر عالم | میر عالم کے خطوط کا ایک مجموعہ ہے جس میں وہ تمام خطوط جمع ہیں جو میر عالم نے
 یا تو خود اپنی طرف سے کسی کو لکھے ہیں یا غفران آب یا ارسطو جاہ کی طرف سے ان نشأت کو ان کے
 منشی خاص حسین علی خاں نے جمع و مرتب کر کے ”باغ و بہار“ تاریخی نام رکھا ہے خطوط کو تین اقسام پر
 منقسم کیا ہے۔

قسم اول میں وہ خطوط ہیں جو حضرت غفران آب کو یا حضرت غفران آب کی طرف سے اوامرا اور سلا
 کو لکھے گئے ہیں۔

قسم دوم میں وہ خطوط ہیں جو ارسطو جاہ کی طرف سے لکھے گئے یا خود ارسطو جاہ کو لکھے گئے۔

قسم سوم میں وہ خطوط ہیں جو میر عالم نے اپنے اقربہ و احباب کو لکھے۔

اس کا ایک نسخہ خود ہمارے پاس موجود ہے ہشتم رجب ۱۲۱۲ھ اس کی کتابت کی تاریخ ہے۔
 اور کاتب میر محمد کاظم ابن میر محمد تقی خاں بہادر ابن میر محمد رضا صاحب ہیں۔ اس نسخے میں کتابت
 کی غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

نواب عابد الملک مرحوم کا خیال ہے کہ میر عالم نے اپنے رقیات و مکتوبات خود جمع اور مدون کیے
 اور انہیں میر عالم نام رکھا۔ اگر اصل رقیات کا نسخہ ہمارے پاس نہ ہوتا اور ہم حالیناب نواب سالار جنگ
 بہادر کے کتب خانہ میں اس کو نہ دیکھتے ہوتے تو ممکن تھا کہ ہم نواب صاحب مذکور کے اس خیال سے
 متفق ہو جاتے نشأت میر عالم کا نسخہ ہمارے سامنے موجود ہے ان کے مرتب حسین علی خاں کا لکھا
 ہوا دیباچہ اس کے شروع میں دو تین صفحات پر مشتمل ہے ان کو یہ امر تسلیم ہے کہ حسب الحکم میر عالم
 انھوں نے رقیات کے مسودات جمع کیے چنانچہ ان کی عبارت یہ ہے۔

”ہر چند ایں بے سواد دارالانشا و سخن گتری و ابجد خوان دبستان دانشوری حسین علی
 مخاطب بہ خطاب خوانی قابلیت آن ندارد کہ ایں گوہر لمے گراں بہار در سلک ترتیب
 و ایں جو اہر بے ہمتا را یہ ملک تحریر تواند آورد لیکن از انجا کہ بہ مقتضائے پرورش
 و رعایت خداوندی نہال قامت عقیدت استقامت بہ آبیاری تربیت آن نخل بند
 ریاض فضیلت نشوونما یافته با مرثی گری مامور است (بحکم المامور معذور) مدت جرت

بہ اجتماع مسودات مسطور کشیدہ بررقم منقسم ساختہ

اس سے ظاہر ہے کہ خود میر عالم نے ان کی تدوین نہیں کی بلکہ اس کی تدوین و ترتیب کا حکم انھوں نے اپنے منشی حین علی خاں کو دیا جنھوں نے بہ امتثال امر اپنی کوشش سے ان کو جمع کیا اور خود اس پر ویسا چھ لکھ کر کتاب کو مکمل کیا۔ یہ ضرور ہے کہ اس کی تدوین میر عالم ہی کے عہد ہیں اور ان کے ہی حکم سے ہوئی۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ خود میر عالم نے ان کو جمع کیا بہر حال رقعات کی زبان فارسی ہے جو اس عہد میں تعلیم یافتہ طبقہ کی اور فاتر کی اور جملہ کاروبار کی تحریری زبان تھی رقعات پر قدامت کا رنگ ہے۔ استعارات اور تشبیہات گوناگوں سے اور تلازمات بدیہی سے اپنے مطالب کو خوشنالباس میں پیش کیا ہے۔ لیکن اس سے مضامین گو رکھ دھند بھی نہیں بن گئے ہیں جن کا سمجھنا بوجھنا بہت مشکل ہو۔ باوجود استعمال صنایع و بدایع ان کی زبان میں سلاست ہے۔ صنایع کی پرکاری کے ساتھ اظہار مطلب رمز و کنائے میں کرتے ہیں۔ بعض ترکیبیں حینہ استعمال کرتے ہیں جیسے خاتمہ کا جملہ ”ایام عاطفت مدام باد“ یا خاتمہ پر دُعا کے ساتھ ”بائنون والصلاء“ وغیرہ لغات غریب استعمال نہیں کرتے رقعات میں ایک دور قعے عربی بھی دیکھے گئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان کے سمجھنے اور پڑھنے کے علاوہ اس کے لکھنے پر بھی قادر تھے ان رقعات کے مطالعہ سے اس زمانے کے بعض تاریخی واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ طرز تحریر معلوم کرنے کے لیے ہم یہاں دو تین رقعے نقل کرتے ہیں۔

(۱) رقعہ از طرف غفران مآب بہ جابج سیوم پادشاہ انگلینڈ کو کب دولت و اقبال و اختر شوکت و اجلال بادشاہ خورشید کلاہ معدلت و سنگاہ والاشان فرخندہ و دودمان برآرندہ آری کہ رفعت و عظمت فرزندہ الویہ اہمت و جہمت مالک ممالک نام آوری سالک سالک عدل گسری مہمد قوانین جہان داری مشید قواعد کامکاری ناہج مناجج از جہندی جابج معلوج سرلمبندی کامکار کشور نامداری شہیرا اعلیم علی تباری شمشعد فرزند فرزند اورنگ رونق آموز دانش و فرنگ جابج سیوم پادشاہ گریٹ برٹن وغیرہ ولایت فرنگ از وفق حصول المانی و آمال طالع وائع بادشاہ ابابعد گماشتہ کلک فصاحت می گرد و کہ شاہدہ محاسن اوضاع و اطوار کہ مقناطیس قلوب بالغ نظر ان کامل عیدراست آزند و محاطت رعایائے ولایت فراست خیر انگریز باہل این دیار و حصول آگہی از اصابت قوانین و ممانت

آداب و آئین سلاطین آن سرزمین علی الخصوص انضباط و استحکام و لوازم معاشرت و وفاق و ثبات و قیام و رسم مخالفت و اتفاق که در نظر دقیقه کشنایان مراتب کمالات بدینی نوع انسان سرآمد فضایل و بهترین خضایل است و به تخصیص تنگنا مکارم صفات و آثار ملکات آن شهریار کما مکار نامدار که در تهذیب ضوابط ریاست و سروری و ترتیب روابط جهانی و معدلت گسری به صفت فریت از امثال و اقران براسند و افواه جمهورند کور و در اطراف و الکاف این نه طاق لاجوردی رواق بهمت اقیانوس در جحان از سائر جهانداران معروف و مشهور است همیشه خاطر توده و مظاهر اایل تحریک سلسله محبت و داد و در اغب تائیس مبانی مودت و اتحاد است از آنجا که هر امری موقوف بر وقت خویش می باشد درین دلا ایا رت و ایالت مرتبت شہامت و بیا لت منزلت منبع الشان سموالکان مشرعیان اقل و بیا در که بحسن معاشرت و نیک ذاتی انالی اینجدا به مرتبه از خود راضی داشته که اکثر رؤسا و حکام بلاد هندوستان از روانگی مشارالیه افسرده خاطر و دل گراں اند غریت سخت آن بادشاه و الا جاه نمودند و تشید ارکان موالات به تائیس بنیان مراسلات بواسطت آن رمز شناس و تقایق فطانت آگاهایی پرده کشائی خواص صداقت و هو خواهی مناسب نمود و بعض امور قرار داد که بفرید تشید این اساس شهرهای مخصوص بود به معروضه مشرشارالیه حواله نموده تا بنیاد این بنائے عظمت اعتبار فوایدی قرار گیرد که دست سواخ حدشای از دلمان تحلل بنیانش کو تا هی پزیرد و بحکم (تحداد و احتیاجات) یک حلقه انگشتر الماس موافق رسم این دیار بر سبیل هدیه ابلاغ یافت ترصد که قبول خاطر لطفت آثار بود و هو ابره ابواب مراسلات طریقین مفتوح و طریقہ اینقه اتحاد و یکرنگی از جانبین مرعی و سلوک باشد زیاده ایام دولت بکام باد.

(۲) رقعہ از طرف نواب ارسلو جاہ بہادر بہ لارڈ کورنوالس بہادر متضمن کشتہ شدن غیرالکاد درین ایام احتمالے کہ از یرنگی ہائے تقدیر بواسطہ سوسے تدبیر جاقظ فرید الدین خاں بہ ظہور آمدنہ قطع بہ موجب برہمی کار محاصره گویم کنندہ شد بلکہ ایں تحلل بہ بعضی حرات از نزدیک قلعہ مذکور بجائے دور سرایت گردانہ تفصیلات و طرق دشواری نمایان

غبار آلوده تکرر واقعہ طلبیان گردید ہر چند از انتہائے رایات فیروزی آیات
 مرشد زاده بلند اقبال محبت مقام ہمزادہ بریک شبانہ روز فرصت توقف
 نیافت معینہ انگین این آشوب کہ بیک ناگاہ پدیدار شد و فرو نشانیدن
 جوش و خروش فرصت جویاں قابو طلب و تصفیہ راہ ما و اطمینان مترودین
 امتداد ایامی می خواست لیکن چون متواتر از نوشتہ میر صاحب جلیل القدر
 عظیم الامر صاحب میر عالم بہادر معلوم شد کہ آن مہربان بہ مقتضائے اتحاد غم
 سرزنگ پن را بمحض انتظار وصول ملوکب اجلال مرشد زاده بلند اقبال رسید
 مختص رہن توقف داشتہ فوق الحدیثیم براہ اند لہذا انتظام کاروائے این حدود
 را بروفق خاطر خواہ موقوف بروقت دیگر داشتہ بعد بندوبست ضروری تبایخ
 باز دہم جمادی الاول از گورم کندہ نہضت بعمل آمد و در یک ہفتہ مقام فلاں
 بہ نصب خیام نصرت اتنام مرشد زاده بلند اقبال رونق افروز گشت و در روز
 توقف ضرورتاً منظر والا کند جا ذبہ اشتیاق رساتر ازاں است کہ بے ضرورت
 وقفہ مانع تذکر کج تواند گشت انشاء اللہ تعالیٰ المستعان تبایخ فلاں ازین جا
 نیز ارادہ انتہائے مصمم بفضلہ تعالیٰ غم قریب شاہد اشتیاق پردہ از روئے حجاب
 می اندازد و سرور مواصلت با تبتلاقی امتداد ایام مفارقت لمے اتفاقی می پردازد
 زیادہ ایام شادمانی مدام باد

(۳) رقعہ از طرف میر عالم بہادر بہ گورنر جنرل لارڈ کورنوالس بہادر ہنگام سفر بنگالہ
 از بندر گنجام پیش از ملاقات بقلم آمدہ۔

ہر چند موافق قانون حفظ مراتب محبت و ولا و مطابق قاعدہ مراعات درجات
 مودت و صفایہ مقتضائے مراسم یگانگت کہ فیما بین سرکار شایخ الارکان کمپنی
 والاشان بہ اقصی الغایت استقرار و استمرار دارد و بہی خواہان ہر دو دولت
 را کہ فی الحقیقت واحد است می زبید کہ سر اخلاص از گریبان دعوی اتحاد
 بردارند کہ بہ آب و رنگ این رابطہ معنوی و واسطہ عقلی نقش یگانگی و یکپارگی
 بر لوح اثبات بزنگارند علی الخصوص مخلص از وقتے کہ حسب الحکم حضور پر نور
 ذیل مقدمات و واقف معاملات طرفین است نظر بریں کہ مداخلت

مدعی مخالفت می باشد بکرمزید اطلاع از محاسن احوال و اوضاع صاحبان عظیم الشان انگلیس عموماً و استماع عظمت قدر و مکارم اخلاق آن یگانه آفاق خصوصیت بے شائبہ تکلف نہایت مشتاق لعل گرامی می بود تا آنکہ بفضل الہی حضور لامع النور دریں ایام یمینیت انجام تشید و استحکام مبانی خلعت و دودا و بیش از پیش مصمم و منظور و ذہن نشین نمودن مراتبہ کہ موجب انضباط فوائد یکجہتی و یکیتا دلی تواند بود بہ آن والا مناقب سلم و منظور لہذا مخلص بہ این امر از حضور محض و مامور شد بچونہ تعالیٰ تباہیخت بست و دوم شہر ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۵ ہجری بہ مقام بندر گنجام مقام دارد و کوچ بہ کوچ غرم استحصال نعمت سامی موصلت وافی مباہجت دارد الحمد تقدس و تعالیٰ عنقریب بہ منزل مقصود بہ مقصد محمود فائز گردانہ بفضلہ و کرمہ خریطہ حضور پر نور موسوم اسم سامی کہ دریں ولا شرف ورود ارزانی فرمود و ملفوف و انچہ مخلص ہمراہ خریطہ مذکور بہ گزارشش آن مامور است انشاء تعالیٰ بالمشافہ التماس خواہد نمود۔ زیادہ بجز اشتیاق چہ نگارود۔

(۴) رقعہ از طرف میر عالم بہادر بہ کرک پیانک (حشمت جنگ) رزیدنیٹ حسیل آمد۔ دریں آوان سرت آفران نوید بحبت اقرائے خرمیت آن مہربان بہ این نواح بہ تقرراقامت حضور پر نورندہ آن قدر موجب سرور خاطر محبت آثار گردید کہ شرح شمع ازاں مانند محاسن اخلاق آن مہربان مقدور خامہ طول اللتان تواند بود و نہایم بحبت شامم ایں خبر سرت اثر نہ آنچنان باعث شگفتگی و غری دل و دستا گشت کہ عشر عشر آن رقم توان نمود چون مراتب شوق و آرزو مندی موصلت تا زیادہ از احاطہ تقریر و ما فوق اندازہ تحریر است۔ الحمد تبارک و تعالیٰ بہ اسرع اوقات بخوبی و غری زمان ملاقات ہمارا قریب الوقوع گردانہ و گلشن تمنائی دوستان را بہ آب یاری وصال آب و رنگ تازہ حاصل فرماید زیادہ زیادہ۔

(۵) حدیقہ العالم | اس کتاب کے متعلق تین امور مشہور ہیں (۱) میر عالم کی تصنیف ہے

(۲) اس کو میر عالم کے نام پر سید عبد اللطیف شوستری نے لکھا ہے (۳) یہ کسی اور کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ پہلے پہل یہ سراج الملک کے عہد وزارت میں انھیں کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی ہے اور پھر حسب ایمائے حالیہ پنجاب نواب فتح الملک سادہ کتب ۵۰۰ تہ الا بارہ شش

مطبوعہ انہوں کے پہلے مقالہ میں ایک مقدمہ اور سات باب ہیں اور دوسرے مقالہ میں چار باب اس کے متعلق نواب عطاء الملک بیچن لکرامی کہتے ہیں کہ حدیقۃ العالم کو میر عالم کے نام پر مرزا عبد اللطیف شوستری نے تصنیف کیا ہے نہیں معلوم کہ نواب صاحب مملوح نے اس امر کا پتہ کہاں سے لگایا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرزا عبد اللطیف میر عالم کے ایک گہرے دوست تھے ہماری تحقیق میں یہ عبد اللطیف شوستری میر عالم کے چچے بھائی ہیں۔ ان کے دادا شیخ الاسلام سید نور الدین کے آٹھ لڑکے تھے (۱) سید عبد اللہ (۲) سید نعمت اللہ معروف بہ سید آغا (۳) سید حسن (۴) سید محمد (۵) سید فرج اللہ (۶) سید مرتضیٰ (۷) سید طالب (۸) سید رضی سید طالب عبد اللطیف کے والد تھے اور سید رضی میر عالم کے والد عبد اللطیف شوستری صاحب تصنیف ہیں اور انہوں نے ایک کتاب تختۃ العالم بطور سفر نامہ لکھی ہے۔ ممکن ہے کہ تحفۃ العالم اور حدیقۃ العالم کو ایک ہی کتاب سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو یہ ممکن ہے کہ حدیقۃ العالم عبد اللطیف کی تصنیف ہو کر کرنے میں اس وجہ سے غلطی ہوئی ہو کہ حدیقۃ العالم کا متداول نسخہ مطبع سیدی (حیدر آباد) میں مالک مطبع سید عبد اللطیف شیرازی کے اہتمام سے طبع و شایع ہوا اور ممکن ہے کہ نواب صاحب مرحوم کا خیال انھیں عبد اللطیف کی طرف بابت کر گیا ہو۔ لیکن اس کا ایک غلط نسخہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں ہمارے دیکھنے میں آیا جس کے دوسرے مقالہ کی تہذیب یہ ہے۔

”مضیٰ نماذک اضعف عباد اللہ القوی یہ محمد مدوحہ میر ابو تراب ابن سید احمد الرضوی عالمہا اللہ بلطفہ انھنی والجبلی حسب الکلم واجب الانقیاد والنجاب سید کرم معدن احسان وکرم وزیر اعظم حضرت خلیفہ دوران سکند زماں دام ظل رحمتہ علی رؤوس العالم میر ابو النعمان المطالب بہ نواب میر عالم اعلیٰ اللہ مقامہ، چوں کتاب حدیقۃ العالم متفحص و دو مقالہ مقالہ اولیٰ در ذکر آثار ملوک قطب شاہیہ نور اللہ مرقدہم و مقالہ ثانیہ در بیان احوال خیر آل سلطہ عالیہ آصفیہ خلد اللہ دولہم وغیرہ کہ در فہرس ایں مقالہ مرقوم تالیف نمودہ بنام نامی آں وزارت آفتاب منوب گردانیدہ بیضہ مقالہ اولیٰ آں کہ متداول من اللہی و مشتہر بین الناس گردید بخلاف بیضہ مقالہ دومیش کہ جبریک و دہنود مشہور و مرجع مگردید و اکثر اعزہ از اولیٰ الابصار درخواست کنندہ و طلبکار بیضہ ایں مقالہ بودند

یہ نواب صاحب مذکور نے محمد الملک سالار جنگ کی سوانح عمری انگریزی زبان میں لکھی ہے جس کا ترجمہ فتح
... ...

تا اینکه درس زمان فیض قرآن سن یکہزار دو صد و ست و سیوم ازین ہجریہ و علی صاحبہا
افضل الصلوٰۃ والتیمتہ بر نحو اسے ائمہ ظہور ہر شے منوط بوقت آنست چوں حکام ہر
فردا جش رسید خاطر فیض باثر فیض رسان عالمیاں و اہم ظل فیضہاں گراںید کہ
مبیضہ از مسودہ نشر الادراک کہ نزد مولف است منظم ملک ترقیم گشتہ بنمازہ رواج
چہرہ افروز گردد۔

اس تہید کی توجیہ صاف ظاہر ہے کہ حدیقۃ العالمیہ محمد معروف بہ میر ابو تراب کی تصنیف ہے
اور چونکہ انہوں نے اس کو حسب احکم میر عالم تصنیف کیا ہے اس لئے اس کا انتخاب انہیں کے نام
کیا اور اپنی کتاب کے دوسرے مقالہ کے دیباچے میں بالتفصیل اس کا اظہار کر دیا مصنف کے نام
کی اسی تبدیل و تحریف کو برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی فہرستوں کے مرتب کرنے والوں نے بھی
بتایا ہے چنانچہ چارلس ریو برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات میں یہ لکھتے ہیں کہ حدیقۃ العالم کے قلمی
نسخہ (مخزنہ برٹش میوزیم) کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ابو تراب بن سید احمد الرضوی اسکے
مصنف ہیں جو دوسرے مقالے کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پہلے مقالے کو جس کی تہید میر عالم
کے نام سے موسوم ہے ختم کرنے کے بعد میں دوسرے مقالہ کو شروع کرتا ہوں اس قلمی نسخہ میں چارلس
ریو اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ مطبوعہ نسخہ میں میر عالم جہاں اپنا ذکر کرتے ہیں تو اپنے آپ کو ایں
خیر خواہ کے الفاظ سے بیان کرتے ہیں بخلاف اس کے اس قلمی نسخہ میں جہاں میر عالم کا ذکر آیا ہے
وہاں اُن کے نام کے لیے ضامراً واحد غائب استعمال ہوتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اس کا لکھنے والا
کوئی اور ہے اور گرائنٹ ڈف نے اپنی تاریخ مرہٹہ (جلد اول صفحہ ۲۲۸ کے فٹ نوٹ) میں بھی
حدیقۃ العالم کے مولف کا نام محمد ابو تراب ہی بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس نے اس کتاب کو
میر عالم کے نام پر معنون کیا ہے اور یہ کہ اس کے دو نسخے اس کے پاس تھے جنہیں کا ایک سٹر
ولیم سکس نے اسے دیا تھا اچھے نے کتب خانہ انڈیا آفس کی فہرست مخطوطات میں اپنی مزید تحقیق
یہ بتائی ہے کہ میر ابو تراب بن سید احمد الرضوی اپنی کتاب کی تہید میں یہ لکھتے ہیں کہ میرا گھر علی گڑھ
سکندر جاہ کے حکم پر (میر ابو تراب ابن سید احمد) شامان قطب شاہی کی تاریخ لکھنے پر مامور تھے
اور اس نے کتاب تصنیف کی جس کا نام قطب ناما سے عالم رکھا۔ اس کا سہ ماہی تصنیف ۱۲۸۸ھ
م ۱۸۷۱ء ہے اس کتاب میں بھی ایک مقدمہ اور سات باب اور ایک خاتمہ ہے جو حدیقۃ العالم
کے جملہ ابواب کے ساتھ مطابق ہے ہر چند ہم نے تلاش کی لیکن ہم اس کا پتہ لگانے میں قاصر

رہے کہ اس کتاب کو میر ابو تراب نے سکندر جاہ کے حکم پر لکھا اور قطب نامے عالم نام رکھا۔
 قلمی نسخہ کو اگر مطبوعہ نسخہ کے مقابل رکھ کر پڑھا جائے تو جزوی لفظی اختلاف کے قطع نظر
 یہ معلوم ہوگا کہ اکثر مستقل احوال و بیانات کا الحاق ہو گیا ہے۔ لیکن قطعی طور پر یہ معلوم کرنا
 کہ الحاق کس زمانہ میں ہوا یا کس نے کیا مشکل ہے۔ البتہ بعض الحاقات کے مطالعہ سے یہ قیاس
 ہوتا ہے کہ کسی نے میر الملک کی دیوانی کے زمانہ میں ان کی خوشنودی کے لیے بعض اضافے کر دیے
 چنانچہ مطبوعہ نسخے میں شیر جنگ اور درگاہ قلی خاں سالار جنگ کا احوال صریح الحاق ہے۔
 قلمی نسخے میں اس کا مذکور نہیں ہے اور چونکہ ان کا ذکر متن کتاب میں بے محل معلوم ہوتا تھا
 اس لیے الحاق کرنے والے نے یہ تمہید لکھ کر احوال بیان کیا۔

”وچوں دریں مقالہ اکثر جا ذکر نواب حیدر یار خاں بہادر شیر جنگ و نواب درگاہ
 قلی خاں بہادر سالار جنگ رحمۃ اللہ علیہما تقریباً در مطاوی کلام بزبان قلم آمد لازم شد
 کہ احوال اس ہردو امیر کبیر عالی شان کہ از اعیان دولت آصفیہ بودند بمعرض بیان“
 خود اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اس کو اصل متن سے کوئی تعلق نہیں یہ اور اس کے بعد
 کے احوال فٹ نوٹ کی حیثیت سے داخل کتاب ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ احوال مرہٹہ بھی
 اسی طرح الحاق کیا گیا ہے۔ مطبوعہ کتاب کا دیباچہ نہایت شاندار ہے اور بڑی قابلیت کے ساتھ
 لکھا گیا ہے مقالہ اول میں شاہان قطب شاہی کی تاریخ ہے۔ تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ
 لکھنے والے نے تاریخ قطب شاہی کو بہ تبدیل الفاظ نقل کیا ہے۔ بعض مقامات پر اختلافات
 روایت بھی نقل کئے ہیں لیکن تحقیق واقعہ کی نسبت کوئی بحث نہیں کی۔ مقالہ دوم کے دیباچہ
 میں اس کے پانچ باب بتائے گئے ہیں۔ لیکن پانچواں باب نہ کتاب مطبوعہ میں موجود ہے نہ قلمی
 میں اصل کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے جہاں کتاب کی اجمالی تقسیم بتائی ہے وہاں یہ ذکر کیا
 ہے کہ اس کے دوسرے مقالے میں احوال سلسلہ عالیہ آصفیہ ادا ام اللہ ایام دولہم کا ذکر ہوگا
 اور خاتمہ میں محل احوال مولف۔ لیکن نہ مطبوعہ نسخوں میں مولف کا حال لکھا ہے اور نہ قلمی میں
 بہر حال کتاب میں قطب شاہی زمانے سے شیو سلطان کی آخری جنگ تک کے واقعات ہیں۔
 اگر یہ میر عالم کی تصنیف ہوتی تو ان واقعات تاریخی کی جن میں میر عالم کا تعلق رہا ہے بہ نسبت
 اس عہد کے اور تاریخوں کے کچھ تفصیل زیادہ ہوتی ہم کو اس تاریخ سے میر عالم کے متعلق توڑک
 آصفیہ سے کچھ بھی زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتے ایک بات البتہ یہ پائی جاتی ہے کہ مصنف

ارسطو جاہ سے شکستہ دل نظر آتا ہے ایک دو مقام پر ان کی کفایت شعاری اور آئین پر اجالی نظر ڈالی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر عالم کو خوش کرنے کے خیال سے مصنف نے ارسطو جاہ کے خلاف خامہ فرسائی کی ہے جیسا کہ عبداللطیف شوستری نے بھی اپنی کتاب ”تحفۃ العالم“ میں کیا ہے۔ کتاب کا دوسرا مقالہ میو سلطان کی آخری جنگ پر ختم کیا ہے جس میں ان کی شہادت ہوئی۔ شہادت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے اس جگہ پر کتاب کو ختم کر دیا۔ ”قصہ کوتاہ تمثیل ایزدی چناں بوچیں شد“

(۶) دہ مجلس | ایک اور کتاب میر عالم کے نام سے مشہور ہے اور وہ ”دہ مجلس“ ہے جس میں واقعات کر بلا اردو زبان میں نظم کیے گئے ہیں تقریباً ہر مجلس کے خاتمہ کے شعر میں ”میر عالم نام بطور تخلص کسی نہ کسی دُعا کی تحت لایا گیا ہے جس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے والے میر عالم ہی ہیں اور ہر مجلس کے آخری شعر میں تخلص رکھا ہے لیکن ہم نے جب اس کو شروع سے آخر تک تفصیل سے پڑھا تو معلوم ہوا کہ ہر مجلس کے ختم سے دو تین شعر قبل ایک شعر میں بالالتزام محکم تخلص رکھا گیا ہے چنانچہ دوسری مجلس کی آخر میں (جو خاتون جنت حضرت فاطمہ الزہرا علیہ السلام کی رحلت کے بیان میں ہے) یہ اشعار ہیں :-

اے محکم عرض کر صد التجا سے جناب حضرت خیر النساء
جناب کبریا میں عرض ہوا لب سخن سر سبز میرا ہوئے باز
کرم سے میر عالم پر اے سجا
دوسری مجلس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں :-

غرا داروں کو کعبہ شکر کا جو غم حسین ابن علی ہے شاہ محکم
یہ ہی ہو عرض اے امت کے سردار رہوں دل سے تمہارا تفریہ
شفا دنیا میں عقیں میں شفا

بہر حال ہر مجلس میں تخلص محکم رکھا گیا ہے اور سب سے آخری شعر میں میر عالم لایا گیا ہے اور جس شعر میں میر عالم ہے اس میں کسی نہ کسی دینی یا دنیوی دُعا کا التزام رکھا گیا ہے۔ محکم کو میر عالم کا تخلص تصور کرنے میں تامل اس وجہ سے ہے کہ جب تخلص بتا دیا گیا تو پھر خطاب میر عالم کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں تھی اگر اس سے یہ مقصود ہوتا کہ لوگ یہ معلوم کر لیں کہ میر عالم ہی کا تخلص محکم ہے تو کسی ایک مجلس میں اس کا تکرار اظہار ممکن تھا۔ ہر مجلس میں دونوں اسماء کی تکرار سے یہ پایا جاتا ہے کہ لکھنے والے محکم نے وہ مجلس لکھی ہے اور میر عالم کی خوشنودی کے لیے ان کا نام ہر مجلس کے آخری شعر میں لکھ دیا۔

حرارت کے نطریے

(از جناب محمد علی دہلوی صاحب مکتبہ علمی اکلیہ علیہ رحمۃ)

نظریہ حرارت (Thermodynamics) کا ذکر پوسٹن کی نہایت مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ امتحان جامعہ کی تیاری کے سلسلہ میں یہ کتاب میرے زیر مطالعہ رہی اس کے دلکش اور انوکھے طریق تفہیم اور بلند پایہ خیالات کی وجہ سے اس کتاب کے ترجمے کا شوق پیدا ہوا اور میں نے وقتاً فوقتاً اس کے چند باب کا ترجمہ کیا لیکن مال حال یہ کتاب جامعہ عثمانیہ کے ام، ایس، سی، (طبیعیات) کے نصاب میں داخل ہو چکی اور دارالترجمہ جامعہ کے زیر نگرانی اس کا ترجمہ شاید شروع ہو چکا ہے اس لیے میں نے ترجمہ تو ملتوی کر دیا لیکن مقدمہ کتاب میں دو ایک جگہ خفیف سی تبدیلی کر کے اور اصل کتاب سے ابتدائی نظریات کا اضافہ کر کے ناظرین محترم کے مطالعہ کے لیے پیش کرتا ہوں اگر اسے دل چسپی پائی گئی اور مجھے فرصت ملی تو اس کتاب کا غیر مصلحی علم فہم اور پچھپ چھپ میں کرنے کی کوشش کر دوں گا۔ (وہاب) بہت ٹھوڑا عرصہ ہوتا ہے کہ لوگ علمی تحسین کو ذاتی مذاق تک ہی محدود سمجھتے تھے لیکن جوں جوں جدید انکشافات کے معاشرتی اثرات محکم ہوتے گئے عوام الناس بھی یہی خیال کرنے لگے ہیں کہ علم ایک دولت ہے اور سائنٹفک تعلیم قومی افتخار کا موجب ہے۔

جب ہم سائنس کے مطلع نظر اور اس کے بلند تہ پر غور کریں تو ہمیں چاہیے کہ اس خیال کو دور کریں جو عام طور پر سائنس کے متعلق کیا جاتا ہے آج کل عام طور پر لوگ یہ سمجھنے ہیں کہ ضروریات وقت کی تکمیل کے لیے چند واقعات کا معلوم کر لیا سائنس دانی ہے لیکن یہی یہ باور کرنا چاہیے کہ چند واقعات سے واقفیت حاصل کر لینے کا نام سائنٹفک تعلیم نہیں ہے اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص کسی علم کو بلا کسی ذاتی غرض کے یعنی محض تحصیل علم کے لیے نہ سیکھے۔ اُس وقت تک اس کا علم نفع بخش نہیں ثابت ہو گا۔

یہی محض اس کا نام نہیں ہے کہ ہم جنگ و جدال کے کارنامے اور حسن و عشق کے چند افسانے پڑھیں اور نہ اس کو تاریخ دانی کہا جاسکتا ہے کہ چند نین ہمارے حافظہ میں بہ حفاظت تمام موجود ہیں لیکن اگر حقیقتاً دیکھا جائے تو تاریخ ان معلومات کا نام ہے جو ہم واقعات کی تہ کو پہنچنے کے لیے فراہم کریں اور پھر ان واقعات کا اعلیٰ معاشرتی ارتقاء پر شاہدہ کریں بھی حال سائنس کا ہے وہ علم جس کو دراصل "طاقت" اور "اصلی قوت" کے نام موسوم کرنا چاہیے محض واقعات کے حفظ کر لینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اُن واقعات کو سمجھنے اور اُن کا انطباق

مظاہر فطرت پر کرنے کو اعلیٰ منوں میں سائنس کہتے ہیں۔

ان ہی معلومات کی جستجو سے نظریات سائنس کی ابتدا ہوتی ہے۔ کسی بنیادی نظریے کے بغیر ہمارے معلومات کے متعلق یوں سمجھیے کہ یہ محض مشاہدات کی ایک طویل فہرست ہے۔ سائنس کے ہر نظریے کے متعلق ہم یوں تصور کر سکتے ہیں کہ وہ دماغ انسانی کی ان بے شمار کوششوں کا نتیجہ ہے جو صداقت کی تلاش اور اصلیت کی چھان بین میں کی گئی ہوں۔ چونکہ یہ نظریہ واقعات اور حقائق پر عمل ہوتا ہے اس لیے یہ ایک ربط مسلسل ہے جو ان واقعات کو ایک دوسرے سے منسلک کرتا ہے۔

کوئی نظریہ کیسا ہی قابل قبول کیوں نہ ہو ممکن ہے کہ آخر میں چل کر غیر مستحکم ثابت ہو اس لیے یہ لازم آتا ہے کہ اس نظریے کو ہم ہر وقت تجربوں کے نتائج کے ساتھ منطبق کر لیا کریں۔ اور اس کی وسعت کے ہر پہلو کی تقیش کر لیں اس لحاظ سے بھی اور علاوہ ازیں تعلیمی نقطہ نظر سے بھی سائنٹفک مضامین کے لیے تاریخی اسلوب بیان نہایت مفید ہے جب اس اسلوب بیان کے ساتھ تفہیم کے لیے مضمون کی تشریح و توضیح بھی کی جائے اور ساتھ ہی رلے و تنقید کے ذریعہ پڑھنے والے میں آزاد خیالی اور عملی زندگی پیدا کی جائے تو ظاہر ہے کہ یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم چند واقعات کو اکٹھا فرام کر کے مطالعہ کے لیے پیش کریں ہیں یا درکھنا چاہیے کہ ہر علم میں وہی اسلوب بیان زیادہ بہتر ہے جس میں واقعات کو اس طرح پرکھایا جائے کہ دماغ پر کوئی بار نہ پڑے اور آسانی کے ساتھ ہر شخص سمجھ لے اور بذات خود ان واقعات کے باہمی تعلق پر غور و فکر کر سکے یہی طریقہ توسیع معلومات اور انفرادی طور پر قوت تخیل کی ترقی کے لیے نہایت کارآمد ہے۔

نظریات حرارت کے بیان کرنے میں ہم اسی طریقہ کو کام میں لائیں گے تاکہ نظریات کی ترقی میں تسلسل اور منطقی ربط پیدا ہو اور ساتھ ہی ذرا سے غور و فکر کرنے سے انطربین پر خود بخود ظاہر ہو جائے کہ یہ تبدیلیاں کس طرح رونما ہوئیں اور موجودہ نظریات کے استحکام اور مزید ترقی کے لیے کیا صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

حرارت کی ماہیت اور مادہ پر حرارت کے اثرات کے متعلق غور کرنے میں جو دیکھی پیدا ہو سکتی ہے وہ طبیعیات کے کسی دوسرے شعبہ میں ہونا اگر محال نہیں ہے تو اس قدر آسان بھی نہیں ہے۔ حرارت کا تعلق انسان کی روزمرہ زندگی سے اس قدر گہرا ہے کہ بیان سے باہر۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ نہایت غور سے ہے کہ برق و بجلی کی یہ دو ابعبیاں محیر العقول ضرور معلوم ہو رہی ہیں اور ان کا اثر روزمرہ زندگی پر سُرعت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے اور بڑھتا چلا جائے گا۔ لیکن ہم ابھی تک اس وجہ پر نہیں پہنچے ہیں جو ان تاثرات کو اسی قدر وسعت حاصل ہو سکے جو حرارت کے مظاہر کو عالم طور پر محال ہو سکتی ہے۔

حرارت کے اثرات اس قدر واضح اور ہمہ گیر ہیں، حیات انسانی اور قوت نمو پر ان کا اثر اس قدر گہرا ہے کہ پہلے پہل جس کسی نے بھی ان مظاہر قدرت پر غور کیا ہو اس کو تو یہی معلوم ہوا ہو گا کہ اس کرہ ارضی کی ساری نشوونما اور انسانی زندگی کی اصلی بنیاد صرف حرارت پر قائم ہے۔ موسم بہار میں کلیوں کا چلکنا۔ نباتات کی تحریک نمو اور بلبلوں کے دلفریب نغمے، پرندوں کے دل خوش کن اچھیے، غرض یہ تمام ایسی چیزیں ہیں جو ایک مفکر کے دماغ کو ضرور اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ اگر ذرا وسعت نظر سے کام لیا جائے تو اس دنیا میں جانداروں کی پیدائش کا راز صرف حرارت کے وجود میں مضمر پایا جائے گا لیکن ان سب سے بڑھ کر تو وہ اقتدار ہے جو انسان کو حرارت پر خالق عالم نے عطا فرمایا، اور یہی اقتدار اس کو دیگر مخلوقات پر ممتاز کر رہا ہے

یہ امر تعجب خیز نہیں ہونا چاہیے کہ ایک ایسی چیز جو اس قدر طاقتور اور ساتھ ہی ساتھ اس کا رازند ہو اور جو بعض اوقات خطرناک ہونے کے باوجود اس قدر فیاض ہو، کسی زمینے میں قابل پریش سمجھی جائے لیکن یہ حقیقت ضرور حیرت انگیز ہے کہ اس کی تحقیق اور تدقیق کو اُسی قدر نظر انداز کیا گیا جس قدر اس کے احترام میں التزام کیا جاتا تھا۔

جن چیزوں کو انسان روزمرہ استعمال کرتا رہتا ہے اور وہ چیزیں جو روزمرہ زندگی پر عام طور سے اثر کرتی رہتی ہیں انہیں چیزوں کے ساتھ عموماً یہ تو یہی برتی جاتی ہے انسان کی سب سے پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ قوائے فطرت کو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے استعمال کرے۔ نظریہ سازی کا درجہ بعد کو آتا ہے۔ انسان کے علمی معلومات کا پتہ ان آثار قدیمہ سے چلتا ہے جو آج تک عجائبات دنیا میں شمار کیے جاتے ہیں اور جو تاریخ کے ابتدائی دور میں معرض وجود میں لائے گئے تھے۔ مصر کے سرفلک نیار پونان درو ما کی اہم تابش ان عمارتیں اور ہندوستان کے عظیم الشان منار اس بات کا پتہ دے رہے ہیں کہ ابتدائی تاریخ عہد میں انسان تجرقل اور سمار کی اعلیٰ فنون سے کما حقہ واقف تھا۔

لہٰذا ابتدائیہ اور ایک حد تک قرون وسطیٰ میں علما و حکما اس عام مرض میں مبتلا پائے جاتے ہیں کہ وہ اپنا علم عام طور پر نہیں بلکہ اپنے خاص خاص شاگردوں کو سکھایا کرتے تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علم کا ایک بیشل بہا خزانہ ہمیشہ پردہ اخفا ہی میں رہا اور عوام کی قابلیت پر ان علوم کا کافی اثر نہ پڑ سکا۔ اس عہد کے علما و حکما نے کبھی اس قسم کا خیال ہی نہیں کیا کہ اپنی ایجادات کی فہرست چھوڑ جاتے یا ان انکشافات کو قلمبند کرتے جو انہوں نے اس قدر جاں فشانی کے بعد کیے تھے۔ اس کی وجہ سے متاخرین کی علمی جدوجہد میں جو جو رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں محتاج بیان نہیں۔

حرارت کیا ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جو خود سوال کرنے والے کو عرصہ تک اس حقیقت کے انکشاف میں سرگرداں رکھنے کے بعد پیدا ہوا اور یہ مجبوری تمام اس نے دوسروں سے مدد حاصل کرنے کے لیے اپنی زبان سے نکالا کیا یہ ممکن ہے کہ ہم ہر روز گرمی اور سردی سے متاثر ہوں اور ہماری اجتماعی زندگی میں حرارت کا اس قدر بڑا حصہ ہو لیکن پھر بھی ہم اس کے متعلق کبھی غور نہ کریں کہ خود یہ عامل کیا ہے جس کی مدد سے ہمارے سیکڑوں کام بن رہے ہیں اور جیل پر ہماری حیات و موات کا دار و مدار یہ غیر ممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمہیں نظر میں صرف اسی پر انکشاف نہیں کریں کہ حقایق فطرت کا مشاہدہ کر لیا اور ان کی اہلیت اور اباب و علل کی دریافت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سورج کی گرمی زمین پر اثر کرتی ہے اور اس وقت روشنی یا نور بھی پایا جاتا ہے یہی وہ چیز ہے جو ابتداء میں مفکرین اور فلاسفہ کے لیے غور و فکر کا باعث ہوئی کہ ”نور کیا ہے؟“ اور پھر حرارت کیا ہے؟ سب سے بڑھ کر اسی کو تو کائنات کا آسان سوال یہ ہے کہ آواز کیا ہے؟ اور پھر اس کے مفروضات کی مدد سے مقدمہ لکھ دو نوں سوال ٹری حد تک خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ آواز کے مظاہر پر جب ہم بحث کرتے ہیں تو ایک ایسے واسطے کی حد تک محدود ہوتے ہیں جس کو ہم زیر تجربہ لاسکتے ہوں اور جس کے خواص کو ہم بدرجہم معلوم کرسکتے ہوں لیکن جب نور یا حرارت کے مظاہر پر غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو ہم ایک معلوم واسطے سے نکل کر بالکل غیر معلوم اور مبہوم واسطے کی حدود میں قدم رکھتے ہیں۔ مرنی اور محسوس بالہس فضا سے نکل کر یکایک غیر مرنی اور غیر محسوس فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ معلوم طریقوں کی مدد سے ہمارے خیالات میں سل پیدا ہونے لگتا ہے اور تشکیل کی مدد سے توجیہ کرتے ہوئے ہم اپنے خیالات کو حواس کی سرحد کے باہر آسانی سے لیجا سکتے ہیں۔ مشاہدہ اور تجربے کی وجہ سے انسان کا دماغ اشیا کی خاصیتوں اور ان کے باہمی تعلق سے واقف ہوتا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان معلومات کی بنا پر توجیہ و استدلال کرتے ہوئے ہم ایسی چیزوں کے لیے بھی وجہ دریافت کرسکتے ہیں جو غیر معلوم اور غیر محسوس ہوں ان سب کا دار و مدار صرف ان خیالات پر ہوتا ہے جو ہم میں محسوسات اور مرنی اشیا کی مدد سے پیدا ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس اور کلمہ فلسفیانہ طریقہ وہ طریقہ ہے جس میں ہم محسوسات کی توجیہ غیر محسوس اشیا کی مدد سے کریں اور یہ وہی طریقہ ہے جو ابتداء طبعیوں نے اختیار کیا تھا۔ قدیم یونانیوں میں ذوق لطیف اور عقلی قوی بدرجہ کمال موجود تھے وہ قدرتی طور پر تمنا اور پاکیزہ چیزوں کا ادراک آسانی سے کر لیتے ان کا مشاہدہ نہایت درجہ گہرا تھا لیکن طبعیات کے میدان میں انھیں انجمن کا کام ہوا۔

ان کی یہ ناکامی اس وجہ سے نہیں تھی کہ ان میں فہم و ادراک کی ابھی کمی باقی تھی بلکہ انکی ناکامی اس طریقہ میں مضمر ہے جو انھوں نے طبیعی مظاہر کے استدلال کے لیے اختیار کیا۔ وہ فطرت کے ایک مبہوم نظام کے متعلق خیال آرائی کرتے اور توجیہات کی طواریک باندھے لیکن واقعات اور صحیح معلومات کی بنا پر انھیں استدلال نہیں آتا تھا اور اس طرح طبیعی مظاہر کی توجیہ بجز یہ اور مشاہدے کی مدد سے نہیں بلکہ خیالی اور محض تصوری استدلال کے ذریعہ کرنا چاہتے مشاہدات اور واقعات پر غور و فکر کرنے کی بجائے معلومہ چیزوں پر معلومہ چیزوں کے ذریعہ استدلال کرنے میں اپنا سارا زور ختم کرتے۔ اس طرح حرارت کے عام اثرات کو سمجھانے کے لیے انھوں نے جواہر زاری (Jewellery) کو ایجاد کیا۔ جو اجسام کے مسات میں نہایت خمدی کے ساتھ گزر جائے اور اس طرح ٹھوس کو مایع اور مایع کو گیس میں تبدیل کر دیتے تھے۔

اگر تجرباتی علوم کی ایک اہم شاخ ہونے کی حیثیت سے غور کیا جائے تو حرارت کا باقاعدہ مطالعہ گذشتہ صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے اس سے پہلے حرارت کی اہلیت اور اس کے اثرات کے متعلق صرف کیمیا دانوں نے کچھ جستجو کی۔ "احتراق" کی اہلیت کو واضح کرنے کے لیے کیمیا دانوں نے پہلے پہل نظریاتی شروع کی جس کی وجہ ہمیں اپنے مضمون کی تہ کو پہنچنے کے لیے اولاً کیمیا کا مطالعہ کرنا ہوگا اور بعد ازاں تجرباتی ذوق کی ترقی پر غور کرنا ہوگا۔

اگرچہ کیمیا دانوں کا پتہ قدیم مصریوں میں بھی چلے ہے تاہم تجرباتی ذوق کی ابتدا ساتویں اور اٹھویں صدی عیسوی کے بین بن معلوم ہوتی ہے اس کی پیدائش کا زمانہ وہی ہے جبکہ تہذیب اور علوم و فنون عربوں کے زیر سایہ میدان ترقی میں کام زور تھے تحصیل دولت کا داہمہ اس بری طرح ان کا دامن گیر تھا کہ جتنے کیمیا ساز (جیسا کہ اس زمانے میں کیمیا دانوں کو کہا جاتا تھا) اُس زمانے میں گزرتے ہیں انھوں نے اپنی ساری کوشش اس بات کے حاصل کرنے میں صرف کر دی کہ جس طرح بھی ممکن ہو معمولی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کا راز معلوم کر لیں۔ اسی لیے انھیں تجربات اور عملیات کی طرف مائل ہونا پڑا جس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ معلومات میں دن بدن وسعت ہونے لگی اور اس طرح یہ تجربے معلومات انسانی کی تجدید کا باعث ہوئے اور قدیم یونانیوں کے توجہات کا قطع قیہ ہونا شروع ہوا۔

جس زمانے میں یونان دروما جہالت اور بربریت کے ذخائر سمندریں غوطہ زن تھے مسلمانوں نے جو پہلے ہی سے ذہنی ترقی میں دیگر اقوام سے مابقت حاصل کر چکے تھے علوم و فنون کے چراغوں سے فضاے عالم کو منور کرنا شروع کر دیا تھا انھوں نے مصر میں فلسفہ ارسطو اور کیمیا کی تحصیل کی اور شمالی

آفریقہ سے ہوتے ہوئے آٹے کی طرف بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ بحرِ روم کو عبور کیا اور اندلس میں داخل ہوئے یہاں پہنچے مہمفرانِ روائی میں فنونِ لطیفہ اور علم و حکمت چمک اٹھے اور اندلس کے مدارسِ جلیہ عیسائی ممالک کے مزاج بن گئے اور تیرہویں صدی صیہوی کی ابتداء تک عربی کیما سازی سارے یورپ میں پھیل چکی تھی۔

جب کوئی قوم عیش و عشرت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کی علمی جدوجہد میں اضطراب ہوتا ہے اور وہ اپنے علوم و فنون کو بھی بھٹکا دیتی ہے۔ یہی حال مسلمانوں کا بھی ہے وہ جن کی علمی قوت اشد زبردست تھی اور جن کے پاس زندگی کی بنیادِ عمل جدوجہد پر موقوف ہے جب عیش پرستی میں مبتلا ہوئے تو علوم و فنون میں ترقی تو ایک طرف خود اپنے دریافت کردہ علوم و فنون سے انھیں غفلت پیدا ہونے لگی۔ پس بجائے اس کے کہ وہ کسی نئی سائنس کی تلاش کرتے، انھوں نے اپنے پہلے علم کو ہی بھٹا دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کیمیا کے ابتدائی انکشافات صرف کیمیا سازی کے تجربات تک محدود ہو گئے اور ان سارے تجربوں کا مقصد ”نگ پارس“ اور ”آب حیات“ کی تلاش اور جستجو تھی یہ ایسی تلاش تھی اور اس کا خیال اس قدر زبردست تھا کہ دوسرے علوم کے انکشاف میں اس وہم نے زبردست رکاوٹ پیدا کر دی۔

نگ پارس اور آب حیات کی جستجو میں جو تجربے کیے گئے اور جو طریقے اختیار کیے گئے انکی تشہیرِ صلیبی خلکوں کی مدد سے بھی ہوئی کیونکہ وہ عیسائی جو فتح کے خواب دیکھا کرتے تھے ملے ہو کر جوق جوق فلسطین پہنچتے تاکہ جس طرح بھی ممکن ہو اس ارضِ مقدس کو مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیں لیکن جب وہ یہاں سے لوٹتے تھے تو اس کے ساتھ ہی ان کے دماغ نگ پارس اور آب حیات جیسی عجیب و غریب چیزوں کے فریب میں آچکے ہوتے اور اس طرح یہ زمانہ محض نگ پارس اور آب حیات کی تحقیق کے لیے قابلِ مطالعہ ہے۔

اس زمانہ میں اقوامِ مغرب کچھ کچھ تصوف کی طرف مائل نظر آتی ہیں تاہم ہر زمانے میں معلومات کی محبت اور قوتِ علمی کا احساس عام طور پر لوگوں میں موجود رہا اور اسی وجہ سے وہ تاریکی میں روشنی کے خواہاں رہے اور اس کی طرف نہایت جوش کے ساتھ بڑھے اگرچہ وہ محض مغالطہ اور دھوکے ہی میں کیوں نہ پوشیدہ رہی ہو۔

قرونِ وسطیٰ میں شجاعت اور توہمات کا دور دورہ رہا لیکن ساتھ ہی یہ وہی زمانہ ہے جس کو ہم تجرباتِ طبیعیات کا دور کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس زمانہ کے قلبِ نبضات اور تحقیقین وقت کی

تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت مختلف دھاتوں کو ایک دوسرے میں تبدیل کیا جا چکا تھا ان مہران کیمیا کے خیالات کے قلمبند ہو جانے سے آئندہ تلاش کرنے والوں کے لیے ایک خاص راستہ بن گیا۔

ان کیمیا دانوں میں سے کچھ تو ایسے تھے جو بھولے بھالے اور سیدھے مادے لوگوں کو دھوکا اور فریب دینا اپنا مقصد مل اور نصب العین بنائے ہوئے تھے لیکن بعض ایسے بھی تھے جو بذات خود فضول امیدوں کے دھوکے میں مبتلا تھے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ سب اس علم کو ایک مہم سمجھ کر اس کے حل کرنے کی مسلسل کوشش میں لگے ہوئے تھے یہ لوگ اپنے تجربوں کے نتائج اور طریقہ عمل کو اپنے خاص خاص شاگردوں سے بیان کرتے اور وہ بھی رفر آئینہ طور پر اس طرح انہی اہمیت ہمیشہ مشتبہ ہی رہی۔

اس زمانہ میں لوگوں کو دھوکا دینا اسی قدر آسان تھا جس طرح آج کل مشکل ہے بہت سے حقائق کا انکشاف اس زمانہ میں ضرور ہوا لیکن یہ سب جعلی اور غیر حقیقی چیزوں اور نوادرو عجائب میں مخلوط ہیں اور اسی وجہ سے بعد میں اس کے لیے عرصہ دراز کی ضرورت باقی رہی کہ جھوٹ اور سچ کھوٹے گھرے کو جدا جدا کر کے بتلایا جائے۔

علم کیمیا میں اس زمانہ کے کیمیا ساز نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے غیر ممکن اشیاء کی تلاش میں بہت سی پتے کی باتیں دریافت کر لیں جنکو عملیات اور نظریات ہر دو میں خاصی اہمیت حاصل ہے۔ اس زمانہ میں بھی بہت سارے کیمیا دانوں نے اپنی تحقیق اور تجسس میں سائنٹفک نقطہ نظر کو پیش پیش رکھنے کی کوشش کی۔ بہت سے حکما ایسے بھی ملیں گے جنہوں نے عوام الناس سے علیحدہ ہو کر مظاہر فطرت کو طبعی نقطہ نظر سے جانچنا شروع کر دیا تھا۔ قدیم کیمیا کا غاصر کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے کہ ہر عنصر کسی نہ کسی دیو بھوت یا پری کے قبضہ میں ہے اور یہ غیر آدمی اجسام انسان کے قبضہ میں آسکتے ہیں نظام فطرت کے یہ غیر آدمی کارندے ان کیمیا دانوں کے دل و دماغ پر ہر طرح حاوی تھے وہ مافوق الفطرت باتوں پر عقیدہ رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ معلومات کا ایک ذخیرہ ایسا بھی ہے جس کو ہم اپنے حواس کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کے جو منطقی اصول پائے جاتے ہیں وہ بالعموم الفاظ کی تخیل پر مبنی ہیں نہ کہ اشیاء کے باہمی ربط پر۔ جس کا اثر یہ ہے کہ ان اصول کی بناء پر بجائے اس کے کہ وہ صداقت کا انکشاف کر سکیں۔ اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کو پوشیدہ کرنے میں حد درجہ کامیاب رہے۔

جب ادبیات یورپ میں جان پڑنے لگی تو ساتھ ہی یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ سائنس میں فلسفی استدلال سے کام لیا جائے۔ اشاعت ادب سے عوام الناس فطرت اور صداقت کے معیار سے واقف ہونے لگے۔ تجرباتی علوم میں ناکامیابیوں کی وجہ سے ہر قسم کی احتیاطیں ملحوظ رکھی جانے لگیں اور جب غلطیوں کا متواتر پتہ چلنے لگا تو عقلی ارتیابیت کی ابتدا ہوئی۔ سائنس نے ان روحانی ہستیوں کو اپنی حدود سے نکال باہر کیا اور قوانین فطرت پر بالکل بھروسہ کرنے پر زور دیا۔ جب مافوق الفطرت چیزوں سے میدان خالی کر دیا گیا تو اس کے بعد فطری مظاہر کو عقلی استحکام پہنچایا جانے لگا اور اس طرح جن چیزوں کو اعلیٰ روحانی ہستیوں سے منسوب کیا جاتا تھا ان کو بالکل عقلی طور پر سمجھنے کی کوشش ہونے لگی۔ تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں روجر بیکن نے خاص قابلیت اور ذہانت کے ساتھ خود تجربات اور مشاہدات میں مصروف کر دیا تھا۔ اس کا میلان طبع بالکل فلسفیانہ تھا وہ فطرت کے راز لمبے سربستہ کے انکشاف کا ہمیشی اور سرچشمہ فہم کی وسعت کا خواہاں تھا گو اس کی تلاش و جستجو کی وجہ سے بعض بعض غیر معمولی روابط معلوم ہوئے لیکن نہ تو اس کی اور نہ اس کے ہم عصر اہل علم کی کوششیں اسی زمانے میں موثر ثابت ہوئیں۔ تجربوں سے جن چیزوں کا انکشاف ہونے لگا۔ عوام ان کو سمجھ کر اور فہم سازی سے تعبیر کرنے لگے اور چونکہ یہ زمانہ خاتما ہوں کی آب و تاب کا زمانہ ہے اس لئے فلسفہ جدید کو یہ خانقاہ نشین حضرات حد کی نظروں سے دیکھا کرتے۔

لارڈ بیکن کے زمانے سے قبل تجرباتی علوم کے لئے کوئی واضح نقطہ نظر نہ تھا اس نے میدان عمل میں انسان کی مشکلات کا مطالعہ کیا اور یہ بتلایا کہ مجبور انسان کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔ بعد ازاں اس نے آلات سائنس کو استعمال کرنے کی ہدایت کی اور اس طرح مشاہدین کو غیر جان دار چیزوں سے مدد لیکر اپنے کام کو انجام دینے کا مشورہ دیا اس نے یہ بتلایا کہ انسان مظاہر فطرت کی محض توجیہ کر سکتا ہے اور صداقت کو محض مظاہر فطرت کے گہرے مطالعہ سے پاسکتا ہے۔ معلومات کے صحیح نظام کو قائم کرنے کے لیے قدما کی کتابوں سے مواد حاصل کرنا یا حقائق فطرت کو مابعد الطبعی نقطہ نظر سے حل کرنے کی کوشش کرنا یا ان کی بنیاد بجائے محسوسات اور مشاہدات کے تحلیل پر قائم کرنا بالکل لغو ہے۔ پس ہمیں چاہئے کہ مشاہدات سے قبل ہی انکشافات فطرت کے خیال خام کو اپنے دماغ سے دور کر کے میدان عمل میں قدم رکھیں اور تجربوں کو وسعت دیں۔

حقائق اور واقعات کو مذاق اور وضع طبیعت انسانی سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ان پر کسی قسم کی تنقید و تبصرہ کی گنجائش ہے اگر یہ حقائق ہمارے اصول موضوعہ کے متضاد واقع ہوں تو وہ

ہمارے لیے باعث برکت ہیں کیونکہ ہمارے نظریات اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ حیثیت میں بھی اشیاء کے صحیح علم کی غیر مکمل تقربات ہیں۔ طبعی تجربات میں شک ہی ایک ہی چیز ہے جو عموماً وسعت عمل کی محرک بنتی ہے اور اس طرح ہم حقیقت اور صداقت سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ شکوک خیالات انسانی کو مظاہر فطرت کی طرف اور زیادہ متوجہ کرتے ہیں اور اس طرح مظاہر قدرت کے پس پردہ کام کرنے والی قوت کا شاہدہ یا مطالعہ وسیع ہونے لگتا ہے۔ بعض اوقات مشاہدات کی حدود سے ہٹ کر ہمیں نظریات بنانے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جو ہمارے احاطہ محسوسات سے بالکل باہر ہوتے ہیں لیکن یہ نظریات ہمارے لیے تشفی بخش ثابت ہوتے ہیں جبکہ ہم بعض بعض امور فطرت کی بنیاد کو ان نظریات پر قائم ہوتی ہوئی پائیں۔ فلسفہ فطرت ایک تجرباتی علم ہے نہ کہ وجدانی۔ کسی چیز کے متعلق ہمیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ یہ دریافت کریں کہ ”وہ کیا چیز ہے؟“ نہ کہ اہم صرف یہ خیال کر لیں کہ اس کو کیا ہونا چاہیے یا ”وہ کیا ہو سکتی ہے؟“ مظاہر فطرت کے باہمی ربط اور دیگر علل نے ان معاملات میں انسانی تخیل کو عرصہ دراز سے بے تعلق کر دیا ہے۔

سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں ریاضی اور طبیعیات کے مسائل کی جستجو تہذیب یافتہ ممالک میں اس کثرت سے ہونی شروع ہوئی کہ اس سے قبل اس قسم کا مذاق بہ مشکل کسی ملک میں پایا جاسکے گا۔ واقعات کی بنا پر معلومات کو وسعت دینے کا طریقہ اس قدر عام ہو گیا کہ بہت سے محققین اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُس وقت انھوں نے یہ سمجھ کر تحقیقات شروع کیں کہ ابھی تک فطرت کا کوئی راز مخفی نہیں ہوا اور معلومہ شعبہ جات حکمت کے علاوہ بہت سے دیگر شعبوں کی دریافت سے اور دلچسپی بڑھ سکتی ہے انسانی معلومات میں اضافہ اور انسان کی عقل میں زیادتی کا واحد ذریعہ یہی ہو سکتا ہے۔

فرانس۔ انگلستان اور اٹلی میں مجالس علمیہ قائم ہونے لگیں تاکہ تبادلہ خیالات میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو اور تحقیقات کے لیے جو اخراجات ہوتے ہیں ان کا بوجھ کسی ایک شخص کی ذات پر نہ پڑے۔

۱۶۵۱ء میں ۱۔ Academy del cimento کا افتتاح زیر سرپرستی Duke of
Tuscany۔ ۲۔ ۱۶۶۶ء میں Royal society of london اور ۱۶۶۶ء میں Royal
Academy of sciences کی بنیادیں قائم ہوئیں ان اعلیٰ مجالس کے زیر سایہ نامور اور لائق اشخاص نے جو اس کے مختلف شعبوں میں کافی معلومات حاصل کر چکے تھے کام کرنا شروع کیا تبادلہ خیالات کی وجہ سے مذاق علمی میں کافی تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ اعلیٰ تحقیقات اور انکشافات علمیہ کے لیے انعامات کے اعلانات سے

کیمیائے ابھی علمی مرتبہ حاصل نہیں کیا تھا کہ تحقیق کی توجہ ایک دوسری طرف منتقل ہو گئی۔ نیوٹن نے *Newtonian Philosophy* اپنے آغاز کے ساتھ ہی نہایت سرعت کے ساتھ پھیلنے لگا اس کے اثرات کا اندازہ محض اس سے کیا جاسکتا ہے کہ زبردست تحقیق وقت اپنے لئے یہ امر باعث فخر سمجھے لگے کہ وہ نظریات نیوٹن کے متعلق تحقیق اور انکی تنقید کریں۔ ان تحقیقات کا پر جوش خیر مقدم ہونے لگا اور زیادہ سے زیادہ کچھ پیدا ہونے لگی۔ یورپ کے بڑے بڑے محققین نے ان ہی نظریات پر غور و خوض کرنے میں نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزار دیا۔

آخر کار سائنس فک خیالات کی رو ایک دوسری سمت بہنے لگی اور اٹھارویں صدی کا نصف آخر "حرارت" کی اصلیت کے باقاعدہ مطالعہ میں گزر گیا۔ اس زمانے میں اس مطالعہ کو *Black and* اور *Caloric* وغیرہ نے وسعت دی جن کے بعد *Dalton*، *Rumford* اور *Lavoisier* وغیرہ نے اس کو جاری رکھا اور تحقیقات علمی میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں۔ ان تکمیل بنیادوں پر جو شاندار اعداد قائم کی گئی اس کے دوام کی صورتیں انیسویں صدی میں پیدا ہوئیں *Fourier* اور اس کے ہم عصروں کے کارنامے زرین حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

قدما کے خیالات پر نظر ثانی کرنا اور علم طبیعیات کے متعلق ان کے خیالات پر نقد و تبصرہ کرنا نہایت سبق آموز ہو گا۔ ان کی تحریرات سے مختصر خیال آرائی کا واضح طور پر پتہ چلتا ہے لیکن ہر جگہ تجرباتی محسوس مفقود ہے۔ خیالی اور من گھڑت مفروضات کے ذریعہ قوانین فطرت کی توجیہ کرنا ان کے لیے بالکل آسان تھا اور وہ طبعی نتائج کو لایعنی دعووں پر قائم کرتے تھے۔ عوام کو یہ سمجھایا جاتا تھا کہ سیارے اس لیے گھومتے ہیں کہ دائری گردش کامل ہوتی ہے۔ ان کے پاس نظام طبعی کا دار و مدار اس پر تھا کہ "خلا محال ہے" اور اباب اور ان کے نتائج مبادی ہوتے ہیں "جب تک ان چیزوں کا وجود رہا علوم طبیعیہ کی ترقی محال رہی" ان دعاوی کا سلسلہ نسل بعد نسل جاری رہا یہاں تک کہ قرون وسطیٰ میں آزاد خیالی کے آغاز نے ان کا بھی خاتمہ کر دیا۔

گذشتہ صدیوں میں جو انکشافات ہوئے ان کے متعلق ہم کو یوں خیال کرنا چاہئے کہ جہالت کی تاریکی میں بعض بعض لوگوں نے علم کو ٹٹوٹنا شروع کیا اور اتفاقی طور پر ان میں سے بعض علمی روشنی میں پہنچ گئے۔ ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کے لیے اب تورتہ صاف ہو چکا تھا اس کے بعد جتنی ترقی معلومات میں ہوئی وہ محض ان انکامیوں اور کامیابیوں کا مشاہدہ ہے جو متقدمین کو دیکھنا پڑیں۔ انہماں کے ذہن میں پہلے کچھ شکوک پیدا ہوئے ہیں اس کے بعد وہ کوتاہ نظری تعصب اور دیگر ان تمام حسدوں کو

دور کرنے کی کوشش کرتا ہے جو جو اس کو دھوکہ دیتی ہیں تو ہمت اور ابتدائی غلط تعلیمات کا اثر دور ہونے لگتا ہے جذبات عالیہ نوع انسانی کی خیر میں داخل ہیں اور زبردست عقل و فہم والوں کے لیے بھی یہ امر مشکل ترین ہے کہ وہ ان لوگوں کی تعلیمات کو محو کر دیں جن کی وہ تعظیم کرتے ہیں حالانکہ وہ یہ محسوس کیوں نہ کرتے ہوں اور انھیں یہ صریحاً معلوم کیوں نہ ہو کہ یہ تعلیمات ناقص اور امحض غلطیوں کا مجموعہ ہیں۔ نوجوان اس سارے عرصہ میں یعنی ابتدائے لیکر انیسویں صدی عیسوی تک کا سارا زمانہ اسی جدوجہد میں گزرا کہ انسانی میں آزاد خیالی کا جذبہ پیدا ہوا اور توہمات و تصوف کی بیجا قید و بند سے دائمی نجات حاصل ہو۔ اس ساری جدوجہد کا نایاں نتیجہ یہ ہے کہ سائنس فک طریقہ کی جڑیں مضبوط ہونا شروع ہوئیں اور صحت عقلیہ کے آغاز سے سائنس فک ترقی کی ابتداء عمل میں آئی علمی دنیا میں روحانی اثرات کا استیصال کر کے آزاد خیالی اور اعلیٰ دماغی کوششوں کو ان کی جگہ دی گئی۔

ظاہر ہے کہ ایسے عہد کی تاریخی حالت نہ صرف تعجب خیز ہے بلکہ موخرین کے لیے یہ واقعات دس عبرت ہیں تاکہ وہ اپنی ذہنی ترقی اور وسعت عقلی کی طرف مائل ہوں۔ علوم طبیعیہ میں صرف دعوئل سے کوئی کام نہیں نکل سکتا اور نہ صرف شعور باطنی کی مدد سے ہم نظام فطرت کے مظاہر کی کڑیوں کو ملا سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ہم نہایت ایماندار می اور ثابت قدمی کے ساتھ تجربوں کو انجام دیکر اور مشاہدات کو اخذ کر کے ان از لمائے سربستہ سے حتی الوسع واقفیت حاصل کریں۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ مابعد الطبعی خیال آرائی ازمنہ سابقہ ہی تک محدود ہو چکی اور اعلیٰ طبیعیہ نے اس کا استیصال کر دیا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک ذہن انسانی میں شگفتگی باقی ہے خیال آرائی اسی طرح دل بھانے والی شے ثابت ہوگی جیسی کہ قدیم یونانیوں کے عہد میں تھی۔ ایک حد تک یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سائنس کی موجودہ فضا خیال آرائی سے بنیبت پہلے کے زیادہ مکرر ہو گئی ہے۔ ہر آنے والا دن اپنے ساتھ بے شمار جدید نظریات اور تازہ انکشافات کو دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جو زیادہ تر یا تو مشکوک ہوتے ہیں یا محض مفروضی۔ اس کا لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ عوام میں ذہنی بے تریسبی پیدا ہو جائے۔ اب بھی دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جو زمین کے چمپٹی ہونے یا دوائی حرکت کے ممکن ہونے کو اپنے ذہن سے دور نہیں کر سکتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی شخص کے ماننے یا نہ ماننے سے اصول فطر میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اصول فطرت ہمارے ذاتی مذاق سے بے نیاز ہیں۔

ابتدائی نظریات :- طلوع سائنس سے لیکر گزشتہ صدی عیسوی تک دونوں نظریات ایسے پائے

جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے مد مقابل معلوم ہوتے ہوں اور ہر ایک نظریہ میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ حرارت کی اصلیت واضح ہو جائے مگر ان کی بنیاد کسی مسلمہ اصول پر نہیں رکھی گئی۔ ایک نظریہ کے مطابق جس کو حراری نظریہ *caloric theory* کہتے ہیں حرارت کو یونٹ فرض کیا گیا تھا کہ یہ ایک نہایت چمکدار سیال ہے جو اجسام کے مسات پر اثر کرتا ہے اور مادہ کے فضاے بین السلمات کو پر کر دیتا ہے۔ دوسرا نظریہ جو قدامت میں قدیم یونانیوں کا ہم لپہ ہے اور جس میں حرارت کے موجودہ نظریے کی کچھ بوباس پائی جاتی ہے۔ حرارت کی اصلیت کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ کسی جسم کے مسات کے تیز ارتعاش کا نتیجہ حرارت ہے اور اس طرح نتیجہ کے طور پر حرارت کو حرکت سے متعلق کر دیا گیا۔ اس نظریہ کے مؤیدین کی تعداد عرصہ دراز تک نہایت قلیل رہی۔

بیکن لارڈ بیکن پہلا حکیم ہے جس نے اس امر کی کوشش کی کہ نظریات کی بنیاد کو مشاہدہ پر قائم کرے اس نے اپنے ایک رسالہ میں جو طریقہ انکشافات فطرت پر لکھا گیا ہے ان تمام اصولی واقعات کو جمع کر دیا ہے جو حرارت کی اصلیت اور اس کے پیدا کرنے کے طریقوں سے متعلق اس وقت تک معلوم ہو چکے تھے۔ اس کے بعد اس نے اس بات کی کوشش کی کہ ان کی اصلی وجہ پر کوئی صائب رے قائم کر سکے۔ رگڑ اور تضادم کے ان مختلف طریقوں کے متعلق غور کرنے کے بعد جن سے حرارت پیدا ہوتی ہے وہ صرف اس نتیجہ پر پہنچ سکا کہ ”حرارت حرکت ہے“

بیکن کا یہ خیال بہت جلد مقبولیت کے درجہ پر پہنچ گیا مگر اس میں مزید دو تریمات کی گئیں انگلستان کے مفکرین نے اس کو یوں تصور کیا کہ حرکت خود اس جسم کے باریک ذرات میں ہوتی ہے جو گرمی کا اظہار کرتا ہے لیکن یورپ کے مفکرین کی ایک کثیر تعداد یوں سمجھتی رہی کہ حرکت جو حرارت کی باعث ہے خود جسم کے ذرات میں نہیں ہوتی بلکہ اس چمکدار اور غیر مرئی سیال کے ذرات میں ہوتی ہے جو اس جسم کے مسات میں مبعرجاتا اور فضاے بین السلمات کو پر کر دیتا ہے اس سیال کے متعلق ان کا یہ خیال تھا کہ وہ ساری کائنات میں منتشر ہے اور کثیف ترین اجسام میں بھی بہ آسانی گھس جاتا ہے ان میں سے بعض تو یہ بھی خیال رکھتے تھے کہ بعض بعض حالات کی تحت وہ نور اور برق کے مظاہر بھی پیدا کر سکتا ہے۔

حراری نظریہ (*caloric theory*) فلسفیوں کا یہ دوسرا گروہ بہر حال ۱۹ ویں صدی ع کے آغاز تک برسر اقتدار رہا وہ برابر اسی پر مصر رہے کہ حرارت حرکت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ کسی جسم پر اس سیال کا عمل ہے جو نہایت چمکدار ہے اور جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے پہلے پہل جو خاصیتیں اس سیال کو دی گئیں وہ صرف یہ تھیں کہ یہ نہایت درجہ چمکدار ہے اور اس کے ذرات آپس میں ایک دوسرے کو شدت کے ساتھ دفع

کرتے ہیں اس سیال کا نام بعد میں کیا لوک (caloric) یعنی حرارہ رکھا گیا۔ کیا لوک کی اس دوسری خاصیت کی وجہ سے احتراق کے وقت حرارت اور نور پیدا ہوتے ہیں اس کے بعد ڈاکٹر کلے مارن (Dr. Cleghorn) نے اس سیال کی ایک اور خاصیت یہ بتلائی کہ اس باہمی اندفاع کے باوجود caloric کے ان ذرات کو مادہ کے ذرات شدت کے ساتھ جذب کرتے یا کھینچتے ہیں اور مادہ کی مختلف قسمیں ان ذرات کو مختلف قوتوں سے اپنی طرف کھینچتی ہیں بلاک بلیک (black) نے اس خیال کی تائید کی پس اس نظریہ کے مطابق اگر بہت سے جسم رکھے ہوں تو وہ مختلف قوتوں کے ساتھ کیا لوک کے ذرات کو کھینچیں گے تو اس انجذاب اور خود ان ذرات کے باہمی اندفاع کی وجہ سے تعادل قائم ہوگا اور اس تعادل کے قائم ہونے تک کیا لوک ایک جسم سے دوسرے جسم میں گذرتے رہیں گے۔

سیال حرارت کی جو اساسی خاصیت بتلائی گئی وہ یہ تھی کہ وہ غیر فانی ہے اور ہم کوئی طریقہ ایسا نہیں ظاہر کر سکتے جس کے ذریعہ اس سیال کو پیدا کر سکیں۔ جب جسم گرم ہوتے ہیں تو یہ اس امر کا نتیجہ ہے کہ ان میں کیا لوک داخل ہو جاتے ہیں اور جب ان میں سے کیا لوک خارج ہوتے ہیں تو وہ تختہ ٹڑے ہو جاتے ہیں اس لحاظ سے اس سیال میں وہی خاصیت پائی جانی چاہیئے جو عام طور پر مادے میں پائی جاتی ہے اور جو توانائی کے ساتھ بھی شریک ہے جب ہم مادہ کی اس خاصیت پر غور کریں کہ وہ وزن رکھتا ہے تو اس خیال کی شدت کے ساتھ مخالفت پیدا ہو جاتی ہے بعض فلاسفہ نے یہ کہا کہ کیا لوک میں وزن ہوتا ہے اور بعض یہ کہتے تھے کہ یہ بے وزن ہے اس امر کے تصدیق کے لیے تجربے کرنا نہایت مشکل کام تھا۔ جو تجربات بھی کیے گئے وہ نہایت شکوک تھے اور ان تجربوں سے جو بھی نتائج مرتب ہوئے وہ بالکل ایک دوسرے کے مخالف ہوتے تھے۔ آخر کار اٹھارویں صدی عیسوی کے ختم ہوتے ہوئے یہ خیال کیا جانے لگا کہ سیال حرارت ایک غیر وزنی شے ہے اس خاصیت کی وجہ سے وہ معمولی مادہ سے ممتاز ہے اخیر میں چل کر کوئٹ رمفورڈ نے نہایت احتیاط کے ساتھ حس تجربوں کو انجام دیکر اس نتیجہ کا اعلان کیا کہ اجسام کے ظاہری وزن پر حرارت کے اثر کے مشاہدے کی کوشش کرنا سببی لاعمل ہے۔

کلے مارن (Cleghorn) کے نظریہ کی بنا پر حرارت نہیں caloric نے اس امر کی تشریح کی کہ مخالفت اس مساوی اوزان میں مساوی وقفہ کے اندر جو اضافہ پیش میں ہوتا ہے اس کے لیے حراروں کی مختلف تعداد درکار ہے۔ یوں کہ مختلف مادے اس سیال کے ذرات کو مختلف قوتوں کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ اس لیے لازماً ایک ہی اضافہ تپش کے واسطے بعض جسموں کو زیادہ حراروں کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض کو کم۔ اس نظریہ کے نتیجہ میں بعض طبی مظاہر کی توضیح بھی اسی نظریہ کی مدد سے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اجسام کی حرارت کے اثر سے چھلنا ایک فطری تقاضہ ہے کیونکہ حرارہ کے ذرات خود آپس میں ایک دوسرے کو دفع کرتے ہیں جب یہ کسی دوسرے

جسم میں خلل ہوں گے تو اس باہمی اندفاع کی وجہ سے اس جسم کے حجم میں اضافہ ہونا ضروری ہے بعض اوقات جب حرارت سے کسی جسم میں سکڑاؤ پیدا ہوتا ہے تو نظریہ کی تائید میں کوئی نہ کوئی توجیہ کر لینا کوئی مشکل کام نہیں۔

بلاک نے یہ فرض کیا کہ حرارے محض آزادانہ حالت یعنی محسوس حرارت کی شکل ہی میں پائے جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ مادہ کی ترکیب میں بھی شامل ہیں اس حالت میں مخفی اور غیر فعال ہوتے ہیں اس طرح بلاک نے حرارت مخفی کو ایجاد کیا جب کیا لوہے کی غیر فعال اور مخفی ہوتے ہیں تو ان کا پتہ پیش پیمائی مدد سے نہیں چلتا۔ اس نقطہ نظر کی بنا پر پانی کو یوں سمجھیے کہ وہ برف اور بچہ حراروں کا مجموعہ ہے اور بھاپ پانی اور مزید حراروں کے مجموعہ کا نام۔ ”بلاک“ کا یہ دھوئے زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ امانت محض حرارت ہی کا اثر نہیں ہے مثلاً بعض یہ خیال کرتے تھے کہ پانی بذات خود ایک سیال ہے جو اپنے مختلف ذرات کی مفروضہ کردہ شکل پر منحصر ہے۔ جب پانی منجمد ہونے لگتا ہے تو اس میں کسی بیرونی شے کا اضافہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے منجمد ہونے کے بعد اس کا حجم بڑھ جاتا ہے۔

ایصال حرارت یعنی حرارت کے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہو جانے یا خود ایک ہی جسم کے مختلف حصوں میں حرارت کے پھیل جانے کے لیے بھی اسی نظریہ کی مدد سے توجیہ کی جاتی تھی کیونکہ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ حرارے زیادہ تپش کے مقام سے کم تپش والے مقامات کی طرف بہتے ہیں جیسے کہ مایعات بلند سطح سے ہمیشہ پست سطح کی طرف مائل رہتے ہیں زیادہ تپش والے مقامات سے کم تپش والے مقامات کی طرف حراروں کا بہاؤ اس باہمی اندفاع کا نتیجہ ہے جو پہلے ہی سے سیال حرارت کے ذرات میں فرض کر لیا گیا تھا۔

اس حد تک حرارین کے استدلال تشقیق شش ہوتے تھے حالانکہ بااوقات وہ زیادہ پیچیدہ اوزنا قابل استعمال ہو جاتے تھے۔ آگے چل کر ہم کو خود معلوم ہو گا کہ بعض بعض واقعات ایسے فراہم ہوں گے کہ ہم ان پر حراری نظریہ کے ذریعہ استدلال نہیں کر سکتے جب تک کہ ابتدائی اصول موضوعہ میں بنیادی اور طبعی تبدیلیاں نہ کی جائیں۔

سیر

(از جناب محمد عین الدین صا)

”دو آنے تین پانی“ بالے نے نفرت سے ماتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”گھنٹے بھر سے چنیتے چنیتے حلق بیٹھ گیا اور اس کا معاوضہ ”دو آنے تین پانی“

بالے کی نواسی رحمت ایک میلی پھلی ٹوپی میں دو آنے تین پانی لیے ہوئے اس کے سامنے کھڑی تھی یہ ان کی ایک گھنٹہ کی جائتشی کا صلہ تھا جو انھوں نے گاؤں میں سانپ کا کھیل دکھانے میں کی اس نے چاروں طرف نظر ڈالی سوائے اس کی نواسی کے کسی آدمی کا پتہ نہ تھا ہجوم راجہ ناگ کے پیارے میں بند ہوتے ہی منتشر ہو گیا تھا اور جب رحمت ٹوپی ماتھ میں لئے سلام کر کے ہر ایک سے سانپ کے دودھ کے نام سے پیہ مانگنے کھڑی ہوئی تو وہاں دو چار لوگوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ بالے کو یہ سننا اس حقیقہ معاوضہ سے زیادہ برا معلوم ہوا۔

”یس۔ رحمت! یہ ہمارا آخری تماشا تھا“ اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا ”ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ ان میں سے آدھے سے زیادہ کھیل ختم ہونے کے بعد ہی شتاق نظروں سے دیکھتے کھڑے رہتے تھے مگر اب انھیں اس کھیل میں مزا نہیں ملتا۔ اتھیر سہینا گانے کے جلسوں کو چھوڑ کر وہ یہ معمولی اور سستے کھیل کیوں دیکھنے لگے۔ چھوٹے بچوں کے خیالات بھی اب بدل گئے ہیں۔ اب نئی تعلیم کا اثر ہے انگریزی پڑھنے کا۔ بس اب ہم بھی کل سے یہ پیشہ چھوڑ کر انگریزی پڑھنے لگیں گے نفرت سے ہنستے ہوئے اس نے فقرہ ختم کیا مگر یہ طعنے سے بھری ہوئی ہنسی اس کے دلی بیچ کو چھپانہ سکی۔ رحمت کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔

”تانا! کیا تم سچ سچ ایسا ہی کرو گے“ اس نے التماسانہ انداز میں پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ دیکھ تو سہی یہ پیسے بھلا کیوں نہ کروں“

”مگر آج تو تماشا کچھ اچھا ہی رہا“

”دو آنے تین پانی کی آمدنی والے تماشے کو تو اچھا کہتی ہے۔ خوب گویا یہ پیسہ نہیں اشرافیا

..... نے ملے کر لہو لہو کرنا انی چاہئے“ اس نے تلخ طعنہ آمیز لہجہ میں جواب دیا۔ پھر

رحمت کی بسورتی جوی صورت کو دیکھ کر وہ کہنے لگا ”رحمت تو نہیں سمجھ سکتی ابھی بھی ہے جب میری عمر کو پہنچ چکی تو معلوم ہو گا کہ دو آنے تین پائی صرف دو آنے تین پائی ہیں۔ نہ کچھ کم نہ زیادہ ان سے ہرگز یہ امید نہیں ہو سکتی کہ کل کم از کم دو آنے چار پائی ہی مل جائیگے اور پرسوں ایک پائی اور زیادہ دت ربو بھی ملے“ اس نے محبت سے رحمت کے گالوں کو تھپکتے ہوئے کہا۔ رحمت اس کے بچنے ہوئے کوٹ کی آستین پکڑ کر اٹھنے لگی۔ ”نہیں نانا راجہ ناگ کو جنگل میں چھوڑ دینا۔ نہیں خدا کے لئے نہیں“ اس نے مسکایا لیتے ہوئے کہنا شروع کیا اور ایک ہفتہ تک دیکھئے۔ آج دھوپ سخت تھی۔ ممکن ہے کہ گرمی سے پریشان ہو کر تماشائی نہ ٹھہر سکے“ اونٹ۔ اس آج لیل بھی دھوپ پڑنی تھی نہیں۔ پھر وہ کیوں شوق سے کھڑے رہے تھے اور رات روز وہ بولی مجھے یقین ہے کہ اس مدت کے اندر کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ اس کے قبل بھی تو نے ہی کہا تھا اور میں رضا مند ہو گیا آخر کب تک“

وہ سوچنے لگی۔ راجہ ناگ سے اس کو ایسی محبت تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لیے اس کی جدائی گوارا نہ کر سکتی تھی مگر کیا ایک جانور کی محبت کی وجہ سے وہ اپنے نانا کو بھوکوں مرنے دے نہیں اس نے مجبور ہو کر کہا اچھا نانا جو تمہارے جی میں آئے کرو“

بالے کو ایک برتنی جھکسا سا لگا اور وہ مایوسی کے ساتھ اس کی صورت دیکھنے لگا (بیچاری بھولی لڑکی یہ کیا جانے کہ بالے کو راجہ ناگ سے اس سے کئی گنا زیادہ محبت ہے)

”کیا چھوڑ دوں۔ ہاں؟“

”جو تمہارے جی میں آئے کرو۔“

”خیر تیری خاطر میں رعایت کرتا ہوں اور رات روز تک دیکھوں گا، موقع ملتے ہی اس نے جلدی سے کہا اگر کاروبار اچھا چلا تو پھر کیا کہنے ورنہ — اس نے خوفناک غم کے ساتھ سر ہلایا۔ رحمت کا دل خوشی سے بھر گیا اس نے ایک خوشی کی چیخ کے ساتھ بولنے کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔

بالے سانپ کی ٹوکری کو باندھنے لگا ایک عورت جو دیر سے سڑک کے اس طرف کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی دفعتاً قریب آئی۔ رحمت کی نظروں میں وہ کوئی غمزہ بوڑھی معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ حقیقت اس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی اور کہا۔

”میں انوس کرتی ہوں کہ دیر سے آنے کی وجہ سے تمہارا تماشنا نہ دیکھ سکی۔ کیا تم جا رہے ہو؟“

”ہاں۔ اور شاید ہمیشہ کے لئے“ دو آنے تین پائی اس کی جیب میں تھیل رہے تھے۔

”یہ چھوٹی بچی تمہاری سہیلی ہے؟“

”نہیں نواسی“

”آج تمہیں کہیں اور تماشہ تو نہیں کرنا ہے“ اس نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

بالے نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے دل میں امیسد کی چنگاری چمکنے لگی۔

”آج میرے گھر پر تماشہ دکھاؤ گے؟“

”خوشی سے۔ میں بچوں کا دل بہلانے سے کبھی نہیں بھگتا۔ کتنے بچے ہوں گے۔ اس نے پوچھا۔

وہ فکر میں پڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر کہا کہ

”ہاں بچہ ہی کو تماشہ دکھانے کی ضرورت ہے۔ صرف ایک بچہ کو وہ رک کر کہنے لگی۔

”اچھا شکریہ ایک گھنٹے بعد۔ دیکھ کر مکان تم جانتے ہو نہ؟ گاؤں کے باہر۔ وہاں آنا“

”بہت خوب رانی“

”اور دیکھو۔ اگر ہو سکے تو تنہا آؤ۔ اس سے تمہارے کھیل میں تو کوئی حرج واقع نہ ہوگا۔“

”نہیں۔ رحمت صرف ٹوپی لیکر گھومتی ہے کھیل میں اس کا کوئی حصہ نہیں علاوہ بریس اسے

گھر جا کر میرے لیے کھانا تیار کرنا ہے۔“

”ہاں تو پھر ضرور آنا۔ بھول تو نہ جاؤ گے تمہیں معاوضہ اچھا دیا جائے گا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئی۔

گھنٹہ بھر کے بعد بالے دیکھ کر گھر کے قریب تھا ایک بوڑھا نوکر اس کی راہ دیکھ رہا تھا وہ بالے

کو پھوپھو اڑے لے گیا جہاں ایک اہلی کا درخت تھا۔ مکان کی دوسری منزل کی پھیلی دیوار کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

”یہاں۔ یہاں“ نوکر نے اہلی کے درخت کے نیچے ایک جگہ تبا کر کہا ”تماشہ شروع کر دو“ نوکر بھی

چلا گیا۔ بالے حیران پریشان کھڑا کھڑا کھڑا راہ دیکھ رہا تھا کہ دیس کھڑا کھڑا ہے۔ کئی

نوبصورت اور خوش لباس بچے اس کا استقبال تالیوں سے کریں گے۔ دیکھنے والوں کا ایک جھگڑا ہوگا

اور اسے خوب انعام ملے گا۔ مگر یہاں ایک آدمی کا بھی پتہ نہیں۔ نوکر بھی نظر سے غائب ہو چکا تھا۔ گانوں کے

باہر شام کے وقت۔ جنگل قریب۔ سنان اور خاموش جگہ پر اس کا کھیل کون دیکھے گا۔ دو منٹ تک۔

(وہ حیرت اور تعجب سے کسی کے آنے کا منتظر کھڑا رہا) مگر کوئی نہ آیا۔ شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی اسے خوف لاتی

تھی اس کے پیشہ ورانہ غور کو سخت صدمہ پہنچا۔ کیا خوب! ایک بہترین سپر انجیل کے درختوں اور مکان کی بچھلی دیواروں کو تماشاً دکھائے اور ذی روح کوئی نہ ہو۔ قریب تھا کہ وہ سانپ کی ٹوکری باندھ کر وہاں چلا جائے مگر یکایک اسے خیال آیا کہ معاوضہ اچھا دینے کا وعدہ کیا گیا ہے اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی چاہے تماشہ دیکھنے والا کوئی ہی نہ ہو۔ وہ خاموشی کے ساتھ ٹوکری کھول اپنی لوگی نکال سانپ کو اپنے راگ پر بچانے لگا۔ کھیل شروع ہوا وہی تھا کہ اُسے پیروں کی چاپ سنائی دی وہی عورت جو اسے بلالائی تھی سامنے کھڑی تھی۔

کھیل ختم ہوا رانی نے خوشی کا اظہار کیا اور دیر تک کچھ سوچتی ہوئی کھڑی رہی بالے دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ شاید کھیل میں کوئی نقص تھا جس کی شکایت وہ کرنا چاہتی ہے۔ آخر کار اس عورت نے سرائٹھیا ”کھیل کے دوران میں کوئی آواز تو تم نے نہیں سنی؟ ایسی جیسے بچے تمہارے کھیل کو دیکھ کر کیا کرتے ہیں مثلاً ”ہنسی کی“ اس سے پوچھا۔

بالے نے تعجب سے دیکھا کہ وہ بڑی بے چینی اور اضطراب سے جواب کی منتظر ہے۔
 ”نہیں رانی نہیں۔ یہاں تو شہر خاٹوں کی سی خاموشی طاری تھی اس نے جواب دیا۔
 ”ہائیں کیا کیا کہا؟“ وہ حالت کرب میں بڑبڑانے لگی۔

بالے نے اور زیادہ خوف اور تعجب سے دیکھا شروع کیا اور کہا۔

”تبر کی سی خاموشی۔ جس کا مجھے خود افسوس اور بے چینی ہے۔ وہ بہت دیر تک مغموم سر جھکے کھڑی تھی۔“
 ”مجھے چاہیے تھا کہ پہلے ہی کہہ دیتی۔ تمہاری یہ شرافت ہے کہ تم نے بغیر اعتراض کیے دیکھنے والوں کے موجود نہ ہونے پر بھی کھیل کیا مجھے کہہ دینے پر مجبور کر رہی ہے، وہ رک رک کر کہنے لگی اور پھر تمہیں یہاں آنا بھی پڑے گا۔ بشرطیکہ میری کہانی سننے کے بعد تم یہاں آنا پسند کرو یہ کھلی ہوئی کھڑکی تم دیکھ رہے ہو۔“
 اس نے دوسری منزل (کوٹھا) کی ایک ہی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا بالے نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور متوجہ ہو گیا۔ میرا چھوٹا بچا اس وسیع دنیا میں میری تنہا ملک اس کمرے میں تین منٹ قبل انتقال کر گیا اس نے رنجیدہ آوازیں سرگوشی کے طور پر کہنا شروع کیا۔ بالے اظہارِ رنج و ملال کے طور پر تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔

”مگر مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ وہ زندہ ہے اسی گھر میں ہے بلکہ میرے قریب بیٹھا ہے اس کا جسم نہیں تو کم از کم روح۔“
 ”بالکل صحیح رانی“ بالے نے ازراہ ترجمہ کہا۔

میرا نچا بچہ سانپ کا کھیل دیکھنا بہت پسند کرتا تھا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے ”اماں مجھے سانپ کا ماشہ دکھاؤ۔ آج بازار میں جب میں نے تمہیں دیکھا تو مجھے اس کی آخری وصیت یاد آگئی اور اس وجہ سے یہاں بلایا کہ شاید تمہارے کھیل کے سبب پھر وہ مجھے مل جائے۔“ اس کی کشش نہایت زبردست ہے رانی، اس شخص کے لیے جو اس کھیل سے سچی محبت رکھتا ہو مجھے خوب یاد ہے کہ اکثر لڑکوں نے میلوں میں اچھپا کیا ہے۔ ہاں البتہ اتنا فرق ہے کہ وہ زندہ تھے ”اور تمہارا بچہ مردہ“ وہ یہ کہتے کہتے رک گیا کہ اس سے اس کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔

تو زندہ رہتی ہے وہ ہمارے پاس آسکتی ہے ملاقات اور بات چیت کر سکتی ہے۔ اب بالے کی سمجھ میں آگیا کہ ہنسی کی نسبت سوال کی کیا وجہ تھی؟

کہ ہمسایہ کی بہت سوال کی کیا وجہ تھی؟
میں تو اب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ آپ کا لڑکا کھیل کے دوران میں یہاں موجود نہ تھا
گو اس نے آواز نہ کی ہو، وہیں نظر آئے بغیر سب کچھ دیکھ اور سن سکتی ہیں پھر وہ کیسے ستھنے ہو سکتا ہے۔
اگر وہ اس کھیل کا ایسا ہی شائق تھا جیسا کہ آپ نے کہا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ تین ہفتہ کے سے قلیل عرصہ میں
اسے بھول گیا ہو بچے آخر بچے ہیں چاہے اس دنیا میں ہوں یا اُس دنیا میں“

وہ مایوسی سے منہ نہ لگی اور آنکھیں بے اختیار کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں ”اوہ۔ اگر مجھے اس کا یقین ہو جائے۔۔۔“ اس نے کہا ”میں یقین زیادہ عرصہ تک نہیں روک سکتی۔ تمہاری بھی منظر ہوگی۔ کیا تم پھر آ سکتے ہو۔ کل نہیں۔ پرسوں۔ اسی وقت۔ تمہارا تماشہ مجھے اور اپنے بچے کے درمیان ملاقات کی ایک زنجیر معلوم ہوتا ہے۔ جب میں تمہارا راک سنتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے بازو کھڑا ہوا ہے۔ رہا ہے۔“ بالے نے دوسرے روز آنے کا وعدہ کیا۔ رانی نے اس کو دور روپیہ دیئے اور بغیر فکر یہ کا انتظار کئے چلی گئی۔

دوسرے روز بالے اسی وقت اہلی کے درخت کے تلے پہنچا اب کے رانی شروع سے اس کے ساتھ تھی کل کی گفتگو کا کوئی تذکرہ نہ بالے نے چھیڑا اور نہ رانی نے۔ بالے کی دلی بہدردی اب رانی کے ساتھ تھی۔ آج وہ اپنا کمال دکھانا چاہتا تھا۔

راگ شروع ہوا آخری حصہ قریب الختم تھا کہ یکایک لڑکوں کے تیر تھقبے کی آواز کان میں آئی۔ بالے کے ہاتھ سے لڑکی جھوٹ پڑی۔ رانی دوڑتی ہوئی مکان میں داخل ہوئی اور کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھنے لگی۔

اسے یقین دلایا کہ وہ کسی ایسے لڑکے کے قہقہے کی آواز ہوگی جو راستہ چلتے چلتے راگ کی آواز سن کر باہر کھڑا ہو گیا تھا مگر بڑے نوکر سے جو اسی کی نگرانی کے لیے باہر بیٹھا یا گیا تھا پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کوئی نہ تھا حسب معمول بالے کو دور پیسے ملے اور دوسرے روز آنے کا وعدہ لیا گیا۔

تیسرے روز بالے پھر پہنچا۔ رانی درخت کے نیچے اس کی منتظر کھڑی تھی اس کے پہنچنے ہی اس نے کھیل کے فوری شروع کر دینے پر اصرار کیا آج وہ نہایت بے چین اور مضطرب تھی۔ راگ شروع ہوا۔ آج کے گانے میں خود بالے کو ایک عجیب لطف مل رہا تھا وہ عالم وجد و بے خودی میں بجائے جا رہا تھا اور یہ تک نہ جانتا تھا کہ اس کے منہ سے کونسا راگ نکل رہا ہے۔ رانی کھڑکی کو کھینچی کھڑی تھی۔ فضا میں غیس مچولی ارتعاش تھا۔ راگ نصف کے قریب پہنچا تھا کہ کھڑکی والے کمرے میں کچھ روشنی دکھائی دی۔ مگر کل کے تجربے کے بعد رانی نے ہلنے تک کی جرات نہ کی۔

راگ ختم ہوا اور خامتہ پر کل سے بھی زیادہ صاف اور تیز آوازیں ایک قہقہہ سنائی دیا آواز بالکل رانی کے بچہ کے مشابہ تھی۔ بار ایک ٹھٹھی اور صاف۔ ابھی اس قہقہہ کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی کہ رونے اور سرسکیاں لینے کی آواز کان میں آئی یہ آواز قریب آتی گئی۔ رانی چونک پڑی۔ بوڑھا نوکر ایک بچی کو کان سے پکڑے گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا رانی غصے سے بالے کو دیکھنے لگی۔

”کیوں یہ تمھاری نواسی ہے نا؟ (نوکر سے) کیا واقعہ ہے“

”جی سرکار۔ یہ بچی باڑ کے سرے پر کھڑی ہوئی تماشہ دیکھ رہی تھی آپ کے حکم کے مطابق میں لے آیا۔“

”ہاں بچی۔ مت رو۔ ابھی ابھی میں نے تیری منہ کی آواز سنی ہے اور ابھی تو رو رہی ہے۔ اور بالے۔ اب تم جاو۔ اگر ضرورت پڑے تو میں بلا لوں گی۔ خدا حافظ“ یہ کہتے ہوئے اس بچہ کو روپیہ کا نوٹ نکالا اور زمین پر پھینک کر چل کھڑی ہوئی۔

بالے کچھ دیر تک پریشان کھڑا رہا۔ اس کو رحمت پر بہت غصہ آ رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ شاید رانی نے خیال کیا ہو گا کہ وہ عجز اس کو دھوکا دینے کے لیے اپنی بچی کو ساتھ لایا تھا اور منہی صرف دینے کے لیے اختیار کی گئی تھی وہ رحمت سے کچھ نہ بولا۔ اور اس کا ناتھ بکڑ سانپ کی ٹوکری سنبھال چلنے لگا۔ رحمت بالے کی خاموشی سے خوف زدہ ہو رہی تھی اس کے نانا کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ اس سے خفا ہے گو دیکھ کر سمجھ میں نہ آ سکی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد رحمت چپکی نہ رہ سکی اور پوچھ اٹھی۔

”نانا! رانی نے منہ کی متعلقہ کیا کہا۔ میں دو روز سے برابر یہاں آ رہی ہوں کیونکہ نانا کا راگ کو

دیکھئے اور آپ کاراگ سے میں رہ نہیں سکتی گرہنی کیا میں تو کبھی مہنی نہیں۔ پھر رانی نے کیا کہا؟
 ”توہنی نہیں“ بالے نے تعجب اور حیرت سے پوچھا۔

”نہیں“ اس کی نواسی نے جواب دیا۔

ہاں یقیناً اس کی نواسی کی آواز مونی کرخت اور مدسم تھی مگر اس ہنسی کی صاف۔ میٹھی اور تیز۔
 (ماخوذ)

عنف

از نواب نصیر الدین خاں ہجوڑ ایم اے (اڈنبرا)

طبع میں جب بوج در موج انبساط و شرم
 سطح دریائے ملاطم پوشش قعر چشم ہو
 جب کہ لب ہوں ذائقہ مانوس ہر و انیس
 جذبہ توام ہو ستر بوسہ عیش آفریں
 سینہ عریاں جو رنگ گوہر پارینہ ہو
 حیرت نظارہ عشاق کا آئینہ ہو
 روح پرور ذوق و تجدید گنہ کی آرزو
 دل میں ہو صد عالم زبانیافتہ کی جستجو
 جب کمال جن کو پہنچے ثبات ازت
 فراطحیرت سے ہو محض خود ثانی ذل گشت

عقدہ مشکل سہی آسان ہے اس کی کشود
 بے حجاب ہے جبین بند کی صرف سجود
 فطرت موجود ہے تکمیل مقصود و وجود
 قوت نامیہ کی نشوونما میں ہے نمود
 حلقہ جاوید ہے گویا کہ ترست بود

شاہد نیزنگ استی آشیان گیسر عدم
 مرکز احاس میں تیرے بنائے راز قدم
 ابتدائے آفرینش انتہائے جن جنم
 بے خبر ہم ہیں مگر تو سرابا پوش ہے
 ذرہ ذرہ اصد جہان کہ شدہ بود ہے

شاہد نیزنگ عالم جلوہ فہم انقلاب
 محرم راز خوشی چشم واکرہ بہ خواب
 ذرہ اذرہ یک ہجوم امتزاج کائنات
 عالم عالم جوشش پر آواز اجرائے حیات
 چشم سلفی گردش سخی ناکردہ قدم
 منظر استی: پائے آشیان گیسر عدم

عالم زبانیافتہ کا ہے نشین گیسر تو
 خانہ ویرانی تماش صورت تمسیر تو

ماثر ناآفریدہ باد پیائے ظہور
 نقش راقلانی خاطر بشارتے ظہور
 ہے شبیہ عقل انسان نقش بر آب خیال
 معرفت یک و ہر عکس آمینہ دریش حال
 ہے ترا از نظر نگار تار عنکبوت
 دانش عالم ہے تیری یک گس آننگ تو

من گوش آئے دل عالم سے یہ پردا ہوں
 موسیقی آئینہ جوئے خلوت فردا ہے کیوں
 وضع نو طرز ترانہ ہے تری آواز سے
 پر صد اہں کان میرے نغمہ ہائے راز سے

ادب اور شخصیت

(از غلاب بشارت علی صاحب علم جامعہ عثمانیہ)

آرٹ ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ادب زندگی کا نقد و تبصرہ ہے۔ اگر اس قول کی توجہ کی جائے تو اس کا مدعا یہ ہوگا کہ ادب زندگی کا ترجمان ہے اور یہ ترجمانی مصنف اسی اثر کی تحت کرتا ہے کہ جس کا نقش اس کے دل پر زندگی اور قدرت کے مطالعہ سے کندہ ہوا ہو ایک اور فراموشی کہاوت ہے کہ ”زندگی ایک آرٹ ہے جس کا مطالعہ ذاتی وسائل اور فطرت کے تحت ہو سکتا ہے۔“ جس طرح آئینہ میں اگر کوئی شخص اپنا عکس ڈالے تو اس کو سوائے اپنی صورت کے اور کچھ نظر نہیں آتا اسی طرح ایک مصنف اپنے مصنفات کی تحت خیالات کی ترجمانی کرتا ہے اور ان خیالات کی تہ میں وہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی توضیح صاف الفاظ میں یہ کہ تعریف ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں مصنف اپنی قلبی گہرائیوں کے نظر آتا ہے فی الحقیقت یہ ایک رقی کا نام مصنف کی دل و دماغ کی پیداوار ہوتا ہے اس کے انتخاب الفاظ ترتیب محاورات تخیلات کی پرواز، اسلوب بیان جو اس کی کتاب کا جہز و لانفک ہیں اس کی شخصیت کی ترجمان ہوتے ہیں جو اس کی شخصیت، ذاتی وجاہت علمیت نفس کی چوریاں قلبی نفاذیں سب کو پوست کندہ ظاہر کرتی ہیں ادبیات میں بیوگرافی کو اختصاصی شان حاصل ہے کیونکہ اس سے انسانی زندگی کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے مگر شخصیت کے باب میں وہ اس قابل ہیں کہ کسی زندگی کے واقعات کو من و عن پر درہ بدر کرے۔ شرح و بسط کے ساتھ کسی مصنف کی زندگی کے واقعات پر حقیقت میں اگر روشنی پڑ سکتی ہے تو خود اس کے ذاتی منقوشات اور مصنفات ہیں اس میں شائبہ کی کوئی وجہ نہیں اگر ہم کسی کی کتاب کو اس کی زندگی کا تصویر تصور کریں جس طرح سے عکاس خانہ میں زندگی کے واقعات پر عکس ڈالا جاتا ہے اسی طرح سے مصنف اپنے واقعات پر اپنی تصانیف میں عکس ڈالتا ہے اور یہی عکس صداقت اور حقیقت پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ دوسروں کی قلم کاری اس کی تصویر کے خلاف میں رونق پیدا کرے سکتی ہیں لیکن مافی الضمیر میں رموز اور دلی اسرار اور گہرائیوں کا پتہ سوائے مصنف کے دوسروں کو میر نہیں آ سکتا۔ مولانا حالی کی قوم پرستی، سرسید کا خلوص، غالب کی خود گردانی، شبلی کی علمیت، اور اسلام پرستی ان سب کا بہترین مظاہرہ ان کے تصانیف سے ہو سکتا ہے اسی اعتبار کی تحت قاری کا سب سے اول کام یہ ہے کہ قبل اس کے کہ وہ ایک ژرف نگاہ طالب علم بنے صرف قاری بننے کی کوشش کرے

اور وہ اس وقت تک مصنف کی تصنیف سے متنع نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ مصنف کے ہم مذاق بن کر اس کے خیالات اور جذبات کا سچا جامیہ بن جائے۔ شخصی تجارب سے استفادہ حاصل کرنا اور ان کے خیالات کے شریک بننا حقیقت میں اسی کا نام ادبی تربیت ہے۔ ایک آدمی کا شہ کار اسی وقت تک صحیح معنوں میں اختراع فائدہ نہیں ہو سکتا جب تک شخصیت میں وقت اور بلند پایگی نہ ہو اور یہی شخصیت کتاب کی جان اور حیات جاوید ہے۔

بچ کے پیارے نام سے جس چیز کو ہم لقب کرتے ہیں اس کا مطلب صرف فطری تازگی اور مادہ اختراعی کے سوا کچھ نہیں۔ اعلیٰ کتاب کی اختصا صلی خصوصیت یہ ہے کہ صداقت کے ساتھ ساتھ اس کے مطالعہ سے ہم کو نئی چیز حاصل کر سکیں۔ ادب کے مطالعہ کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ ہم میں یہی صداقت اور خلوص کے ساتھ بچ اور ارتقاء کے ذہنی پیدا ہو یہی پسیر ادب کی تربیت میں مرحلہ اولین ہونے کے علاوہ فائض المرام قاری بننے کے لئے زینہ اختتامی ہے۔

اس سلسلہ میں غلطیوں سے مامون و محفوظ رہنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ایسے ادب میں جس میں مصنف کے تجارب خیالات و جذبات مختصر یہ کہ مصنف کی شخصیت اور اپنی قلبی واردات کی ترجمانی ذہنی کیفیات جا بجا جھلک دکھا رہے ہوں، امتیاز کیا جائے ایسے ادب سے جو دوسروں کے جذبات اور حیات کا بچوڑ ہوں آخر الذکر کا کوئی مرتبہ ادبیات میں نہیں ہوتا۔ اگرچہ کہ وہ اسلوب بیان اور الفاعلی جو سیرہ کی تحت اعلیٰ درجہ کا کیوں نہ ہو۔

ادب اور صداقت :- افلاطون صداقت کو ادبیات کا جزو لا ینفک قرار دیتا ہے اسی کو کار لائل تمام بڑی بہادر یوں کی جان قرار دیتا ہے اسی سلسلہ میں جارج ہنری لیوس، قطارز ہے کہ ہم اس بات کے متذکر ہیں کہ ہر شخص کو نئی چیز اور اختراع فائدہ پیش کرے بلکہ ہم اس سے اس بات کی التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنے پُر خلوص سچے اور نایاب تحایف سے مطمئن کرے، ڈاکٹر جان سن بھی اس سلسلہ میں یہی کہتا ہے :- ہر آدمی سے یہ توقع کرنا کہ کوئی نئی چیز پیش کرے اس کے معنی یہ ہیں کہ مصنفین کی جماعت کو کم کر دیا جائے ایک فہم آدمی کو مجبور کرنا کہ وہ مرقوم صورت میں کوئی نئی چیز پیش کرے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی تصنیف کو چند صفحات پر مختص کر دیں۔

اسی سلسلہ میں مضمون کے ابتدائی صفحات میں وہ اہل قلم کی تقیم مندرجہ ذیل اقسام پر کرتا ہے :-

- ۱۔ وہ شخص جو ہمارے معلومات میں ایسی چیز کا از دیا کرے جس سے ہم خالی الذہن ہوں فی حقیقت ایسی چیز تھیائے دہر ہونے کے علاوہ فن کار (ماسٹر) ہو گا اور وہ قابل احترام ہے۔
- ۲۔ وہ جو طمیت کو دل خوش کن اور نئے اسلوب میں پیش کرے حقیقت میں اس سے انت چشمت نافع کے کی جا سکتی ہے۔

۳۔ وہ جو علم کے ذریعہ زندگی کو معصوم غلطیوں سے ملو کر رہے اس کا شمار ایک بہترین مصعب میں ہو سکتا ہے وہ مصنفِ تمغہ شہرت حاصل کرتا ہے جو اظہارِ مافی الضمیر میں لیت و لعل نہیں کرتا حتیٰ کہ صداقت کی خاطر اپنے معائبِ نفس کی چوریاں اور قلب کی کمزوریوں کی پست کندہ ظاہر کر دیتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے متعلق بیان کرتا ہے، دوسرے جو اس کے خیالات کو پڑھتے ہیں اس سرستہ راز کے فاش ہونے سے سبقت لے جاتے ہیں کیونکہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنی شخصیت کی تحت خود کے راز کو فاش کر رہا ہے ایسے ہی کردار کے لوگ دنیا میں شہرت دوام اور زندگی جاوید حاصل کرتے ہیں ورنہ وہ ہستیاں جو اپنے معائب کو پردہِ اخفا میں رکھ کر محاسن کو عوام میں لانا چاہتے ہیں۔ کسی نہ کسی صورت سے ان کے طرزِ بیان سے غلو اور مگر ظاہر ہو جاتا ہے جس کا لامبدي نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد گمراہی کی مرگِ مغافات سے فنا ہو کر ہمیشہ کے لیے ستور ہو جاتے ہیں کسی خاص زمانے میں یا کسی خاص انفرادی ہستی میں صداقت کی کمی یا فقدان اس عصر کے ادبیات کو مفقود کر دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ بجز صداقت کے کوئی زندہ جاوید کا نامہ کا ظہور ناممکنات سے ہے۔

بالخصوص اربابِ علم کو اس بات کا کافی کاٹ رکھنا چاہئے کہ یہ جو کچھ بھی علمی پیداوار پیش کریں وہ ان کے دماغ اور دل کی کاشت کا نتیجہ ہو۔ اس میں کوئی ہرج نہیں کہ وہ تجارب اور شخصی نقطہ نظر سے کہتے ہیں گئیے۔ اور حقیقت کیوں نہ ہوں وہ شخص عام طور پر واقع اور بلند رتبہ سمجھا جاسکتا ہے جس کو اپنے بل بوتے کا سہارا ہو اسی کا طے وہی علمی پیداوار زیادہ مستمر بالشان ہے جس کا متن شخصی تجارب، خیالات، جذبات، معلومات، مشاہدات کا سچا مرقع ہو۔ اجمال اس گفتگو کی یہ ہے ”ادب کا حقیقی اور آخری مقصد صداقت اور اخلاقیات ہے لیکن علمی نہیں ظاہری نہیں بلکہ معنوی، منطقی اور استدلالی نہیں بلکہ اصولی اور حقیقی“ کتاب میں شخصیت: جب کوئی اعلیٰ کتاب جو کسی اعلیٰ مصنف کی پیداوار کا نتیجہ ہو ہمارے سامنے ہوتی ہے تو نظرِ امعان سے اس کتاب کے ذریعہ مصنف کی شخصی زندگی کا پتہ لگاتے ہیں۔ اس کی عبارت مفہوم طرزِ تحریر بلکہ لفظ لفظ کو غور و خوض سے مطالعہ کرتے ہیں اس کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ مصنف میں اور ہمسام میں ارتباط قائم ہو جائے تاکہ مصنف کی شخصیت کے مطالعہ میں سہولت ہو اس کی زندگی اور کائنات کے خوشگوار تعلقات انفرادیت، اور ماحول کی کیفیات پر بصیرت سے روشنی ڈالتے ہیں کیونکہ ان ہی اصولوں کی تحت وہ اپنی شخصیت اور ذاتی وجاہت کی ترجمانی کرتا ہے۔

فی الحقیقت اگر اسماں نظر سے مطالعہ میں کام لیا جائے تو مصنف کی شخصیت کا پتہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں ہے ذرا محنت کی ضرورت ہے اگر اس مرحلے کو صبر کے ساتھ طے کر لیں تو ہم کو یہ دیکھ کر بعد خوشی ہوگی۔ کتاب ہی میں مصنف کی ذات کی جھلکیاں ہم پر ظاہر ہو جائیں گی۔ اس کے قلبی، روحانی، علمی، اخلاقی، نفسی، ارتقا کا انعکاس اس کی کتاب میں جا بجا ہو گا۔ کتاب ہی کی مدد سے ہم کہیں کی تعلیمی کیفیت فطرت کی تعمیر کے ذرائع، ماحول کا مناظرہ جس میں اس کی پرداخت اور نشو و نما ہوئی ہے، طرز سخن، دنیوی لوگوں کے ساتھ اس کا تعلق کائنات کے ساتھ اس کی وابستگی قوت تحریر و تقریر، ایمان، شاہدے کی اہمیت، دنیوی تجارب، غامض مردم شناسی، جلی اور فطری حادثات و اطوار، حکیمانہ شارکت اور ہر طبقہ الناس سے معاشرت غرض ان فروعات کا پتہ چلے گا جو کسی شخصیت کے محبے کو بے نقاب کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

جوں ہی اصولی اور نظم ادبی مطالعہ کا سوال پیدا ہوتا ہے اس وقت سے ہماری خواہش اور ولولہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ایک سطحی طالب علم بنیں ایک ایسا طالب علم جو تبحر اور ٹھوس معلومات کی محنت طالب علم کے لہجے صحیح معنوں میں خطاب کیا جاسکے ہمارے مطالعہ کی شان یہ ہونی چاہیے کہ کتاب کی چھان میں بال کی کمال نکال دیں۔ قلمی موثر گمان لفظی سحر کاریاں عار عام اصول ہو کچھ حصہ تک اگر ہم اسی اصول پر کار بند رہیں گے تو یہ معلوم کر کے ہماری طمانیت کی کوئی انتہا نہ ہوگی کہ ہم ادبی تحیات کے طوطا المستقیم پر ہیں جس کی وساطت سے کتاب کی شخصیت ایسی ہی ظاہر ہو جائے گی جیسی کہ طلوع آفتاب کے ساتھ دن جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی اصول کے اطلاق سے ہم پر کلینا ادب اور زندگی کے تعلقات کا سرسبزہ راز حل ہو جائے گا۔ جابج الیٹ جو خیال آرٹ کے متعلق ظاہر کرتا ہے اس کی تطبیق ادب سے بھی ممکن ہے۔ چنانچہ وہ بیان کرتا ہے کہ وہ زندگی کے لیے قریب ترین چیز ہے وہ ایک ذریعہ ہے جس کی وساطت سے تجارب اور بنی نوع آدم سے تعلقات کے وسعت دینے میں مدد ملتی ہے "خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ ادبیات حقیقی معنوں میں ایک اعلیٰ پیمانے پر زندگی کی شارکت کا موقع دیتی ہے۔ اس باب میں مجھے لیے ایک وسیع میدان تجارب نے تخیلات کا کھل جاتا ہے علاوہ ازیں بشریت کے دائرہ کی متوازن حد عبور کر کے روزانہ واقعات سے بڑھ کر ان ہتم باشان شخصیتوں سے تعارف حاصل کرتا ہے جو کتاب کی خیالی دنیا کے روح رواں اور فرو نایاب ہیں۔

زبان وہ ہے کہ جس میں ہونے پر تفسیر زبان وہ ہے کہ جس میں زبان پائے کسی کو صدقہ شماروں میں ملے کسی کو اس نے اشاروں میں ملے گا
زبان وہ ہے کہ جس میں عظمت و توقیر زبان وہ ہے کہ جس میں ہونے کوئی دیگر کسی کو دستوں میں ملے کسی کو اس نے اشاروں میں ملے گا
زبان وہ ہے کہ لطفے بان چسپاں بھلائی پر اگر آئی تو لا جواب ہی یہ

زبان وہ ہے کہ حسن بیان چہ میں
زبان میں فحش ہو گنج میں لطافت
زبان کی گرم بیاہنی بڑی حرارت ہے
زبان کی تیزی طرازی کیا آفت ہے
زبان پر اگر آتی تو بھر خراب ہے
زبان کی سخت کلامی کڑی مصیبت ہے
ہر ایک جہلیں اک آن ہوا صحت
ہر ایک فقو میں اک شان تلو بوجہ
کلام وہ کہ ملاقہ ٹپک ٹپک ہے جس سے
اسی سے ہوتی ہی پیدا اطلال کی صورت

کلام وہ کہ محبت نپاک ٹپے جس سے
ادار مالی ہو طرز بیان انوکھی ہو
ہر ایک لہجہ میں اک بانچن ہو چوٹی
ملاست ہو سلاست ہو اور خوبی ہو
مدد بھی بولٹے بول پال ہی ہو
ادھر زبان سے نکلی اُدھر جی دل میں
کہ جیسے پلئے محل نشین ہو محل میں
یہی دکھاتی ہے ظالم زوال کی صورت
یہ باتوں توں میں جگر سے کبھی بجاتی ہے
کبھی بجاتی ہو غرت کبھی گھٹانی ہے
قسم خدا کی ہر اک فن میں لا جواب ہے
تمام جسم میں انساں کے انتخاب ہے

اسی سے ہوتی ہو دنیا میں قسمت و اسی سے ہوتی ہو عالم میں کثرت و اس کی وعدہ خلافی ہو ہوتی ہو سخت دروغ گوئی سے اکی ہو غفلت کو غفلت
اسی سے ہوتی ہو حال جاہلیں عزت و اسی سے ہوتی ہو ہرزو زانیہ میں ہمت ہے بے عمل کی کمی گفتگو سے بے قسمت یہ خود ہی کموتی ہو کثرت آپا پی بہت
زبان پر ہو جو قدرت ادیب ہو یا بیان میں ہو جو قدرت خلیب ہو یا
ہے یہ کہنے میں اپنے تو بات ہے اے گل

ہے یہ کہنے میں اپنے توبات ہے اے گل
نہیں تو پھر یہ بڑی وامیات ہے اے گل

یہی زبان کوہم ہی زبان مبارک
یہی زبان ہو مونس ہی زبان ہمارا
یہی زبان ہو مکتار اور یہی غماز
یہی زبان ہے بعد اور یہی نام
ی زبان سے اچھی بری نکلتی ہے
ی زبان سے آپس میں تیغ چلتی ہے

سید مظفر علی خاں اسیر

(از سید محمد ام لے)

داجد علی شاہی دور کے بالکمال شاعروں اور بزم رامپور کے سربراہ اور وہ سخن سراہوں میں اسیر مرحوم ایک بلند پایہ شاق اور پرگو شاعر گزے ہیں جس عہد میں لکھنؤ میں چکے وہ اپنے سیمائی جلوؤں اور نظر فریب بہاروں کے لیے شہرور تو بہت ہے مگر موجودہ زمانے میں بہ اقتضائے وقت وہ جلوے کا فور ہو گئے اور اب وہ عہد افانوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ آج اس زمانہ کے بالکالوں کی اتنی بھی قدر نہیں کی جاتی ہے جتنی کہ ان کے شاگردوں اور نام لیواؤں کی کی گئی اور کی جا رہی ہے۔ اسیر مرحوم نہ صرف شاعر بلکہ شاعرِ گر عالم اور ماہر فن شعر و عروض کی وجہ سے شعرائے اردو کی صف میں قابلِ قدر جگہ کے متحق ہیں۔ اردو فارسی شاعری کے ضخیم کلیات کے علاوہ صرف نحو اور عروض و قافیہ میں بھی کئی کتابیں ان سے یادگار ہیں۔

اسیر مصنفات لکھنؤ کے ایک قصبہ امیٹھی میں پیدا ہوئے سنہ ولادت ۱۲۹۰ھ بتایا جاتا ہے ان کا خاندان دربار لکھنؤ کا ملازم اور اچھی خدمات پر مامور رہا۔ خاندان کے اکثر افراد علم و فضل کے علاوہ شاعری سے بھی جو عام شرفا کا ایک و محبوب مشغلہ بلکہ ایک ضروری لازمہ شائستگی تھا، متصف تھے۔ ان کے والد میر مدد علی بھی بڑے عالم دربار لکھنؤ کے قدیم ملازم اور محمد صالح کروڑی کی اولاد میں تھے وہ پبلہ ملازمت لکھنؤ میں سکونت پذیر تھے۔ اسیر بہت کم عمری میں لکھنؤ میں آ گئے ہیں انکی نشوونما اور تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کی تعلیم زیادہ تر گھر ہی میں ہوئی بچپن سے طبیعت میں تیزی اور جودت بھی بہت ہی کم مدت میں باپ اور چچا سے فارسی کی متداولہ کتابوں حدیث و فقہ اور کچھ حکمت و منطق کی تکمیل کی ایک اور عالم مرزا کاظم علی سے بھی استفادہ کیا۔ علم و فضل کے ساتھ گھر میں شاعری کا بھی چرچا تھا یہ بھی غفوان شباب میں شعر کہنے لگے۔ استاد وقت شیخ غلام بھادانی مصحفی کے آگے زانوئے شاگردی طے کیا مصحفی کا یہ آخری زمانہ تھا۔ ابھی دو تین سال اسیر کو ان کے ہاں تربیت پاتے نہ گزے تھے کہ انادنے وفات پائی۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اسیر نے اس کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔ طبیعت کی جولانی اور شعر و شاعری سے قدرتی لگاؤ سے اس فن میں رفتہ رفتہ اتنی مہارت پیدا کر لی کہ اس زمانے کے بہت بڑے استادوں میں شمار ہونے لگے۔

اسیر خاندانی تعلقات اور اغراض کی وجہ سے کم عمری ہی میں دس بار لکھنؤ میں ملازم ہو گئے اور محکمہ صدر امانت میں ایمنی کی خدمت پر ان کا تقرر کیا گیا۔ ان ایام میں نصیر الدین حیدر شاہ سربراہ آریسے سلطان تھے۔ یہ خود بڑے نیک دل اور بخیر تھے مگر حکمرانی کے جھگڑے بکھیرٹوں سے بکھرتے تھے۔ سارا وقت عیش و عشرت میں بسر ہوتا۔ وزیر ریاست کا مختار کل تھا۔ کسی بیگم کی سفارش سے ایک فیلبان وزیر ہو گیا۔ اس نے جو چاہا کیا۔ بادشاہ اس کے ماتھے میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ کسی بات پر بادشاہ اس سے ناراض ہوئے تو اس نے کورنگی کر کے رزیدنٹ سے بادشاہ کی شکایت کر دی اور خود بادشاہ کو بھی مکی دی کہ اگر مجھے وزارت علیحدہ کیا گیا تو آپ کے تخت کی بھی خیر نہیں۔ ملازم کی اس بے ہودگی اور احسان فراموشانہ بیباکی نے نازک مزاج بادشاہ کی طبیعت بہرہم کر دی۔ شراب نوشی کی کثرت سے پہلے ہی قویٰ امضہ مل ہو گئے تھے۔ دفعۃً اس مہم سے بیمار پڑے۔ موت کا خیال سایا تو تمام مہنیاں سے توبہ کر لی اور اطباء کے کہنے کے باوجود جان پر کمیل کر شراب کو جس کا استعمال ان کی زندگی کا جزو بن گیا تھا منہ نہ لگایا۔ آخر ۱۲۵۲ھ میں دس برس حکومت کر کے راہی عدم ہوئے۔ ان کے مرتے ہی تخت و تاج کے لیے دعویٰ داروں میں عجب کشمکش شروع ہوئی۔ مرنے والے بادشاہ نے کسی بات پر بیٹے سے ناراض ہو کر اس کو پہلے ہی محروم الارث کر دیا تھا اور اس کی یا ضابطہ اطلاع بھی رزیدنٹ کو دے دی تھی۔ باپ کے مرنے پر بیٹا اپنے صلاح کاروں کی سی سے اس کے باوجود تخت نشین ہو گیا مگر عین شین تاج پوشی میں رزیدنسی کی فوج کے گولوں نے کھنڈت ڈال دی۔ چند ہی گھنٹوں میں یہ تخت نشین گرفتار ہو کر معہ اہل و عیال کانپور بھیج دیا گیا۔ اس کی جگہ مرحوم بادشاہ کے ایک چھامرا محمد علی شاہ جو کوئی ساٹھ برس کے بوڑھے تھے بادشاہ بنائے گئے یہ بھی چار پانچ برس حکومت کر کے تپ عرقہ طویل ہو کر فوت ہو گئے۔

اس طوائف الملوک اور افراقی کے زمانہ میں اسیر محکمہ صدر امانت کے گوشہ غزلت کے پابند اور اپنے فرائض خدمت کی ادائی میں جپت و چونبد تھے ان انقلابوں اور کہریلیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑا جب مرزا محمد علی شاہ کے انتقال پر امجد علی خاں بادشاہ ہوئے تو ان کا تارہ انتہا چمکا۔ ایمنی سے ترقی کر کے سلطانی کچہری کے سررشتہ دار اور جیل خانے کے داروغہ ہوئے۔ امجد علی خاں کے عہد حکومت ۱۲۵۲ھ تا ۱۲۶۲ھ میں امداد حسین کو جو بادشاہی ملازم تھے بڑا مرحوم نصیب ہوا۔ وہ ذوالفقار جنگ میں اللہ کے خطاب سے سرفراز ہو کر پہلے تو بادشاہ کے پیش دست بنے۔ پھر چند ہی دن میں وزارت کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ یہ بڑے علم دوست اور مدبر تھے۔ اسیر کی ذاتی قابلیت اور عہدہ کارکردگی کی وجہ سے ان کے حال پر بہت مہربان تھے۔ اسیر کو ترقی دیکر میرنشی کے مغرور عہدے پر مامور کیا۔ سلطان لاہور

میں امجد علی خاں فوت اور انکی جگہ واجد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ امین الدولہ کی توجہ خاص اور اپنے ذاتی کمالات سے اسیر کونئے بادشاہ کے ہاں بہت جلد خاصا رسوخ حاصل ہو گیا۔ واجد علی شاہ جو خود بھی بڑے بڑگوشتا مہتے اور آخر تخلص کرتے تھے، اسیر کے کلام سے بہت محفونہ ہوتے تھے۔ ایک روز کوئی نشر کی کتاب دیکر اس کو نظم کر دینے کی فرمائش کی۔ اسیر نے اس کو منبوم کر کے پیش کیا تو بہت پسند فرمایا۔ اپنے کلام کی اصلاح کے اعزاز سے اسیر فرمایا اور ساتھ ہی اپنی فیاضانہ خطابتی سے تدبیر الدولہ مدبر الملک بدرنگ کے خطابات عطا کیے۔ بادشاہ کے استناد ہونے سے اسیر کی شہرت و مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔ ہر وقت دربار میں حاضری کا موقع ملتا۔ بادشاہ کے مصاحب بلکہ ہم نوالہ وہم پیالہ، من گئے۔ بادشاہ نے فرید غنایت یہ کہ کی دار و خجہ کل بنایا۔

اسیر کی خوش اقبال کا زمانہ کچھ زیادہ طویل نہیں ہوا تھا کہ وہ گردش زمانہ کے شمار ہو گئے امین الدولہ وزیر کے خلاف دربار کے دوسرے ارکان اور بالخصوص بادشاہ کے خسر علی نقی خاں نے توڑ جوڑ شروع کیے اور آٹا ٹاٹا بادشاہ کو ان سے بدظن کر دیا۔ امین الدولہ وزارت سے معزول کیے گئے۔ اور انکی جگہ علی نقی خاں کو مدار الدولہ کے خطاب کے ساتھ فلدان وزارت سپرد ہوا۔ علی نقی خاں نے وزیر ہوتے ہی سابق وزیر کے وابستہ اور ہوا خواہوں کی بیخ کنی شروع کی۔ اسیر کو بادشاہ کی فوارش خاص سے ممتاز تھے اور اپنے علم و فضل بے لوثی، اور صاف گوئی کی بدولت بڑے بار رسوخ تھے مگر ان ہی اوصاف کی بنا پر علی نقی خاں کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے ایک روز انہوں نے کنایتہ امین الدولہ کی معزولی پر جو انہیں کسی طرح گوارا نہ تھی اور جو ان کی رائے میں ریاست کے لیے سخت نقصان پہنچانے والی تھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ علی نقی نے جو پہلے سے ان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرا تھا انہیں اس قصور پر خدمات سے معزول اور اعزاز دربار سے محروم کر کے قید کر دیا۔ کئی دن سیری میں کاٹ کر پھر بادشاہی کی غنایت سے رہا ہوئے۔ اس کے کچھ دن بعد ہی علی نقی کی کھانسی پناہاں دن دھاڑے رعایا پر ظلم و ستم اور بادشاہ کی غفلت رنگ لائیں۔ بادشاہ سلامت غمت حکومت سے آئندہ بے گئے۔ اور کلکتہ میں وظیفہ خوار کی طرح رہنے کا حکم ہوا۔ انہوں نے اسیر کو بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہا مگر وہ دربار لکھنؤ سے بالکل شکستہ خاطر ہو چکے تھے کسی طرح بھی بادشاہ کے ساتھ جانا پسند نہیں کیا بادشاہ کے کلکتہ جاتے ہی یہ راہپور چلے گئے۔ واجد علی شاہ نے کئی جگہ اسیر کی اس بے وفائی کا گلہ کیا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

”تدبیر الدولہ منشی مظفر علی خاں صاحب بہادر جنگ اسیر جوانی میں راقم کا ہم پیالہ وہم نوالہ رہا اس کے باپ دادا میرے دربار کے قدیم نمک خوار رہے اسیر میرے صاحب اور دار و خجہ

تھا لیکن جب میں لکھنؤ سے کلکتہ چلا تو یہ گھر میں جا چھپا اور مجھے چھوڑ کر نواب رام پور کو اپنا بادشاہ بنالیا۔“

جس زمانے میں نواب محمد سعید خاں والی رام پور لکھنؤ میں قیام پذیر تھے اپنے بیٹوں کی تعلیم کے لیے اسیر کو استاد مقرر کیا تھا ان کے انتقال کے بعد جب نواب یوسف علی خاں سندھ حکومت پر بیٹھے تو اسیر کے لیے بطور حق استاد کی کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ انھیں لکھنؤ ہی میں ملا کر تھا۔ ۱۸۵۲ء میں واجد علی شاہ کلکتہ روانہ ہوئے تو اسیر نے رام پور کا رخ کیا۔ نواب یوسف علی خاں بڑی تواضع سے پیش آئے۔ معقول معاوضہ مقرر کر کے دربار میں جگہ دی اور اپنا کلام بھی اصلاح کے لیے دکھانے لگے۔ یوسف علی خاں کے بعد ان کے جانشین نواب کلب علی خاں نے بھی اسیر کی سرپرستی و قدر افزائی میں کمی نہیں کی۔ اسیر کی زندگی کے یہ آخری ایام نہایت اطمینان اور فراخ البالی میں گزرے۔ دربار رام پور میں ہر وقت شاعرانہ صحبتیں گرم رہتی تھیں دلی لکھنؤ اور دیگر مقامات کے باکمال شعر اہر وقت دربار میں حاضر رہتے۔ بڑے سخی اشہر گوئی اور خوش مذاقی کی یادگار بزم قائم تھی اسیر یہاں کی محفلوں میں خوب چمکے اور بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ۱۸۵۹ء میں یہیں وفات پائی۔ اور اپنے مکونہ مکان کے قریب دفن ہوئے۔

اسیر کی مشق سخن پچاس ساڑھ برس سے بھی زیادہ کی تھی اگرچہ انھیں اپنے استاد سے کچھ زیادہ فیض حاصل تھا موقع نہ مل سکا لیکن شعر و شاعری جو قدرتی لگاؤ ان کی طبیعت کو تھا اور متصل مشق سخن نے انکی شاعری کو بڑی ترقی دی اور اپنے زمانہ کا استاد سخن بنادیا۔ لکھنؤ کی شاعرانہ صحبتوں کا بھی انکی تربیت اور شاعری کی ترقی و اصلاح میں بڑا حصہ ہے۔ رام پور میں تو انکی استاد کی تعلیم تھی اور بڑے بڑے اساتذہ وقت کے پہلو بہ پہلو واد سخن حاصل کرتے تھے اسیر کے شاگردوں کی فہرست خاصی طویل ہے ان میں بہت سے اعلیٰ پایہ شاعر ہیں بعض انکاوش خود استاد کی ذات کو فخر و مبالغت حاصل ہے ممتاز شاگردوں میں امیر احمد امیر سبانی، منشی احمد علی شوق قدوائی، الہی بخش نادرش، ریاض احمد ریاض فیض رسول خاں واسطی، ماہر لکھنوی، تھوڑ لکھنوی، یوسف لکھنوی، اسد، سرشار، ابراہیم و صفدر قابل ذکر ہیں اسیر کے دو بیٹے حکیم اور افضل بھی باپ کے شاگرد۔ صاحب دیوان شاعر اور لکھنؤ کے حامدین ہیں سے ہیں۔ اسیر نے صرف اردو کے کہنے مشق شاعر تھے بلکہ فارسی شعر گوئی بھی اس زمانے کے تعلیم یافتوں و اہل علم کی طرح کیا کرتے تھے فارسی میں ان کا ایک ضخیم دیوان گلشن عشق اور دو کمانین جو نوابان امپور کے مدحیہ قصیدوں کا مجموعہ ہے موجود ہیں اردو میں چھ دیوان ہیں جن میں سے چار چھپ چکے ہیں۔ مولف خجاندہ جاوید نے چاروں مطبوعہ دیوان سے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ مثنویوں کی بھی خاصی تعداد ہے جن میں سے ایک درۃ الکاج شائع ہو چکی ہے۔ اسیر کے کلیات میں ہر صنف سخن کا کلام کثرت سے ہے اور ان کے زور طبع اور قدرت بیان کا کافی ثبوت ہے۔ اس زمانہ کی لکھنؤ

شاعری کی عام خصوصیت یعنی لفظی رعایتوں اور صنعتوں کا التزام ان کے ماں بھی ہے اور بہت ہے۔ شعر و شاعر کے علاوہ صرف سخن اور علم و دہش میں بھی کئی رسالے اُن سے یادگار ہی ایک رسالہ ”زرکامل عیار شجیع“ والا شمار، مطبوع اور شائع ہو چکا ہے۔

پردہ قدرت

(از جناب مخدوم اقبال صدیقی صاحب اقبال)

پردہ اگر نہ ہوتا تھا انتظام مثل پرے میں ہو رہے ہیں دنیا کے کام مثل
کس طرح چین آتا کیوں کرجیات ہوتی دن کی جو روشنی میں پردہ نہ رات ہوتی
پرے کی سب سے قوت اعضا میں کچھ نہ ہوتا پردہ اگر نہ ہوتا دنیا میں کچھ نہ ہوتا
پردہ انہ کا نہ سنا اپنا نہ کہا اے شمع کس سے سیکھا پرے میں ٹھہرنا
پرے میں تو چھپی ہے کیا دلِ بادل ہے تو جان لے رہی ہے وہ جانِ دہرا ہے
پردہ انہ کو میسر ہرگز پیش نہ ہوتی پردہ اگر نہ ہوتا ایسی کشش نہ ہوتی
کوئی صدا سنی جب یاد نگار آئی دل نے کہا تڑپ کر آواز یار آئی
نالے نہ در بدر ہم یوں دل خواش کرتے پردہ جو وہ نہ کرتا کس کو تلاش کرتے
پردہ میں رہ کے یار پردہ شیں نے مارا پردہ سے اس نے ہم کو نکلنا تو طرح پکارا
پردہ میں کیوں چھپا ہے اے نور بنیاد ہر شان سے عیاں ہے تیری کرشمہ سازی
باغ جہاں پہ تیرا احساں ہے غائبانہ ہر تپا کہہ رہا ہے ہم سے ترانہ
اقبال کون ہے جو قابل نہیں تمہارا پردہ سے باہر آنا مثل نہیں تمہارا

تیاگ

ڈاکٹر ابن درانا تھ میگور

مترجم جناب غلام رسول صاحب (سٹی کالج)

(۱)

بھاگن کی پورنما ہے۔ آم کے بوروں کی خوشبو سے بسی ہوئی موسم بہار کی ہوا چل رہی ہے۔ مالاب کے کنارے ایک پرانے لیمچی کے درخت کے گھنے پتوں میں سے کسی بے خواب ٹھکے ماندے پیپیہ کی الاپ مکر جیوں کے مکان کی ایک بے خواب خواب خواجگاہ میں داخل ہو رہی ہے۔ ہمیت کچھ چلیے پن سے کبھی تو اپنی بیوی کے بندھے ہوئے سر کے بالوں میں سے تھوڑے سے بال کھول کر اپنی انگلیوں میں پٹیتا ہے۔ کبھی اس کے کڑے اور چڑیوں کو لگا کر بجاتا ہے اور کبھی اس کے جوڑے میں لپٹے ہوئے پھولوں کے گجورے کو نکال کر اس کے منہ پر رکھ دیتا ہے۔ شام کے وقت کے کلمائے ہوئے پھول کے پودے کو تروتازہ کرنے کے لیے ہوا جیسے ایک دفعہ دوسرے اور ایک دفعہ دوسرے ذرا ذرا ہلکا جھلا دیتی ہے۔ ہمیت کی بھی کچھ کچھ وہی حالت تھی۔

لیکن کسم روبرو کے چاند کی چاندنی میں فضا کے بسط کی جانب دونوں آنکھیں گاڑے چپ چاپ بیٹھی ہے شوہر کی چھپا ہٹ لٹے چھوکر۔ مگر اگر کچھ چھپے لوٹ جاتی ہے آخر میں ہمیت نے کچھ بیانی سے کسم کے دونوں ماتھ پکڑ کر کھینچا ناکی کی اور کہا ”کسم کہاں ہو تم؟ تم تو اتنی دوپہنچ گئی ہو کہ دوہرے میں سے بڑے غور کے ساتھ دھینچے پر بیٹھ کر کہیں بوند سی دکھائی دیتی ہو۔ میری بڑی تنہا ہے کہ آج تم دراپاس آ جاؤ۔ دیکھو تو یہی کسی سہانی رات ہے“ کسم نے چاندنی کی طرف سے نگاہ اٹھا کر ہمیت کی جانب رخ کیا اور کہا ”یہ چاندنی رات یہ موسم بہار کی ہوا اسی گھڑی طلسم بن کر ہوا ہو جاسکتی ہے۔ میں ایک ایسا نتر جانتی ہوں“

ہمیت نے کہا۔ ”اگر جانتی ہو تو اس کے اظہار کی ضرورت نہیں بلکہ ایسا اگر کوئی فریاد ہو تو جس سے غصہ میں تین چار اتوار پڑیں یا رات شام کے پانچ ساڑھے پانچ بجے تک ٹھہر کے تولے سننے کے لیے میں تیار ہوں“ یہ کہتے ہوئے اس نے کسم کو اور بھی اپنی جانب کھینچا جا۔ کسم اس بغلیکری کے پھندے میں پھنسنے نہ پائی کہنے لگی ”ہرے دم جو بات تم سے کہنا چاہتی تھی اُسے آج ہی کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج تم مجھے کتنی ہی سزا کیوں نہ دو۔ میرا سہیڑی خوش اسے سرسکا اگا۔“

سڑک کے بارے میں سچے دیکو کا ایک ٹلوک سنا کہ ہمیں ایک کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اس اٹا ہیا
 غصہ سے آتے ہوئے کسی کے پیلیس کی چٹ چٹ آواز قریب تر سنا ئی دینے لگی۔ یہ ہمیں کے باب ہری ہر کر جی
 کی جانی پہچانی آہٹ تھی۔ ہمیں گھبرا گیا۔ ہری ہرنے دروازہ کے پاس آکر غصہ سے گرجتے ہوئے کہا ہمیں
 ہو کو ابھی گھر سے فوراً ہی باہر نکال دو، ہمیں نے عورت کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ عورت نے کچھ بھی تعجب
 ظاہر نہیں کیا۔ صرف دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا کر اپنی پوری قوت اور جوش سے اپنے کو گویا اوجھل
 کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ بادلیم کے ساتھ پیچھے کی سڑکی الاپ مکان میں گونجنے لگی۔ کسی کے کانوں تک پہنچی
 دنیا بے انتہاء دلفریب ہے۔ لیکن پھر بھی اتنی جلدی برہم ہو جاتی ہے۔

(۱۲)

ہمیں نے باہر سے لوٹ کر عورت سے پوچھا ”کیوں یہ بات سچ ہے؟“

عورت نے کہا ”اے سچ ہے۔“

”اتنے دنوں سے کہی کیوں نہیں تھی؟“

”بہت دفعہ کہنے کی کوشش کی پر کہ نہ سکی میں بڑی پاپی ہوں۔“

”تو آج سب کچھ کر کہہ دے۔“

”کسم نے سوچ بچار کے ساتھ ڈھٹائی سے سب حال کہہ سنایا۔ گویا وہ نہ رکنے والے قدموں سے پامردی کے

ساتھ دھکتی ہوئی آگ میں سے ہو کر نکل گئی۔ کس قدر شوش تھی کوئی سمجھ نہ سکا۔ سب سن کر ہمیں اٹھ کر چل دیا۔

کسم نے سمجھا ختم جو چلے گئے اُن کو اب وہ پانہیں سکتی۔ ذرا بھی تعجب نہ ہوا یہ واقعہ بھی گویا روزمرہ کے اور واقعات کی

مانند بالکل قدرتی طور پر اس کو پیش آیا۔ دل پر ایک عجیب ہی پڑمردہ خاموشی طاری رہی۔ بار بار اسے دنیا اور پریم

شروع سے لیکر آخر تک جھوٹے اور خالی معلوم ہونے لگے۔ ہمیں کی گزشتہ پریم کی ساری باتیں یاد کر کے نہایت ہی

ناگوار اور تکلیف دہ مہسنی ایک تیز بے رحم چہری کی مانند اس کے دل پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک

داخل کر گئی۔ شاید اس نے سوچا ہو۔ جس پریم کو وہ اتنا سمجھتی تھی۔ اتنا مغرر اتنا موقر جس کے پل بھر کی برہ ایسی ل

لو بھر گانے والی تھی جس کے لمحہ بھر کا لاپ ایسا دلنوا تھا کہ غیر محدود دلتا مہاسی معلوم ہوتا تھا۔ ایک جہم سے دوسرے

جہم تک بھی جس کے انتہا کا قیاس نہیں ہو سکتا وہی پریم ہے یہ! بس اتنی سی نیو پر کھڑا تھا وہ! اس نے جو اپنی ذرا سی

غیس لگائی وہ غیر محدود دلتا مہاسی پریم چٹ سے پاش پاش ہو کر ایک مشت خاک بن گیا! ہمیں ابھی کچھ دیر

پہلے لڑکھڑاتی ہوئی آوازیں کانوں کے پاس کہہ رہا تھا ”کیسی سہانی رات ہے“ وہ رات تو ابھی ختم نہیں ہوئی ہے

بھی وہی پہلا بول رہا ہے۔ وہی بادلیم مہری کو جنبش دے جاتی ہے۔ وہی چاندنی مٹھی سینہ سوتی ہوئی سینہ

۵۹
 کی طرح دریچہ کے پاس کے پتنگ کے ایک کنارے سے لڑ پڑی ہوئی ہے۔ سب کچھ جھوٹ ہے! پریم مجھ سے بھی زیادہ جھوٹا ہے فریب ساز ہے!

(۳)

دوسرے دن صبح ہی بے خوابی سے پڑمردہ ہمیت پاگل کی طرح پیارے شکر گھوشال کے گھر پہنچا۔ پیارے شکر نے پوچھا، "کو بھائی سیم کیا خبر ہے!" ہمیت نے دھکتی ہوئی اور اونچے شعلوں سے جلتی ہوئی آگ کی مانند کانپتے کانپتے کہا، "تم نے ہماری ذات خراب کر دی ہے۔ ستیا ناس کیا ہے۔ تمہیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی" کہتے کہتے اس کا گلا بھرا۔ سانس چھوٹنے لگا۔ پیارے شکر نے ذرا مکرانے ہوئے کہا۔

"اور تم لوگوں نے ہماری ذات کی کجداشت کی ہے،" ہمارے سلج کی رکھشا کی ہے۔ ہماری ٹیچے پر ماتھ پھیرا ہے! ہم پر تم لوگوں کی بڑی ہیرانی ہے۔ بڑا پریم ہے کیوں؟

ہمیت نے چاہا کہ اسی وقت پیارے شکر کو غصے کی آگ سے بھسم کر دے۔ پر اسی آگ میں خود جلنے لگا پیارے شکر بڑے مزے سے جوں کا توں بٹھارا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ہمیت نے بھرائی ہوئی آوازیں کہا، "میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

پیارے شکر نے کہا۔ میں پوچھتا ہوں۔ میری ایک لڑکی کے سوا اور اولاد نہیں۔ میری اس لڑکی نے تمہارے باپ کا کیا قصور کیا تھا؟ "تم تب چھوٹے تھے بچے تھے اس کے اندر بڑے بڑے گل میں کھلیں گے تب دیکھنا" "میرا دادا نوکانت جس وقت میری لڑکی کا زیور چرا کر ولایت بھاگ گیا تھا تب تم بچے تھے بعد ازاں پانچ برس کے بعد وہ جب بیسٹر ہو کر وطن لوٹا تب محلے میں ایک سنسی پھیل گئی۔ شاید تمہیں کچھ یاد ہو۔ تم تب کلکتہ کے اسکول میں پڑھتے تھے تمہارے باپ کے گاؤں کے سرسبز بن کر کہا کہ لڑکی کو اگر دادا کے ہاں بھیجنے کا ارادہ ہو تو بھیج" اسے پھر گھر نہیں لاسکتے ہیں نے ان کے ماتھ پر چھوئے منت کی "بھیا اس دفعہ تم مجھے بچالو۔ میں نے لڑکی کو گوبر کھلا کر کفادہ ادا کیا ہے آپ لوگ اسے ذات میں داخل کر لیجئے۔ تمہارے باپ کی طرح ابھی باضی نہ ہوئے میں بھی اپنی اکلوتی لڑکی کو نہ چھوڑ سکا۔ ذات چھوڑ کر وطن چھوڑ کر کلکتہ میں آ رہا۔ یہاں آ کر بھی نیڈ نہ چھوڑا۔ اپنے بھتیجے کے بیاہ کی جس وقت میں پوری تیاریاں کر چکا تو تمہارے باپ نے جا کر لڑکی والوں کو ایسا بھڑکا دیا کہ آخر بیاہ ہوا ہی نہیں میں نے عہد کیا کہ اگر اس کا انتقام نہ لے لوں تو برہمن کی اولاد نہیں۔ اب شاید کچھ سمجھ گئے ہوں گے۔ پھر تھوڑی سی اور سن لو۔

ساری باتیں سن کر تم خوش ہو جاؤ گے اس میں بڑا لطف ہے۔

"تم جب کالج میں پڑھتے تھے تمہارے گھر کے پاس ہی ویرداس چٹرجی کا مکان تھا۔ بھارا بڑا بھلا مکان تھا اب انتقال کر چکا ہے۔ چٹرجی صاحب کے مکان میں کس نامی کس بیوہ میتر کا نیڈ لڑکی بیکسی کی حالت میں

بہتی تھی لڑکی بڑی خوبصورت تھی۔ بچا بوڑھا برہمن کلچ کے طلبہ کی نظروں سے اُسے محفوظ رکھنے کے لیے ذرا پریشان ہو گیا تھا۔ پر بوڑھے آدمی کو چمک دینا ایک لڑکی کے لیے معمولی بات تھی۔ لڑکی اکثر کپڑے کھانے کے لیے چھت پر جایا کرتی اور تھا ابھی شاید چھت پر بیٹھ گئے سبق یاد نہ ہوتا تھا آپس میں دونوں کی چھت پر کوئی بات چیت ہوتی تھی یا نہیں یہ یقین جانو پر لڑکی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر بوڑھے کو شبہ ہوا۔ کیونکہ کام دھندے میں اس کی اکثر بھول چوک پائی جاتی اور تب ہوائی گوری کی طرح دن بدن آب و خواب چھوڑنے لگی۔ بعض وقت شام کے وقت وہ بوڑھے کے سامنے ہی بلاوجہ آنسوؤں کو روک نہیں سکتی تھی۔

آخر بوڑھا تازہ گیا کہ چھت پر تم دونوں کا وقت بے وقت خوب میل جول ہوا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ کالج میں غیر حاضر ہو کر دوپہر میں چھت کے ایک گوشے میں زندگانی کے سایہ میں بیٹھ کر تم کتاب کے صفحے الٹا کرتے تھے تنہائی کے مطالعہ میں یکایک تمہارا اتنا شوق بڑھ گیا تھا کہ وپر داس جس وقت میرے پاس صلاح لینے آیا تو میں نے کہا چچا تم تو بہت دنوں سے کاشی جی جانے کی سوچ رہے ہو۔ لڑکی کو میرے پاس چھوڑ کر تم تیرہ باسی جاؤ۔ میں اس کا بار اپنے سر لیتا ہوں۔“

”وپر داس تیرہ کرنے گیا۔ میں نے اس لڑکی کو سری جی جڑجی کے گھر میں رکھ کر مٹی کو لڑکی کا باپ مشہور کر دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا تم جانتے ہو۔ تم سے شروع سے لے کر آخر تک سب باتیں بیان کرنے میں مجھے بڑا لطف آیا۔ جیسے کوئی کہانی ہے۔ طبیعت تو چاہتی ہے کہ اسے پوری لکھ کر ایک کتاب چھپاؤں۔ پر مجھے لکھنا نہیں آتا۔ سننا ہوں میرا بھتیجا شہد بدھ لکھنا جانتا ہے اسی سے کھانے کی خواہش ہے مگر تم اور وہ دونوں مل کر لکھیں تو بہت ہی اچھا ہے کیونکہ سرگذشت کی جزئیات مجھے بخوبی یاد نہیں۔“

ہیمنت نے پیارے شکر کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی۔ بولا۔ ”کسم نے اس سیاہ کی بابت کوئی شکا نہیں کی“ پیارے شکر نے کہا ”شکایت کی تھی یا نہیں سمجھنا بڑی ٹیر سی کھیر ہے۔“

جانتے ہو بیٹا وہ عورت ٹھہری جس وقت تاکے تو ماں سمجھنا چاہئے پہلے پہل تو نئے مکان میں آکر تعین نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے کیسی بگلی سی ہو گئی تم نے بھی نہ جانے کیسے پتہ لگایا اکثر کتابیں ہاتھ میں لیے کالج جاتے ہوئے تم راستہ میں بھول جایا کرتے اور سری جی کے مکان کے سامنے نہ جانے کیا ڈھونڈا کرتے۔ ٹھیک پر ریڈ نیسی کالج کا راستہ ڈھونڈتے ہو۔ ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا دراصل کسی بھلے آدمی کے گھر کی چلین سے کپڑے پنگوں اور وارفتہ نوجوانوں کے دل کو راہ ہوا کرتی ہے یہ سن کر مجھے بڑا اعلق ہے۔ دیکھا تمہاری بڑھائی میں بہت ہرج ہورہا ہے اور لڑکی کی اوقات خراب ہو رہی ہے۔“

”ایک دن کسم کو بلا کر کہا ”بیٹا۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ جب

کو دل سے چاہتی ہے میں جانتا ہوں لڑکا بھی سٹی ہوا جا رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ دونوں کا میل ملاپ ہو جائے سنتے ہی کسم دفعہ رو پڑی اور تیزی سے بھاگ گئی۔ اسی طرح اکثر کبھی کبھی شام کو سری پتی کے گھر جا کر کسم کو بلاتا اور اس سے تمہارا ذکر کر کے حجاب کو دور کرتا اتنے میں اس کا حجاب جاتا رہا اور لگاتار روزانہ سبق پڑھا پڑھا کر میں نے اسے سمجھا دیا کہ بحرِ بیاہ کے دوسرے کوئی علاج نہیں اس کے سوا ملاپ کی کوئی صورت نہیں۔ کسم نے کہا ”کس طرح ہو گا“ میں نے کہا ”خاندانی کنواری لڑکی بتا کر چلا دوں گا۔ بہت بھلا بھئی کے بعد اس نے تمہاری رے دریافت کرنی چاہی میں نے کہا ”وہ تو ویسے ہی پاگل سا ہو رہا ہے اس سے پریشان کن باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟ بلا وقت اطمینان سے کام ہو جانا ہی ہر دو کے لیے اچھا ہے خاص کر جبکہ اس بات کا افشا ہو جانے کا اندیشہ نہیں تو پھر خواہ مخواہ کیوں بچا رہے کو زندگی بھر کے لیے پریشانی میں ڈال جائے؟“ ”کسم کیا سمجھی کیا نہ سمجھی میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ کبھی روتے رہتی کبھی چپکے بیٹھے ہوتی۔ آخر میں میں جب کہتا تو جانے دے تو پھر وہ بے چین ہو جاتی۔ اسی حالت میں سری پتی کے ذریعہ تمہارے پاس شادی کا پیام بھجوا دیا۔ دیکھا فیصلہ کرنے میں تم نے ذرا بھی دیر نہ لگائی۔ تب بیاہ کی بات بچتہ ہو گئی“

”بیاہ سے کچھ پہلے کسم ایسی بکھری کہ سمٹنا دشوار ہو گیا۔ وہ پاؤں پٹرنے لگی بولی نہیں تاؤ جی ایامت کرو میں نے کہا کیسی بکھی ہو گئی ہے۔ سب کچھ تو ہو چکا ہے اب کیسے بات لوٹائی جاسکتی ہے۔

کسم بولی تم ظاہر کر دو کہ دفعہ اس کی موت ہو گئی ہے اور مجھے یہاں سے کہیں کو روانہ کر دو۔“ میں نے کہا۔ پھر اس کی ذرینہ آرزو دل پوری ہو گئی یہ جان کر وہ سو رگ میں بیٹھا ہوا ہے آج میں بچا ہوں اس کے پاس تمہارے مرنے کی خبر پہنچا دوں! اور اس کے دوسرے ہی دن تمہارے پاس اس کے انتقال کی خبر پہنچائی پڑے گی اور پھر اسی دن شام کو میرے پاس تمہارے مرنے کی اطلاع آئے گی۔ میں اس بڑھاپے میں عورت کا اور مرد کا خون کرنے بیٹھا ہوں اس کے بعد شبہ لگن میں شادی مبارک ہو گئی۔ میں اپنے ایک فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہوا پھر کیا ہوا سو تم جانتے ہی ہو“

ہیمنت نے کہا ہم لوگوں کو جو کچھ کرنا تھا سو وہ آپ کر چکے تھے پھر بات کو ظاہر کیوں کیا؟“ پیارے شکر نے کہا دیکھا کہ تمہارے چھوٹی بہن کی بیاہ کی بات جیت سب بچتہ ہو چکی ہے تب لہٹ لہٹ میں سوچنے لگا ایک بہن کی ذات بگاڑ چکا ہے تو وہ صرف فرض سمجھ کر اب جو دوسرے ایک بہن کی ذات جا رہی ہے اس میں میل فرض ہے کہ اس کی نگہداشت کروں لہذا ان لوگوں کو خط لکھ دیا اور لکھا کہ ہیمنت نے شہر کی کنسیا کے ساتھ بیاہ کیا ہے اس کا میرے پاس ثبوت ہے۔“

ہیمنت نے بڑی مشکل سے ہمت کر کے کہا ”اب میں جو اس لڑکی کو چھوڑ دوں گا اسکی گت کیا ہو گی؟“

آپ لسے سہارا دیں گے؟“

پیارے شکر نے کہا میلا جو کام تھا سو وہ میں کر چکا اب دوسرے کی چھوڑی ہوئی عورت کو پرورش کرنا میلا فرض نہیں ملے آؤ ہمیں تباہی کے لیے ذرا شربت ڈال کر ایک بگلاس کچے نایل کا پانی لے آ۔ اور پان بھی لیتے آنا۔
ہمیں اس ٹھنڈائی کی آہ بھگت کا انتظار کیے بغیر فوراً ہی وہاں سے چل دیا۔

(۴)

کرشن کپڑی کی پانچویں ہے۔ اندھیری رات میں جڑیاں چھپاتی نہیں ہیں تالاب کے کنارے لمبی کے درخت نے گویا سیاہ تختہ پر گہری سیاہی کا روغن پھیر دیا ہے صرف باد نسیم اس تاریکی میں اندھے کی مانند دھڑا دھڑ گھوم رہی ہے گویا اُسے اندھیرے نے گھیر لیا ہے۔ آسمان کے تارے ٹکلی ٹکلی لگائے نظروں سے جی جان سے تاریکی کو جدا کر کے نہ جانے کس راز نہانی کا انخفاف کرنا چاہتے ہیں۔ خواہ گاہ میں کج دیا نہیں جلایا گیا ہے۔ ہمیں کھڑکی کے پاس پلنگ پر بیٹھا ہوا سامنے کی تاریکی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کسم زمین پر دونوں ہاتھوں سے اس کے پیروں کو پکڑ کر ان پر اپنا سر رکھے پڑی ہے۔ سامان۔ سمجھ جال ہونے والے سمندر کی مانند واقع ہے۔ گویا انتہائی رات کے وقت نا تجربہ کار مصور نے یہ امٹ تصویر کھینچ دی ہے چاروں طرف ہوکا عالم ہے۔ بیچ میں ایک سنج ہے اور اس کے پیروں کے پاس ایک مجرمہ ہے۔ پھر سیلیروں کی چٹ چٹ آہٹ ہوئی ہری ہرکڑی نے دروازے کے پاس آکر کہا بہت دیر ہو چکی ہے اب مزید انتظار نہیں ہو سکتا لڑکی کو گھر سے نکال باہر کر دو!“

کسم نے ان الفاظ کے سنتے ہی لمحہ بھر کے لیے ایک دفعہ اور طویل عمر کی حسرت مٹانے کے لیے ہمت کے پیر اور بھی گئی قوت سے پکڑ لیے۔ قدم چوم کر پاؤں کی خاک پٹائی پر لگا کر پیر چھوڑ دیے۔ ہمیں نے اٹھ کر باپ سے جا کر کہا ”عورت کو میں تیاگ نہیں کر سکتا“
ہری ہرکڑی گڑ گڑا ”ذات کھوے گا“

ہمیں نے کہا ”میں ذات پات نہیں مانتا“
”تو جا، تو بھی نکل جا“

۱۳۳ بَان دکن

خواجہ بہت علی خاں تہمت کے کلام کا انتخاب

خواجہ بہت علی خاں بہت کے حالات و واقعات کا صاف طور پر پتہ نہیں چلتا، بعض کتابوں کے دیکھنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا چند ولال (دیوان دکن) کے درباری شاعر تھے، چنانچہ ہمارا چند ولال نے اپنی کتاب معشرت کدہ آفاق کی تقریب میں جن علما و فضلاں کے نام لگائے ہیں ان میں ہماری بہت کا بھی نام لیا ہے ہمارا چند ولال کے فرزند ارجمند راجہ بالا پر شاہ معروف بہ دھرم راج بہادر کی شادی خانہ آبادی علی گڑھ میں جہاں مرزا محمد طاہر شیرازی نیرسی محمد جواد شیرازی صاحب مرزا شائق بخوانی ملا محمد فاضل کاشانی۔ مرزا ابوالغنیض بیگ اقتدار حسین علی خاں ایٹا و ذوالفقار علی خاں صفائے ہینتی قصاید و تاریخی قطعات پیش کیے تھے وہاں بہت نے بھی چند تاریخی قطعات گزرائے۔ اور یہ قطعات عشرت کدہ آفاق میں تحریر ہیں۔ یہاں صرف ایک قطعہ نمونہ کے طور پر درج کیا جاتا ہے۔ عشرت خورشید طلعت ماہر و جلوہ گردش باہر اراک و دزدان برائے بہت بہت بگو، صول ماہ و مشتری آمد کو دربار چند ولال کے پہلے نواب اعظم الامرا اسطو جاہ کے دربار کی باریابی کا ثبوت اس شعر سے ملتا ہے

اعظم الامرا کا دل جو دو سخا کا ہے محیط صدق دل ہیں پُر از گوہر شہوار کہ بس

اور ایک قطعہ ان کے حالات پر روشنی ڈالنے والا یہ بھی ہو سکتا ہے۔
کرم ادھر بھی جابِ نفوس تاج اس اپنے بہت کا نام لیتا کیونکہ شاد کروں و ذرا غم جاہلوں کیا جو رنجہ قدم مجھ سے اتنا کی طرف
اس کے علاوہ بہت کے متعلق مجھے کسی اور ذریعہ سے معلومات نہ ہو سکے ان کے دیوان میں ایک مثنوی غزل
ایسی ہے جس سے بہت کی سوانحی وغیرہ کا ایک حد تک علم ہو سکتا ہے۔

غزل

وہ کیا دن تھے کہ بہت کو ہنسا ساز و سماں تھا ٹہنے گل رنگ سیر باغ اور خوش وقت خداں تھا
گمت تھی شغل تھا مجسم یا ران رنگیں سے گم بہت کا خدا شاہد ہے رشک مگدستان تھا
ہنر، خان تھا، خان آئینہ بہت و تہنسا ہر باں الفت و ایماں ہر داک (شاعر غزل خواں تھا

مہ:۔ (نوٹ: مثنوی) میں ان کا نام خواجہ طاہر الشیراز لکھا ہے۔ جو لکڑ جگت کے بیٹے اور خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت شاگرد شاہ سرخ اورنگ آباد کے بھائی ہیں لیکن شعلے دکن لکھا پوری میں تو نفوس کوئی اور ہی ہے ۱۲
عہ: تاشا۔ دکنی اردو ۱۲

خصوصاً رات کو اس کے مکان پر شبیں ہوتا تھا
 فجر سے جاگھڑ ہوتا تھا اس جا راگ وزنگ ایسا
 کبت و حریت کی تائیں سن کھنیا کان کو کپڑے
 ہوا ایسا فقرہ میری اس کی ہو گئی دوری
 ہوا پھر حب و محبت اتفاق اس شہر آنے کا
 آیا میں اس کے ملنے کو تو کیا دیکھوں کہ عکس تھا
 میں پوچھا کیا ہوالے یاد رنگیں کچھ حقیقت کہہ؟
 میں اس آرام جاں کے ساتھ راہمیش کرتا تھا
 جو دیکھا غور سے میں بنے ہوا زار و زار اتنا
 ہوی و ملت میں فرقت ناگہاں طالع کی گردن
 پڑا تھا خاک خوں میں آہ اس کے شمع بالیں تھی
 ہوا میں مال اس کا دیکھ کر بے تاب دے طاقت
 کہاں ہو دل کہ عاشق تھا کہاں ہو جاں کہ گویا تھا

خبر اس کی سنا جب سے کہا انوس و احسرت

خداے مغفرت ہمت بہت خوش خلق انسان تھا

ہمت کا دیوان نواب عالی رفاہی مستراحین ارباب اور روزگار حیدر آباد دکن کے کتب خانے میں

(۱) کی رویت تک غلیں ہیں ان کے کلام کا انتخاب اسی دیوان سے کیا گیا ہے (عمریاضی)

مطلع دیوان جو سربلیم اللہ کا زنجبش صفحہ دل نام ہے اللہ کا
 ہر تیری شمع نور سے تابندہ ہو خدہ بے دست پا خورشید کی درگاہ کا
 وہ جہاں تیرا کیا کہوں نزل ہو یہ صفحہ کی سیارہ دل آہ کا
 خلد زاد فاطمہ تھا غلام اللہ بیت بندہ شہزادگان ملوک حضرت اللہ کا
 و محبت کو سرسینہ میں ایسا جاذبہ رہا ہوا پس میں کیا کہہ باؤ کا
 حق تعالیٰ نے کیا قرآن مجید ہی ہوا ہوں مثال خوان دل سے اصحاب ہی اللہ کا

کہاں مقدور و قدرت کا خاموش رہمت

خلوۃ اور بندہ کیے پھر مردہ کے دم کا

بمحو کو عشرت کیونہ ہمت بردہ کی

ہو ویدہ امر و ات رسول اللہ کا

بزمِ اوشیخ سے جھکنا نہ ٹوٹے گا
زنتہ دسج کا سمجھے ہو یہ زنا کا
چار در اسلام کے قائم ہوئے تھے
دیں جو رجن میں ہی رجن جو تھا
ختم سبوش ہوں ڈھکا ہے اکبر جو
تر و اعلق ہوا کہ گھوٹے کیوں کیا
آدھی ہو آدھا گلاب رٹا آدھا آب
دوریا سٹے میرے ہو مقرر سارا
میں نگر غرض ہوں پال میں پانچ
ساتی بھر چکے نہ بچھ کو تو سنا غارا
کوئی مارتے گھر میں ترے ہماں بہت

صحیح قائم ہو در و دام منور سارا
دن کو امید دل پہ اوقات کاٹنا
آتما جو جب بان پیرے بھوک نام
پھر شبت لب کو چاٹنا یا مات کاٹنا
دو گالیاں دو جھیر کیاں لک بوری دیا
گذاں اپنی بر سر خیرات کاٹنا
یہ کہنی کر میں تجھے لازم تھا کیا رتب
نکوذیگر کرنا مری بات کاٹنا
ہمت یہ زندگی کے کس طرح نہ دل

ایدا ہی میری جان پہ سکران کاٹنا
روایوں کو پی چکا دو شام کھا چکا
تجھ یا سہا جس بھیجیں جس کیب کھا چکا
اپنی زبان کا اس نے فراس پہ کھا چکا
ہوں علاج در پئے آزار ہے سر
اس کو دھندل سے میں خبر کھا چکا
توڑے یا جوڑے زنتہ الفت جو ہو تو
اس دل شکستے اتنے میں دل کو کھا چکا
دور اکن کھانیں روشن ہو از یاد
سو بار شمع سر اپنا کیا چکا
پھر کافس میں آتا پربال جھڑکے
پروان کی ہوس کو میں ل سو کھا چکا
مت تھا میری دنیا اور ہمت تیرے دے

اپنے کیے کی دل سے سزا آپ پا چکا
پرکھنا کھو اکھرا پوچھنا چھابرا
گلے میں ازہ حایل ہو بار بھولوں کا
چھبے نہ مار کھیں رکنار بھولوں کا
چکنا آئے کہیں خیر نکالیں میں
یہ گھبرا ماتھ سے اپنے آنا بھولوں کا
کچھ ایسا باز نکلتے سے قدر نہ ہوا
کہ جیسا بوجھ ہو ڈالی چار بھولوں کا

دھکا تے ہو ڈھکے کو تاتے ہو مار کت
اب تم کو قیوں کی حمایت ہو پید
قری کے ارٹے فاختے قامت کو تر کتے
آنا قیامت کی عداوت ہو پید
احوال در اس کے دو چپ تھا گالے
ہمت اے باضد ہو جت ہو پید

اچھو تاکسی کو نہ زہار چھوڑا
پنیا جسے زلف نے مار چھوڑا
ہوے کڑے دامن کے دست خوں سے
گریباں کا ثابت ناک تار چھوڑا
ملاوٹ کے ڈھب چال اچھو کھال
مرے خوب و نے بد اطوار چھوڑا
دوبی جو چلے بولے ٹھوٹے ٹھوٹے
نہ وہ گالی آمینہ زلف تار چھوڑا

چلن اور چلنے لگا وہ تو ہمت
لڑکپن کی اب اس نے زلف تار چھوڑا
اے وعدہ تو نسا ہی مری آہ کے لٹا
دیکھا تو نے اے ہمارے آسوا کاٹا
آگے تو بچا تھا پاب جی ہی سپر
آئی ملا جان پہ دل کے میں آلا

دل چلبے لاکاٹ کو بیذہ نہ دیدو
 دل جگر اور جسم جان باریز تیشہ کو چارہ سازدیں کو دل آک کر کس علاج
 بیسیہ ڈھیلے چچ کی بڑا نارنج ڈالا ہوا مال کرنے کو دل کے شہ چچ
 گلشن میں باؤ منہ کی ایسی نرس دتا گل کے کھل گئے پیر سے جارج
 مخمور چشم مست نگہ کی وہ کیفیت نرس کی دیکھا ہی میں پہلے فصیح
 ہمت سے بات کرنے پر گنت ہوا ہیکشتی شب کا نمایاں خاص فصیح
 خانی اس کف پاکی ہو ایک ہو کس کہ درد نرس کے مرد واسطے مفید نرس
 نہ دھو لہو کو مچ اپنی تیغ سے قال کہ یا دگر ہے یہ نیام کل سرخ
 نہ خطا یہ ٹہر ہے ناہے کمر بند لفافے کا کھلا ہو سر سربند
 کیا قاصد کو خطا لے کر نظر بند کسو تر کے بھی کر رکھا ہے پر بند
 محبت کے اُسے رشتوں میں جگر اگر قناری میں ل ہی بند و پر بند
 بغل میں ل نے طفل اشک پالا ہی یہ نور چشم ہے میرا جگر بند
 تری دلیز پر دیکھا ہوں شب کو نساں پائے غیر اور گھر کا در بند
 کروں کیا بس تھا جو کھٹ پڑا پھر کتر دل با جوں مرغ پر بند
 کرے میںے نوزیاں اور شیش و عشر رکھیں گے گھر کا در آٹھوں پر بند
 دو قسمیں کو نا بس چھوڑ کجخت رہا نہیں کچھ کہیں پر در پر بند
 خوابان تلنگاں کا آرایش ویرد خورشید کا سر بند مرہ نو کا کر بند
 نادل کی طیش جاتی ہو محبت نہ وہ خوش
 زنجیر سے آہوں کی رکھا وحشی کو کر بند
 ترش رو کا ہے کو ہوتا ہی لے شیریں تلخ و شام بھی ہو کسے ہنگام لہ
 ہے بخت دل مرا بندے یا کا تعویذ ہے چشم بد کی نظر کے آمار کا تعویذ
 کوئی تو ٹوٹا کر ٹوٹا کا فون فتر لے آویار کے اظہار کیا کا تعویذ
 ہلال نکلا ہو خورشید رو کے باز پد چکاں ہو نقش و نگار کا تعویذ
 گلے میں اس دل ہمار کے لے محبت باغ
 تپ وراق کی رفع بخار کا تعویذ
 کیے مجھ سے برا لوگوں نے آٹھ کو گھر دود بطن اور میں سوا ہوش و نام نہ کر

دل چلبے لاکاٹ کو بیذہ نہ دیدو
 دھول آئینہ مستور کا تری کھیندو
 داند مجھے کو پچہ دل دار کا سایا یاد آئے گا فردوس میں ہوا رکھایا
 دیکھ آئینے میں ابرو سے نکلا رکھایا دیکھا مہ نو دیکھ کے تر دار کا سایا
 ہر روز دھاما گتھا ہوں مانتا نکلا کر جم جم ہے سر پر قدم بار کا سایا
 تب شام و صبح جلوہ نما ہوتے ہیں
 جب رخ پر ترے زلف کلن ار کا سایا
 اشک اک پل نہ آنکھ سے سوکا رنگ کچھ پھر ہوا مرے روکا
 دل تھا بیلے رنیتق بازو کا ہنشمیں! اب ہی تیرے پہلو کا
 دل ٹکڑ کو کیوں دیا ہبیات عقل نے بھولا ہوش نے چوکا
 حق کا نشہ بے خودی سے کی دقت ہو داو گھاؤ قابو کا
 یا بے رحم دل پئے آزار دشمن جاں ہو دوست پہلو کا
 ہنس کے کہتا ہے خوب رو بہت
 نہ کرو ذکر ایسے بد خو کا
 آہ بھرا ہے کوئی تفتہ جگر آخرب نالہ سوختہ رکھا ہو آخرب
 دل اپنا سے کے دشمن جانی کہا بس آج سے نہ دوستی کیجے کس کے
 مہندی کا کل بابہ تھا ہوا آج کل کا وعدہ وفا ہو صل کا کب جلیہ جو کے
 دیکھو نہ غریزہ دل نا کام کی صورت دکھلاؤ مجھے میرے لالام کی صورت
 (مستندو)
 اس وقت میں ہو کبھی پیر سرخشا یو بچانہ کسی نے کہ جیتا ہو میرا
 آوارہ ہوا خوا کیا اکی ہو حالت
 سن شب کو مرے درد و مصیبت کی کہا یہ تو وہی اگلا ہے تراقصہ پرانا
 کہنے لگا "خاموش" کہتا زہ حکایت
 رہیں یہ چشم تر دایم وضو سات کہ گزیرے مردموں کی آبر و سات
 قدم بوسی کی ہوں حسرت میں بال رنگ نقش پا کس آبر و سات
 میں بد ماغی سے تیری کہاں کوئی ہوا نہ آج ملک کوئی داکو سر باغ

دل لال اشال بلبل نید کہ چہ کہ
کہ تا دغینہ لب گل کی طرح ہر کوئی نہ
رگ بر بارہی ہو سے چشم نہ بک
کس طرح فانی نہ کو دین نہ بک
مری محوں میں پل نہ سے مرغ آئی تا
ہو ہر مرد و آبی نصیبانی میں نہ کہ
ہو بستر گل بار دلا رام بل میں
لیٹے ہی ہیں سج سے تاشا ملک
دو ماز کے اندازہ ہم غشی کے لطف
شب ہم کو نے سے ہوئی نام ملک
تھاری لطف کو غیر تھا بک
کچھ آچکی کپ جو بل ملک میں ہی الی
کبھی کیا تھا وہ شاید کیر کو نہت
چمن میں خم ہو جاتی ہے نہ ہاں نہ
ایک تو یا ملا یا تملکہ کہ بس
دوسرا تھا بکوں کے ہوا چار کب
چشم خور تری کچھ چمن میں کس
بے عشا اٹھ نہیں تھی ہوئی ملک
آگے ہر لپٹ پہ تھا آئے بے آجی
اب تو ہوں مجھ ہی نہیں کس ملک
تو تادل ہو ہر اک نقش قدم پر ہمت
تو قیامت و غضب تہ نہ خار کب

صدائے قفل مینا ہے بحر شوش
وداع عقل ہو اور خست ہو
زبان گشتی ہو اور کرتا نہیں آہ
بزرگ شمع جلنا رو ناخوش
نقد میں سے بھولے پن کے
یہ نیسیان بار دہ وعدہ فراموش
قدم بوسی کا مجھ کو جب میں حکم
کردل کیوں کرتا ہے ہم ناخوش
ہے ساقی ترے خانہ آباد
ہو نوشا نوش ہو کو کا ہوا پیش
ہمارا سجدہ کہ نقش قدم ہے
ہمارے سر کا افسر تیری پاؤں
سے ہمت کی وہ فریاد کیوں کر
بجائے پنہ در رکھا ہے در گوش

نغمے کا کس طرح اس بگوان بگوان
مجھی سے میری بکھ کو جہاں اٹھا
بھلائی اور دل میرے خوش خبر
برائی میں ہوئے سے زبان اٹھا
یہ دل تو دشمن جاں ہوئے تو ساز کہ
جو چاہے جی سے رکھ اس ہر اٹھا
نہ دیکھا ذرہ نوازی کا آفتاب
ترسی ہی چشم کے ہی رُودہ جی اٹھا
اُتر کے جرج سے آتاری کو تری
نہو تا اس نہ نوکے اگر کاب اٹھا

ہر اک خزان میں کس کیفیت علیحدہ
غلط ہوشیخ نہ رکھ نہ شراب میں نقص
لے نقد دل عوض کہ او ہوا نام
سکر زلف کا ہو ترا دم و اتم میں
حاجت سیاق سے کی خاطر کاش
پہنچی ہی گیا وعدہ تیرا نام میں
گزان ہو ادا ہے صبر قرار کی
جس گرسنگی سے بھتا ہو کام میں
اُس کتابی رخ زیبائے کلمہ وصال
مہربانی و کرم چاہ کے اہل رخ میں
موقوف سے کیا نقاشی یہ کارواں
حسن کھتا ہو سے چہ خوشا میں
مار کے ماحیہ ہیں تن باز کس
ہو گ ل کی طرح تجھ بدن میں خط
داتاں ہجری اور ہو تر شرح وصال
حرف کچھ نہیں رمال ہو الطاف میں خط
شہر خوں میں ہے ہمت تو مادی کہنے
دل گم گشتہ کی خاطر کلمہ طراف میں خط

بھٹا کیوں کوئی ایسی کج ادب
اُسے بھٹا ہے پورا ہوا اور مجھے دعا ہے
جہاں میں اور کوئی خوب نہ تھے ہمت
کیا جو خود بھٹا کے تو ایسے بھٹا ہے
نہیں بات میں تیری ثبات درانہ بھٹا
پہ فاکا تو دلم
بھلا لوگوں سے پوچھو نہ یا تو برا جی تم بھٹا
ہو کہ بھٹا
مے گھر کے سو اکہیں جاتے نہیں کوئی اور ہاں بھٹا
بھٹا
رکھو دیدوں یہ ہاتھ تم پنہاں جی مے سر کی نہ کھا تو بھٹا
مے طلح جو سوتے جاگٹے ترے پاؤں میں بھٹا
تو نے رات کو خواب میں تجھ بھٹا
ازا نو پیکر تو بھٹا
مجھے پس سے اپنے تو دور کیا مے
شعب جاں کو حضور کھا

ترا قول و قرار تم بھٹا ترا آئے بے نقص
بھٹا
شراب مارنے کا ہے نہ یوں کا بھٹا
جو کچھ کہ چشم نے ساقی کی گرد بھٹا
ہے ہے یار صحت شراب و دل
میں سے خوش ہوا اور مجھ کو بھٹا
محل میں عاشقوں نے کوئی بکھشت
جل جلا کا تپک بھی کہ لاشع
رونی ہی جلی لگتی ہو اس بکھشت
نابستہ راہ عشق میں آتا بکھشت
مجھ سے لئے کا نہ کیا تو اقرار صوغ
اور قیوں کی ملکا کا انکار و صوغ

ایسی شمع! تو ہے خود غلطانہ خودی سے پہنچے خدا ملک
اے بہت اس سے نہ کر کلاترے چھڑنے سے ہو دھوا

ہنسے گل کی طرح و دو گل کھلا رہے حجاب ملک
ہمارے سینہ میں یوں آہ پر شرار ہو ایک کہ جیسا یکڑوں نے ہیں اور زار ہو ایک
کیا ہو وعدہ دیدار کس عجب یار بنا جو میری آنکھوں میں تل اور نہار ہو ایک
ہو آستانہ دل کی مجھے تمہیں کہ شوخیاں مری لاکھوں پردہ دار ہو ایک

حق اگر چاہے تو بہت ناخن پیر عقدہ خاطر ترا ہو جا ہو بحر حال
چشم و زار عجب ہیں چمن گل دیکھ باہم میوہن اور تھن بھول بھول
گلبدن کوچہ دین تم تو ہو چوہوں کیلے زرخیز تو گل اشک نین بھول بھول
مرگوب میں جو تجھ بھول پوتے کھیا غنچہ تو کر کرتا ہے جتن بھول بھول
ناگ ٹفلوں کو دوا نہ کاہن تو بن گیا بیل بوا ہے یہ خوش گنگن چمن گل

سج پر چوہوں کی بہت نہیں بھانا
منا ہے نرم ہے خوش ہے بن بھول بھول

معموہ عطر گل سے حبیب کنار ہم تم ہی روز عیدل میں جاؤں سار ہم تم
ابھی نہیں کہرت ہو مست صدفانی جو آئینہ نمایاں دل کا عیار ہم تم
پیارا چمن میں گل کر کے بکشی کو اس خست زری کی مل کر ٹوئیں سار ہم تم
دعویٰ سخن کا اکثر کرتے ہیں لیکن ہیں یاد کار دوران و تین چار ہم تم
کافر بتوں کے بند کہتے ہیں لوگ ناحق

ایمان اور بہت ہیں و پندار ہم تم

چمن میں ہو جو جھک رہا ہر کی ہو میوہ ہر ایک گل پر ہے بلبلوں کا حرم
نہیں ہو شیوہ ہر وفا۔ محاذ بند بتوں کی چاہہ کا کیا اعتبار ہو ہر حرم
ملا ہو خاک میں لٹل نقش پا بہت جاکشہ و غم دیدار سے محرم
ہوا ہی تیغ نگہ سے شہید یاد آیا جو مارا مرگ وہ جنت مکان ل حرم

قصو کیا ہوا بہت نے کیا کیا قصیر

سبب غائب کا اب تک اپنے نامعلوم

عہد و پیمان کا ورہ ہے جسے دہا کار کلمات والا کا ورہ نصرت رکھتا ہے سانسو رے راز

اتحان کر چکا عیار ترے کرو خرب سچ تو یہ ہو کہ کیا دھڑکیاں دروغ
ہو زبان و سخن خلق میں بہت مشہور

راستی میری تو اندک و ببار دروغ

شام کو عارض آنک ایسی لکھا کی ہونے بلغ میں بل کی سی صبح بھرتی ہونے
کیا بلایا ہیچ و زور و سکران ملک سے جتنا ملتا ہوا آنا ہی بھاتی ہونے
دل ہوا تو اس کے کس طرح بھگا بھگا

جول کی کھشیاں لانے کی گول لاتی ہونے

غصبت دیکھ ہی جب مجھ کو اتوں کار میں کچھ رہا ہوں اس کی طرف

صبا تو کان میں غنچہ کی بن کر سے نہ دیکھ اسکے تو گھر کرب ناں کی طرف

ایسی شمع ہے ہر وقت پردہ و کبیل جو ہو گی فترت تو کسی جوان کی طرف

خدا کی یوں ہی خدائی حق ہو لے یار ہو کا وارث کوئی ہونہ جتناں کی طرف

شریف پذیر ہو بہت حکمت تمہیں

لکھ اس غزل کو تو آسا و تختہ اس کی طرف

چلا ہی دل مجھے کوئے لٹاں کی طرف رواں ہو جس عنوان غزل کی طرف

چمن میں گوش ہو کر گل کا بلبلوں لو رکھا نہ کان کی کبھی غزل کی طرف

گلن تباہ سے شمع تیری روشن ہے حجاب سے سے کر دیکھت جوں کی طرف

ہو نفاق ان میں ہر گز نہیں بتا دہم سے اتفاق اپنے ہوا بل کی طرف

وہا سے آتے ہر شے سے یہاں سے ہر شے دید گزار چہاں کا تمام ملش تیری طرف

چکی ابرو میں جس سے یکساں وراثت یہ نگارستان چمن چکر رکھا لاکھ طرف

اس کے حجب بھانپنے میں نہت گر ہو جا بار گراں سم جدائی ل شائق

میں رنگ غنچہ گلوں دن تجھے دل کی گھنڈی کی گردہ کو

مرا دست میں ہو نیم سار سے کاش بند تبا ملک

دل غم نصیب کے شاد کر مجھے تو نے بھیجا نہ یاد کر

نہ تو نامہ اور نہ پیام نہت سلامت مانے دعا ملک

مجھے اس صدم کا حضور جو تری بندگی میں مقصور ہے

نہ تہا دل ناتواں بیجا ہوں جو خواہاں ہو جی کا تو جاں بچاؤ
 مجھے تیری الفت کی مانند ہو؟ زباں کا دل انکاں بیجا ہوں
 بھلا آپ رہ کے کیوں تو چھپے ہیں نہیں کہ میں کہتا ہوں بیجا ہوں
 خریدار کتنے ہی الپا ہے میں یہ چین خیزاں گراں بیجا ہوں
 نہیں ال چوری کا میں جو چھپاؤ اسے آشکارا عیاں بیجا ہوں
 پند آئے مجھ کو تو حاضر ہے پیار میں تیرے سوا اور کہاں بیجا ہوں؟
 ترے در پہ بہت کا دل حلقہ زن ہے
 پھر آہی وہاں تہاں بیجا ہوں!
 ہو جگر تیر مژہ کی چوٹ میں جی لگا جینے کو دل کے اوٹ میں
 سیل میں ان کی شرکان ڈوب گئی خار خوس بہتے ہیں جیسے لوٹ میں
 بڑبانی خوب نہیں اے خوش دمن کیوں چاتا ہی باتیں ہوٹ میں
 مرد میں میل میں بہت تیغ زن بنا ہو چھین ہرگز کوٹ میں
 ہم اُن کے اونچے اٹھانچے جاتا رہے پاؤ تو نہ کہ کہنے لگے بس نکمے تھار پاؤ
 اب اے خوشی سے تم سے جو نکلی کرے رگڑ کے ایریاں بھلائی سے سپار پاؤ
 جو اتھ جھگے سے بھلا رہے تو کھو کا کرے ہو بہر گشت سے امار پاؤ
 رکھوں میں گو دین حتیٰ کہ قدم بھلا لیے میں انھوں نے تیرے تہاں جاؤ
 گل گلاب تہاں کہ ہیں ایریاں تیری دو کڑے چاند کے ہیں گریہ جاؤ

کلا جو آنکھیں تیرے لگے لگے گدی گدی گئی سکھانے جھاوٹیں او بے ادب ہمار پاؤ
 نہ اتھ بات میں تیرے پہ پاؤں اٹھائے تخیہ سے سرم جو کمر دھار پاؤں
 میں سر گیا ہوں سر سے اتھ لگا کہ تیرا تھانہ آہے چڑھنے نہ مار پاؤں
 چلیں گے سر کو قدم کر ہم اس کے کوچ میں
 نہیں ادھی یاروں کے ہمت پھیلنے پاؤں
 آواہ اپنے دل تو ان کی کیا میں کہو جاگے گھرے کیا اس فغاں کو کیا میں کہوں
 خد گناہ سے کہ ہو جزا کت کماں کو تیر کو اہل کماں کو کیا میں کہوں
 ہوں سر پاس تو پھر شام کہیں صحبت میں فیقول کی بند نام کہیں
 ماتی کے مجھے کہانی میں دوشم کے کیا تم شیشہ سبز ساغر گف نام کہیں ہو
 بھال تو سنان سواں ہو کہ لگا لگا گھرا جاتا ہو تم خیر سے گھر جلتے ہو
 جھڑی انو کی لگی آہ شراب ہری رات دن کی اندھیری ہو کہ جھڑے ہو
 نہ اٹھو پاس بہت کے کیا نہ ہو جان جاتا ہو ادھر تم تو ادھر جاتے ہو
 گل سے خار میں اُتریں مہا مہر تیرے قربان میں کیا بل دیکھا پرانہ
 سنتے ہی قہقہہ ہجران کو دیا چھوٹم درد مندوں کا ہو کیا زود اثر افانہ
 روز و شب لگایا ہی کام ہو اللہ دم و شبہ ترانہ ہے اللہ اللہ
 مثل منصوبہ جو جنات کہے سر رہے راست گو کا یہی انجام ہے اللہ اللہ
 (خاتم)

خزیرہ موت

(از جناب قبال الدین محمد صادق لکھنوی۔ جاسٹ اڈیٹر اخبار کاظمیہ لاہور)

بحرنا پیداکنار کی خونخوار و ظالم موجیں ایک سنگلاخ خزیرہ کی اونچی نیچی جہانوں سے ٹکر کے سفید جھاگوں بڑے بڑے جہانوں اور منسٹر چھینٹوں میں فضا ہو رہی ہیں اس خطرناک آبی منظر میں طوفانِ عظیم برپا ہے۔ سینہ آب سے اٹھنے والی موجیں پہاڑی کی چوٹی تک جا کر تفرسمند تک پہنچ رہی ہیں۔ مخدبوت کے بڑے بڑے ٹکڑے روئی کے گالے کی طرح اڑ رہے ہیں آبی مخلوق ان تباہ کن ٹکڑوں سے پریشان۔ بڑھنے والا طوفان ہر نقطہ خوفناک صورت اختیار کر رہا ہے تمام فضا پر سیاہ بادلوں کی فوج پانی برسائے کے لیے محیط ہے جس کا پیش خمیہ ہوا کے نیز ترسند جھونکے میں جوہر خیز کو اڑائے لیے جا رہے ہیں آسمان کے پانی اگٹنے بجلی کی چمک۔ رعد کی لڑاکا نے ٹری سے ٹرٹی تک ذرہ ذرہ کو ہلا دیا۔ اندھیرے کی ایک چادر نے سارے عالم کو اپنے کونے سے چھپا لیا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے نے شدت باراں اور بجلی کی چمک کو ساتھ لے کر منظر کی ہولناکی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ سمندر کا پانی آسمان تک جانے کے لیے بے چین..... سوائے برق جہاں سوز اور رعد جگر دوز کے کوئی خیر نہیں۔ چند انسانی مہتیاں شکستہ اور پھٹے بادبانوں کے جہاز پر موت و زلیت کے عالم میں تھلائے ملاطم تھیں۔ جہاز ایک گس نیم جاں کی طرح اپنے ناتوان بادبانوں کی مدد سے شننا و طوفان تھا طوفانی تھپ تھیرے اُسے مشرق سے مغرب پہنچا دیتے کبھی وہ آسمانی پہاڑیوں سے جالقا اور کبھی قعر سمندر میں۔ ان فضاگت زدہ مسافروں کی بری حالت تھی۔ ان بحاروں پر دوسری بلایہ نازل ہوئی کہ اس ستم رسیدہ جہاز کو برف کے ایک ٹکڑے نے پاش پاش کر دیا اور زندگی کا ٹیکستہ سہارا بھی نہ رہا اور الکان جہاز کا دل یاس سے ڈوبنے لگا۔ حواس گم۔ ہوش پران۔ بدن جہاز کے ہچکولوں۔ موجوں کے پھینٹوں۔ بارش کی مارا ماراؤلوں کی دھچکا سے چکناچور تھا۔ مائے..... انکس..... کہ جہاز ڈوبنے لگا۔ پیاری جان کو بچانے کے لیے آخری تدبیر کی گئی۔ کشتیوں کی رستیاں کاٹ کر ناہموار پانی پر چھوڑ دی گئیں۔ خوف زدہ مسافر بد حواسوں اور پاگلوں کی طرح اس میں کودنے لگے۔ فتمت برگشتہ نے یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ لبض کے کودنے سے کشتیاں پٹ گئیں اور لبض کو کشتیاں نہ معلوم کہاں لے گئیں۔ ہاں خوش قسمتی یا ہمت در کی مہربانی کہ یہ شکل چار آدمی صبح و سالم اپنی پیاری جان بچا سکے۔ جہاں جیہاز ڈوب رہا تھا وہاں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے اس کو اور بھی بے دردی سے توڑ رہے تھے اور اس کی چرچراہٹ موت کا گیت گارہی تھی۔

سب زقار کشتیاں پانی کے ریشاں کن آتار سے تہ وبالا ہو رہی تھیں اور مسافر ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے

۷۱
جہانست تین کشتیوں کے غرق آب ہو گیا اور ایک مسافر مرکز ورتپوار کے سہارے ڈوبتا اچھلتا۔ توکل سمجھا اپنی بہادر مہارت بخت کی یادری سے جزیرہ کی پتھری ڈھلوان سے جا لگا۔ ہر کمالے راز وال۔

خونفک طوفان کم ہوا۔ آسمان نے آنکھ کھولی۔ آفتاب نے بادلوں کے پردے سے منہ نکالا۔ اپنی تیز و خوش چال شاعروں سے موجوں کو محدود کر دیا۔ نہیں اب معلوم ہوا کہ اس خوشخوار اور موزی سمندر کا یہ ہیجان صرف اس جزیرہ کے نکلنے کے لئے تھا اس کا ارادہ پورا ہو۔۔۔۔۔ گیا۔۔۔۔۔ وہ مصیبت کا مارا تنہا مسافر پتھر کی ایک چٹان پر آرام کی ماس لے رہا تھا اس کی آنکھیں نہ معلوم کس کس کے نام میں اسٹکار تھیں۔ جسم بہرہ۔ اعصابست حوصلہ۔ یہ سرزمین جہاں یہ بیچارہ غریب الوطن پڑا ہوا تھا۔

”موت کا جزیرہ“ کہلاتی یہی جہاں نہ آبادی نہ خوبصورتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پہاڑی نے سمندر سے نکل کر سطح سمندر پر اپنی خونفک چٹانوں سے قبضہ کر لیا ہے اور اکثر جہاز اس کے کالے کالے پتھروں سے ٹکرائے کہیں تباہ ہو گئے۔ ملاح اس طرف دیکھتے ہوئے گھبراتے مسافروں کو اس کے نام سے غش آجاتے جب کبھی یہاں سے جہاز بچت گذر جاتا تو خلاصی اور پرستان سب مل کر خدا کا شکر ادا کرتے۔ ترانہ مبارکباد بلند کرتے اور پیچھے مڑ کر کبھی نہ دیکھتے اس نیند سے آنکھ کھولی اور ایک انگڑائی لیتے ہوئے اس خاموش سنان ہدیت ناک منظر پر چلتی ہوئی نظر ڈالی۔ اسے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر شہنشاہ حیوانات دکھائی دیا جو اس کی طرف گھور رہا ہے اور کوئی دم جاتا ہے۔ کہ اس شیر کی چھبٹ اس کی زندگی کا خاتمہ کرے یہ اقانہ جنیسنہ ان شاہ بلوط کے ایک درخت پر چڑھنے کے لیے لڑکا اس طرح کہ یہ درخت کی تنائیں اور شیر اس کے تعاقب میں۔ شیر کا وار خالی گیا اور مسافر ایک مضبوط پٹھنی پر کڑا اور ایک ٹکڑا اور پھر اس کے بھیگے اور زنگ دار پتوں کی دو گولیاں شیر کے جسم میں۔ وہ پرہیز آوازیں مارتا ہوا اڑکھتا پڑکھتا تھکتا مسافر کا دل خوشی سے پھولانہ سوتا اس نے اپنے وفادار ساتھی (پتوں) کو بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگا یا بھوک نے درخت سے اترنے پر مجبور کیا۔ آخر کار وہ دیکھتا بھاتا پھونک پھونک کے قدم رکھتا ہوا ان چھبٹوں سے کل کے ایک راستہ پر ہولیا جو ایک صاف شفاف دریا کے کنارے پر تھا اس کے دھڑکے فخر و ط کے درخت تھے۔ اس ندی کے کنارے سبزہ لہرا رہا تھا اور جا بجا جتنے جاری تھے۔ مسافر کے جب قدرے سکون و اطمینان ہوا تو اسی اخروٹ اور جنگلی میوؤں سے شکم پری کی۔ موتی جیسا صاف پانی پی کر سبزہ پر دراز ہو گیا وہ عالم خواب میں محو تھا کہ یکایک چوہے پڑا پیاری نیند اچاٹ ہو گئی۔ گھر لے اٹھ بیٹھا اور حسرت بھری پُرم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا ایک لمبا تھ اس کا دل پر تھا اور دوسرا سبزہ پر ایک جج اس کی زبان سے نکلی ”ہائے“ اگر دن پیچھے کو جھٹک گئی اور وہ بلا سہار گھاس پر گر پڑا۔ اور چپنڈ کلمے بھٹکل اس کی زبان سے سنائی دے۔ میری۔۔۔۔۔ پیاری۔۔۔۔۔ محبوبہ۔۔۔۔۔

میرے۔۔۔۔۔ پیارے۔۔۔۔۔ بچے۔

عَنْتِل

(جناب صفی اورنگ آبادی حیدر آباد)

فیصلہ کر! یا تو ارمانِ دل مضطر نکال!
 کون کہتا ہی، کہ ارمانِ دل مضطر نکال!
 اے دل وحشی! بخل گھر سے تو۔ اُس کا گھر نکال!
 مجھ کو جو کہنا ہو، کہہ! میری خطا۔ میرا قصور۔
 دل کی چوٹیں دیکھ کر۔ اُس سخت گونے یہ کہا
 بے دلی کو بھی جنون سمجھیں تو سب سمجھا کریں
 اللہ اللہ! کفری کی کوئی حد ہی نہیں
 دل کے دینے بیشش پنج اس قدر بے سود ہے
 یہ نیا غم ہے کہ تجھ سے مل کے بچپنا نا پڑا
 تجھ کو لگنے کی ضرورت کیا ہی! اب میرا قصور
 یہ تلوں تو تر اے دل نہیں کچھ کام کا
 اے جنونِ عشق تیری قدر اب ہونے لگی
 میں یہ کہتا ہوں کہ ”نام اُس بے وفا کا اب لو
 تیرا دیوانہ ہوں تو اپنا مجھے سایہ سمجھ!
 جرمِ دل کا دیکھ! خود کو دیکھ! اپنی شان دیکھ!
 اے صفی پھر اُس کی محفل کی تمنا ہے تجھے
 یاد ہی وہ؟ ”ہی اے کوئی اے باہر نکال!

یا تو، بس اللہ میں حاضر ہوں حل! خبر نکال!
 باتوں باتوں میں بگڑ جا! بیٹھے بیٹھے شہر نکال!
 پانوں کے چکر نہیں تقدیر کے چکر نکال!
 نام، تو اس کا نہ منہ سے۔ اے ماریت نکال!
 ”تو مرنے زدیک سے ایک آدھ تو پتھر نکال!“
 دل تو کہتا ہی کہ گھر کی بات کو باہر نکال!
 تیرے صدقے! کوئی اپنا سا پری بیکر نکال!
 مجھ پہ کچھ تیرا نکلتا ہے تو غارت۔ گرنکال!
 بس! مگر بس! شکایت کے نہ اب دفتر نکال!
 ظلم تو ہی! ایک کے دس۔ سات کے ستر نکال!
 یا تو اُس سے ڈر ہمیشہ! یا تو اس کا ڈر نکال!
 ضعف کہتا ہے کہ گھر سے پانو تو باہر نکال!
 دل یہ کہتا ہی کہ ”اُس کا تذکرہ اکثرت نکال!“
 گھر میں وہ تو گھر میں رکھ! باہر نکل! باہر نکال!
 جانے دے! اُن جان ہو جا! چشم پوشی کر! نکال!

اے صفی پھر اُس کی محفل کی تمنا ہے تجھے
 یاد ہی وہ؟ ”ہی اے کوئی اے باہر نکال!

تنقیدیں

۷۳

فرنگ عثمانیہ از قاضی میر لطف علی صاحب عارف حیدر آبادی۔ ضخامت (۳۱۸) صفحات قیمت پانچ روپیہ مولف صاحب سے یہ مقام اندرون فتح دروازہ حیدر آباد کو طلب کیا

فرنگ عثمانیہ المعروف بہ اصطلاحات اسنادی جیسا کہ اس عرف سے ظاہر ہے معاش، مہوار، زمین، پٹہ اور مالگزاری و تاریخی اسناد کے الفاظ و اصطلاحات کی ایک جامع فرنگ ہے۔ مولف نے بڑی تلاش اور کوشش سے زمینداروں اور اہل معاش کے لیے نہایت مفید تالیف کی ہے۔ غالباً یہ پہلی جلد ہے اس میں صرف وہ الفاظ اور اصطلاحات ہیں جو الف اور ب سے شروع ہوتے ہیں۔ الفاظ کی تشریح توضیح بڑی حد تک صحت اور صفائی سے کی گئی ہے دکلاء، اہلکاران، دفاتر اور معاش داروں کی اس کے ذریعہ بہت سی فنی مشکلات جو وقت بے وقت الجھنیں پیدا کر دیتی اور بہت سادہ وقت لے لیتی ہیں دور ہو جائیں گی یہ کتاب نہ صرف ریاست حیدر آباد بلکہ دوسری تمام دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کے باشندوں کے لیے بھی یکساں مفید ثابت ہوگی کیونکہ اس میں مغلیہ زمانہ بلکہ اس سے پہلے کے عہد کی مالگزاری کی اصطلاحیں جو اکثر قدیم دستاویزات و اسناد میں ملتی ہیں اور ایسے مصطلحات جو حیدر آباد کے سوا دوسرے رجواڑوں میں رائج تھے اور ہیں سب درج ہیں۔ بعض چیزیں غیر ضروری طور پر بھی شریک کر دی گئی ہیں جن کا اندراج اور وہ تفصیل کے ساتھ اس کتاب کے موضوع سے بالکل خارج نظر آتا ہے مثلاً آصف جاہ کی ضمن میں جلد آصف جاہی بادشاہوں کا ذکر اور پھر بادشاہ کی ضمن میں ابرشاہ بانی خاندان مغلیہ سے لیکر بہادر شاہ ظفر اور علاء الدین حسن ہمینی سے لے کر قطب شاہی، عادل شاہی، عماد شاہی، نظام شاہی، برید شاہی، اور آصف جاہی بادشاہوں کی تاریخ مدائن کے وزرا وغیرہ کے حالات کے کتاب کے موضوع سے بہت کم علاقہ رکھتے ہیں۔ آصف جاہی بادشاہوں کا ذکر دو جگہ آیا ہے ایک موقع پر کسی قدر تفصیل سے اور دوسرے موقع پر بالکل اختصار کے ساتھ۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو کتاب کی ضخامت غیر ضروری طور پر بڑھتی اور اس کے ساتھ دوسری متعلقہ اشیاء کے لیے خاصی جگہ کل آتی۔ مہبت مولفہ منڈت ہری صاحب شاستری پروفیسر مہدی و سنگرت کلیہ جامعہ عثمانیہ صفحہ ۱۲۶) وسط تقطیع قیمت ۶

ہندی اردو مال

منڈت جی نے ہندی کی پہلی کتاب بڑے سچ بکار کے بعد لکھی ہے اور اس کی تالیف کا مقصد اردو دانوں کو ہندی زبان کے کھینے میں آسانی پہنچانا ہے۔ ہندی کی ابتدائی کتابیں بکثرت ہیں اور خصوصاً ہندی ہتھالیوں کے زیر اہتمام جو نہایت شاندار پریمانے پر ہندی کی زبان کی اشاعت اور اس کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں پکایا

کی کوشش کر رہی ہے متعدد سالے اور ابتدائی کتابیں ایسی شائع ہوئی ہیں جو دوسری زبانوں کے جاننے والوں کیلئے جلدی سے ہندی سیکھ لینے کا سامان کر دیتی ہیں۔ نپڈت جی نے اردو دانوں کے لیے یہ کتاب بڑی مفید لکھی ہے اور یہ کام اس تجربے کے جو انھیں جامعہ عثمانیہ میں اردو داں طلبہ کو ہندی پڑھاتے رہنے سے حاصل ہے تمام ضروریات کو ملحوظ رکھا ہے۔ ہندی حروف تہجی کے نیچے اردو میں ان کے تلفظ اور بعد میں ہر سبق کو اردو رسم الخط میں لکھا ہے جس سے پڑھنے والے بلا کسی وقت کے ہندی سیکھ سکتے ہیں۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ نپڈت جی اس سلسلہ میں اور کتابیں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دوسری کتاب کی تالیف تو شروع بھی کر دی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب ردو میں ہندی کے لیے جو ابتدائی کتابیں شریک ہیں اگر انھی بجائے یہ اور اس کے بعد کی دوسری اور تیسری کتابیں تیار ہوں یہ شریک درس کی جائیں تو یقین ہے کہ امیدواران امتحانات ایف اے وی اے کے لیے بڑی سہولت کا موجب ہونگی اور فی الوقت جو دقیق موجودہ کتابوں کے خالص ہندی خوانوں کے لیے ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہیں وہ بھی

سالنامہ ریسرچرکن مرتبہ مولوی سید احمد محی الدین صاحب ضخامت (۱۰۰) صفحے پونیسہ لہ تقطیع قیمت چھ
 مولوی سید یوسف الدین صاحب منجر ہر دکن انفل گنج حیدر آباد دکن سے طلعت
 روزنامہ ریسرچرکن جو حیدر آباد کا نہایت مقبول اور سربرآوردہ روزنامہ ہے اپنی بے لاگ پالیسی حق گو
 اور صحیح خدمت گزار کی ملک و قوم کی وجہ سے روز بروز ہر دلعزیز ہوتا جا رہا ہے۔ کئی سال سے ہر فصلی سند کے
 آغاز میں انگریزی اخباروں کی طرح عظیم الشان بیانے پر انشائے کر رہا ہے یہ سالنامہ ۱۳۳۹ء کا ہے اور صورت
 و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اردو صحافت میں بے نظیر ہے کسی اردو اخبار تاریخ تک اس شان کا سالنامہ شائع
 نہیں کیا اگر ایک طرف مختلف علمی تعلیمی اور ادبی عنوانات پر مفید تحقیقی اور دلچسپ مضامین اور قدیم و جدید رنگ
 کی دلکش نظموں اور غزلوں کا ایک پاکیزہ مجموعہ ہے تو دوسری طرف تاریخی دلچسپی اور حیدر آباد کے نظائے دفاتر
 اور عام پسندیدگی کی متعدد تصاویر کا نفیس مرقع ہے۔ انجمن حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملک کا ایک کئی رنگی
 فوٹو نہایت خوبصورت اس کی خوبیوں میں چار چاند لگا رہا ہے تاریخی دلچسپی کی تصاویر میں جملہ آصف جاہی
 سلاطین، قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کی قلمی تصویریں اور قدیم ہندو منار کے فوٹو قابل ذکر ہیں
 نظام سار کے مناظر اور ان کے ساتھ اس ساگر پر بسیط معلومات کا مضمون ایک دلچسپ چربے متعدد افانے ہیں
 جو اچھے انسانہ نویسی کی قلمکاری کا نتیجہ ہیں۔ جدید طرز کی نظموں میں جنسٹہ پر قاضی زین العابدین صاحب کی
 نظم اعلیٰ تحلیل اور چتر ترکیب اور زور بیان کے لحاظ سے ایک شہ کار ہے۔ غزلوں میں حیدر آباد کے مشہور شاعر
 صفی مہر اور غزنی اور اچگر کی غزلیں عین شہادت پسند کی جائیگی۔ اگرچہ تمام مضامین نہایت عمدہ ہیں لیکن
 چھپت مجموعی اردو کے حروف ہمایا اور دیوان خاکی دو ادبی مضمون بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھے گئے ہیں

اول الذکر اس لحاظ سے بھی خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے کہ اب تک عام طور پر اردو کی بجا میں (۵۵) سے زیادہ انگریز نہیں دریافت کی گئیں۔ مولوی ابوالحسن متین صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے بڑی تلاش و تجسس سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کی بجا میں (۵۵) سے بہت زیادہ یعنی (۱۲۲) آوازیں ہیں۔ اس تحقیق و انکشافات اردو زبان کی لسانیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ مدیر صاحب رہبر و کن اس سالانے کی ترتیب و اشاعت پر قابل مبارک باد ہیں۔ اردو صحافت میں ان کی یہ سعی انقلاب انگیز ثابت ہوئیگی۔

انگریزی ہفتہ وار۔ مدیر عزیز احمد صاحب بی اے عثمانیہ سالانہ چندہ پے شش ماہی ہے نہ ہی کا
دی اسٹار فٹنگ صاحب دی اسٹار ہیوٹل روڈ الد آباد

یہ انگریزی زبان کا ایک آزاد اسلامی ہفتہ وار خطبہ جو الد آباد سے جناب عزیز احمد صاحب بی اے عثمانیہ کے زیر ادارت جاری ہوا ہے اس کے مسلسل کمیٹی ممبروں کے مطالعہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اغراض و مفاد کی حفاظت ان کے حقوق کے مطالبے اور انکی تائید اس پر ہے کہ انصاف العین ہے ممالک اسلامیہ عرب، ایران، مصر و عراق افغانستان اور حیدرآباد کے مایمل حاضرہ اور حالات و کوائف پر تنقید و تبصرہ کا خاص اہتمام ہے مسلمانان ہند کے سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی مایمل پر آزادانہ مباحثے اور رہنمائی نہ ملے وہی میں کافی سی کی جاتی ہے ہر ممبر میں ضرور ایک آدھ علمی مضمون بھی ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں مسلمانوں کے خاص اخبارات کی جو کمی ہے اس کے مد نظر یہ ہفتہ وار اخبار نہایت مفید اور قابل قدر ہے لائق مدیر اور کارپردازان انتظامی کے حسن سعی سے اچھے کاغذ صاف لٹپ اور پاکیزہ طباعت کے ساتھ یہ پابندی شایع ہو رہا ہے۔ انگریزی کے اچھے اشعار و دازوں کے مضامین بھی ہوتے ہیں پبلک ذہنیت کی تعلیم و تربیت کے لیے امید ہے کہ اس کی خدمات بڑی مفید ثابت ہوئیگی۔

بجز نائل نقیب کامل حصہ تین مطبوعہ خورشید پریس موقوفہ یوسف باز اینال حیدرآباد

۷۶ اس صدی کی پہلی شانِ اردو کتاب اردو شہ پارے

زیرِ ادارت ڈاکٹر سید غلام محی الدین قادری ام اے پی، پاج - ڈی (لندن)
اردو شہ پارے تین جلدوں میں شائع ہو رہی ہے

جلد اول اردو کی ابتدا سے لیکر دہائی کے عہد تک - مرتبہ سید غلام محی الدین صاحب قادری ام اے پی پاج ڈی (لندن)
جلد دوم دہائی کے عہد سے دہائی کے عہد تک - مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ام - اے
جلد سوم دہائی کے عہد سے موجودہ زمانے تک - مرتبہ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام اے پی ل بی -
پہلی جلد وسطیٰ دور میں شائع ہو رہی ہے

(۱) اردو کی ابتدا سے دہائی کے عہد تک کی ادبی تاریخ (۲) اردو ادب کے تن کا خاکہ (۳) اس دور کے مصنفین انکے کارناموں اور انکے خطوط کے متعلق تفصیلی معلومات (۴) اس عہد کے اردو مصنفین کے بہترین شہ کار (۵) قدیم متروک اور ناموس الفاظ کی درجہ (۶) سید شاہ راجہ علی عادل شاہ ثانی سلطان عبداللطیف شاہ - ابوالحسن ناما شاہ - سلطان محمد علی قطب شاہ ابن خواصی اور دوسری قدیم معاشرت کی تصویریں شامل ہیں۔

قدیم اردو ادب پر اس سے وسیع اور بہتر معلومات کا مواد نثر اور ہے اس کے لیے مصنف نے یورپ کے

تمام کتب خانوں کی جانچ کی واپسی کا عند تقطیع کر اؤن (صفحہ ۴۰۰) نفیس جلد کے ساتھ کوئی اردو کتاب اس شان سے آج تک شائع نہیں ہوئی قیمت پچھروپے بارہ آنے علاوہ محصول ڈاک
مکتبہ دارالاسلام، لاہور، (۱۰۰) ایڈیشن بروڈ جسٹس آباد دکن،

فہرست مضامین مجلہ مکتبہ (جلد سوم)

مضمون نگار

مضمون

مضمون نگار

مضمون

۱۔ سائنس

فن تقریر غلام اطہر

خیالات لطیف ایس۔ پی۔ انشا

کوبستانی دوشیزہ سید علی

تیر بہ ہدف شیر حسن قیس

ایک نوزائیدہ کی موت سید علی

ذکیل بالجبر سید وزیر حسن

۴۔ افسانے اور ڈرامہ

عزازیل کا دربار الف مہد

کچھڑی غلام رسول

قرض خواہ محشر عابدی

خان بہادر اعظم کریوی

جوش انتقام شیر حسن قیس

بھوت ام۔ اسلم

خاندان چوہان کا آخری راجہ شیخ نور الحسن

اعتماد غلام رسول

۵۔ وکھنیاں

کلام قلام مصطفیٰ اسحق بونگیا عمر یاضی

۶۔ منظومات

غزل علامہ شجر

رباعی صفی (اورنگ آبادی)

فریاد انگ مہال الدین اشنگ

ابوالکلام فیض محمد بی۔ آ

۲۔ تاریخ معاشیات

۱۔ یورپ کی موجودہ ترقی میں خواجہ مہر الدین

مسلمانوں کا حصہ۔

۲۔ ترجمہ گلشن بیجا پور۔ عمر یاضی

سلطان علاء الدین جن بہمنی۔ محمد موانصاری بی۔ آ۔ ال۔ لی

۳۔ عرب اور ان کے میلے۔ ابوالکلام عبدالکریم ضحانی

۴۔ امام سیوطی اور تاریخ حافظ نثار احمد

۵۔ پردہ۔ آبرو بیگم

۳۔ زبان و ادب

۱۔ سدی ایک سہری تھاں لکھاری نگار۔ ابوالحسن تہیں

۲۔ گوکٹھ کا ایک قہر بہترین ادبی شکار ڈاکٹر سید محمد الدین قادری ام۔ آ

۳۔ قضا کے شمال کی زبانیں۔ عبدالوہاب مسلم

۴۔ ہندی ادب کا ابتدا اور نشوونما۔ لالہ سیتا رام بی۔ آ

۵۔ حافظ شجاع الدین۔ میر مظہر علی مولوی کامل

۶۔ میر عالم کی شاعری۔ سراج الدین طالب

۷۔ مرزا غالب کا فارسی کلام۔ مودود احمد تشنہ

۸۔ اقبال (اپنی رباعیاں کی روشنی میں)۔ عزیز احمد

۹۔ ابن رشد علی۔ ڈاکٹر سید محمد الدین قادری ام۔ آ

۱۰۔ میر کی ایک اور تصنیف۔ مسعود حسن رضوی ام۔ آ

مضمون

مضمون نگار

مضمون

مشاہدات -

ابوالفضل راز

دیوان بیردرد

انکار عفو -

سید شاہ ابراہیم عفو

دی چھپک آف گلشن ان دین
اسکولس -

دعا نوزید -

تہنیت علی خاں نوزید

دی انجریس ایڈریس -

غزل -

علامہ انگر

سیر گل -

سید ابراہیم خلیل

غزل -

مغزن نکات -

سید شاہ ابراہیم عفو

تخیلات عفو -

تذکرۃ الخواتین -

عابد علی غابد

رنگ نغزل -

تذکرۃ جیل -

قادر حسین قادر

جوانی -

چمنستان شعرا -

اعظم کرپوری

غزل -

خزینہ تاریخ -

سودود احمد تشنہ

غزل -

حالات قدسی

رباعی -

محمد علی خاں ناظم

ترانہ ناظم -

تساویر

علامہ انگر

غزل -

مولانا سید شاہ عفو مرحوم

صفی (اورنگ آبادی)

غزل -

سید عسکری حسن بیار ستر

محمد حسین ادیب

محمود گادوال -

قان بہادر ڈاکٹر خواجہ محمد حسین

عشق رام پوری

غزل -

جدید کتب خانہ آصفیہ

قادر حسین قادر

غزل -

کتب خانہ قمر فلک نا

فتیل (حیدر آبادی)

رباعی -

ڈاکٹر سید محمد الدین قادری ام - آ

صفی (اورنگ آبادی)

غزل -

ابن نشاظمی -

نغز (حیدر آبادی)

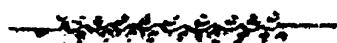
دکھیا سپانگ

تنقیدین

نواب آصف جاہ ثانی

نواب مسعود جنگ بہادر

بقائے دوام



زندہ طلسمات

میں کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ معزز حکماء اور ڈاکٹروں نے صدمہ مریضوں پر امتحان کر کے سیکرٹری سرٹیفکیٹ عطا کئے۔ زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ رجسٹرڈ اور سرٹیفٹ شدہ ہے۔ حسب ذیل امراض پر آنا فانا میں طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیضہ۔ پلگ۔ بخار۔ چیخ۔ سہلی۔ کھانسی۔ دنتہ۔ بواسیر۔ غارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور ہمد اقسام کے درد کے لئے اکیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزماتے ایک بار ضرور آزمائیں۔ پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے۔ شیشی نمبر (۱) عدد نمبر (۲) ۸ نمبر (۳) ۲۴ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ وی پی صاف ہوگا۔

”زندہ طلسمات حیدرآباد دکن“

خطا اور تیار کا

و بحسب سال باہم

بیرونی استعمال کی پرتا شیر اور لاجواب

بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزاء سے مرکب اور بالکل بغیر ثابت ہو چکی ہے۔ جو اقسام کے بھابی و اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عرق ریزی کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے۔ اور مستعد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے روبرو پیش کرتے ہیں اس سے زیادہ پرتا اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھٹ اور فائدہ ان اسے خالی نہ رہنا چاہئے استعمال کے ساتھ ہی اپنا برقی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیا ہی شدید درد چند مرتبہ کے استعمال سے بالکل کافور ہو جاتا ہے۔ علی الخصوص نفرس وجع مفاصل۔ دنتہ۔ درد سر۔ درد سول۔ بچھو کے زہر کے لئے اور جلے ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

ترکیب استعمال۔ تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام ماؤف پر ملیں اور اگر افادہ نہ ہو تو دوا استعمال پہلے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر اچھی طرح اعضا کو بھانپیں اور صاف کریں جو صحت مند انسان کو مطلوبہ دوا بخوشی قبول کرے گا۔ خوش:- ہمارے دواخانہ میں ہر قسم کی تازہ ادویات کا ذخیرہ ہمارا ہوتا ہے اور نسخہ جات نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں۔

المش۔ جمیل اینڈ کمپنی ڈسپنسنگ کمپنی شش روڈ قریب محلہ مالگناری حیدرآباد دکن تھک

ہندوستان کی طباعت میں عظیم ایشیائی انقلاب اور یورپ کی مرقع جہتنامی (یعنی) دیوان غالب مصور

جس کی پہلی اشاعت کے ۲۰۱۰ نسخے بحساب فی نسخہ ماعت ۱۱۰ کلدار فروخت ہو چکے
یہ شاندار مرقع اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اعلیٰ ترین فن و نظام غلام اللہ ملکہ کے نام فنی اسم گرامی سر اجازت منسوب ہے
مختصر تفصیل

تعارف نامہ از ڈاکٹر سر محمد اقبال
(۱) مکمل متن دیوان غالب نہایت عمدہ طریق سے - (۲) مقدّمہ فقہائے کفّتی (از مصور جہتنامی) (۳) انتخاب کلام
(۲۱) تصاویر جو چار رنگوں میں بذریعہ بلاک پریس ایک بار ہر فن کا نقشہ سے تیار کرائی گئی ہیں -
(۲) تصاویر حضرت جہتنامی کی بہترین صنعتی کا اعلیٰ نمونہ اوٹ لائن بلاک کے ذریعہ تیار کرائی گئی ہیں
(۲) تصاویر جہتنامی کے پیشانی خاکوں سے بنوائی گئی ہیں -
(۹) تصاویر عام رنگوں اور باقی ہلکے رنگوں میں تیار ہوئی ہیں -

کتاب کی جلد نقل مرا کو کے چمڑے سے تیار کرائی گئی ہے جس پر طلائی بیل بوٹے اور کتاب کا نام کندہ جو عابدیو لیم کاغذ پر تیار کیا گیا ہے

قیمت ان تمام غریبوں کے باوجود صرف ۱۰ روپے کے عثمانیہ دکھی گئی ہے۔

مکتبہ ابراہیمیلہ ملاوہا کی محروسہ کار عالی میں فروخت کا انتظام اپنے ذمہ لیا ہے

مکتبہ ابراہیمیلہ ملاوہا، مسی (محدود) ایشین روڈ حیدرآباد دکن

نوٹ: مکتبہ کے شوقیوں میں کتاب کو ہر وقت ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے

مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ



- روح تنقید | از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ام، اے، پی، ایچ، ڈی (لندن) فن تنقید پر اردو زبان میں پہلی اور جامع کتاب ہے جس میں ہندی و حال کے علمائے مشرق و یورپ کے اصول تنقید مع مثالوں کے بیان کئے گئے ہیں اور اردو تنقید کی موجودہ حالت اس میں ترقی کے امکانات پر بحث اور نیا اصولوں کی روشنی میں ثانوی سحر البیان تنقید کی گئی ضخامت (۳۰۵) صفحے طبع دوم قیمت (عہ)
- تنقیدی مقالات | از ڈاکٹر زور یہ روح تنقید کا دوسرا حصہ ہے جس میں مصنف نے روح تنقید کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں اردو کے مشاہیر شعرا اور شغریوں کے شہ کاروں پر سلیقہ تنقید کی ہے تخلیقی تنقید کے ساتھ انشا پر دازوں کے طرز تحریر پر تبصرہ کر نیکی خاص اصول بیان کئے گئے ہیں ضخامت (۱۰۰) صفحہ مجلد قیمت (عہ)
- اردو کے اسالیب بیان | از ڈاکٹر زور۔ اردو و شغری کی ابتدا سے لیکر موجودہ زمانہ کے شغریوں کے طرز تحریر و انداز بیان پر مانع نظر نہ تنقید۔ اردو انشا پر دازی کے اسالیب کی عہد بہ عہد تبدیلیاں مختلف رجحانات تحریر پر محققانہ تبصرہ ضمنی مضمون (۲۰۴) قیمت (عہ)
- سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب | از ڈاکٹر زور۔ سلطان محمود غزنوی سے پہلے فارسی ادب کا سرسری خاکہ، محمود غزنوی کے علمی ادبی کارنامے۔ فارسی ادبیات و غزنوی کا مفصل تذکرہ ضخامت (۱۲۰) صفحہ قیمت ۱۲
- دنیائے افسانہ | از مولوی محمد عبدالقادر زور۔ ام، اے، ال ال، بی، افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ۔ افسانہ نگاری کے اصول و مبادیات اور اردو افسانوں پر اجمالی تبصرہ ضمنی مضمون (۲۱۸) قیمت (عہ)
- دکن میں اردو | از مولوی نصیر الدین غنی منشی فاضل، جنوبی ہند میں اردو کی ابتدا قطب شاہی، عادل شاہی، اور آصف شاہی دوروں میں اردو نظم و شری ترقی کی تاریخ اور دکن کی ابتدا سے لیکر موجودہ زمانہ کے دور و دور کا

قامیس الاغلاط | از مولانا ذہین و علامہ سید مختار احمد، عربی، فارسی، اردو، الفاظ جو غلط طور پر اردو میں
متروج ہیں، ان کی مختلف پہلوؤں سے تفہیم کر کے ہر لفظ کا صحیح طریقہ استعمال بتایا گیا ہے۔ ہر صفحے کے ایک
اس سے استفادہ کرنا ضروری ہے، ضخامت (۳۳۲) صفحے، قیمت مجلد (۷۰)

دکنی لغت | از سید شعرا احمد شکار، اردو سے قدیم اور دکنی کے الفاظ و محاورات کی لغت،
ولی اور دیگر شعرائے قدیم کے مصالحوں میں مدد دینے والی فرہنگ، قیمت ۸۰

مبادی فلسفہ | از مولوی حسین الدین بی، اے، ال، ال، بی، ڈاکٹر ابرار علی، ایچ، ڈی کی
پرائمر آف فلاسفی کا مختصر اور باجمادہ سلسلہ اردو ترجمہ، اردو میں فلسفہ کی پہلی کتاب (ضخامت ۱۳۴) قیمت ۳۰
فسانہ اور کردار | از مولوی محمد عبدالقادر سرور سی، ام، اے، ال، ال، بی۔ ویلے فسانہ کا دوسرا حصہ،
جس میں اشخاص قصہ انصاف میں ان کی اہمیت اور خوبی کے معیار اور اردو زبان کے چہ بہترین
اشخاص قصہ پر معنی خیز بحث، ضخامت (۲۳۲) قیمت (۷۰)۔

خیابان اردو | از مولوی مختار، ہندوستان کے ممتاز اردو انشائیہ پردازوں اور گرامی شعرا کے
مضامین نظم و نثر کا بہترین انتخاب جو شائقین ادب کے لئے لاجواب تحفہ ہے، ضخامت (۴۲۵) مجلہ قیمت (۷۰)
طلسم نقد پر | از ڈاکٹر زور، ایک دلچسپ و تاریخی فسانہ جس میں دکن کی تاریخی حالت اور اس کے باشندوں کے
تمدن پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز نقد و تدبیر کے اہم مسئلہ کو بڑی خوبی سے سلجھایا، ضخامت (۱۵۰) قیمت ۸۰
اسود حسنہ | از مولوی احمد عبداللہ مسعود سی، بی، اے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے
سامنے کیسی زندگی پیش کی، اس کا تفصیلی جواب۔ ضخامت (۸۰) صفحے قیمت ۸۰

جغرافیہ ریاست | از مولوی غلام قادر بی، اے مولوی غلام رسول قلمروے حضور نظام کا تفصیلی اور پُر
حیدر آباد کن | معلومات جغرافیہ جس میں ضلع وادی اور مختلف موضوعات کے متعدد نقشے شامل ہیں۔

ضخامت (۱۷۶) صفحات قیمت ۱۲

مخزن القواعد | از مولوی میرزا علی رضا شیرازی پچھار فارسی سٹی کالج، فارسی کی سلیس اور
مفید صرف و نحو۔ قیمت ۱۲

ملنے کا پتہ: منیجر مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن

سرمایہ داروں کے لئے زرین موقع

ملک میں علم و ادب کی خدمت کے لئے ملک والوں کے فائدہ ہی کے لئے ملک ہی کے مشترکہ سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر تجارتی کاروبار چلانے کی غرض سے انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ محدود کی بنیاد ڈالی گئی اور انجمن ہائے امداد باہمی ملک سرکار عالی کے تحت رجسٹری کرائی گئی ہے انجمن کا کاروبار تین شعبوں میں تقسیم ہے:-

(۱) تجارت کتب (۲) اشاعت کتب (۳) طباعت

اس انجمن کو اتحادی طور پر کام کرتے ہوئے چوتھا سال ہے۔ تین سال سے اپنے حصہ داروں کو سالانہ دس فیصدی نفع علاوہ زرگواۃ کے تقسیم کر رہی ہے انجمن کا مجوزہ سرمایہ ایک لاکھ روپے کے ہزار حصوں میں تقسیم ہے۔ ہر ایک حصے کی قیمت کو روپیہ ہے اور ہر حصے کی ادائیگی (۲۰) قسطوں میں یکمشت قیمت کی ادائیگی پر اس سال کا ڈیوڑھا منافع دیا جاتا ہے۔

اجرا شدہ سرمایہ پچاس ہزار روپیہ قیمت فروخت شدہ حصص تیس ہزار روپیہ۔ شرکت کے فائدہ اور قواعد و ضوابط کے لئے ذیل کے پتے پر درخواستیں آنی چاہئیں۔

مستند انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ محدود اشیش روڈ حیدر آباد

مجلہ مکتبہ خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے اکیس سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ ایساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور دوسری کتابیں کم قیمت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے ان کے نام سالہ سال بھر کے لئے باقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ اہنیتیس روپے کی درستی دیگر کتابیں بدفعات یا کم قیمت نقد خرید کر نیں گے ان کی ختمیں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ باقیمت حاضر ہوگا۔ کیشٹ خریدنے والے حضرات کے نام سالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے ان کو ایک سیدھی جاگتی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔

خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب ادب لا رقم سینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسید میں منظم مجلہ مکتبہ کے اپنی مسجد میں رسالہ لکے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کمی بیشی مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبعه مکتبه ابراهیمیه طبع شد در آباء دکن

دارالاشاعت مکتبہ برہمپور دہلی محدود آباد کن

کا

عبدالمجید و محمد
ماہوار علمی ادبی

مکتبہ

فلسفہ

عبدالقادر سروری ایم اے

شکر

عمر پوری

سید محمد امجد

مجلہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ لیدار باہمی محدود کا مہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں سے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جز ہوگا۔

نظر احتیاط پرچہ بذریعہ ٹریفکس آؤن پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول نہ ہو تو ممبر کی ۲۰ تیار سیچ تک بحال نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (دو) سہ محصول ڈاک چکی چھ ماہ کے لئے (پچاس) فی پرچہ ۶
اشتمالات کا رخ فی اشاعت پورے نسخہ کے لئے (دو) نصف کپڑے (دو)

اور چھ مہینے کے لئے چھ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲
فیصد کمی ہو سکے گی۔

ترسیل ذریعہ ممبران اور حوالہ دہانہ بٹ منسٹر مجلہ مکتبہ ابراہیمیہ
امدادی شیشین روٹ میں درآباد کن سے کیجئے۔

مجلہ مکتبہ

جلد (۴۱) بابۃ ماہ مہمین ۱۳۳۹ھ دسمبر ۱۹۲۹ء شمارہ (۳۳)
تصاویر

(۱) موسیٰ ندی (حیدر آباد دکن) - (۲) مندر کا رنگ (مصر) کا اندرونی حصہ

فہرست مضامین

- | | | |
|----|--|---|
| ۲ | س۔ م | ۱۱) شذرات |
| ۵ | جناب ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے | ۱۲) خود اعانتی |
| ۱۹ | سفی اورنگ آبادی | ۱۳) پند بے سود (نظم) |
| ۲۱ | محمد علی الدین صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ | ۱۴) بھکاری (افسانہ) |
| ۲۷ | غلام جیلانی صاحبی علیہ پریذنگ من مسلم ایوسی ایشن | ۱۵) ارسطو کا سیاسی تخیل |
| ۳۸ | ابوالسنخا محمد سعید صاحب بائیل سالاجید آبادی | ۱۶) غنم دل |
| ۳۹ | سید عبد الغفریز صاحب | ۱۷) فیض |
| ۴۲ | ابوالفیض احمد عبدالکریم صاحب گل حیدر آبادی | ۱۸) شبِ برات اور آتش بانی (نظم) |
| ۴۳ | قیس حیدر آبادی | ۱۹) آخری خط |
| ۴۵ | عمر بانفی صاحب | ۲۰) بادۂ دکن { حکیم اکمل انوب سحت طلب خان بہادر { |
| ۵۶ | قیس حیدر آبادی | ۲۱) محبت کا راگ |
| ۵۷ | محمد سوہدائی صاحب مدرسی کالج | ۲۲) کج وار و مرزیا (افسانہ) |
| ۶۴ | س۔ م | ۲۳) تنقید |

شذرات

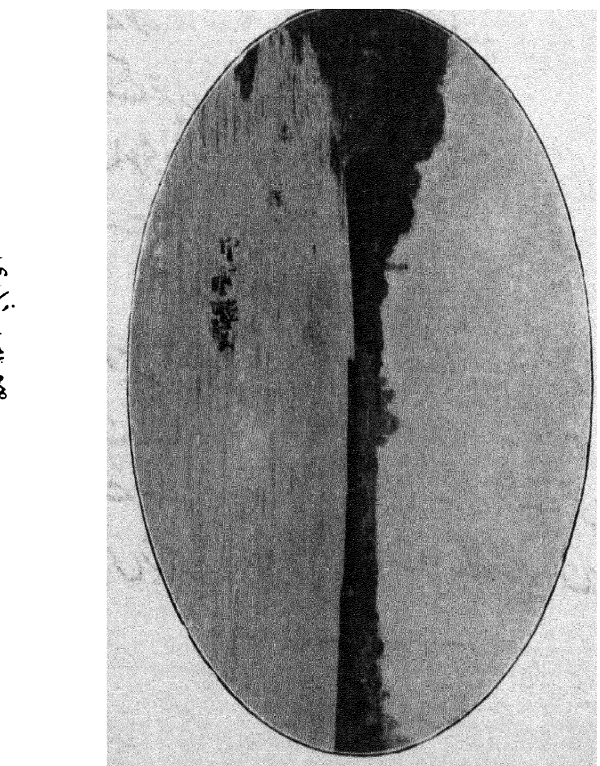
مجلہ مکتبہ میں چوتھی جلد سے جو صورتی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں، انہیں ہمارے قارئین کی پسندیدگی حاصل ہوئی اور ہم مسرت کے ساتھ اس کا اظہار کر سکتے ہیں کہ دکن اور بیرون دکن میں مجلہ مکتبہ رفتہ رفتہ خاص مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اس کا ہمیں افسوس ہے اور اس کا اظہار بدتر از گناہ نہیں تو اور کیا ہے کہ طباعت و کتابت کی ناگوار شکلات ہیں قدم قدم پر مٹائے زحمت کئے جا رہی ہیں۔ جن لوگوں کو اس کام سے سابقہ پڑا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ حیدر آباد دکن میں فی الوقت اچھی کتابت اور طباعت کیسی کم یاب شے بن گئی ہے، ہم اس کی منقل کو شش میں ہیں کہ کسی طرح ان پر غالب آئیں اور پابندی وقت سے رسالہ پیش کریں۔

اس سال دسمبر کی آخری تاریخوں میں انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن (مجلس اسنادات تاریخی) کی بارہویں میقات گوالیار میں منعقد ہوئی۔ گوالیار کے ارباب نظم و نسق کے حسن اہتمام سے یہ میقات نہایت کامیاب رہی۔ ہندوستان کے چندہ علمائے تاریخ مثلاً سر جادو ناتھ سرکار، ڈاکٹر جھنڈا کر پرسل رائس اور مولوی عبدالعلی ایم۔ اے وغیرہ نے متعدد تاریخی عنوانات پر محققانہ مضامین پڑھے اور پھر ہندوستان کے مختلف اقطاع کے محکمہ جات اسنادات تاریخی کے ذمہ دار عمدہ داروں اور نمایندوں نے سال بھر کی اسنادی چھان بین اور نئے مواد کی فراہمی وغیرہ پر تبادلہ خیالات کیا۔ کمیشن کے سلسلے میں بڑے سلیقے سے تاریخی اسناد و آثار کی عظیم الشان نمائش بھی کی گئی۔ نمائش کیا تھی ہندوستان کی عظمت گزشتہ کا ایک مربع۔ ایک وسیع ہال صرف اگلے زمانے کے آلات حرب سے سجا ہوا تھا۔ دیگر نو بڑے بڑے کمروں میں اگلے بادشاہوں کی تصاویر، تحریرات، کتبے مجھے تاریخیں، سیکے اور دیگر آثار اس خوبی سے آراستہ کئے گئے تھے کہ ایک سرسری سیر بھی ہر دیکھنے والے کو ہمارے گزشتہ تمدن کی عظمت و اہمیت کا قائل کر دے۔ ہماری ریاست سے بھی مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر اسنادات تاریخی نے نمائندگی کی اور اسناد کی خاص کارروائیوں میں شریک رہ کر اس خصوص میں یہاں جو تحقیقات ہوئی ہیں

اُن سے ارکان مجلس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ صاحب موصوف کے علاوہ جامعہ عثمانیہ سے بھی پہلی دفعہ مولوی مارون خاں صاحب شروانی پروفیسر تاریخ کو نمائندہ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ گوالیار کے ارباب اہتمام نے ارکان مجلس کو دہاں کے آثار قدیمہ کی سیر کرائی۔ گوالیار کا قلعہ جو قدیم ہے اور متعدد جنگوں میں مرہٹوں کی جائے پناہ تھا قابل دید ہے۔ اس کے علاوہ حضرت محمد غوثؒ ایک بڑے بزرگ کا مزار بھی مشہور زیارت گاہ ہے۔ یہیں ہندوستان کے مشہور مغنی تان سین کی قبر ہے۔ ریاست کی طرف سے آثار قدیمہ کی حفاظت کا معقول انتظام ہے اور سیاح بکثرت آتے رہتے ہیں۔

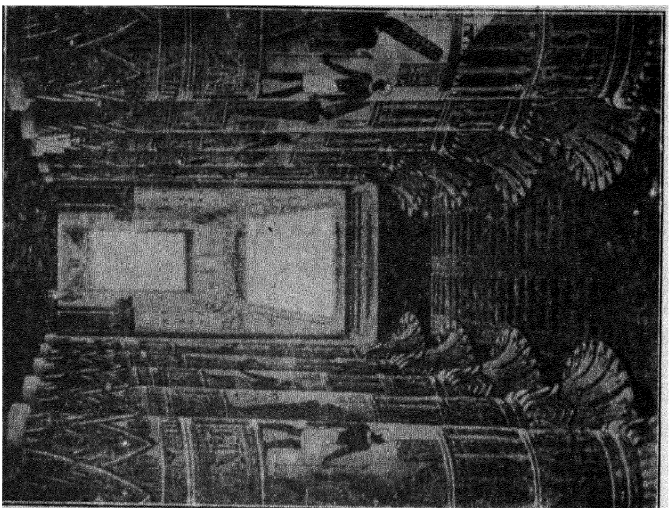
دسمبر کی آخری تاریخوں میں سیاسی جلسوں کے ساتھ زندہ دلاں پنجاب کی سی و اہتمام سے ساریہ ہندوستان کے کتب خانوں کی کانفرنس بھی منعقد ہوئی اور یہ پہلی دفعہ ہے کہ اس کانفرنس کے ساتھ ایک مفید نمائش بھی کی گئی۔ سر پی۔ سی سے پروفیسر جامعہ کلکتہ کے فاضلانہ خطبے کے علاوہ کتب خانے کے متعلق مختلف ارباب علم نے اپنے پیش ہا خیالات کا اظہار کیا۔ مسٹر رائنڈ جی ایم۔ ایسے دیر انڈیاں ریویو کا مضمون "کتب خانے کے فوائد" پر بے حد پسند کیا گیا۔ نمائش میں پنجاب اور دیگر مقامات کی انگریزی و اردو مطبوعات کے علاوہ مخطوطات کا ایک مختصر ذخیرہ بھی تھا۔ ایک حصے میں کتب خانے کی تازہ ترین اصلاحات کا مظاہرہ کیا گیا تھا جس سے کتب خانوں کے ارباب متعلقہ نے بڑی مفید معلومات حاصل کیں۔

مکتبہ ابراہیمیہ ایک عرصے سے اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ اس سرکار عالی کے لئے مختلف مضامین میں عمدہ کتب نصاب تیار کرے۔ قبل ازیں سلسلہ نصاب ادبی و جغرافیہ ریاست حیدرآباد سلسلہ معلومات دیہی اور چند دیگر انتخابات جو اس نے پیش کئے تھے ملک اور سرکار عالی دونوں نے ان کو پسند کیا اور ان میں سے اکثر و بیشتر نصاب تعلیم میں شریک کر لئے گئے۔ اب مکتبہ فارسی کا کورس مرتب کر رہا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی قاعدہ فارسی کو طبع کر کے اہل ملک کے آگے پیش بھی کر دیا ہے۔ یہ کورس بالکل جدید اصول تعلیم پر تیار ہو رہا ہے۔ نیز اس کی ترتیب میں بطور خاص یہ ملحوظ ہے کہ مقامی خصوصیات کے ساتھ کتابیں طلبہ کے لئے دلچسپ ہوں اور ان میں اعلیٰ



مجله مکتب

موسی فی



مکتب دارفک (مکتب) دارفک و مکتب

ذوقِ ادب پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔ ہمیں امید ہے کہ مکتبہ کی یہ مساعی بار آور مفید ثابت ہوں گی۔

اس مہینے مکتبہ سے ایک اور کتاب ”کردار اور افسانہ“ اشاعت پذیر ہوئی ہے جو مجلہ مکتبہ کے ایڈیٹر کی تالیف ہے۔ مصنف نے اس سے قبل افسانے کے اصول و مبادیات پر اپنی ایک کتاب ”دنائے افسانہ میں افسانے کے تعلقات پر غریہ تحقیقات و معلومات پیش کرنے کا جو وعدہ کیا تھا“ اسی کا ایفا ہے۔ ”کردار اور افسانہ“ میں افسانے کے سب اہم پہلو یعنی اشخاص قصہ سے تعلق تمام فنی اور تنقیدی معلومات جمع کی گئی ہیں اور اردو کے چند مشہور ترین اشخاص کو انھیں اصول کی روشنی میں جانچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہندوستانی اکادمی نے اردو میں اعلیٰ کتابیں شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں حسب ذیل کتابیں جو اس وقت زیرِ طبع ہیں اردو ادب میں مفید اضافہ کریں گی:-

۱۔ مغلوں سے عرب و ہندوستان کے تعلقات۔

۲۔ مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر۔

۳۔ ہندی مشاعری۔

۴۔ ترقی زراعت۔

اس مہینے اردو میں چند نئے رسالے جاری ہوئے ہیں اور بعض کے جنوری سے اجرا ہونے کی اطلاع ملی ہے۔ ان میں لکھنؤ کا ”ادب“ اور الہ آباد کا ”چاند“ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آئندہ نمبر میں انشائندہ ان نئے معاصرین پر تبصرہ کیا جائے گا۔ تنقید کے لئے بھی اس ماہ میں متعدد کتب وصول ہوئی ہیں جن پر اس نمبر میں تبصرہ نہیں کیا جاسکا۔ اگلے نمبر میں ان پر بھی ریویو شائع ہوں گے۔

خود اعانتی

(از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی آ)

مرزا صاحب نے اسلام کی مشہور عالم کتاب ”سلف ہلب“ کا اردو میں نہایت پاکیزہ ترجمہ کیا ہے اس سے پہلے اس کتاب کا ایک مختصر ترجمہ ”سحر کب“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ لیکن علی دنیا میں اس کتاب کی غیر معمولی ہر دفعہ پڑی کے منظر اس کی ضرورت تھی کہ اس کو پوری طرح اردو زبان میں منتقل کر دیا جائے۔ مرزا صاحب کی یہ کوشش بے حد ستائش کی مستحق ہے کیونکہ اس کے مفید ہونے میں شبہ نہیں۔ یہ اس ترجمہ کا ابتدائی حصہ ہے دیگر حصے بھی آئندہ شائع کیے جائیں گے۔ ”جلد یکم“

”خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد و آپ کرتے ہیں“

یہ ایک آزمودہ مقولہ ہے اور اس چھوٹے سے فقرے میں وسیع انسانی تجربے میں خود اعانتی کا جو ش حقیقی انفرادی ترقی کی بنیاد اور قومی ترقی و اقتدار کا اصلی ذریعہ ہے دوسروں کی مدد کے نتائج عموماً کمزور ہو کر رہتے ہیں لیکن ذاتی مدد سے انسان کو کافی تقویت حاصل ہوتی ہے، اشخاص یا گروہوں کا کام دوسرے انجام دیں تو اس سے ان کے دماغوں سے خود اعانتی کا جو ش اور اس کی ضرورت کا احساس جاتا رہتا ہے۔ اور جب کبھی اشخاص کسی رہنما یا حکومت پر کامل اعتماد کر لیتے ہیں تو اس صورت میں ان کا یہ طرز عمل انھیں بالکل بے بس بنا دیتا ہے۔

بہترین ادارے یا دستور بھی انسان کو علی مدد نہیں دے سکتے ان سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ صرف یہ ہو کہ وہ انسان کو اس کی فلاح و بہبود کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دیں لیکن ہر زمانہ میں لوگ اس بات کو تسلیم کرتے آئے ہیں کہ مرفہ الحالی اور عیش و آرام ذاتی کوشش سے نہیں بلکہ اداروں کے ذریعہ حاصل کیا جائے اور یہی ہے کہ قانون ساز مجلوں کو انسانی ترقی اور بہبودی کا بڑا ذریعہ خیال کر کے انھیں سب سے افضل و اعلیٰ سمجھا جاتا ہے تین یا پانچ برس میں ایک آدمہ دفعہ ایک یا دو اشخاص کسی سلسلہ کی نسبت رلے دینے سے خواہ وہ کسی ہی دین یا مذہب سے دیکھے قوم کی بھلائی ہو سکتی ہے۔ اس سے کسی شخص کی زندگی اور سیرت پر بہت تھوڑا اعلیٰ اثر پڑ سکتا ہے۔ نیز یہ بات دن بدن روز روشن کی طرح واضح ہوتی جا رہی ہے کہ حکومت کا کام انسانی اور علی نہیں بلکہ انسانی اور مبالغہ ہے اور وہ انسانی جان و مال اور آزادی کی حفاظت ہے قوانین کا نفاذ اور عذر آمد اگر دشمنی سے

ہو تو اس سے انسانوں کو اپنی دماغی یا جسمانی محنت کے ثمرہ سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ لوگ کسی قدر ذاتی اشیاء سے بھی کام لیں لیکن محنت ترین اور اچھا کرنے والے قوانین میں ایک کابل کو معافی، صرف کو کفایت شعار۔ یا شرابی کو پھر ہینرگار نہیں بنا سکتے۔ یہ باتیں انفرادی کوشش کفایت شعاری اور غیرت سے حاصل ہو سکتی ہیں نیز ان کے لئے صفات ستودہ کی ضرورت ہے نہ کہ اعلیٰ حقوق و اقتدار کی۔

کسی قوم کی حکومت ہمیشہ ان افراد کا عکس ہوتی ہے جن پر وہ حکم ران ہوتی ہے جو حکومت اپنی رعایا تہذیب و شائستگی میں اعلیٰ ہوگی وہ مجبوراً کچھ کچھ رعایا ہی کی سطح پر آجائے گی اور جو حکومت اپنی رعایا سے پیچھے ہو وہ آخر کار ترقی کی دوڑ میں رعایا کے دوش بدوش چلنے پر مجبور ہو جاتی ہے یہ ایک قانون فطرت ہے کہ قوم کا مجموعی کردار جس قسم کا ہو قانون اور حکومت بھی اس کے موافق ہوتے ہیں جس طرح کہ پانی اپنی چٹان سے آجاتا ہے۔ شریف انسانوں (عمدہ رعایا) پر شریفانہ اور بدکرداروں و جاہلوں پر غیر تہذیب طریقہ سے حکومت ہو سکتی ہے حقیقت میں تجربوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی سلطنت کی قوت اور قدر و منزلت کا انحصار اسکی حکومت کے عمدہ ہونے پر نہیں بلکہ اس کے افراد کے کردار اور تہذیب پر ہوتا ہے کیونکہ قوم محض انفرادی اوصاف کا مجموعہ ہے اور قوم کی تہذیب و حقیقت ان مرد و عورت اور اطفال کی ذاتی ترقی کا مسئلہ ہے جن سے کہ قوم بنتی ہے جس طرح قومی منزل انفرادی کا ہی خود غرضی اور برائیوں کا مجموعہ ہے اسی طرح قومی ترقی شخصی محنت و غرت، ہمدردی و استقامت کا نتیجہ ہے جن امور کو ہم اہم تمدنی تقاضے کے نام سے موسوم کرتے ہیں ان کے متعلق اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ محض انسان ہی کی آوازیں اور گراہیوں کا نتیجہ ہیں اور اگرچہ کہ ان کو نیست نابود کرنے اور ان کی بکری کئی کی جدوجہد کی جاسکتی ہے تاہم جب تک شخصی زندگی اور کردار بنیاد خود رو بہ اصلاح نہ ہو جائے برائیاں دوبارہ تازہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتی رہیں گی اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کی حب الوطنی اور انسانی ہمدردی کا انحصار قوانین کے تغیر و تبدیل اور اداروں کی ترمیم و اصلاح پر اس قدر نہیں ہے جس قدر کہ انسانوں کو ان کی ذاتی اور آزادانہ کوشش سے اعلیٰ مدارج کے حصول اور ترقی کا جوش دلانے اور ان کی مدد کرنے پر ہے۔

یہ بات کہ انسان پر خارجی حکومت کس طرح ہوتی ہے بہت کم اہمیت رکھتی ہے کیونکہ ہر چیز کا انحصار اس پر ہے کہ انسان اپنی قوتوں کے ذریعہ خود پر کس طرح حکومت کرتا ہے سب سے بڑا غلام وہ نہیں ہے جو کسی مطلق العنان اور ناخدا ترس بادشاہ کا محکوم ہو گو یہ جرم بڑا ہے بلکہ وہ شخص غلام ہے جو اپنی بد اخلاقی خود غرضی یا جہالت اور شریر نفسی کا غلام ہو وہ اقوام جن کے دل اس طرح غلام بن گئے ہیں وہ محض عمدہ دستوروں یا عمدہ قومی انتظام سے آزادی حاصل نہیں کر سکتیں اور جب تک یہ غلامانہ ذہنیت کہ ہماری آزادی

بلکہ بہتر حکومت پر منحصر ہے دور نہ ہو اس وقت تک حکومت کے عہدہ انتظام سے خواہ کچھ ترقی ہی محنت کا نتیجہ کیوں نہ ہو ویسے ہی غیر موثر اور غیر سودمند نتائج پیدا ہوں گے جیسے کہ سیمائی جلوے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ نیز اس قسم کے نتائج کا رتبہ فائوس خیال سے زیادہ نہ ہو گا آزادی کی استوار بنیادوں کا انحصار انفرادی کردار پر ہونا چاہیئے کیونکہ یہی تمدن و معاشرت اور قومی ترقی کا محافظ اور نسیل ہے جان اسٹوارٹ مل کا یہ قول صحیح ہے کہ ”ظالم اور خود مختار حکومت بھی اگر اس کی رعایا میں شخصی ترقی اور اصلاح کی صلاحیت موجود ہو تو اپنے فسیح اثرات پیدا نہیں کر سکتی اور جو چیز شخصی ترقی کو دبا دیتی ہے وہ حقیقت وہی خود مختار اور ظالم حکومت ہے خواہ وہ کسی نام سے موسوم کی جائے۔“

انسانی ترقی کے متعلق لوگوں کے خیالات مختلف رہے ہیں بعض لوگ خضر جیسی تہوں کو دھونڈتے ہیں اور بعض قومیت اور قوانین پارلیمنٹ کے خواہاں ہیں یعنی ایسی فیاض حکومت کے خواہشمند ہیں جو ہمارے سب کام کرے ہمیں خضروں کا انتظار کرنا ہے اور جب وہ مل جائیں تو ”خوش نصیب ہیں وہ تو گے جو ان کو پہچان کر ان کی تقلید کریں“ اس اصول کا مختصر مطلب یہ ہے کہ ہر چیز رعایا کے لیے کی جائے رعایا خود کچھ نہ کہے یہ ایسا اصول ہے کہ اگر اس کو ہمارا رہنا اور ہادی تصور کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ قوم کی آزادی و ذہنیت کو برباد کر کے انسان پرست بنا دے گا خضر کی پرورش انسانی پرستش کی بدترین شکل ہے اور حقیقت میں ایسا ہونا محض قوت کی پرستش ہے نیز اس کے اثرات دماغ انسانی کو ایسا ہی حقیر بنا دیتے ہیں جیسا کہ دولت کی پرستاری سے وہ خوار و ذلیل ہو جاتا ہے ایک بہتر اور سچا اصول جس کی اقوام کو تعلیم و یکجہتی ہے اور جس سے دنیا کی مغرور قوموں نے غرت پائی ہے وہ اصول خود اعانتی ہے اور جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے عملی جامہ پہنائیں گے۔ خضر کو ڈھونڈنا بھول جائیں گے اور دن پر عبور و سہ اور اپنی مدد آپ یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور دکر ہو گونے قلم اور سیف کے متعلق اپنی جولائے ظاہر کی ہے کہ سہ زبان سلم سیف پر ہوگی غالب۔ ان ہر دو اصول پر عملی مجتبہ منطبق ہوتی ہے اور اس سے ہم یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ ہمیں خود اعانتی کے اصول کو اپنا مطمح نظر اور نصب العین بنانا چاہیئے کیونکہ ذاتی مدد اوروں کی مدد پر غالب آتی ہے۔

قوموں اور پارلیمنٹ کے قوانین کی قوت بھی ایک SUPERSTITION ہے آئرلینڈ کے ایک سچے محب وطن ولیم ڈارگن نے ڈہلن کی پہلی صنعتی نمائش کے موقع پر جو کچھ کہا اس کا ذکر اس موقع پر مناسب ہے اس نے کہا کہ ”سچ تو یہ ہے کہ جب کبھی میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں میرا وطن اور میرے ہم وطن مجھے فوراً یاد آتے ہیں ہم اپنی آزادی کی نسبت بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں مگر میرے دل میں

قومی یقین ہے کہ ہماری صنعتی آزادی ہمارے ہی اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کیے جائیں اور اپنی قوتوں کو بجا طور پر استعمال کریں تو اس سے بہتر کوئی موقع ہماری آئندہ بہتری کے لیے نہیں ہے استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے اگر ہم دلی جوش اور محنت سے کام کیے جائیں تو مجھے کامل یقین ہے کہ تھوڑے زمانہ میں ہماری حالت بھی ایک اچھی قوم کی مانند ہو جائے گی اور ہم شیش آراء خوشی اور آزادی سے مستفید ہوں گے۔

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی تمام قومیں کئی نسلوں کے تجربوں اور کارناموں سے بنی ہیں مستقل مزاج اور محنتی مزدوروں۔ باہمت کاشت کاروں کا نکلنا موجود۔ صناعات جبرئیل سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ وروں شاعروں حکیموں فلسفیوں اور مدبروں نے اپنے اپنے پیشہ کی حد تک اقوام کے بنانے میں حصہ لیا ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی اور اس کو اعلیٰ مدارج تک پہنچایا ہے ان شریف کاریگروں نے تہذیب و شائستگی کے معیاروں کی مسلسل محنت نے صنعت سائنس اور فنون میں بے ترتیبی کو دور کر کے ایک تنظیم پیدا کر دی اور رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس بے ہوا جائداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے آبا و اجداد نے اپنی ہوشیاری اور محنت سے مہیا کی تھی یہ جائداد ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل ماہر گنج اس کی حفاظت ہی کیا کریں بلکہ اس سے مستفید ہوں اور اپنی کوشش سے اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جائیں۔

انگریزوں کو جو اس قدر ترقی ہوئی اس کا سبب صرف یہ ہے کہ خود اعانتی کا جوش ہرزانیہ ان کے قومی کردار کی ایک نمایاں خصوصیت رہا ہے اور اس سے ان کے قومی اقتدار کا اندازہ ہوتا ہے۔ انگریزوں میں ہرزانیہ میں چند افراد ایسے پیدا ہوتے رہے ہیں جو عوام کے طبقہ سے بلند تر رہتے تھے اور عوام انھیں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن انکی ترقی میں ہزاروں معمولی اور غیر معروف ہستیوں کے کارناموں کو بڑا دخل رہا ہے۔ گو کسی لڑائی کی تاریخ میں صرف یہ سالاروں کے نام قابل یادگار ہو سکتے ہیں تاہم ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ فتوحات اکثر افراد ہی کی جرأت و ولادری کی بدولت حاصل ہوئی ہیں زندگی بھی ایک ”پامیانہ جنگ ہے“ ہرزانیہ میں عام لوگ ہی بڑے بڑے کام انجام دیے ہیں جس طرح بہت سے خوش نصیب اور زبردست مہتیوں کے نام سوانح عمری میں بچ ہو چکے ہیں اسی طرح اکثر ایسے لوگوں کے حالات زندگی جن کا تہذیب و ترقی انسانی پر نہایت گہرا اثر پڑا ہے ضبط تحریر میں نہیں آئے۔ ادنیٰ ترین انسان کی زندگی کا بھی جو اپنے ہم جنسوں کے سامنے محنت

سجیدگی بے لوثی و ایمانداری کی نظیر پیش کرتا ہے ملک کی خوش حالی پر زمانہ موجودہ مستقبل میں اثر پڑتا ہے کیونکہ اس کی زندگی اور چال چلن کا اثر غیر معلوم طور پر دوسروں پر بہت پڑتا ہے اور آئندہ نسل کے لیے ایک اچھی نظیر قائم ہو جاتی ہے۔

روزمرہ کا تجربہ بتاتا ہے کہ شخصی کردار سے دوسروں کی زندگی اور چال چلن پر قوی اثر پڑتا ہے اور حقیقت میں یہی بہترین علمی تعلیم ہے اور جب ہم اس کا علمی تعلیم سے مقابلہ کریں تو مکتب و مدرسہ اور مدرستہ العلوم کی تعلیم محض ابتدائی تعلیم معلوم ہوتی ہے زندگی کے علم کا جس کو انگریزی میں مائف ایجوکیشن کہتے ہیں۔ قوم اور انسانوں پر بہت زیادہ اثر ہوتا ہے مکتب و مدرسہ کا علم طاق یا صندوق یا کسی بڑے کتب خانے اور الماری میں رکھا ہوا ہوتا ہے مگر زندگی کے برتاؤ کا علم ہر وقت دوست سے ملنے، گھر کی بود و باش، شہر کے کوچوں میں پھرنے، حلاقہ کی دوکان کرنے، بل جوستے بکلوں کے کارخانوں اور پارچہ بانی کے مقامات پر اپنے ساتھ ہی ہوتا ہے یہی وہ مکمل اور موثر تعلیم ہے جس کو شکر نے ”نسل انسانی کی تعلیم کے نام سے موسوم کیا ہے اور جو محنت، اخلاق، خود تربیتی اور نفس کشی پر مشتمل ہے۔ اسی قسم کی تعلیم سے انسان انسان بنتا ہے اور اس کی صحیح تربیت ہونے سے وہ اپنے کاروبار اور فرائض زندگی کو صحیح طریقہ پر انجام دیتا ہے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور اپنی عاقبت کو سنوارنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہ تعلیم کتابوں سے حاصل ہو سکتی ہے اور انسان اس کو کسی علمی تحصیل سے حاصل کر سکتا ہے لارڈ میکن کا نہایت عمدہ قول ہے کہ ”علم سے عمل نہیں آ جاتا علم کو عمل میں لانا علم کی دسترس سے باہر ہے مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست کرتا اور اس کو عالم یا عمل بنادیتا ہے یہ رلے علی زندگی اور داعی تربیت پر ٹھیک طبع پر صادق آتی ہے کیونکہ تجربہ شاد ہے کہ انسان خود کو بہ نسبت تعلیم کے عمل کے ذریعہ زیادہ کامل بنا سکتا ہے اور علم کی بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ کردار آدمی کو زیادہ مستند بنادیتا ہے۔

بڑے اور خصوصاً اچھے آدمیوں کی سوانح عمریاں نہایت کارآمد اور سبق آموز ہوتی ہیں کیونکہ ان کے مطالعہ سے دوسروں کو کافی مدد حاصل ہوتی ہے اور وہ محمل۔ اور رہبر کا کام دیتی ہیں۔ بعض بہترین سوانح عمریاں قریب قریب الہامی کتابوں کے مساوی ہیں جن میں ہم کو اعلیٰ زندگی، بلند خیالی اور ذاتی اور دنیاوی مفاد کے لیے بوجہ عمل کا سبق ملتا ہے۔ خود اعانتی کی قوت، مستقل غم، عمل اور دیانت داری کی جو مفید مثالیں یہ سوانح عمریاں پیش کرتی ہیں اور جن سے شریفانہ اور مردانہ اخلاق یا کردار کے بنائے میں مدد ملتی ہے ان سے واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ہر انسان میں اس کے ذاتی مفاد کی کوشش کی کس قدر قوت موجود ہے نیز یہ کہ خود اعتمادی اور خود ماری سے ادنیٰ انسان بھی دوامی اور غیر فانی شہرت

اور عزت و آرام حاصل کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

بڑے بڑے ماہران سائنس - انشا پر دامن کار - زبردست پیروان مسیح اور مسیحیہ گار کسی باقی یا اعلیٰ جماعت سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ درس گاہوں - کارخانوں - گوداموں وغیرہ کے جھونپڑوں اور املاک محلوں سے ہی پیدا ہوئے مسیح کے بعض زبردست پیرو معمولی لوگوں میں سے تھے بعض اوقات غریب ہی نے اعلیٰ مناصب و مراتب حاصل کئے ہیں۔ ناقابل عبور دشواریاں بھی انکی راہ میں روڑے اٹھا نہ سکیں بلکہ یہی دشواریاں اکثر موقعوں پر ان کے مدد و معاون ثابت ہوئی ہیں نیز ان سے ان کے قوت عمل اور غم کو تقویت حاصل ہوئی اور ان کی وہ قابلیت یا ذاتی جوہر جو بصورت ثانی پوشیدہ اور بیکار رہتے ظاہر ہو سکے اس قسم کے مخلوق پر کردہ موانعات اور محصلہ کامیابیوں کی مثالیں حقیقت میں اس قدر ہیں کہ ان سے مندرجہ ذیل خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔

بہر کارے کہ ہمت بستہ گرود اگر خارے بود گلہ ستہ گرود

مثال کے طور پر اس مشہور واقعہ کو لیجئے۔ دنیا کا ایک زبردست شاعر و پادری جرمی میلر۔ سوت کاتنے کے آلے کا موجد اور صنعت کپاس کا بانی سر چرڈ آرک ریٹ۔ انگلستان کا ایک مشہور میجر جس عدالت لارڈ منسٹر ڈن اور زبردست مصور ٹریزیسب اشخاص ایکٹائی کی دکان سے اٹھے تھے کسی کو اس بات کا یقینی علم نہیں کہ فلکپیروں کون تھا لیکن یہ امر ناقابل بحث ہے کہ وہ ایک اونٹنے درجہ کا آدمی تھا اس کا باپ ایک نقاب اور چرواہا تھا۔ فلکپیروں کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ابتدائی حصہ یعنی بچپن میں اُون صاف کرنے کا کام کیا کرتا تھا لیکن بعض لوگوں کو اس خیال سے اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک مدرسہ کا ملازم تھا اور بعد میں کسی ساہوکار کا منشی مقرر ہوا حقیقت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلکپیروں صرف ایک کام نہیں کرتا بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں حصہ لیتا رہا۔ ایک مصنف جو مندر اور اس کے تعلقات پر لکھا کرتا تھا۔ فلکپیروں کے بحری صلاحات کی خوبی و جہنگلی کی بنا پر اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ فلکپیروں در ایک ملاح رہا ہوگا اسی طرح ایک پادری اس کی تصانیف کے داخلی ثبوت سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ غالباً وہ کسی پادری کا منشی تھا گھوڑوں کے گوشت کے ایک مشہور ماہر کا خیال ہے کہ وہ تاجرا سپ ہوگا۔ فلکپیروں نقیٹا ایک تاجرا تھا اور دوران زندگی میں اس نے ”کئی کھیل کھیلے“ اور وسیع تجربہ اور شاہدہ سے اپنی عجیب و غریب قات اور معلومات میں اضافہ کیا۔ بہر حال وہ ایک شوقین طالب علم اور بلا کا جفاکش اور محنتی لڑکا تھا۔ انگریزوں کے کردار کو نبھانے میں اس کی تصانیف آج تک زبردست حصہ لیتی چلی آرہی ہیں۔

انجینئر بن گئے۔ ناخدا الگ اور شاہ عرب بن ادا نے مزدوروں ہی سے پیدا ہوئے ہیں۔ معائنہ جانسن پر فخر و مہابت کر سکتے ہیں جو لنکسن ان کی عمارت پر ماتھے میں تھاپی اور جیب میں کتب رکھے ہوئے کام کیا کرتا تھا۔ اڈورڈ اور ڈیٹا فورڈ انجینئر ہیو ملر باہر ارضیات اور لائن کننگھم مصنف ونگ تراش بھی مولیٰ انسانوں میں سے تھے مشہور نجاروں میں ہم اینگو جونس معمار۔ ہیلین CHRONOME-MAKER جان ہنٹر باہر فعلیات، روہنے اور اوپٹی مصور، پروفیسر لی متشرق اور جان بسن برٹ کے نام پاتے ہیں۔ سمن ریاضی داں۔ لیکن نگ تراش۔ آڈم واکر۔ جان فاسٹر ولسن ماہر علم طیور۔ ڈاکٹر لیونگ اسٹون مشنری سیاح اور ڈیٹا ہل شاہو جلاہوں کے طبقے سے ہوئے ہیں۔ سکرلوڈ مسلی شاول زبردست امیر البحر، اسٹرنجن ماہر علم برق۔ سیامیول ڈرو مضمون نگار۔ گفرڈ مدیر رسالہ "کوآرٹری ریویو" بلوم فیلڈ شاعر اور ولیم کیلے مشنری کفش و زوں کی جماعت سے تھے اور جفاکش مشنری مارین بھی جو تو ان کے سانچے بنایا کرتا تھا۔ گزشتہ چند سال میں تھا مس اڈورڈ نامی ایک مشہور ماہر علوم طبیعیہ کے متعلق یہ دریافت ہوا ہے کہ وہ ایک کفش دوز تھا اور کفش دوزی کا پیشہ اختیار کر کے ان سے اپنی بساوقا کی۔ اس نے اپنا فرصت کا وقت علوم طبیعیہ کی تمام شاخوں کے مطالعہ کے لیے وقف کر رکھا تھا اس کا نظم البدل اس کو یہ ملا کہ جس زمانہ میں وہ چھوٹے گھونگوں کی تحقیقات میں معروف رہتا تھا۔ اس نے ایک نئی چسپنہ دریافت کی جس کو ماہران علوم طبیعیہ نے "پرانزا اڈورڈوزی" کے نام سے موسوم کیا ہے خیالوں کے گروہ سے بھی بہت سے آدمی شہرت حاصل کئے ہیں۔ جان اسٹو سوڈخ نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ خیاطی میں گزارا جیسا کن مصور سن شعور کو پہنچنے تک ایک خیاط کا کام کیا کرتا تھا۔ جانیا سر جان ہاکس وڈ جس نے پائرسس کی لڑائی کے موقع پر بڑی شہرت حاصل کی اور جس کو جرات و بہادری کے صلہ میں اڈورڈ سوم نے نائٹ کا خطاب عطا کیا۔ ابتدا میں ایک خیاط کے ناں بطور کارآمد کام کیا کرتا تھا۔ امیر البحر لاسن بھی جس نے سنٹائی میں بہ مقام وگو BOOM کو توڑا تھا خیاطی کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ بمقام جزیرہ ویٹ بان چرچ کے قریب وہ ایک خیاط کے پاس کام کر رہا تھا یکایک موضع میں یہ خبر پھیلی کہ جنگی جہازوں کا ایک بڑا ایک دور دراز کے سفر پر جانے والا ہے یہ سنتے ہی وہ دوکان سے نکلا اور جہازوں کا شاندار منظر دیکھنے کی غرض سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ساحل پر پہنچا۔ اچانک اس کے دل میں طالع خیر کا خیال پیدا ہوا وہ کشتی میں بیٹھ کر بیڑے کا رخ کیا اور امیر البحر کے جہاز پر پہنچ کر بطور رضا کار ملازم ہو گیا کئی سال بعد نہایت اغزاز کے ساتھ وطن واپس ہو کر اسی مکان میں تناول طعام کیا جہاں کہ کسی زمانے میں وہ حیثیت کارآمد آموز رہ چکا تھا۔ لیکن سب سے بڑا خیاط بلاشبہ اینڈریو جانسن موجودہ صدی دشین

ممالک متحدہ ہے وہ ایک غیر معمولی کردار اور داغی قابلیت کا آدمی ہے۔ یہ تمام ڈانگٹن جس وقت اس نے یہ بیان کیا کہ اس نے اپنی سیاسی زندگی حاکم شہر کی خدمت سے شروع کی اور وضع قوانین کے جملہ شعبوں پر حاوی ہو گیا حاضرین میں سے کسی نے چلا کر کہا کہ ”تم نے درزی کے درجہ سے ترقی کی“ اس وقت بائسن کا قابل تعریف طرز عمل یہ رہا کہ اس نے اس ہجو کا مطلق اثر نہ لیا بلکہ اس طرح جواب دیا کہ۔ ایک صاحب کہتے ہیں کہ میں ایک خیاط تھا یہ امر میرے لئے باعث تکلیف و پریشانی نہیں۔ کیونکہ جس وقت میں حیثیت خیاط کام کرتا تھا تو مجھے ایک اچھا کام کرنے والے خیاط کی شہرت حاصل تھی میں ہمیشہ اپنے گاہکوں کا کام وقت کی پابندی کے ساتھ کیا کرتا تھا۔“

کارڈنل اولرے۔ ڈیفو۔ اکن یڈ اور کرکویٹ بھی قصا بول کے لڑکے تھے نہیں ایک ٹین گر یعنی کیرا اور جوزف لٹکاسٹر ایک BASKETMAKER تھا۔ بخاری انجن کی ایجاد سے متعلق جو بڑے نام مشہور ہیں وہ نیو کوفن واٹ اور اسٹیفن کے ہیں ان میں سے اول الذکر ایک آئنگلند دوسرے آلات ریختی بنانے والا اور آخر الذکر ایک انجن کا خلاصی تھا۔ ہیننگڈن و اعطامل میں کوئلہ ڈھویا کرتا تھا اور بیوک جو چوبی کندہ کاری کا موجد ہے ایک کوئلے کی کان میں کام کرتا تھا۔ ڈاڈلے ایک چپراسی اور بال کرافٹ ایک سائیس تھا۔ بافن ناخدا کی بحری زندگی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ پہلے پہل وہ محافظ متول مقرر کیا گیا اور سرکلوڈسلی شاول جہاز کے کرہ کا دربان تھا۔ ہر چل کسی فوجی بیاند کاتے نواز تھا اور چانٹری گشت لگا کر کندہ کاری کیا کرتا اور اٹنی ایک گشتی طبع A JOURNEYMAN PRIN تھا سر تھامس لارنس شراب خانہ کے ایک محافظ کا بیٹا تھا۔ میکائل خراٹے ایک آہن گر کا لڑکا ابتدا میں ۲۲ سال کی عمر تک ایک صحافی کے پاس حیثیت کا رٹنور کام کرتا رہا اس وقت وہ سب سے زبردست فلسفی مانا جاتا ہے اور علم طبیات کے پیچیدہ اور مشکل مسائل و سخت کنی تشریح اور وضاحت میں اس کو اپنے استاد پر بھی فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ ان اشخاص میں جنہوں نے علم ہیئت کو ترقی دی ہم پولینڈ کے ایک نان بانی کے لڑکے کو پیکس جرمنی کے مسافر خانہ کے محافظ کے لڑکے کیسلر۔ ڈمی البرٹ جو لاڈاری ٹکی حالت میں پیرس کے سنٹ جین لی راک نامی گرجا کی پیریمیون پر موسم سرما کی ایک شب بڑا پایا گیا اور جس کو ایک چرواہے کی عورت نے پرورش کیا اور نیوٹن اور لاپیس کو پاتے ہیں۔ نیوٹن گراں تہم کے ایک معمولی آدمی کا لڑکا اور لاپیس بیومنٹ کے ایک غریب کن کا بیٹا تھا۔

ان مشہور اشخاص نے اپنی زندگیوں میں مخالف اور غیر موزوں ماحول کے باوجود اپنی فہم و فراست ایسی غیر فانی اور دایم شہرت حاصل کی جو دنیا کی ساری دولت کے بدلے میں بھی حاصل نہیں کی جاسکتی تھی

حقیقت میں ان اشخاص کی ترقی میں ان کے اور نے ماحول سے بھی زیادہ دولت ہی کے سدھار اور مانع و مزاحم ہونے کا امکان تھا۔ ماہر علم ہیئت و ریاضی لیا گریج کا باپ ٹیورن میں جنگی خزانچی کی خدمت پر مامور تھا لیکن SPECULATIONS سے تباہ ہونے کی وجہ اس کا خاندان اتہار درجہ کی مفلسی میں گرفتار ہو گیا۔ لیا گریج نے بعد چل کر اسی واقعہ کو اپنی شہرت و کامیابی کا بڑا سبب قرار دیا ہے وہ کہا کرتا تھا کہ ”اگر میں دولت مند ہوتا تو غالباً ایک ریاضی داں نہ بنتا“

لیا گریج انگلستان میں ایسے پادریوں اور مذہبی رہبروں کی مثالیں بھی موجود ہیں جن کے لڑکوں نے خاص شہرت حاصل کی۔ ان میں ہم ڈریک اور سن جنھوں نے بحری جنگوں میں ناموری حاصل کی سائنس دان اولاسٹن - نیگ - پلے فیئر اور بل - حسن کاری میں سن - رینالڈس ولسن اور ولکی، قانون دان ٹھیسر لو اور کیا مپ بل اور ادبیات میں اوسین، تھامسن - گولڈ اسمتھ - کورج اور ڈینی سن کے نام پاتے ہیں۔ لارڈ ہارنگ کزنل اڈورڈز اور میجر ہارڈسن بھی جنھیں ہندوستانی جنگوں میں بڑی ناموری حاصل ہوئی پادریوں کے لڑکے تھے حقیقت میں ہندوستان میں برطانیہ کو جو حکومت حاصل ہوئی اور برقرار رہی وہ حاصل کرنا بیہوش واران ہینرنگ اور اس کے جانشینوں جیسے اوسط طبقہ کے اشخاص ہی کا طفیل تھا یہ وہ لوگ تھے جن کی پرورش کارخانوں میں ہوئی اور زندگی کا روبرو میں بسر ہوئی۔

وکلہ کے لڑکوں میں ہم اڈمنڈ برک - انجینئر اسمیٹن - اسکاٹ اور ڈس ورتمہ - لارڈ سومرس ہارڈوک اور ڈن نیگ کو پاتے ہیں۔ سر ولیم ہالاک اسٹون ایک ریٹیم فروش کا بیٹا تھا جس کی ولادت اس کے باپ کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔ لارڈ گفرڈ کا باپ ڈور کا ایک کرانہ فروش لارڈ ڈنہم کا باپ ایک طبیب یا دوا فروش نصف ٹالفرڈ کا باپ ایک دیہی شراب فروش اور لارڈ چیف بیرن پالک کا باپ چیرنگ کر اس کا ایک مشہور زین ساز تھا۔ آٹارنیو کا محقق لیا رڈ LAYARD لندن میں کسی وکیل کے دفتر کا نشی تھا اور سر ولیم آرم اسٹرانگ موجد HYDRAULIC MACHINERY بمبئی کچھ عرصہ وکالت کرتا رہا ملٹن لندن کے کسی ساہوکار کا بیٹا تھا اور پوپ اور سودے اونی پارچہ فروشوں کے بیٹے تھے۔ پروفیسر ولسن پیری کے ایک دستکار کا بیٹا اور لارڈ اسکالے ایک آفریقی تاجر کا بیٹا تھا۔ کیٹس ایکٹ دوا فروش تھا اور سر ممفری ڈیوی ایک دوا فروش کا شاگرد تھا۔ ڈیوی نے اپنے متعلق ایک مہذبہ کہا میری موجودہ حیثیت خود میری ذاتی کوشش کا نتیجہ ہے۔“

نیچول سٹری کے ماہر جہڑا اوون کی زندگی ایک ادنیٰ جہازی کے درجہ سے شروع ہوئی تھی اس نے اپنے وہ سائنٹیفک تحقیقات جن پر اس کی موجودہ شہرت کی اساس قائم ہوئی عرصہ سیدہ ہونے کے بعد شروع

۱۲ کی تھی جس وقت وہ اس شاندار عجائب خانہ کی فہرست کی ترتیب میں جس کو جان ہنٹر نے بڑی جدوجہد فراہم کیا تھا مصروف تھا اسی وقت اس نے اپنی زبردست قابلیت کی بنیاد قائم کی اس کام میں وہ تقریباً دس سال تک بہ مقام جنرل کلج مشغول رہا۔

تاریخ اٹلان کی طرح دیگر ممالک کی تاریخ میں بھی ایسے لوگوں کی صدائیں ملیں گی جنہوں نے اپنی ذاتی محنت اور فہم و فراست سے مفلسی پر غلبہ حاصل کیا تھا جن کا روں میں ہم کلاؤ ایک باورچی کے بیٹے اور جیفیس ایک ناک بان کی بیٹے کو پاتے ہیں۔ لیو پو لڈ رابرٹ ایک گھڑی ساز کا اور ہیڈن ایک پھیلے بنانے والے کا بیٹا تھا۔ ٹاگبری کسی تماشہ گاہ کا ایک مصور مناظر تھا گری گویر فٹم کا باپ ایک نجاریکسٹن پنجم کا باپ ایک چروانا اور اورین ششم کا باپ ایک غریب ملاح تھا بچپن میں جب اورین کو پڑھنے کے لیے چراغ میر نہ تھا سڑکوں اور گر جاؤں کے کچراغوں کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے اسباق یاد کیا کرتا تھا اس سے اس کی اُس محنت تحمل اور شوق کا پتہ چلتا ہے جو اس کی آئندہ شہرت و ترقی کا پیش خیمہ ہے اسی طرح مندرجہ ذیل اشخاص بھی ادنیٰ درجہ کے آدمی تھے۔

۸۸ ماہر معدنیات ہے (۸۸۷۲) سنٹ جٹ کے ایک جلاہے کا بیٹا تھا کل سارا مانی ہوئے آرمین کے ایک نان بان کا بیٹا تھا۔ ریاضی داں جوزف فوریر آکیر کے ایک خیال کا بیٹا تھا۔ معمار ڈیوژنڈرس کے ایک کشت و زک کا بیٹا تھا اور ماہر علوم طبیعیہ جبرز وچ کے ایک دباغ کا بیٹا تھا جس نے اپنی زندگی مفلسی علالت اور خانگی افکارات و مصائب سے شروع کی تھی لیکن ان میں سے کوئی چیز اس کی ہمت کو متزلزل اور اس کی ترقی کو روک نہ سکی۔ اس کی زندگی حقیقت میں اُس مقولہ کی صداقت کی ایک عمدہ مثال ہے کہ ”جن لوگوں کو بہت کچھ کرنا ہے اور جو محنت کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے وقت بہت ہے۔“ پیری رامس بھی اسی قسم کا آدمی تھا وہ مفلس والدین کا بیٹا تھا بچپن میں اس کو بھیلوں کی نگرانی پر مقرر کیا گیا تھا لیکن اس کام سے ناراض ہو کر وہ پیرس چلا گیا۔ بڑی دشواری کے بعد ناویر کلج میں بحیثیت ملازم داخل ہو گیا اس ملازمت سے اس کے لیے تحصیل علم کی راہ کھل گئی اور بہت قلیل عرصہ میں وہ اپنے زمانہ کا ایک نہایت مشہور شخص ثابت ہوا۔

دیاکولن دوافر ویش ایک کان کا بیٹا تھا بچپن میں جس وقت وہ مدرسہ میں پڑھتا تھا گو اس کے جسم پر معمولی کپڑے رہتے تھے لیکن اس کے چہرے پر فہم و فراست اور اعلیٰ قابلیت کے آثار نمایاں تھے اس کا استاد جس نے اسے نوشت و خواند سکھایا اس کی جفاکشی اور غلی شوق کی توصیف کرتے وقت کہا کرتا تھا ”میرے پیاسے لڑکے محنت کیے جاؤ۔ کالمن محنت سے پڑھو ایک روز تم بھی ایسا ہی لباس زیب تن کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ جیسا کہ دار و فخر گربا پہنا کرتا ہے۔“ ایک دیہی دوافر ویش نے جس کو مدرسہ میں جانے کا اتفاق

ہوا کالین کو دیکھ کر اس کے توانا قوی کی تعریف کی اور اپنے محل LABORATORY میں ادویات کو ٹھنڈے پر ملازم رکھنے کی خواہش ظاہر کی جس پر ویاٹکولن اس امید سے کہ اس کو ویاٹکولن کی تعلیم جاری رکھنے کا موقعہ ملے گا رضی ہو گیا دو فروش اس کو کچھ وقت تعلیم میں صرف کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اس لیے وہ فوراً ملازمت ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس طرح سینٹ اینڈرسے کو خیر باد کہہ کر اپنا اسباب اپنی پیٹھ پر لیے ہوئے اس نے پیرس کی راہ لی۔ پیرس پہنچ کر اس نے کسی دو فروش کے ہاں نوکری کی تلاش کی لیکن ناکام رہا۔ ماندگی اور تہی دستی سے مجبور ہو کر بیمار پڑ گیا جس کی وجہ اس کو شفا خانہ پہنچا دیا گیا۔ یہاں ویاٹکولن کو موت کا یقین ہو گیا لیکن اس محتاج لڑکے کا مستقبل شاندار تھا اس لئے اس کو صحت حاصل ہوئی اس نے اور ایک بار نوکری کی تلاش کی اور آخر کار ایک دو فروش کے ہاں ملازم ہو گیا۔ چند روز بعد مشہور وواساز فورکر اسے اس لڑکے کا حال سنا اس کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوا اور اپنا معتمد خانگی بنالیا۔ کئی سال بعد فورکر نے کے اتھال پر ویاٹکولن بحیثیت پروفیسر کیمیا اس کا جانشین بن گیا آخر ۱۸۹۶ء میں ضلع کالونل LECTORS نے چیمبرکرفٹ ڈپوٹیس (مجلس ناہین) میں اس کو اپنا نمایندہ مقرر کیا اور وہ دوبارہ تہایت اعزاز کے ساتھ اپنے اس موضع میں داخل ہوا جس کو اس نے کئی سال پیشتر مفلسی اور گناہی کی حالت میں خیر باد کہا تھا ایسے اشخاص کی مثالیں جنہوں نے معمولی درجوں سے ترقی کر کے اعلیٰ فوجی مراتب و خدمات حاصل کیے فرانس میں انقلاب اولے کے زمانہ کے بعد سے بکثرت ملتی ہیں انگلستان میں ایسی نظیریں نہیں ملتیں۔ اگرچہ میرٹ اور بچی گردنے اپنی زندگیاں خانگی پامیوں کے درجہ سے شروع کیں۔ مگر کچھ وقت شاہی فوج میں ملازم تھا ولیمٹ کوٹون کی آرائی کیا کرتا تھا جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ اس ذریعہ سے وہ پیسہ پیدا کر کے وہ فوجی نامور کی کتابیں خریدنے کے قابل ہو جائے۔ ہمبرٹ بچپن میں بڑا کمزور اور بے چارہ لڑکا تھا سولہ سال کی عمر میں گھر سے بھاگ گیا اور باری باری سے ناسی کے ایک تاجر ایلائس کے ایک کاریگر اور ضرگوش کے چمڑوں کی تجارت کرنے والے ہالام رما۔ ۱۸۹۷ء میں بطور رضا کار فوج میں داخل ہوا اور ایک ہی سال میں فوج کا افسر بن گیا۔ کلی بڑا لائبریری سوپرٹ وکٹر لانس۔ سولٹ۔ ماسینا۔ سنٹ کیرٹوئی ایلن۔ میورٹ۔ اگر یو، بیرے اور نے کو معمولی درجوں سے ترقی حاصل ہوئی جو بعض صورتوں میں تیز اور بعض میں جھمی رہی۔ سنٹ کیرٹوٹول کے ایک دباغ کا بنایا تھا اس نے اپنی زندگی ایک تماشکار کی حیثیت سے شروع کی اس کے بعد جاسو کی فوج میں داخل ہوا اور ایک ہال کے اندر ترقی کر کے کپتان کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ وکٹر ڈک ڈی بلونو ۱۸۹۷ء میں توپ خانہ میں بھرتی ہوا۔ انقلاب فرانس کے پیشتر فوج سے برطرف کر دیا گیا تھا لیکن آغاز جنگ کے ساتھ ہی دوبارہ شامل ہوا اور چند ماہ کے عرصہ میں اپنی قابلیت اور بہادری کی وجہ اجیتا میجر اور افسر فوج کے عہدہ تک ترقی کر گیا۔ میورٹ پری گورڈ کے

ایک قصبہ کے مسافر خانہ کے محافظ کا بیٹا تھا اور غوروں کی حفاظت کیا کرتا تھا پہلے چار سو جنٹ میں بھرتی ہوا اور بعد دل حکمی کی علت میں برطرف ہوا لیکن دوبارہ بھرتی ہو کر تھوڑے عرصہ میں کرنل کے عہدہ تک پہنچ گئے اٹھارہ سال کی عمر میں حصار کی ایک جنٹ میں بھرتی ہوا اور رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ کیا لیرلی قابلیت دیکھ کر اس کو ”مفتی یا جاکش“ کا خطاب دیا اور پچیس سال کی عمر میں اجیٹ جنرل کے عہدے پر ترقی دی اس کے برخلاف سولٹ کو فوج میں بھرتی ہو کر عہدہ سر جنٹ تک پہنچے چار سال گزارا لیکن سولٹ کی ترقی ماسینا کی ترقی کی نسبت تین مرتبہ ماسینا کو سر جنٹ کے عہدہ تک پہنچنے سے قبل ۴۸ سال تک سپاہی کا کام کرنا پڑا اور گوبند میں کیے بعد دیگرے کرنل جنرل اور مارشل کے درجہ تک پہنچا اس نے کہا کہ سر جنٹ کی خدمت انجام دیتے وقت دیگر خدمات کے مقابلہ میں اس کو زیادہ محنت کرنی پڑی۔ فرانسیسی فوج کے کئی معمولی آدمی آج تک اسی قسم کی ترقیاں کرتے چلے آئے ہیں۔ چنگاریز سلسلہ ۱۸۵۷ء میں شاہی باڈی گارڈ میں بحیثیت خانگی ملازم کے شریک ہوا۔ مارشل بیو گارڈ کو چار سال معمولی خدمت انجام دینے کے بعد انری کا عہدہ ملا۔ فرانس کے موجودہ وزیر جنگ مارشل رائڈن کی زندگی ایک بیانیڈ نواز کے درجہ سے شروع ہوئی تھی۔ ور سے کی گیلری میں اس کی تصویر موجود ہے جس میں اس کا مات باجے پر رکھا ہوا ہے یہ تصویر خود اس کی خواہش پر تیار کی گئی تھی اس قسم کی مثالیں فرانسیسی سپاہیوں کو ان کے فرائض کی انجام دہی کیلئے جوش دلاتی ہیں کیونکہ ہر سپاہی محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی اپنی ذاتی محنت سے ایک بہ سالار بن سکتا ہے ایسے اشخاص کی مثالیں جو متعل کو کشش کے ذریعہ اونٹے درجوں سے ترقی کر کے اعلیٰ مناصب حاصل کیے اور سوکاسٹی کے لیے مفید ثابت ہوئے انگلستان اور دیگر ممالک میں اس قدر ملتی ہیں کہ ایک عرصہ انھیں ستنے تصور نہیں کیا جاتا ہے بعض قابل خور مثالوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مخالف واقعات اور دشمنیات کا ابتداء میں مردانہ وار مقابلہ ہی ترقی کی مقدم شرط ہے۔ برطانوی دارالعوام میں ہمیشہ ایسے خود ترقی یافتہ SELFRAISED اشخاص کی بڑی تعداد برسر کار رہی ہے ان اشخاص نے صنعتی نمایندوں کی حیثیت سے عہدہ خدمات انجام دیے اور مجلس وضع قوانین کا طفیل ہے کہ وہ ان کی وقت بوقت اور ان کا جزیر مقدم کیا گیا۔ سالغورڈ کے نمایندے یارکن جوزف براڈٹن آج بخانی نے TEN HOURS BILL پر بحث کرتے وقت جب ان مصائب و آلام کا جوش کے ساتھ تفصیلی ذکر کیا جن میں وہ ایک کپاس کی کرنی میں قلی کی حیثیت سے کام کرتے وقت قبلارہ چکا تھا نیز جب یہ کہا کہ اس نے اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اگر کبھی اس کو اقتدار حاصل ہو تو وہ مزدوروں کی اصلاح اور فلاح میں کوشش کرے گا جس میں گراںم فخر کھڑے ہو کر کہا کہ مجھے اب تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ مٹزر اور ٹن نے ایک اونٹے درجہ سے ترقی کی ہے

نیز یہ کہ اس واقعہ سے دارالعوام میں حمیس کو پہلے سے زیادہ باز ہو گیا تھا کہ ایک ادنیٰ درجہ سے ترقی کیا ہوا شخص ملک کے موروثی شرف اور امرائے دوش بدوش ساوی حیثیت سمیٹنے کے قابل ہو گیا۔

اولڈ ٹام کا نمائندہ مسٹر فاکس اپنے گزشتہ واقعات کا تذکرہ اس طرح کیا کرتا تھا کہ ”جب میں ناپوچ میں جلاہے کا ملازم تھا“ پارلیمنٹ کے دیگر ارکان بھی جنگی اہلیت نہایت ادنیٰ تھی اس وقت موجود ہیں جہازوں کے مالک مسٹر لنڈ سے نے جو حال تک نڈر لینڈ کے نمائندے رہ چکے ہیں ایک مرتبہ اپنے سیاسی مخالفین کے ایک جملے کے جواب میں دسے مت کے انتخاب کنندوں سے اپنی زندگی کے واقعات بیان کیے۔ چودہ سال کی عمر میں لنڈ سے کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا اور جب وہ تلاش و زنگار میں گلاسگو سے لیورپول روانہ ہوا تو جہاز کا مقررہ کرایہ ادا کرنے سے قاصر رہنے کی وجہ جہاز کے کپتان نے کرایہ کے معاوضہ میں جہاز پر کام لینے رضامندی ظاہر کی اور لنڈ سے کو کوئٹے کی کان میں کام کرنا پڑا۔ لیورپول میں ملازمت ملنے سے قبل اس کو سات ہفتے بیکار گزارا پڑا اس عرصہ میں وہ جھونپڑوں میں رہتا اور پیکل گذر بسر کیا کرتا تھا آخر کار ایک مغربی جہاز میں اس کو پناہ مل گئی اور وہ جہاز میں قلمی بن گیا اور ۱۹ سال کی عمر سے قبل اپنے نیک اطوار کی بدولت ایک جہاز کا انفرین گیا ۲۳ سال کی عمر میں اس نے اپنی بحری زندگی ختم کر کے ساحل پر زندگی بسر کرنی شروع کی اس کے بعد اس نے بہت جلد ترقی کر لی وہ کہا کرتا تھا کہ ”اس نے سخت محنت متعلیٰ عمل اور ہمیشہ اس زبردست اصول کو مد نظر رکھنے سے کہ ہم دوسروں جس قسم کی توقع رکھیں اسی قسم کا برتاؤ ہمیں ان کے ساتھ کرنا چاہیے“ ترقی کی۔

ولیم جاکسن کے واقعات بھی جو اس وقت شمالی ڈربی شائر کے نمائندے ہیں مسٹر لنڈ سے کی زندگی سے بالکل مشابہ ہیں۔ جاکسن کا باپ لنگکاسٹر کا ایک طبیب تھا جب وہ فوت ہوا تو اس نے گیارہ بچے چھوڑے ولیم جاکسن اس کا ساتواں بیٹا تھا۔ بڑے لڑکوں کی تعلیم باپ کی زندگی میں ہو چکی تھی لیکن کمسن بچوں کو باپ کی وفات کے بعد اپنا کفیل آپ بننا پڑا۔ ولیم کو بارہ سال کی عمر میں مدرسہ کو خیر باد کہنا پڑا کیونکہ وہ ایک جہاز پر ملازم کروادیا گیا تھا جہاں اس کو صبح کے چھ بجے سے شام کے ۹ بجے تک سخت محنت کرنی پڑتی تھی جہاز کا مالک علیل ہونے سے ولیم کو *counting house* ملا گیا جہاں اس کو کافی فرصت ملتی تھی اور علم حاصل کرنے کا اچھا موقع مل گیا انگریزی لغت کا ایک حجم اس کے ہاتھ لگا اور اس نے دن رات محنت کر کے اس کے جملہ جلد پڑھ ڈالے بعد میں اس نے تجارت شروع کی اور اس کی جفاکشی دہوشیاری کی بدولت اس کو کامیابی نصیب ہوئی۔ آج تقریباً پندرہ برس اس کے جہاز پر سرکار ہیں اور تقریباً دنیا کے ہر ملک سے اس کے تجارتی تعلقات وابستہ ہیں۔

اسی قسم کے لوگوں میں رجسٹرڈ کاڈن کا شمار بھی کیا جاسکتا ہے جس نے اپنی ابتدائی زندگی نہایت اونٹے درجہ سے شروع کی تھی وہ سکس کے ایک معمولی کان کا بیٹا تھا کم عمری میں لندن بھجوا دیا گیا اور شہر کے ایک گودام میں قلمی مقرر ہو گیا وہ ایک ہوشیار محنتی اور علم کا شوق آدھی تھا اس کا معلم جو ایک قدیم مدرسہ کا مالک تھا اس کو زیادہ پڑھنے سے منع کیا کرتا تھا لیکن کاڈن نے اپنا کام جاری رکھا اور اپنے دماغ کو حتی الامکان علمی معلومات سے پُر کر کے دن بدن اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب حاصل کرتا گیا اس کے بعد اس نے سیر و سیاحت شروع کی اور کافی تجربہ حاصل کر کے آخر کار مانچسٹر میں چھٹیٹ کی رنگائی کا کاروبار شروع کیا۔ رفاہ عام کے کاموں خصوصاً عوام الناس کی تعلیم سے اس کو خاص دلچسپی تھی اور اسکی توجہ رفتہ رفتہ مثلاً (Social Service) کی جانب مائل جس کی تیج کے لئے اس نے اپنی جان اور مال کو وقف کر دیا تھا یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس کی پہلی پبلک تقریر بالکل ناکام رہی لیکن وہ مستقل مزاج اور محنتی تھا مسلسل مشق کے بعد آخر کار ایک قابل مقرر بن گیا اور مسٹر برٹ پل جیسی ممتاز ہستی سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔ فرانسیسی سفیر ایم۔ ڈرون ڈی لہویر نے مسٹر کاڈن کے متعلق خوب کہا ہے کہ ”مسٹر کاڈن قابلیت استقلال اور محنت کی ایک زندہ مثال یا ایسے اشخاص کی ایک عمدہ نمونہ ہے جو سوسائٹی کے اونٹے درجوں سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنی ذاتی کوشش اور قابلیت کے ذریعہ اعلیٰ مراتب حاصل کرتے اور پبلک میں غرت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ نیز مسٹر کاڈن اُن غیر فانی صفات کی ایک نامزد نمونہ ہے جو انگریزوں کے اخلاق میں جلی طور پر پائے جاتے ہیں۔“

ان تمام مثالوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شہرت خواہ کسی قسم کی اور کسی شعبہ زندگی میں ہو محض انفرادی محنت اور جھاکشی کا نتیجہ ہے ہر قسم کا کمال آرام طلبی اور کمالی کی دسترس سے باہر ہے۔ ذاتی جدوجہد اور دماغی محنت ہی سے انسان کی مفید تربیت ہوتی ہے اس کی عقل اور تجربہ بڑھتا ہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ (باقی)

پس کے سود

نظم
جلالہ خجڑا باہمی مجد و مکہ نظم جمعیت ریاضیہ

منعقدہ

۲۵ ربیع النور ۱۳۲۸ھ ۲۵ مہر ۱۳۳۸ھ ۲۵ رجب ۱۳۳۸ھ

تقریب

حضرت صفی اورنگ آبادی (حیدر آبادی) کسی رسمی تعریف و توصیف کے خلیج نہیں یہ اپنے تغزل کی بدولت کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اس کے ثبوت میں آپ کا وہ نگیں اور پرائز کلام ہی جو آج عوام سے لے کر خواص تک کی زبان پر ہے۔ بزم فردوس یا نخل سماع، کوئی اس سے خالی نہیں؛ لیکن اب آپ کی شاعری قومیات اخلاقیات میں جذب ہو رہی ہو! ملک و قوم کو آپ کے استاد حضرت کفئی حیدر آبادی رح کی گرامر مجالس قومی میں ایک خاص اسپرٹ پیدا کرنے شاعری کے فقدان کا جو انوس تھا شاید وہ اس نظم کے پڑھنے کے بعد باقی نہیں رہے گا، اور بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا: ”شکر صد شکر کہ شاگرد بہ استاد رسید“ فیضان خجڑا کسی خاص شخص کا حصہ نہیں؛ ہر داغ اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ ہر مضمون میں شعریت نہیں ہوتی! ”منصب بیل“ کچھ اور ہی رتبہ رکھتا ہے، اوشما کے نصیب میں نہیں! نظم پڑھیے اور اعجاز سخن کے فرسے لیجئے! مضمون کی روانی زبان و بیان، اثر و تاثیر، بال باندھے غلام ہیں! موضوع خشک و قافی محدود، ہنسنوی کی بحر، اور بحر اپنی خصوصیات پر حاوی، یہ شاعری نہیں! معجز بیانیات ہیں!! اور پھر اس پر یہ عجیب؟ ”یہ تو ملو، لیکن رنگ خمرہ“ یہ ہو آئینہ، لیکن گرد آلود؟ نہ عبرت اس عبارت سے ہو ظاہر نہ لذت، اس حکایت میں ہو جھوٹ؟ ہمارے ہم انجمنوں کے لئے پوسہ سالانہ رپورٹ کاغذ: ”یہ گویا ایک طرح کا ہو خلاصہ“

اور پھر مضمون ہی، پرائز ہی۔ اس لیے یقین ہو کہ اس کو پڑھیں گے اور بار بار پڑھیں گے!

ملک کے ادبی مذاق اور زندگی رکھنے والوں سے توقع ہو کہ اس کو دیکھیں گے اور خوش ہو ہو کہ دیکھیں گے کہ ہم بھی ایک ایسا شاعر مل گیا ہو! ایک خشک موضوع پر ایسی نظم؟ میں کیا کہوں خدا کی قسم شاعری ہو یہ! مضمون خشک اگر ہو پسند میں تاثیر مفقود تو ایسی پسند ہو گی پسند بے سود مگر خوش شاعری کا رنگ کچھ اور؟ مگر کوئی بھی نہیں ہوتی یہ بڑا صداقت میں اثر ہو ناممکن صداقت اس انداز میں مفقود اثر کو فاقہ پڑھتے ہیں شاعر صداقت سے تو جلتا بھی نہیں ہو صداقت وہ نہیں ہو کاغذی؟ صداقت وہ جس سے خوش نہیں ہو صداقت میں ہو تغزل شاعری بھی تو پھر حال ہی ہو جو ہوا جو مقصود زبان پر آدمی کی ہونے ہی بات رہے جو بات اس کے دل میں ہو گزرنے ہی ہو پھر سے وار اگر ایسا ہو تو لطف نابود

یہی شکل مجھے بھی آپری ہو ۳
خدا الگتی کچھ کوئی خدا دوست
یہ قصہ ہی وہی پارینہ قصہ
وہی ہی باہمی ادا منظور
یہ ہی اس سخن کا تیل سال
روپوش اس سال جو اس کی چھپی
مگر ان بات تو قول ہی میں تھو
قیام سخن کا ذکر طیف ہر
کیے ہیں متن تختے اس میں
حقیقی تیغ و نقصان مدح و جرح
ہر اک صیغے کا ہر ماضی حال
لکھ میں اس میں اسمائے اراکین
مراتب تب میں خدمت کے بار
مری اک نظم کھلی اس میں جھپی ہو ۴
مگر خوش ہوں کیوں حالہ نہیں ہو
قلم کا غدی کی میری لڑائی
کرد کیوں گفتگو ترکی بہ ترکی
وہ مالک جو بنا ہے بہت کوتاہ
تو بان قریب بھی ہوں سخن کا
وطیفہ پائے ہیں اک صاحب اس
دعا پر ختم ہے یہ سال نامہ
نظام املاک آصف جاہ ملج
دعا میں بھی کروں ہو فرح میر
آہی از طفیل ماہ میلاد
کریا اس کے دشمنوں کو خوار ہو
یہ گویا اک طرح کا ہی صلا
روپوش اس کو کھو یا سال نامہ
اساس کے آگے آخر کیا ہوں
اگر کچھ ہو تو گنجائش ہو اتنی
تو اس جھڑکی ذاتی لئے یہ ہو
اسے ہی باہمی ادا و درکار

اگر ہو جھوٹ تو جھوٹا ہی ہو
بھلا شاعر کرے کیا اس میں آفر
جو بہر نظم جمیبت ہو محدود
وہی ہم دانہ قول کی سیب ہو
ابھی تک تو ہوا ہر کام محدود
وہ ہی کو سا ہی در قول میں محدود
ہر اک شے ہی مع اہلاد و محدود
نظام سخن کا حال موجود
کہ جن میں روح ہو بے حس و نہ
نہیں اپنی طرف سے کچھ بھی فرو
توازن ہی بطور نیک و مبہود
جو ہیں اس کام میں ہر طرح خوش
بکر مفلوک باز نہ محدود
بنار کھا ہو جس نے مجھ کو محدود
بادا ہو کس زبان سے شکر محدود
نہیں درکار کوئی اور بارود
دعا ہوئے سمجھایوں کو مبہود
وہ خالق ہی کے باوجود کو بود
نہیں ہی کام کچھ اس کا بھی بے بود
کہ وہ کرتے ہیں کام آمد ہی محدود
دعا اس کی جو ہو مقبول مبہود
جسے مد نظر ہے سب کی پہود
ہر اک سامع سے ہو امن مقصود
خداوند اجماعی شاہ مولود
دکھا شان عاے حضرت ہو
اگرچہ ہیں مرثا شعرا محدود
کہ ہی اورد و جام اور جام مرد
سخن کو تاہ راہ شکر محدود
بس اپنی رائے کر سکتا ہوں آفر
کہ یہ ہی ایک کار نیک و مبہود
نہیں ہی سخن کچھ طالب جود

نہ شخصی فائدہ ہی اس کا مقصد
نہ ہوتا ہی اس میں کچھ کم و بیش
کتاب اس کی نہیں ہو شاخ و تنایخ
یہ خود ہی آپ اپنی مشاہد کار
پر چھوڑ کر ذرا سمجھ بھی اس کو
یہاں تک تو ہوا حال سخن کا
یہ ہو تلوار لیکن رنگ خورہ
نہ عبرت اس عبارت سے ہو ظاہر
نہ یہ حال کلیم اللہ و فرعون
نہ تعریف خیا کے دست و پائی
پھر اس پر ایک یہ بھی ہو نصیبت
راہ صریح غیب تکرار توامی
نہیں محدود و محدود اس کو مانا
سبب اک در اس سے بھی برا ہو
کہاں ہیں اور کہاں جلسے کہاں نظر
میں اک شاعر ہوں اور وہ بھی غزل
جو میرے رنگ کے شعرا ہوئے
نہ یہ ہو داستان میں ویلے
لب دندان نہیں ہیں لعل گوہر
یہاں پروانہ بے پر نہیں عشق
اشائے میں کہوں کیا حریف محدود
خیال جدت مہید بے کارا
نہ میری نظم میں گل جو بے بلبل
گوئی جو چھو کی شاعر کے دل سے
بے پیش نظر حراف گوی
تو پیش آئی جو کیسی کی شکل
بہت خون جگر کھانا ہو شاعر
یہ اک بڑی ہو گئے سننے والو
تو آتا اور اک احساں ہو بس پر
یہ ستر شعر میں چھنے کے قابل
نہ دیکھو کچھ اصفی کی نظم کچھ

نہ ذاتی سود مندی اس کا مقصد
نہ کہتے ہیں اس میں کچھ غمزہ
حالیں کا نہیں ہو سود و سود
یہ خود ہی آپ ناقد آپ مقصود
لکھا ہی اس میں ہر دم و محمود
مگر ہوش عری کا لطف مقصود
یہ ہی آئینہ لیکن گرد آلود
نہ لذت اس حکایت میں ہو
نہ یہ ذکر خلیل اللہ و فرود
نہ تو صیف اولے سخن داود
جو کردیتی ہی ہر جذبے کو نابود
اودھر صریح قافیہ محدود و محدود
مگر سب کتب ہیں میرے محسود
کہ جس سے ہے مزہ میری محدود
کہاں میں اور کہاں تھر کہاں خود
مرا رنگ سخن مخصوص محدود
تو ہوتے ان میں لاکھوں سخن جو
نہ یہ وصف یا زو مع محدود
دل و زواں میں ہو سب محدود
تو جو کا سخن میر کوں شمع کے
کنائے میں کروں کیا شرح محدود
کمال قدرت تشبیہ بے بود
نہ اس میں کوئی شاہد ہو مبہود
کہ ہو موضوع جس دم سخن ہو
نہیں پھر قافیہ بھی اس کو محدود
الاکہ مجھے ہو جاتے میں نابود
نہیں کچھ شاعری طوے بے دو
اگر اس سخن سے کچھ ہے مقصود
خدا رکھے نصیب خوش حال شود
ہو ان میں تدریج سانس کی ہو
ہو اگر تا ہی پیارا اہل ہو

بھکاری

۱۱

(جناب محمد محی الدین صاحب کلیہ جامع عثمانیہ)

اس پر بھی ایک زمانہ عیش و آرام کا گزر چکا تھا۔ اب اگر وہ غریب اور بیمار ہوا تو کیا؟
پندرہ برس کی عمر میں اس کے دونوں پاؤں راستہ چلتے ہوئے ایک وزنی گاڑی کے پھتے کے نیچے پھل گئے۔
ہسپتال میں اُن کو کاٹ ڈالا گیا۔ تب سے وہ بنلی لکڑیوں کے سہارے گاؤں کے چکر لگاتا اور بھیک مانگتا۔ اس کے
اوپر بچے شانوں کے درمیان اُس کا جھکا ہوا سر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ دو پہاڑوں کے درمیان رکھ دیا گیا ہے۔
گاؤں کے پادری نے ایک دن گرجا سے آتے ہوئے دیکھا کہ ایک نوزائیدہ بچہ خندق میں پڑا ہوا ہے۔ پادری
رحم کھا کر اٹھا لیا۔ اور وہ گرجہ کے خیراتی فنڈ سے پالا گیا۔ یہی وہ بھتی کہ وہ ہر قسم کی تعلیم سے اجنبی بنا رہا مری کے
موسم میں ایک دن گاؤں کے روٹی بنانے والے نے اُس کے کانپتے ہوئے جسم پر ترس کھا کر اسے تھوڑی سی شراب
پلا دی تھی۔ جس کا نتیجہ اس کی کھلی ہوئی ٹانگیں تھیں جو گاؤں کے ہر بچے بوڑھے کا نشانہ مذاق بنی ہوئی تھیں۔
گاؤں کے پادری نے اس کی نگہداشت چھوڑ دی کیونکہ وہ کام کاج کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اب
گداگری کے سوا ایٹ پالنے کی کوئی اور صورت نہ تھی۔ شروع میں گاؤں کی ایک ولتند بیوہ نے اُس کو اصل
میں سونے کے لئے تھوڑی سی جگہ دے رکھی تھی۔ اور جس دن اُسے بھیک ملتی یا برف باری کی شدت کی
وجہ سے وہ باہر نہ جاتا تو اُسے یقین فرور رہتا کہ وہ گھانٹس کے ایک کونے پر روٹی کے چند ٹکڑے ضرور رکھا
ہوا پایگا۔ کبھی کبھی اُسے چند پیسے بھی مل جاتے۔

مگر اب اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ گاؤں میں اسے بہت کم خیرات ملتی تھی۔ لوگ چالیس سال سے دن رات
اسے گاؤں کی گلیوں میں کسی نہ کسی دروازہ پر اپنی لکڑیوں پر کھڑا چلاتا ہوا دیکھ کر اکتا چکے تھے۔ تاہم وہ گاؤں
نہ چھوڑ سکتا تھا۔ یہی وہ تین مکان اور چند جھونپڑیاں اس کی آجگاہ تھیں جہاں وہ اپنی درد و غم سے
بھری ہوئی زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ اس نے بھیک مانگنے کے علاقوں کی تقسیم کر رکھی تھی۔ اور سھرہ
دنوں میں وہ اس علاقہ کے سوا جہاں اس نے اس روز بھیک مانگنا سمر کر رکھا تھا دوسری جگہ نہ گزرتا تھا۔
وہ گاؤں کے باہر دور کے درختوں کی اس پار کی دنیا سے قطعاً ناواقف تھا۔ اور اسے یہ جاننے کی نہ تشویش

تھی نہ ضرورت کیونکہ وہ جگہ اُس کے علاقوں میں شامل نہ تھی۔ اور جب کسان جو اس کے دست سوال سے تنگ چلے گئے۔ اسے بھیک مانگتا ہوا دیکھ کر کہتے۔ ”ہٹ۔ دور ہو جا۔ تو کسی دوسرے گاؤں کو کیوں نہیں چلا جاتا۔“ تو وہ خانو سے سر جھکا کر اُن کے سامنے سے چلا جاتا۔ کسی دوسرے گاؤں کو جانے کے خیال سے ایک خوف اس کے دل پر چھا جاتا۔ نئے چہرے خراب برتاؤ۔ لوگوں کی مشتبہ نظریں اور سب سے زیادہ پولیس میں گو دوسرے آتا دیکھ کر وہ کانٹوں کی جھاڑیوں یا تیز نوکیلے پتھروں کے پیچھے چھپ جاتا۔ ان سب باتوں کا خیال اسے خوفزدہ کر دیتا تھا۔ پولیس جس کے بوٹ کی کھٹ پٹ دور سے سن کر اس کے جسم میں ایک خوفناک پھرتی آجاتی اور بیل سے لکڑیوں کو گر کر خود زمین پر بے تحاشہ سنبھل کر جاتا۔ گولہ کی طرح مسکرا ہوا۔ خاموش خرگوش کی طرح دبکا ہوا اس کے جسم کے خاک آلود چھتھیلے زمین کی رنگت سے مل جاتے اور دیکھنے والوں کو وہ مٹی کا تو دہ نظر آتا۔ حالانکہ اس کو اُن سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ مگر اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے خون میں یہ خوف درشتا شامل ہوتا آیا ہے۔ اس کا کوئی گھر نہ تھا۔ نہ کوئی جھونپڑی اور نہ سونے کی جگہ۔ گرمیوں کے موسم میں وہ کہیں بھی کھلی ہوئی پڑ جاتا البتہ سردیوں میں اسے بارہ کو دکر کسی کے مہبل میں گھس جانا پڑتا تھا۔

لنگرا ہونے کے باوجود عادت کی وجہ سے وہ اس کام میں باہر تھا۔ پو پھٹنے کے قبل وہ اٹھ چلا جاتا تاکہ کسی کی نظر اُس پر نہ پڑے۔ اسے گاؤں کے ہر مہبل کی بارہ کے چند ایسے سوراخ اور ٹوٹے ہوئے مقام معلوم تھے جن کے ذریعہ سے وہ ان کے اندر آسانی پہنچ جاتا تھا۔ ایک مہبل کے دوسرے میں زیادہ طاقت پیدا کر دی تھی۔ اس کے ہاتھ ایسے مضبوط اور طاقت دار تھے کہ وہ درختوں کی ٹلکتی ہوئی ٹہنیوں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اوپر چڑھتا اور بارہ کی دوسری طرف کود جاتا۔

کبھی وہ اناج کے خزن گھانسن کے ڈھیر میں چھپ جاتا اور اس وقت تک باہر نہ نکلتا جب اسے بھوک خوب ستاتی۔ اور جب روٹی اس کے پاس کافی مقدار میں جمع رہتی تو وہ اُن احاطوں سے چار چار پانچ پانچ روز تک باہر نہ نکلتا۔

وہ جنگل کے جانوروں کی سی زندگی بسر کرتا۔ ایسے ہرن کی جو آدمیوں میں گھبراہوا ہو۔ یا ایسے خرگوش کی جس کا تعاقب شکاری کتے کر رہے ہوں گاؤں کے لوگوں کے حرم کے جذبہ کو وہ اب کبھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ دل میں ان سے سخت نفرت رکھتا تھا۔ اور یہ دشمنی کسی نہ کسی طرح اُن کے عاجزانہ الفاظ سے ظاہر ہو جاتی تھی۔

اس کا حرف لوگوں نے ”بل“ رکھ دیا تھا۔ کیونکہ اس کا جسم ان لکڑیوں کے درمیان اسی طرح لٹکتا تھا جیسے گھنٹا پھیلے دنوں سے وہ بھوکا تھا۔ اسے کھانے کو کچھ نہ ملتا تھا۔ ان لوگوں نے اسے خیرات دینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ لوگ اس سے بالکل تنگ آچکے تھے عورتیں اسے دروازہ پر دیکھتے ہی کالیاں دیتی اور پانی لیکر دوڑتیں۔ ”نکل بد معاش۔ حرا خور۔ ابھی پرسوں ہی تو میں نے تجھے پوری روٹی دی تھی“ اور پانی ٹھنڈا برف کا سا پانی اس کے سردی سے اکڑے ہوئے جسم پر ڈالا جاتا۔ وہ ان ٹکلیفوں کو مردانہ برداشت کرتا اور پانی کی صراحت دیکھتے ہی اتنی تیزی سے جتنی کہ اس کی کٹی ہوئی ٹانگیں اجازت دیتیں بھاگ کھڑا ہوتا۔ کینڈ کی طرح اچھلکڑ۔ اور بازو کے دوسرے دروازہ پر جا کھڑا ہوتا۔ جہاں پھر اسی طرح اس کا استقبال کیا جاتا۔ اور دونوں عورتیں اپنے اپنے دروازہ میں کھڑی آپس میں کہتیں۔

”لنگڑا ہے تو ہوا کرے۔ ہمارے احسان کو؟ ہم اس کو عمر بھر تک دو دھنپلاؤ دینے سے تو رہے“
مگر ان سب باتوں کے باوجود بھوک ایک فطری چیز تھی جو اس غریب لنگڑے کو بھی روز آئے دو وقت ضرور لگتی۔ آج اس نے اپنی علاقہ بندی کے خلاف پورے گاؤں کا دو دو بار دورہ کیا مگر اسے کچھ نہ ملا۔ قریب کے ایک دوسرے گاؤں کو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس پر میلا فاقہ گذر رہا تھا۔ مگر دوسرا گاؤں دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ اور ایک انسان وہ بھی لنگڑا خالی پیٹ اور خالی جیب لیکر دو میل کا فاصلہ نہیں ملے کر سکتا۔
مگر وہ چل کھڑا ہوا۔

دوسرا مکان مہینہ تھا۔ سرد ہوا اناج کے کھیتوں اور درختوں کی ٹنگی ٹہنیوں میں سے گذر کر سرسراہٹ کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ کالے کالے بادل نیچی آسمان کی تیلی ٹرک پر کسی نا معلوم منزل کے لئے دوڑ رہے تھے۔ کیا وہ بھی خالی پیٹ تھے اور دو میل کے فاصلہ پر کسی گاؤں کو جا رہے تھے؟ لنگڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس کی لکڑیاں کیے بعد دیگرے تنہا سخت ٹرک پر کھٹ کھٹ کر رہی تھیں۔ وہ پچھلے دنوں میں اپٹا ہوا تھا۔ اور سرد ہوا ان کے سینہ کی گہرائیوں تک اتر رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر پہلے ٹرک کے کنارے کسی پل یا پتھر پر سٹانے بیٹھا جاتا۔ بھوک کی شدت سے بڑی آنت چھوٹی کو کھا رہی تھی۔ اس کے ہوش و حواس آہستہ آہستہ جواب دے رہے تھے۔ اس کا صرف ایک مقصد تھا۔ کھانا پیٹ بھر کھانا۔ مگر وہ یہ نہ جانتا تھا کہ یہ مقصد پورا کیسے ہو سکتا ہے۔ مسلسل تین گھنٹے تک وہ اسی لاٹھی ٹرک پر کھٹکھٹ کرتا رہا۔ اور جب دوسرے گاؤں کے اچھے چارے دور نظر آنے لگے تو اس کے دم میں دم آیا۔ امید نے اس کا قدم بڑھائے مگر اس کی قسمت میں ناکام رہنا لکھا تھا پہلے سوائے

ایک سخت مزاج کسان نے جو گاؤں سے آرا اسے اس مرضی سے جھڑک دیا کہ اس کا دل بیٹھ گیا۔ ”اُس گاؤں میں سب کے سب ایسے ہی ہوں گے“ اس نے دل میں خیال کیا۔ گردہ صابر اور متعل مزاج تھا۔ اس نے ہر دروازہ پر آواز دی۔ اور جتنا وہ گیا اس سے اسی طرح خراب سلوک ہوا۔ اس نے اپنا دورہ پورے گاؤں میں جاری رکھا۔ مگر اسے ایک پیسہ بھی ملا پھر اس نے کسانوں کے کھیتوں اور جھونپڑیوں کا رخ کیا۔ نرم نرم کچڑ اور پانی سے لبریز کھیت جس میں اُس کی لکڑی آدمی سے زیادہ اندر دھنستی جاتی تھی وہ ایسے ہو گیا کہ چونکہ وہ تھک کر چور ہو گیا تھا لکڑی اٹھانا اس کے لئے دو بھر تھا۔ ہر جگہ اسے ڈرا کر تھکا دیا گیا تھا۔ موسم بھی ایسا سرد اور منہوم تھا کہ جس میں لوگوں کے دل بچھر۔ مزاج تیز۔ روح سیاہ اور ہاتھ کوتاہ بن جاتے ہیں۔

وہ ایک خندق کے کنارے بیٹھ گیا۔ جو کسی کسان کے کھیت چھوٹی ہوئی گزرتی تھی۔ اس نے لکڑیوں کو جسم سے دور کیا۔ یہ بہترین طریقہ ہے یہ ظاہر کرنے کا کہ وہ لکڑیوں سمیت زمین پر اوندھے منہ کیسے گر پڑا اور لکڑیاں خود بخود اس سے کیسے علیحدہ ہو گئیں۔ اس میں حرکت کی تک سنگت باقی نہ رہی تھی۔ بھوک اس کے بدن کو کھا رہی تھی۔ وہ منظر تھا۔ مگر کس کا؟ وہ خود نہ جانتا تھا۔ آس۔ غیر فانی اُمید اب بھی اس کے دل میں جاگزیں تھی۔ وہ انداز کا سب سے زیادہ محتاج تھا۔ سرد بر فائے والی ہوا اس خندق کے کنارے بھوکا پڑا ہوا۔ مگر مدد اسے کیسے پہنچ سکتی تھی۔ آسمانی یا کسی انسان کے ہاتھوں؟

کالی مرغوں کا ایک غول سائے سے گزرا۔ وہ جانور اپنی خوراک زمین پر ڈھونڈتے جارہے تھے وہ زمین جو سب جانداروں کو غذا پہنچاتی ہے اور کسی کو بھوکوں نہیں مارتی۔ مگر اس میں استثنا بھی ہے وہ کون؟ یہ لنگر اُبھکاری۔ ہر لمحہ ان مرغوں کی عقابی آنکھ کسی پوشیدہ کیڑے یا اناج کے دانے کو زمین پر پڑا ہوا دیکھ پاتی اور وہ دوڑ کر اسے اپنی چونچ سے اٹھا لیتے پھر اپنی سست برقرار مگر یقینی تلاش شروع کر دیتے۔ ”بل“ انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے خیالات اب اسی نقطہ پر جمع ہو گئے تھے دفعتاً اسے خیال آیا۔ کہ انہی مرغوں میں سے ایک اگر اسے مل جائے تو آگ پر بھونی ہوئی کیا لطف دے گی۔

یہ خیال کہ ایسا کرنا چوری میں داخل ہے اسے چھوٹا نہیں۔ باز وہی ایک پھر پڑا ہوا تھا اس نے اُسے اٹھا لیا۔ اور قریب ترین مرغی پر پھینک مارا۔ بچپن کی نشانہ بازی اب کام آئی۔ مرغی ایک تیز چنچ کے ساتھ زمین پر گر کر لوٹنے لگی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈی ہو گئی۔ باقی پرندے اپنے پرندوں کو پھیر پھراتے اور اپنی پتی پتی ٹانگوں کو جلدی جلدی اٹھاتے ہوئے بھاگنے لگے۔

اور ”بل“ پھر اپنی لکڑی کے سہارے اٹھتے ہوئے اس ہال غنیمت کو لینے کے لئے حتی الامکان تیزی سے بڑھا۔ اس کی چال ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود ایک بڑی مرغی ہے جو اپنے پردوں کو پھیر پھیراتی اور اپنی پتی ٹانگوں کو جلدی جلدی اٹھاتی ہوئی دوڑ رہی ہے۔

مردہ مرغی زمین پر پڑی ہوئی۔ اس کا سرخون میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”بل“ نے ہاتھ بڑھایا۔ دفعتاً اس کی پیچ پر ایک زور کا مٹکا پڑا جس کے صدمہ سے اس کی لکڑیاں بغل سے نکل پڑیں اور وہ لڑکھکتا ہوا اس قدم چلا گیا۔ ایک موٹا کسان غصہ میں بھرا ہوا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ اور قریب آیا اور زمین پر پڑے ہوئے ”بل“ کو گالیاں دیتے ہوئے خوب لات اور کتے مارنے لگا۔ ”بل“ کسی طرح ان بے پناہ ضربوں سے بچ نہ سکتا تھا۔ اس پر کموں اور لالتوں کی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

اس کے نوکر بھی اس کے پیچھے دوڑے ہوئے آئے اور اس زد و کوب میں حصہ لینے لگے۔ جب وہ مارتے مارتے تھک گئے۔ تو وہ اسے نشان نشان ایک جھونپڑے کی طرف لے گئے۔ جہاں ایک تاریک کوٹھری میں اسے مقفل کر دیا گیا۔ نوکروں میں سے ایک پولیس کو بلانے دوڑا۔

”بل“ نیم مردہ خون آلودہ اور بھوک کی وجہ سے حالت غش میں زمین پر پڑا رہا۔ رات ہوئی اور پھر صبح گرکھانے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ”بل“ بے ہوش ہونے کی وجہ سے بھوک کی اس دوزخی تکلیف سے بچا رہا۔ کبھی کبھی اسے ہوش آجاتا اور پھر شدت کرب سے وہ بے ہوش ہو جاتا۔

دوپہر کے وقت پولیس آئی۔ اور جھونپڑی کا دروازہ بڑی احتیاط سے کھولا گیا۔ گویا اندر کوئی ہتھیار آدنی اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار بیٹھا تھا کیونکہ کسان کے نوکر نے تھکانے پر بیان کیا تھا کہ وہ ایک موٹا اور لانا جوان ہے۔ جس کو بڑی مشکل سے گرفتار کیا گیا ہے۔

”اٹھ۔ اٹھ کھڑا ہو“ سارجنٹ نے چیخ کر کہا۔

مگر ”بل“ ہل نہ سکتا تھا۔ اس نے اپنی لکڑیوں کے سہارے اٹھنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ پولیس والوں نے خیال کیا کہ شاید وہ دھوکہ دینے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ دو مسلح سپاہیوں نے اسے پکڑ کر اٹھا دیا اور بڑی مشکل سے اس نے لکڑیوں پر اپنا سہارا قائم کیا۔

اسے خوف کے وہ کانپ رہا تھا اسے غش پر غش آ رہے تھے اور اس کے سر میں سوچا پسینہ جاری تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسی شکار کی صیاد کے سامنے یا چوہے کی تلی کے مقابل میں۔ وہ کسی آسانی قوت کی مدد

کھڑا ہونے کے قابل بن رہا۔

”چل تمہارے ساتھ سارجنٹ نے کہا۔ وہ بڑی شکل سے چلا۔ کسان کے نوکر اُسے جاتا دیکھ کر ہنس رہے تھے عورتیں کوں ہی تھیں اور مرد گالیاں دے رہے تھے۔ اُس کے دونوں بازو دو سپاہی چل رہے تھے جو کبھی کبھی اس کو سہارا بھی دیدیتے۔ یا گرنے سے بچا لیتے۔

اس پر خوف اتنا غالب تھا کہ اس کی اطراف کیا ہو رہا ہے یا کیا ہونے والا ہے وہ یہ تک سمجھ سکتا تھا۔ اس کا دل غماؤں پر ہوا تھا۔ وہ ایک مخمور سٹوالے کی طرح رات طے کر رہا تھا۔ اگر کبھی وہ سستانے رکتا تو سپاہیوں کے آگے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیتے۔ راستہ چلنے والے اُسے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور کہتے۔

”ہو نہ ہو کوئی چور ہے“

شام شام کے وقت وہ پولیس کے تھانے پر پہنچے۔ وہ آج تک کبھی اتنی دور نہ چلا تھا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ شکایت کا نہ نکالا۔ کیوں کہ اس میں اب سمجھنا یا تمیز کرنے کی قوت باقی نہ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا ہی نہ چاہتا تھا۔ دوسرے کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ اور علاوہ بریں اس کے خیالات اتنے پریشان اور طے چلے تھے کہ وہ اُن کا اظہار زبان سے نہ کر سکتا تھا۔

وہ تھانے میں مجرموں کی کوٹھری میں مقید کر دیا گیا۔ پولیس والوں نے اس کا خیال تک نہ کیا کہ اُسے کھانسنے کی بھی کوئی ضرورت ہے۔ دوسرے دن وہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ مگر دوسرے روز جب پولیس مین اُسے لینے کے لئے کمرہ میں داخل ہوا تو اس کا جسم تو زمین پر گر رہا ہوا پڑا تھا مگر اس کی رُوح بہشت میں عمدہ عمدہ نعمتوں اور لذائذ کا لطف اٹھا رہی تھی۔

ارسطو کا سیاسی تخیل

(از جناب غلام جیلانی صاحب بی۔ اے۔ پریذیڈنٹ ٹیچنگ سائنس ٹیچنگ)

یونان کا مروجہ فیز خط و دنیا کی قدیم تاریخ میں مختلف علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے اعتبار سے ایک خاص ممتاز و بلند پایہ حیثیت رکھتا ہے، اسی ملک کی پشت خاک سے فارقلیس، سقراط، افلاطون و ارسطو جی با کمال مبستیوں نے جنم لیا اور اپنی فقید النظر علمی خدایات کی بدولت یونان کو دنیا کی تاریخ میں لافانی عظمت و شہرت بخشی یونان کے مدبرین و علمائیں سب سے بری شخصیت ارسطو کی ہے جو نہ صرف اپنے پیش روں بلکہ چند امتیازی خصوصیات کی وجہ سے فلسفہ سیاسیات میں عہد قدیم سے لیکر عصر جدید تک کے دنیا کے تمام سیاسی مفکرین میں ایک نمایاں اہمیت رکھتی ہے، اس کی ایک بدیہی وجہ تو یہ ہے کہ ارسطو ہی پہلا وہ شخص تھا جس نے سیاسی مسائل پر محققانہ تحلیل و تدوین سے نظر کی جو بر علمی تحقیقات کے لئے اس فرد کی ہے اسی نے سب سے پہلے اپنے پیش رو کے مشترک سیاسی خیالات کو یکجا کر کے اپنے ملکہ ترتیب و تنظیم کی بدولت دوسرے علوم کی طرح سیاسیات کو بھی ایک فن کے درجہ سے ترقی دیکر علم کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچایا جس زمانہ میں وہ پیدا ہوا اس وقت یونانی ذہانت حسن و شباب کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔

یہاں کے شہروں کی سیاسی مگر میاں بڑے بڑے علمائے کی موجودگی اور وسائل جہاں کے علوم و فنون کی ترویج کے سبب ایسے اسباب تھے جو لازمی طور پر سیاسی خیالات آریوں کی ترغیب و تحریک کے باعث ہوتے تھے، انہی ماحول کے اثرات کی وجہ سے ارسطو کو اپنی اعلیٰ دماغی و ذہنی قوتوں کی ترقی و نشو و نما کا موقع ملا، سب سے بڑی خوبی ارسطو میں یہ ہے کہ وہ اپنے پیش رو مشہور عالم فلسفی افلاطون کے برعکس محض فلسفہ کی خیالات آریوں میں بھینس کر حقیقت و واقعیت کو کبھی فراموش نہیں کرتا، اس کے اکثر سیاسی اصول ایسے ہیں کہ ان پر ہر انسانی سوسائٹی بہ آسانی عمل پیرا ہو کر اعلیٰ درجہ کی سیاسی زندگی بسر کر سکتی ہے۔ ارسطو نے جن سیاسی مسائل پر بحث کی ہے ان میں خاص طور پر وہ افکار و خیالات قابل ذکر ہیں جو اس نے آغاز مملکت اس کے انقسام اور ارتقائی کیفیت کے متعلق اپنی مشہور و معرکہ آرا کتاب 'سیاسیات' میں پیش کئے ہیں اس کتاب کے پہلے حصہ میں اس نے مملکت کے چند بنیادی خصوصیات پر سیرکرن بحث کی ہے اس کے نزدیک مملکت تہذیب و تمدن انسانوں کا سب سے بڑا معاشرہ ہے، وہ کہتا ہے کہ جماعت یا معاشرہ کا وجود اس کے افراد کے کسی

ذکسی فائدہ کے لئے ہوتا ہے۔ کیونکہ تمام انسانی افعال کا مقصد کوئی ظاہری مفاد ہوا کرتا ہے، مملکت ایک ایسی جماعت ہے جس کا مقصد مجموعی مفاد ہے معاشری امتزاج و ارتباط کو پیش نظر رکھتے ہوئے مملکت کی ابتدا کو خاندان سے شروع کیا جاسکتا ہے گویا وقت کے لحاظ سے خاندان کو مملکت پر تقدم حاصل ہے، ظاہر ہے کہ انسان بالکل تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا اس لئے تسلسل و بقائے حیات کے لئے مرد و عورت کے اتحاد کی ضرورت ہوئی اور اس اتحاد کی حفاظت کے لئے کچھ احکام اور ان پر عمل کرنے کا سلسلہ چلا اب شوہر و بیوی اتفاقاً غلام باہمی تعلقات سے خاندان بن گیا اور اس طرح ان کی باہمی جدوجہد اور کوشش سے اپنی مایحتاج زندگی سہولت و آسانی سے پیدا کرنے لگا اور جب کئی خاندان متحد ہو گئے تو اس اتحاد سے ایک گاؤں یا قبیلہ بن گیا۔ اور پیشتر کے مقابل انسان کی احتیاجات بطریق آسن پوری ہونے لگیں، بہت سے قبیلے یا گاؤں مل کر مملکت کی صورت میں مبدل ہو گئے، اس طرح مملکت ہی انسانی معاشرہ کی آخری اور مکمل مثال ہے جس کا قیام انسان کی ضروریات زندگی کی بدرجہ اتم تکمیل اور ایک اعلیٰ پایہ کی تمدن زندگی بسر کرنے کے لئے عمل میں آیا ہے، مملکت کو دو طرح سے فطری جماعت کا لقب دیا جاسکتا ہے، اول تو انسان کے عام اور مستقل حالات زندگی اسے مملکت میں رہنے پر مجبور کرتے ہیں، دوسرے مملکت ہی ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں ہر انسان اپنی قوتوں کا پورا پورا اظہار کر سکتا ہے اور ایک تمدن زندگی جو انسانی حیات کا نصب العین ہے، بسر کر سکتا ہے۔ ارتطو انسان کو سیاسی حیوان کا لقب دیتا ہے جس سے اس ”عہد زین“ کی تردید ہوتی ہے جو نظریہ ”معاہدہ معاشری“ کے زبردست مؤید روسو کے نزدیک مملکت کے قیام سے قبل جنی نوع انسان پر گزر چکا ہے جس میں ہر انسان اپنی حالت طبعی میں نہایت اطف و آرام کی انفرادی زندگی بسر کر رہا تھا اور تمدن و تمدن کے جانگداز اثرات سے محفوظ و مصون تھا، ارتطو کے خیال کے موجب جو انسان مدنی الطبع نہوا اور اجتماعی زندگی کو بنظر متفرد دیکھے، ایسا شخص یا تو کوئی افوق الفطرت انسان ہے یا حیوان اور علم سیاسیات کو اس قسم کے انسانوں سے مطلقاً کوئی سروکار نہیں۔

بیان بالا سے ظاہر ہوا کہ تاریخی طور پر خاندان کو مملکت پر تقدم حاصل ہے، ابتداً خاندان کا سرگروہ ایک فرد واحد ہوتا تھا جس کو اپنے ماتحت افراد پر پورا اختیار و تصرف حاصل تھا اس بزرگ خاندان کی حکومت ایک ابتدائی طرح کی شاہی حکومت تھی اس کے بعد حکومت کا زینہ آتا ہے، یہ حکومت ایک نہایت باقاعدہ و منظم جماعت ہے جس میں گاؤں یا قبیلہ محض ایک رکن کی حیثیت رکھتا ہے، ابتداً یہ حکومت

حصول حیات کے لئے بنی تھی اس سے آرسطو نے ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ ملکیت ایک مصنوعی جماعت نہیں ہے بلکہ اس دور عمل کی فطری و صریح تکمیل ہے جس کا زینہ خاندان ہے لیکن ساتھ ہی آرسطو افلاطون کی طرح ملکیت کو صرف ایک وسیع خاندان کے مشابہ اور بادشاہ کی حکومت کو بزرگ خاندان کے اقتدار کی ایک ترقی یافتہ شکل بتلا کر خاموش نہیں رہتا بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہتا ہے کہ ملکیت و خاندان میں درجہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ نوع کے لحاظ سے حقیقی فرق پایا جاتا ہے اس کو وہ یوں ثابت کرتا ہے کہ بزرگ خاندان کا اقتدار اگرچہ خاندان کے کل افراد و جائیداد پر ہوتا ہے لیکن ان تمام پر اس کے اقتدار کی نوعیت بالکل جداگانہ ہوتی ہے اپنی بیوی پر اس کا اقتدار جابرانہ نہیں بلکہ مشیرانہ ہوتا ہے وہ اپنی اولاد پر ایک جابر و قہار بادشاہ کی طرح نہیں بلکہ ایک ایسے رحمدل فرمانبردار کی طرح حکومت کرتا ہے جس کے نزدیک رعایا کا سفاد اپنے ذاتی مفاد سے زیادہ عزیز ہوتا ہے لیکن اپنے غلاموں اور جائیداد پر محض اپنے ذاتی اغراض و مفاد کے لئے خود سمرانہ و جابرانہ حکومت کرتا ہے ان ماتحت افراد کے ساتھ بزرگ خاندان کے جو مختلف التروع تعلقات ہوتے ہیں انہی کے لحاظ سے خاندان اور ملکیت میں فرق کیا جاسکتا ہے کیونکہ آرسطو کے خیال کے مطابق ملکیت میں فرمانبردار کے تعلقات تمام محکوم و ماتحت افراد کے ساتھ یکساں ہوتے ہیں اس کے بعد آرسطو یہ کہتا ہے کہ خاندان مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے بنتے ہیں اور ملکیت اخلاقی و دماغی قوتوں کے نشو و نما کے لئے ملکیت بہ تمام و کمال فطرت انسانی کے مطابق ہے، منطقی ترتیب میں اس کا وجود انسان سے پہلے ہے کیونکہ کوئی شخص مکمل یا قابل برداشت زندگی ایک منظم و باقاعدہ حکومت کی عدم موجودگی میں برہنہ نہیں کر سکتا کیونکہ حکومت خانہ لوگوں کے باہمی اتحاد سے بنی ہے اس سے مختلف افراد خاندان کے فرائض اور ان کی نوعیت کے متعلق ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی اہمیت کے اعتبار سے آرسطو نے ان کو ایک عام اصطلاح "اقتصاد" کے تحت میں رکھا ہے۔ سب سے پہلے ان مباحث میں جس مسئلہ نے اس کی توجہ اپنے طرف منعطف کی وہ غلامی کا مسئلہ ہے، عجیب بات یہ ہے کہ اس نے غلامی کی نہایت زور و شور سے تائید کی ہے غلاموں کو وہ ہر خاندان کا ایک لازمی جزو قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر فطرت کے اصول کے مطابق عمل کیا جائے تو غلام اور آقا کا تعلق کبھی معقولیت اور انصاف کے خلاف نہیں ہے، تنگم اور اطاعت کے باہمی تعلق ہی کے بلندی یہ اصول پر عمل کرنے سے انسان اپنے اعلیٰ مقام پر کیسائی حاصل کر سکتا ہے۔ غلامی کی وہ اس طرح حمایت کرتا ہے کہ ہر انسان میں استعداد و قابلیت کے

مختلف مدارج ہوتے ہیں، بعض لوگوں کی استعداد اتنی اعلیٰ ہوتی ہے کہ وہ محکمہ اور رہنمائی چھی طرح کر سکتے ہیں، بعض میں اطاعت و فرمانبرداری کی فطری طور پر زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، اول الذکر افراد آقا اور مومنین الذکر غلام بننے کی زیادہ اہلیت و موزونیت رکھتے ہیں، اگر ایک دماغی قوت میں متوازن ہیں دوسرے جسمانی قوت میں متوازن کے انفرادی و مقاصد کی تکمیل کے لئے ان ہر دو کے درمیان اتحاد و رابطہ ضروری ہے۔ اس لئے غلامی انسانی فطرت کے خلاف نہیں ہے، اسطرح کو یہ بات معلوم تھی کہ دنیا میں غلامی کے اس اصول پر بہت کم عمل ہوتا ہے اور بہت سے غلام ایسے بھی ہیں جو دماغی قابلیت کے اعتبار سے اپنے آقاؤں پر فوقیت رکھتے ہیں، اس کی ایک پیہی یہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں بظاہر کوئی ایسا معیار نہیں ہے جس کی بنا پر کوئی ایسا صریح امتیاز کیا جاسکے، مفتوحین کے غلام بنانے کے قاعدہ کو وہ اس وجہ سے جائز قرار دیتا ہے کہ جب تک فائین اپنی دماغی ذہنی اخلاقی و جسمانی قوتوں کے اعتبار سے مفتوحین پر تفوق نہ رکھیں اس وقت تک وہ ان کیسے غلبہ حاصل کر سکتے ہیں اس لحاظ سے یونانیوں کے اس عام خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ دیگر اقوام عالم قابو حاصل کر کے ان کو بجا طور پر غلام بنایا جاسکتا ہے۔

افلاطون کے برعکس اسطرح انفرادی ملکیت کو اٹھانا نہیں چاہتا بلکہ خانگی ملکیت کے مروجہ اصولوں میں بہت سی باتوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ افلاطونی اشتراکیت پر جو اس نے فیصلہ کن اعتراضات کئے ہیں وہ زاید از دو ہزار سال کی طویل مدت کے انقضا کے باوجود اب تک اسی قدر زور دار اور مستحکم ہیں۔ پیدائش دولت اس کے نزدیک فی نفسہ انسان کا کوئی اعلیٰ نصب العین نہیں ہے۔ بلکہ بقائے حیات کے لئے انسان کو مجبوراً معاشی جدوجہد کرنی پڑتی ہے اسی ضمن میں جائز و ناجائز پیدائش دولت کے طریقوں کا بھی اس نے اجمالاً ذکر کیا ہے، جائز طریقہ وہ ہیں جن کو عمل میں لانے کا مقصد محض ضروریات زندگی کی تکمیل ہوتا ہے مثلاً کاشتکاری، گلہ بانی، ماہی گیری وغیرہ ناجائز طریقہ وہ ہے جس کا مقصد دولت جمع کرنا ہو، مثلاً اضافہ دولت کے لئے تجارت کرنا خواہ وہ جنس کا جنس سے تبادلہ کی شکل میں ہو یا زر کی وساطت سے ہو، ابتداءً زر کا رواج محض مبادلہ میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے ہوا لیکن بعد کے چکر خور زر کو لوگوں نے انسانی حیات کا مقصد و نصب العین بنا لیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ سود کے لین دین کا مفرت رسالہ طریق شروع ہوا جو بتدریج ترقی کر کے تقسیم دولت کے عدم مساوات کو ناقابل برداشت حد تک بڑھا دیا۔

ارسطو نے افلاطون کے جن اشتراکی اصولوں کی تردید کی ہے وہ جید دلچسپ ہے افلاطون کے اس خیال سے وہ موافقت نہیں کرتا کہ اگر انسان کو اپنی اولاد کے متعلق لاعلمی رہے تو ہر شخص ملکیت تمام بچوں کو اپنی اولاد سمجھ کر پدری الفت و محبت کی نگاہ سے دیکھے گا اور اس طرح خاندانی محبت افراد ملکیت کی محبت میں منتقل ہو جائیگی ذاتی ملکیت و تصرف ہی اُس کے نزدیک فی الحقیقت محبت کی اصل بنیاد ہے اس لئے اگر افراد ملکیت شادی کی رسم کو اٹھا دیں اور اُن کو اپنی اولاد کے متعلق لاعلمی رہے تو کوئی شخص کسی سے محبت ہی نہیں کرے گا یہ بات آزمودہ ہے کہ جو چیزیں بہت سے لوگوں میں مشترک ہوتی ہیں اُن کی بہت کم پروا کیجاتی ہے کیونکہ انسان کو اپنی چیز کا خاص طور پر خیال ہوتا ہے اور یہ بات مشترک چیزیں نہیں پائی جاتی ذاتی ملکیت اگر پوری طرح منقطع کر دی جائے تو اُس سے اشتراکیت کے مفروضہ فوائد کے علاوہ اور بھی بہت سے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں ملکیت کے افراد میں سچی اور اعلیٰ اشتراکیت محض یہی ضرب المثل ہے کہ ”دوستوں کا مال مشترک ہوتا ہے“ (ALL THINGS ARE COMMON AMONG FRIENDS)

ارسطو نے اپنے دور کی اُن شکایات کو جو آج کل کی طرح اس زمانہ کے اشتراکیوں کا اصل سرمایہ فاضل و نامناسب اور انفرادی ملکیت سے بے تعلق بیان کیا ہے۔ ارسطو کے زمانہ میں اس تجویز کو شہرت حاصل ہو گئی تھی کہ تمام شہریوں کے امین مساویانہ طریقہ پر جائیداد کی تقسیم ہونی چاہیے، لیکن شد و مد کے ساتھ اس کی بھی اُس نے مخالفت کی۔ وہ کہتا ہے کہ مساوی تقسیم اور خالص ملکیت کی تجدید فی نفسہ اچھی بات ہے، لیکن اگر بغرض محال اس پر عمل ہو بھی گیا تو محض ایک نسل کی پیدائش اور موت سے تمام شہریوں کے مالکانہ حقوق بد جائینگے اور سارا حساب کتاب درہم برہم ہو جائیگا جائیداد کا مسئلہ حل ہونے کے بعد آبادی کا پیچیدہ مسئلہ درپیش ہو جائیگا جس کے حل ہونے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ علاوہ بریں مساوات خود کوئی بہتر چیز نہیں اس سے بہتر تو یہ ہے کہ انسانی حیثیت میں مساوات قائم کرنے کی بجائے انسانی ضروریات کو برابر کیا جائے۔

اس کے بعد اُس نے دستور ملکیت سے بحث کی ہے اور ملکیت کو شہریوں کے اجتماع سے تہہ نہ کیا یہاں پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ شہری سے آخر کیا مطلب ہے اور شہری کون ہے؟ ارسطو کے نزدیک کامل شہری کی تعریف یہ ہے کہ وہ قانون سازی اور جمہوری میں یا کم از کم دونوں میں سے کسی ایک میں حصہ لینے کا حق رکھتا ہو یا بالفاظ دیگر شہریت کے لئے سیاسی حقوق کا حصول ضروری ہے اور ملکیت ایسے

انسانوں پر مثل ہوتی ہے جن کو اس قسم کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اسطو اور یہ مزید سوال کرتا ہے کہ شہری کون بن سکتا ہے مروجہ اور اہل پیشہ و حرفہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہو سکتے ایک کامل شہری کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا حلقہ حکومت و فرمانبرداری دونوں کی استعداد موجود ہو اور ان ہر دو قسم کی قابلیتوں کو ترقی دینا بہر حال ضروری ہے، جن لوگوں کو بچھ بچھ قیامت کے لئے سخت محنت کرنی پڑتی ہے وہ دوسروں کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے کرتے حکمرانی کی ساری قابلیت کھودیتے ہیں کیونکہ ان کو اپنی اس استعداد کی نشو و نما و ترقی کا موقع نہیں ملتا انسان جنگ معیشت کی فکر سے آزاد نہ ہو اس وقت تک اس کے لئے سیاسی فرائض کو کما حقہ انجام دینا دشوار ہے کام کرنا و طبقتوں کی ملکیت کو جس قدر ضرورت ہے اس لحاظ سے ان کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس اعتبار سے وہ حقیقی معنوں میں شہری نہیں کہلا سکتے۔

ملکیت کے دستور کے متعلق اسطو کا خیال ہے کہ اس کے ذریعہ سے حکومت کے مختلف اعضاء ان کے باہمی تعلقات و نیز اس شخصیت یا جماعت کا حال پوری طرح معلوم ہو سکتا ہے جس میں اقتدار اعلیٰ مرکوز ہو اقتدار اعلیٰ کا مسئلہ دستور ملکیت کے تمام مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ مختلف دساتیر کے درمیان امتیاز کیا جاسکتا ہے جس ملکیت میں یہ اقتدار محکم بہت سے لوگوں سے وابستہ ہوتا ہے وہاں کی حکومت کو عمومیت کا لقب دیا جاتا ہے جہاں چند افراد کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے اس کو اعیانہ کہا جاتا ہے اسطو ملکیت کی روح دستور کو قرار دیتا ہے کیونکہ دستور کی تبدیلی کے ساتھ ملکیت کی ہیئت بھی بدلتی رہتی ہے مذکورہ بالا ملکیت کی تشریح اور دستور حکومت کی تعریف سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ ملکیت اجتماعی زندگی کے خلقی رجحان کے باعث پیدا ہوتی ہے نہ کہ شعوری طور پر ایک دوسرے کی مدد کے خیال سے تاہم اس سب سے بڑے سیاسی معاشرہ کے نظام کی بدولت رد ابط باہمی میں مستند بہ ترقی ہوتی ہے۔ اس سیاسی نظم کے برکات سے تمام شہریوں کو یکساں طور پر استفادہ کرنے کے مواقع ملنے چاہئیں اس لئے دستور حکومت ایسا ہونا چاہیے کہ تمام افراد کو حکومت کے صیغوں میں کام کرنے اور اپنی حسب استعداد ترقی کرنے کا موقع حاصل ہو اقتدار اعلیٰ کے اہم و جمید مسئلہ کے متعلق بھی اسطو نے نہایت واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید کرتا ہے جو محض ایک بڑی تعداد کا مقتدر اعلیٰ ہونا بہتر سمجھتے ہیں یا جو متول و دماغی قابلیت کی بنا پر معدودے چند افراد میں اقتدار اعلیٰ کو محدود کرنا چاہتے ہیں اولاً ان کے طبقہ کے خیال کے مطابق تمام افراد حکومت و معیشت آزاد ہونے اور سیاسی حقوق سے بہرہ ور ہونے کے اقتدار اعلیٰ ان تمام کے ساتھ وابستہ ہونا چاہیے اس کے بالکل برعکس اعیانہ کے مؤیدین دولت و قابلیت اور نسلی امتیازات کی

بلکہ پراقتدار اعلیٰ کی باگ ایک محدود طبقہ کے ہاتھ میں ہونا پسند کرتے ہیں، ارسطو کہتا ہے کہ مملکت ایسا معاشرہ نہیں ہے جس کا مقصد محض دولت پیدا کرنا، تجارت کو فروغ دینا، مختلف قوموں کے درمیان اتحاد کرنا یا اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کرنا ہو یا جہاں لوگ ایک جگہ مقیم ہو کر ایک دوسرے کو نقصان پہونچانے سے بچیں اور باہم ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہیں، بلکہ اس کا مقصد نہایت اعلیٰ اور بہتم باشندان ہے، مملکت کا نصب العین ایک اعلیٰ معیار کی حمد و خوشحال زندگی بسر کرنا ہے، اس زاویہ نگاہ سے اگر دیکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ سیاسی اقتدار اُن افراد کو ملنا چاہیے جو اس قسم کی بلند پایہ تمدن زندگی کی ترقی کے مدد و معاون ہوں، اس لحاظ سے قابلیت اعلیٰ اخلاق اور انصاف پسندی والے لائق جیسے اعلیٰ و پاکیزہ صفات بجائے دولت و نسلی امتیاز کے حصول اقتدار کے لئے معیار بنائے جائیں تو بہتر ہے، اب رہا یہ کہ آیا اقتدار اس معیار سے ایک شخص کو ملنا چاہیے یا چند اشخاص کو یا بہت سے اشخاص کو، ارسطو کہتا ہے کہ اگر بہت سے لوگوں سے یہ اقتدار وابستہ ہو جائے تو اجتماعی طور پر بہت سی خوبیوں سے ملک استفادہ کر سکتا ہے۔

غرض کہ ارسطو کے خیال کے مطابق عوام کے ہاتھ میں اقتدار اعلیٰ ہونا چاہیے، لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آیا تمام افراد متفقہ طور پر یا ہر شخص علیحدہ طور پر حکومت کے فرائض انجام دے، لیکن ظاہر ہے کہ تمام اہم مسائل قوم کے متفقہ فیصلہ ہی سے طے ہوں گے، اس کو ملحوظ رکھ کر وہ کہتا ہے کہ عوام کی جماعت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اُن تمام عہدہ داروں کا انتخاب کرے اور اُن پر نگرانی رکھے جن کے ہاتھ میں انظمام و نسق سلطنت کی باگ و بچاٹی ہو، ارسطو اُن لوگوں کے خیال کی تردید کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بجائے عام لوگوں کی جماعت کے چند مخصوص تجربہ کار لوگ مفید انتخاب کر سکتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سیاسیات میں عوام کا حکم ہمیشہ جائز و درست ہوتا ہے، مفسر یہ کہ اقتدار اعلیٰ کے معیار متذکرہ بالا کی رو سے خواہ ایک شخص کی ذات میں یہ اختیار مرکوز ہو یا چند یا بہت سے افراد کے، تاہم اس اقتدار پر بھی قانون کا اقتدار حاوی ہونا چاہیے، کیونکہ قانون کی حکومت ہمیشہ اچھائی اور معقولیت پر مبنی ہوتی ہے، البتہ جہاں قانون نامکمل یا مشکوک و مشتبہ حالت میں ہو اور وہاں انسانی اقتدار بے روک و مکمل ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، در نہ عام طور پر بے روک اختیار لینے سے نا انصافی کا خطرہ پیدا ہوتا ہے، تقسیم مملکت یا تقسیم و سائر مملکت کے متعلق بھی ارسطو نے نہایت مشہور و معروف نظریہ پیش کیا ہے، اس تقسیم کو اس نے اس تحلیل سے شروع کیا کہ مملکت میں ایک مرکز حکومت ہوتا ہے جس کے ماتحت مملکت کا ہر شعبہ ہوتا ہے، یہ مرکز حکومت مملکت پر خاص اثر ڈالتا رہتا ہے، مملکت کی تقسیم قدر تا اسی بنیاد پر ہے، تقسیم

میں اُس نے اُن اشخاص کی مفاد کو ملحوظ رکھا ہے جنہیں حکم کا اختیار حاصل ہوتا ہے، اول تو وہ ملکیت کی دُور
 شخصیات کا نم کرتا ہے، ایک وہ جو قوم کی بہبودی چاہتی اور اس کی بہتری کی کوشاں رہتی ہے، دوسری شق
 میں وہ اُن حکمتوں کو شامل کرتا ہے جو صرف بادشاہ یا حکمران طبقہ کے مفاد کو پیش نظر رکھتی اور اجتماعی مفاد کو
 نظر انداز کر دیتی ہیں، اول الذکر کو وہ صحیح یا حقیقی اور موخر الذکر کو غیر صحیح یا غیر حقیقی کا لقب دیتا ہے، لہذا اس طوطے کے خیال
 کے مطابق تین اہلی شکلیں ہیں اور اُن کی تین معکوس صورتیں۔ اب حکومت یا تو ایک شخص کے ہاتھ میں ہوگی یا چند
 آدمیوں کے، یہ اختیار جہاں ایک شخص یا ایک ذات میں محدود ہوتا ہے اس کو وہ بادشاہت یا مملکت سے
 تعبیر کرتا ہے جہاں یہ اختیار چند افراد کو حاصل ہوتا ہے اُس کو اعیانہ اور جہاں بادشاہت کی عام جماعت حکمران ہوتی ہے
 اُس کو دولت عامہ کا لقب دیا جاتا ہے، معکوس صورتوں میں جہاں یہ اختیار ایک واحد شخص کے ہاتھ میں ہوتا ہے
 اور وہ شخص اپنے مفاد کے لئے حکومت کرتا ہے تو اُس کو غیر آئینی یا خود سرانہ حکومت سے تعبیر کرتے ہیں اور جب چند
 افراد محض اپنی ذاتی مفاد کے لئے حکومت کریں تو اس کو عادیہ اور جب بہت سے لوگ خود غرضی سے حکومت
 کریں تو اس کو عمومیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا ترتیب سے اس طوطے کا مقصد یہ تھا کہ اس سے نہ صرف مملکتوں کی تقسیم واضح ہو جائے بلکہ اس سے
 حکومت کے ارتقائی دور کا ایک خاکہ بھی پیش نظر ہو سکے، اس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ ابتدائی صورت بادشاہ کی
 تھی اس کے بعد حکومت اعیانی وجود پذیر ہوئی پھر وہ عادیہ و جباریت کے درج طے کرتے ہوئے حکومت عمومیہ
 کی صورت میں تبدیل ہو گئی، غرض کہ اس طوطے کے خیال کے مطابق بادشاہت کا زینہ پہلے آتا ہے اس کی وجہ سے تیار ہوا
 کہ شہرہاں کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے موقر و ممتاز آدمیوں کی قلت ہوگی اس وجہ سے وہ بادشاہ بنا دیئے گئے
 لیکن جوں جوں ممتاز و ذی اقتدار طبقے اضافہ ہوا تو اُن لوگوں نے ایک شخص واحد کی فوقیت و اقتدار سے
 نکلنے کے لئے ایک ایسا نظام حکومت ترتیب دیا کہ جس میں چند مختار روشن خیال افراد ملکر حکومت کریں لیکن یہ
 طبقہ بھی اجتماعی مفاد سے گریز کر کے اپنے ذاتی مفاد کے لئے حکومت کرنے لگا جس کی بدولت دولت عامہ عادیہ
 میں تبدیل ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ حکمران طبقہ اپنے ذاتی مفاد و اغراض کے لئے اپنی کثرت کو اقلیت میں تبدیل
 کر رہا گیا جس کا بالآخر نتیجہ عوام الناس کے اقتدار میں ظاہر ہوا اور اس طرح حکومت عمومی کا وجود عمل میں آیا۔
 اب یہی ملکیت کی اچھائی اور برائی اس کو وہ بالکل اضافی شے بتاتا ہے، ممالک و دعات کے لحاظ
 ایک ملک اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بُری بھی، اسی ملک بہتر ہے جو بہت عرصہ تک اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہو،

انقلابات کی زد سے محفوظ رہے اور افرادِ مملکت کا ایک مستبدِ بھدہ ہمیشہ اُس کے نظامِ حکومت کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہے۔

اُس کے بعد اسطوکرہ اور سارسی پر زیادہ زور دیا ہے اور ملک گیری و خوں ریزی کو مملکت کے نصب العین کے صریح مخالف سمجھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ مملکت کے تمام باشندے ایک ایسی روش پر قائم رہیں جو مملکت کے تمام عناصر کے درمیان رابطہ و اتحاد قائم کر کے بحیثیتِ مجموعی کل انسانوں کو زندگی کی تکمیل کی طرف لجا سکے۔ اور یہی بین بنی حقیقت مملکت کے وجود کا نصب العین ہے، ہر حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس غرض کی تکمیل کے لئے انتھک سعی کرے اور جو حکومت ایمانداری سے اس کی کوشش نہیں کرتی اُس کو فنا ہو جانا چاہیے، اُس شاندار مقصد کے حصول کے لئے جہاں اُس نے افراد کی پاکیزہ سیرت پر زور دیا ہے وہاں مملکت کی وسعت کے متعلق بھی کافی بحث کی ہے، افلاطون کی طرح وہ مملکت کے حدود کو وسیع کرنا مناسب خیال نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ مملکت صرف اُس حد تک وسیع ہونا چاہئے کہ وہ بلا کسی خارجی امداد کے اپنی کل ضروریات زندگی کی تکمیل خود کر سکے، دریا سے قربت ہو تو بہتر ہے تاکہ بن اشیا کی مملکت کو ضرورت ہو آسانی کے ساتھ غیر مالک سے منگوائی جا سکے، اتنی قربت بھی بیکار ہے کہ محض اضافہ دولت خیال سے تجارت کو ترقی دینے اور بحری جہد و جہدیں حصہ لینے کی تحریکیں پیدا ہو، یہ بیرونی دشمن کے حملے سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لئے اندرونی استحکام، برجوں اور قلعہ کی تعمیر، فنون سپہ گری کی تعلیم اور اسلحہ کی فراہمی نہایت ضروری ہے۔ باشندگانِ مملکت کی ذہنی سطح و اخلاقی میاں بلند کرنے کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ میں تعلیم کی نشر و اشاعت ہونی چاہئے، بلکہ تعلیم جبری کا نفاذ حکومت کی طرف سے کیا جائے تو اور بھی بہتر ہے، موسیقی اور جہانی تربیت کو بھی تعلیم کا لازمی جزو قرار دینا چاہیے۔

اسطوکرہس زمانہ میں موجود تھا اس وقت نظامِ سلطنت جلد جلد بدلتا رہتا تھا، اُس کے مطالعہ سے اُس نے تقسیمِ مملکت کا نظریہ پیش کیا، افلاطون کے برعکس واقعات و حالات کو بنظرِ اسحاق دیکھ کر اور اُن کا تجزیہ کر کے مملکت کی ارتقائی کیفیت پیش کی اور اُن اسباب کو تحقیق کرنے کی کوشش کی جو ملک میں انقلاب پیدا کرنے کے باعث ہوتے ہیں چنانچہ سب سے پہلا سبب انقلاب کا اُس کے نزدیک انسانوں کا مساوات کے لئے کوشش کرنا ہے، مساوات کی دو قسمیں قرار دیا جاسکتی ہیں ایک قطعی دوسری تناسبی عوام ہمیشہ قطعی مساوات کے لئے کوشش رہتے ہیں یعنی وہ اُن سیاسی حقوق و اقتدار کے حصول کے لئے انتھک جہد و جہد کرتے ہیں جو ملک کی چند سربراہانہ شخصیتوں کو اُن کی ذہنی، نسلی، مالی امتیازات کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں۔

اس کے بخلاف ان معدود سے چند افراد کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے مراتب و اقتدار کی حفاظت کے لئے ایسی تدابیر اختیار کریں کہ عوام الناس کی ترقی میں متقل رکاؤ نہیں پیدا ہو جائیں اسی آپس کی کشمکش کی وجہ سے حکومت کی بہنیتیں بدلتی رہتی ہیں اور ملوکیت اعیانہ عہدید یہ و عہدہ کے قیام کی کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔

انسانوں کے خصائص و معاندانہ جذبات بھی حکومت کے وجود کے لئے بہت خطرناک ہوتے ہیں مختلف گروہوں کے درمیان جب نفرت، بغض، حسد، خوف اور استقام کے جذبات پیدا ہو کر زیادہ تر ترقی کر جاتے ہیں تو مملکت کو انقلاب کا ہولناک دور سے گزرنا پڑتا ہے ایسے موقع پر انقلاب کی ذمہ داری بڑی حد تک مختلف سیاسی فرقوں کے مابین عاید ہوتی ہے جو عناد و مخالفت کی طرح کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کرتے ہیں عوام الناس میں انقلابی جذبات کی تخلیق اسی وقت ہوتی ہے جبکہ حکومت کی جانب سے اُن پر ظلم و زبردستی کی جائے یا اُن کے جائز سیاسی حقوق سے بالکل محروم کر دیا جائے۔ جب حکمران طبقہ میں نفاق و لالچ پیدا ہو جاتا ہے تو عہدید حکومت کا وجود باقی نہیں رہتا جب تک حکمران جماعت میں اتفاق و اتحاد و رواداری اور عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رہتا ہے ایسا حکومت کبھی انقلاب کی زد میں نہیں آتی اعلیٰ حکومت اُن کی درازدستیوں اور حرص و طمع کی وجہ سے عہدید حکومت میں تبدیل ہو جاتی ہے غریب و مفلس طبقہ کی بیجا خواہشوں اور تنادوں کی وجہ سے دولت عامہ عمومی حکومت کی شکل اختیار کر لیتی ہے کسی دستور میں اس وقت تک کوئی انقلاب یا تغیر واقع نہیں ہو سکتا جب تک کہ حکمران طبقہ میں کمزوری، خود غرضی، اور نفاق نہ پیدا ہو جائے مملکت کو انقلاب کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اسطونے جو تدابیر بتائی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی ایک شخص واحد کو مملکت کے سیاہ و سپید کا اختیار نہیں دینا چاہئے حکمران طبقہ کو خاص طور پر اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ دستور مملکت کے عیسوں کو مختلف طریقوں سے نظام حکومت کی حفاظت پر آمادہ رکھیں اور حکومت کی برکات کا اُن کے قلوب پر سکھ کر ہمیشہ اُن کی تائید حاصل کرتے رہیں مملکت کے اعلیٰ مناصب و عہدے ہمیشہ نیک لائق اور قابل افراد کو دیئے جائیں اور رشوت و مالی منفعت کے سارے راستے سد و دکر دیئے جائیں تاکہ وہ ذاتی مفاد پر مملکت کے مفاد کو قربان نہ کر سکیں حکام سلطنت ایسی روش اختیار کریں کہ جس کی وجہ سے تہم باشندگان مملکت کے دل میں اُن کی ذات پر اعتماد و بھروسہ پیدا ہو جائے اور وہ یہ سمجھنے لگیں کہ حکومت ان کی فلاح و بہبود کی دل سے خواہاں ہے اور ملک کی عام ترقی اور فلاحی کے لئے ہمیشہ سامی رہتی ہے۔

غرض کہ اسطونے انسانی فطرت اور اپنے زمانہ کے سیاسی حالات کا عمیق نظر سے مطالعہ کر کے انقلاب کے

جو اسباب معلوم کیے ہیں ان کی صحت و حقیقت میں کوئی کلام نہیں دنیا میں جس قدر بھی سیاسی انقلاب ہو سکے گا ان کی تحقیق و تجسس کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اسباب بھی بیشتر اسی قسم کے تھے جن کو ارسطو نے ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعض اصول ایسے ہیں کہ ان پر ہر ملکیت میں اب بھی بتا سانی عمل کیا جاسکتا ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس نے افلاطون کی طرح اپنی پرواز خیالی دنیا تک محدود نہیں رکھی بلکہ حالات و واقعات کا دوڑ بینی و عمیق نظر سے مطالعہ کر کے قابل عمل نظریے بنائے لیکن ساتھ ہی ارسطو کے سیاسی تصانیف میں خامی یہ ہے کہ اگرچہ اس نے گزشتہ اور اپنے زمانہ کے دساتیر حکومت کی خامیاں معلوم کیں اپنے پیش روں کے سیاسی اصولوں کو تنقید کی نگاہ سے دیکھ کر ان کی خامیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب کیا لیکن خود بہت کم اس نے اپنی طرف سے ملکیت کے نصب العین تک پہنچنے کی عملی تجاویز پیش کی ہیں اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو کا کام زیادہ تر تفسیری تھا کہ تعمیری افلاطون کی تہوہریریں اچھے لوگوں کی جماعت وغیرہ پر جو اعتراضات اس نے کیے ہیں ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ افلاطون ایک ایسا نصب العین بنا رہا تھا جسے وہ خود ناقابل عمل سمجھتا تھا اور ارسطو نے ان کو عملی تجاویز سمجھ کر اعتراض کیا افلاطونی اشتراکیت پر اس نے بہت وزنی اعتراضات کیے ہیں اور واقعی اس کے دلائل و براہین جو اس نے اپنی رائے کی تائید میں پیش کئے ہیں بہت ہی معقول ہیں اگرچہ ملکیت کا طلسم کہا جاتا ہے اس کے متعلق ارسطو کہتا ہے کہ جو چیزیں بہت سے لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان کی بہت کم پروا کی جاتی ہے کیونکہ انسان کو اپنی چیز کا خاص طور پر خیال رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ انسان کو اپنی ذات و عزت پر گزر عارضی نہیں ہے بلکہ فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہے۔

ملکیت کی جو اس نے تقسیم کی ہے ان میں بعض باتیں موجودہ دور کے لحاظ سے بے سود و بے کار ہیں اول تو ارسطو نے عمومیت کا جو مفہوم لیا ہے اس میں اور اس لفظ کے جدید مفہوم میں بہت بڑا اختلاف ہو گیا ہے موجودہ دور میں اس کا مفہوم وہی ہے جو ارسطو کے عہد میں دولت عامہ کا تھا۔

ارسطو کے قائم کردہ دور سیاسی کے تغیرات کے نظریہ کی تائید زمانہ قدیم کی یونانی شہری سلطنتوں و نیز اٹھارہ صدی میں انقلاب فرانس کی سیاسی تاریخ سے ہو سکتی ہے لیکن اس ہمہ یہ دعویٰ انہیں کیا جاسکتا کہ ارسطو کا قائم کردہ نظریہ دور سیاسی کے تغیرات کی شرط لازمی ہے لازمی ہی کیا اس کو معمولی حالت بھی نہیں کہہ سکتے تو ارسطو کو معمولی شکل سمجھتا ہے اسی طرح ارسطو کی تقسیم ملکیت بھی عہد جدید کی ملکیتوں کے اعتبار سے نامکمل رہ جاتی ہے کیونکہ دنیا میں ایسی بہت سی ملکیتوں کا وجود پایا جاتا ہے جو ان تینوں قسموں میں سے کسی میں بھی داخل نہیں ہیں اس کی ایک

برہمی وہ توجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ارسطو کا طریق تقسیم اعداد کی بنیاد پر تھا، دوسرے یہ کہ ہر ایک ملک کے باشندوں کی بود و باش طرز معاشرت و دیگر حالات کا دستور حکومت پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اور انہی اثرات کے تحت ہر ملک کا دستور جدا ہوتا ہے اس لئے ضرورت اس امر کی داعی ہوتی ہے کہ ارسطو کی ترتیب میں معتد بہ ترمیم و وسعت پیدا کر دی جائے، اول تو شاہی اور عمومیہ کے الفاظ ہی سے خلط بحث پیدا ہو جاتا ہے اگر ارسطو کی دوست عامر کے مانند عمومیہ کے معنی یہ ہیں کہ حکومت بہت سے افراد کے ہاتھوں میں ہو تو برطانیہ کی سلطنت اسی نوع میں داخل ہو جاتی ہے جس میں مملکت متحدہ امریکہ داخل ہے حالانکہ دونوں کی ظاہری ہیئت میں نمایاں فرق ہے ایک کی ظاہری ہیئت ملکیت کی ہے تو دوسری کی جمہوریت کی اس کے برخلاف کسی ایک شخص کو بادشاہ کے لقب سے لقب پا کر برطانوی حکومت کو شاہی کہہ دیا جائے تو یہ ایک مرتج عظمیٰ ہوگی کیونکہ یہاں بادشاہ کے اختیار پر گونا گوں انہی قیود و پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں اس سے ظاہر ہے کہ ارسطو کی قدیم تقسیم میں موجودہ دور کی انہی مشروط بادشاہیوں متحد و غیر متحد حکومتوں و نیز مجلس وضع قانون اور جماعت عالمانہ کے ایسی فرق کے اعتبار سے بھی حکومتوں میں تمیز نہیں کی گئی ہے اس لئے اب ضرورت ایک جدید تقسیم کی ہے۔

غزل

(انجم) ابوالفتح محمد سعید صاحب، "بائشیل" سالاد حیدر آبادی

وہ طوفاں اٹھے چشم تر بیٹھے بیٹھے	مجھے غم نہیں گریہ گھر بیٹھے بیٹھے
ادھر اُس نے تاکا کسے جاتے جلتے	ادھر ہم نے تھا ما جگر بیٹھے بیٹھے
نئی کیوں کریں ہم کسی سے جہمت	یہ کیوں مول لیں درد مر بیٹھے بیٹھے
اٹھا چپکے چپکے تو آفتے ستگر	فراہم کر اسباب شر بیٹھے بیٹھے
صبا کا یہ چلتا ہوا چٹکلا ہے	ہولی گل جو شمع سحر بیٹھے بیٹھے
تصور جو کرتے ہیں ہم لامکان کا۔	پہنچ جاتے ہیں عرش پر بیٹھے بیٹھے
یہ کیوں آنکھ غیروں سے تم نے لڑائی	یہ کیا خانہ جنگی ہے گھر بیٹھے بیٹھے
کسی طرح ٹالینگے ہم روز فرقت	ادھر بیٹھے بیٹھے ادھر بیٹھے بیٹھے
نیا تم کو سوچا ہے سالار نغمہ	غزل خوب ہے مختصر بیٹھے بیٹھے

الفصل ابو الفاضل

(از جناب شیخ عبدالغفری صاحب)

ہندوستان کے لئے سولہویں صدی بھی کیا مبارک صدی تھی۔ ہر طرف اس دامن کا دور دورہ تھا۔ اور رعایا اکبر جیسے شہنشاہ کے تیر اقبال کی مینا پاشیوں سے نئی زندگی حاصل کر رہی تھی۔
ہند کے چاروں گوشوں میں المینان و شادمانی کا ڈھنگ چکا تھا۔ اسی شہرت و انبساط کے زمانہ میں ایک ایسی سستی عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف لوٹتی تھی۔ جس کے وجود نے ادبی دنیا میں وہ شہرت و ناموری حاصل کی کہ ادبی کلیہ سے بقائے دوام کی سند اس کی خدمت میں پیش کی گئی۔ جس پر نہری حروف سے نقش تھا۔

ثبت است بر جریح عالم دوام ما

۱۵۵۷ء کی مبارک ساعت شیخ مبارک ناگوری کا مصیبت کہ وہ اس ادبی آسمان کے آفتاب کے طلوع ہونے کی وجہ سے جگمگا اٹھا۔ اور اس کی مینا پاشی مطلع ابر آلود میں پٹخاں ہونے تک برابر جاری رہی۔

پیدائش کے بعد اس ماہ چرخ سخن کا نام ابو الفاضل رکھا گیا۔ ابو الفاضل کے پدر بزرگوار کے استاد کا نام بھی یہی تھا۔ انہوں نے اپنے استاد کے نام کو مبارک سمجھ کر اپنے فرزند کو بھی اسی نام سے موسوم کیا۔ مہینہ بروز اگلے چلنے چلنے بات، کے بمصادق وہ عالم طفلی ہی میں اُن سال کو حل کر رہا تھا۔ جو اس سے دگنی عمر والوں کے لئے چیتاں تھے۔ ابتدائی تعلیم باپ کے خزانہ علم سے حاصل کی۔ اور پھر درس گاہ نے اپنی علمی گہرائشوں سے اس کے درجہ دماغ کو منور کیا۔ پھر کیا تھا، صدق دہن کے ٹھٹھے ہی درہائے بے بہا نخل پڑتے تھے جن کو سینہ کے صندوق اور دل کی خوبصورت محرطی ڈبہ میں جگہ دی جاتی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ قابلیت حاصل کی کہ آزاد کی ہستی بھی آخر یہ کہے بغیر نہیں رہی کہ ”پدر بزرگوار کے خزانہ عقل کا خزانہ اپنی اور جو اہر سحالی پچھوہ بردار ہو گیا۔“

ابھی اس کی عمر اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ تفتیہ دی میدان میں شہ سواری کرے لیکن یہ وہ شخصیت نہیں تھی جو خاموش رہتی۔ طالب علمی کے زمانہ میں جو اعتراضات کہ سعید الدین اور میر شید شریف پر کئے تھے لکھ رکھے تھے۔ مطول کے حاشیہ پر خواجہ ابوالقاسم نے بھی وہی اعتراض کئے تھے۔ جس کو دیکھ کر لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ فیضی اور مبارک دونوں نے اس کو اکبر کی خدمت میں حاضر ہونے کی صلاح دی۔

چنانچہ ان کی صلاح کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی فراست و دانائی کی وجہ سے اکبر کے دل میں جگہ کر لی، پھر کیا تھا! اس کا مصیبت کہ وہ دولت کا گہوارہ بن گیا۔ قابلیت کے نشہ میں بڑے بڑے محستہ ہندو

ملکہ تھے۔ اکبر نے کئی ایک انجمن اسے مباحثہ قائم کئے تھے جن میں علمی مباحث پر تقاریر ہو کر تھیں۔ انشا بحث میں اگر کوئی مقرر کسی مجتہد کا کلام سند میں پیش کرتا تو ابو الفضل کہہ دیتا ”فلانے حلوائی، فلانا موچی، اور فلانے چرم گر کے قول پر ہم سے بحث کرتے ہو۔“

یہ الفاظ علامہ عبدالقادر بدایونی کے ہیں جو اس کی علمیت اور شہرت پر کباب بنا جاتا تھا۔ ابو الفضل کی طبیعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ دارالانشاء کا عہدہ علیہ سرفراز کیا گیا جس کی اس نے تسلی بخش خدمت کی۔ اکبر نامہ اور آئین اکبری اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ مؤرخ الذکر بجائے خود ایک مکمل کتاب ہے۔ جو اکبر نامہ کے ضمیمہ کے طور پر لکھی گئی ہے۔

مکاتباتِ علامی کے تین دفتر ہیں۔ دفتر اول میں بادشاہ کی طرف سے سلاطین ایران و توران کے نام مراسلات و فرامین ہیں۔ جو امراءے دولت کے لئے جاری ہوتے تھے۔ اس میں الفاظ کے شکوہ، معافی کا انبوه، نفروں کی جستی۔ سفایں کی بلندی، کلام کی صفائی، سلطنت کے مطالب، ملکی مقاصد۔ ان کے فلسفی دلائل۔ آئندہ نتائج کی ساری دلیل ہیں۔

دفتر دوم میں اپنے خطوط اور مراسلے ہیں۔ جو انہوں نے امراء و اہباب و اقربار کے نام لکھے ہیں۔ دفتر سوم میں بعض کتابوں کے دیباچے ہیں۔

کشمول یہ شیخ کی بیاض کا نام ہے جس میں مختلف کتابوں کے جوآن کے مطالعہ میں آئین دلچسپ و مفید اقتباسات ہیں۔

جامع اللغات۔ لغت کی ایک مختصر کتاب ہے۔

رزم نامہ، نہابھارت کا ترجمہ ہے۔ ساتھ ہی اس کے ایک دیباچہ بھی لکھ دیا ہے جس سے اس کی انشاء پر داری کا اندازہ ملتا ہے۔

ان علمی کارناموں کے علاوہ وہ سیاسیات اور مورخ آرائی و دونوں میدانوں میں گوئے سبقت لگ گیا۔ جس وقت اس کا دماغ ادبی خدمت کی انجام دہی میں مشغول ہو جاتا تھا تو عبارت کی سیاہی ستاروں میں بدل ہو جاتی اور ناظرین کلام کے دل و دماغ کو جلی کر دیتی تھی۔

جس وقت وہ کرسی وزارت کو زینت دیتا تو دنیا کا زبردست مدبر اور سیاست دان بھی لگے پانی بھرتا۔ جس وقت میدان کارزار میں قدم رکھتا رستم و اسفندیار کے دل سینوں میں دہل جاتے۔ یہہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ و مشاہدات ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کسی کو اس میں کلام نہیں کہ اس میں بہت سی خوبیاں یکجا مجتمع ہو گئی تھیں۔ خدائے سخن وہ تھا۔ سیاست و تدبیر کا مجسمہ اس کی ذات تھی۔ اور اس کی سستی میدان جنگ کیلئے

تایخ بہت کم ایسی مثالیں پیش کر سکیں گی جس میں متضاد قابلیتوں کا حامل ایک واحد دماغ ہو۔

جو لوگ انشاء کے میدان میں چکر لگاتے ہیں اُن سے یہ توقع نہیں رکھی جاتی کہ وہ سیاست کے دشوار گزار راستہ میں قدم رکھیں گے۔ اور جو سیاسیات کے شہسوار ہوتے ہیں اُن سے ہم کیا امید رکھ سکتے ہیں کہ پولیس کی طرح میدانِ شجاعت میں اپنی بھادری کی داد لیں گے۔ لیکن ابو الفضل صہی کی واحد شخصیت تھی جس میں متذکرہ قابلیتوں کا اجتماع ہو گیا تھا۔ شاید وہ خصوصیات جو اس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہوں اپنے لئے باعثِ فخر خیال کرتی ہوں۔ بھلا اسد کب ان قابلیتوں کے پتلہ کو ٹہنڈے دل سے دیکھ سکتے تھے۔

سیلم کے دل کو اس کی مخالفت کی آگ نے بھڑکا دیا۔ اور وہ آگ اسی وقت فرد ہوئی جب ابو الفضل کے خون سے اس کو بجھایا گیا۔

وہ ہستی جو اپنے عنایت فرماشت ہشتاہ کی طلب پر۔ فرماں برداری کا دم بھرتی ہوئی تیز محامی کیسا تھ مہ اپنے چند جانبا زوں کے دکن کے دشوار گزار راستہ کو عبور کر رہی تھی۔ سردار بندیلہ کے لشکر سے گھر جاتی ہے۔ ساتھی جان بچا کر بھاگ جانے کی رائے دیتے ہیں۔ لیکن اس کی شجاعت اس بزدلی کے ساتھ جان بچانے سے میدانِ جنگ میں جان بحق ہونا مناسب خیال کرتی ہے۔ آخر کار شدید معرکہ آرائی کے بعد ستر سالہ میں واصل بحق ہو جاتی ہے۔

زخموں سے خون کی ندیاں بہتی ہوئی اس سمندر میں جا ملتی تھیں جس پر دوسرے جانبا ز قیامت کی نیند لے رہے تھے۔

اگرچہ اُسے گزرے ہوئے ایک زمانہ ہوا لیکن ابھی تک ہمارے دلوں میں اس کی یاد تازہ ہے اس کی بھادری کا تصور ہمارے کمزور قلوب کو طاقتور بنا دیتا ہے۔

سج سے

ہرگز نہ میر و آنکہ دلش زندہ شد مشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام

شبِ اُت و انتبازی

از جناب ابوالضیاء عمر عبدالکریم صاحب گل حیدر آبادی

انقلاب ہر سے عالم میں ہے اک انتشار
آج ہم اس پر ان بجا کو سمجھتے ہیں کرم
شوقِ حکومت کو کہیں مل اور تماشا کا و شوق
خوب گلچیں اڑائے آئی حسنِ شبِ اُت
اک طرف چھوچھوچا اور ڈھیلوں کی تپ
فرشِ ندے کی میں کیا کیا فرش پر گلیریاں
وہ پٹاخوئی تڑا تڑکی صد امیں و خواش
کھل گئی پونجی گرہ سے پھر تو انھیں کھل گئیں
صرفِ بجا کی بدولت لٹ گئی دولت تمام
جیب خالی ہو گئے اور ہاتھ خالی ہو گئے
لاکھ ہوں محتاج تو کیا دل سے سینے میں غنی
جل گئی ہے بان بسیکن تاؤ باقی رہ گیا
بات تو یہ ہے برائی کا نتیجہ ہے بُرا
اب بلا سے میری اے گل ہو اگر یہ ناگوار

روز لاتا ہے نیا اک دور دور روزگار
ہو گئے افعال بد حق میں ہمارے نیکار
مشغلہ ہم کو یہی ہے اور یہی ہے کاروبار
چھوڑی آنتبازی اتنی ہو گیا کھنڈر بار
اک طرف روشن ہوئے مہتاب گلریر و انار
چرخ پر سنگن ہوئی تار ہنڈل کی بہار
کان بہرے ہو گئے اور ہو گیا دل بقیار
جب کھائی حل گئی نکلا کھیس دل کا بخار
ہو گئے مقروض ہم لے لے کے اوروں آؤ ہار
ہو چکے تلاش تو پھر نے لگے متانہ دار
مفلسی میں بھی ہے پاس وضع اپنی برقرار
اینٹ ہناتا نہیں گو ہو گیا ہے حال زار
اب بلا سے میری اے گل ہو اگر یہ ناگوار

ایک تو شرعی گناہ اور دوسرے نقصان مال

تیسرے خلقت میں خست اور چوتھا دلچ بار

آخری خط

—

قدسیہ!

تسلیم۔ اور آخری تسلیم!!

قدسیہ!! میں اب تمہیں کس طرح "پیاری قدسیہ" کہہ کر مخاطب کروں؟
آہ! میں اب کیسے تمہیں وہ محبت بھرے الفاظ لکھوں؟ جن کے لکھنے سے ایک سرت، ایک قلبی سرور حاصل ہوا تھا۔ وہ محبت کی باتیں لکھنی لامحالہ ہیں؛ تم اب وہ "قدسیہ" نہیں رہیں جو پہلے تھیں۔

یہاں سے جاتے ہی تمہارا رنگ بدل گیا، خیالات تبدیل ہو گئے۔ تم اب میری نہیں رہیں کسی اور کی گئیں؛ کسی کی شیفٹ کسی کی دیوانی؛ لیکن مجھ سے بے اعتنا۔ میں آئندہ تمہیں کچھ نہ لکھوں گا۔ اور نہ لکھ سکتا ہوں؛ کیوں کہ میری زندگی ختم ہو رہی ہے،

میری روح نکلنے کے لئے تڑپ رہی ہے، میرا دل سوختہ ہو گیا ہے، اب طاقت ہے نہ نکت۔
یہ میرے آخری الفاظ ہیں۔ اور پھر تم اس کے بعد سنو گی کہ۔۔۔

"مسعود!۔۔۔ حرام! نصیب مسعود!۔۔۔ اس دنیا سے چل بسا؛

"قدسیہ"! میں نے اس دو سال کے عرصہ میں کتنے خط لکھے۔ مگر تم نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔
یہ بھی نہ پوچھا کہ۔۔۔

"مسعود زندہ ہے کہ مر گیا۔۔۔"

میں نے کس قدر منت سے التجا کی تھی کہ۔۔۔

"مجھے بھول نہ جانا۔۔۔ ورنہ میری زندگی برباد ہو جائے گی!"

لیکن تم نے جاتے ہی مجھے فراموش کر دیا۔ اراہ امیدیں آنکھیں بجھائیں۔ اُنہ انتظار۔۔۔ اس قدر کیا کہ انتقال کا وقت قریب آ گیا، آہ! اب دل مایوس ہو گیا، جگر جل اٹھا، جسم لاغر ہو چلا۔۔۔ میں تمہاری محبت میں برباد ہوا۔۔۔ دُسا ہوا۔۔۔ مگر تم نے کوئی التفات نہ کی۔

”قدسیہ!“
 سچ جانو! میں اب بھی تمہاری محبت کا بھوکا ہوں۔ اور اُس وقت تک میری زبان تمہارے نام کی
 تسبیح خوانی کرے گی، جب تک کہ میری روح نکل نہ جائے؛
 ”قدسیہ!“

میں اب تھوڑی دیر کا مہمان ہوں۔ میں مر رہا ہوں۔ تمام حسرتوں۔۔۔ ارا مانوں کو۔ لے کر دنیا سے
 اٹھ رہا ہوں۔۔۔ ہائے میری آرزوؤں کو تم نے نسل ڈالا۔ اسیدوں پر پانی پھیر دیا۔
 یہ آخری۔۔۔ اور بے آخری خط ہے۔ تم جیتے جی میرا نام نہ لینا! اور نہ یاد کرنا۔ میں اس دنیا
 سے اُگٹا گیا ہوں۔ میں ایک بے وفا۔۔۔ حق۔۔۔ د۔۔۔ س۔۔۔ ی۔۔۔ ہ۔۔۔ کی محبت کا
 برباد کردہ ہوں!

فرشتے۔۔۔
 بلارہے ہیں اور میں اُن کا منتظر ہوں موت سر پہ کھڑی ہے، جب وہ آئے گی تو میں ایک
 میٹھی ابدی زمین میں ڈوب جاؤں گا۔
 موت!

آہ پیاری موت! تو آ!! اور مجھے دوسرے جہاں میں لے چل کہ اس بے وفا دنیا سے نجات لے؛
 تو مجھے ایک ایسے گوشہ میں چھپا دے جہاں نہ کوئی فاتح خواں ہو اور نہ نومر خواں۔
 اے شعلہ محبت!

تو میری روح کے ساتھ بھڑک کر، زمین مہتی کو آگ لگا دینا۔ ہاں۔

اے جنگل کے پتو! تم میری راہ کے تودے کو ڈھانپ کر، ہمیشہ اور ہمیشہ کیلئے نظروں سے رولوش کر لینا۔
 کیا قدسیہ! وہ دن یاد ہے؟

تو نے کہا ”مر“۔ تو مر گئے ہم! فقط

تمہارا بھولا ہوا
 مسعود

رقیب جیل آبلدی

بان دکن

(حکیم الحکما، نواب صحت طلب خاں بہادر شہر حیدر آبادی)

نواب عالی رفاعی نے اپنے تذکرہ شعرائے دکن میں ان کی نسبت لکھا ہے کہ:-
 محمد اکبر خاں نام، اور حکیم الحکما نواب صحت طلب خاں، خطاب خاندانی طبیب شاہی
 اطباء میں تھے، لیکن ہمارا راجہ چند ولال شاداں (دیوان دکن) نے سرکار کی اجازت سے اپنے
 رفقا میں شریک کر لیا اور پچھلے آبائی منصب کے علاوہ اپنے پاس سے بھی دو سو روپیہ ماہوار
 مقرر کر دی تھی، راجہ چند ولال شاداں سے کسی بات پر ناراض ہو کر شہر لانے لگے، ہمارا
 شاداں نے حذر خواہی کر کے بہت کچھ کوشش کی کہ شہر کا خضہ آتر جائے مگر ان کی نازک
 طبیعت نے پھر شاداں کے پاس جانا گوارا نہ کیا اور ماہوار بھی واپس کر دی تو شاداں نے
 تتر کے بھائی محمد اصغر خاں المخاطب نواب عافیت طلب خاں، طلب تخلص کو اپنا استاد
 سرجن بنا کر دو سو روپیہ تنخواہ مقرر کر دی اور شہر کی ماہوار بھی اُن کے ہاتھ لکھ بھجوا دیا کی
 (اقتباس تذکرہ قلمی)

نواب عافیت طلب خاں ایک مشہور شخص تھے جن کا مختصر حال اکثر تواریخ دکن میں ملتا ہے یہ بھی بھائی
 کی طرح نازک مزاج تھیں چنانچہ گلزار آصفیہ (ص ۲۱) میں لکھا ہے کہ ”خوش اخلاق اماز و در بنی اش شہور تراست“
 ”تذکرہ نقش“ (قلمی) میں بھی شاعر کی حیثیت سے ان کا حال لکھا ہوا ہے۔

طلب تخلص، حکیم عافیت طلب خاں مرحوم، از دست سے
 ہو چشم کے پیالہ میں غضب سرم کی رنگ
 قاتل یہ طینچہ ہی شہر باز نگہ کا
 لیکن یہ شعر شہر کے دیوان میں شہر کے نام سے ہوا
 اور خود شہر کا حال بھی تذکرہ نقش میں اس طرح لکھا ہے کہ:-

شہر تخلص، صحت طلب خاں، برادر حکیم عافیت طلب خاں، طلب کہ از کمال نامداران بلد
 بود، بلند فکر، خوش طبیعت، اکثر مائل با باجی ریکہ می بود، از دست سے
 منہ ترا دیکھے سواتن سے نہیں جانے کی وجہ
 یاد میں زلفوں کی اگلی ہی جو دیوانے کی تھی۔

مولف تذکرہ نے شرر کو "مائل باباجی" رکھ دیا، لکھا ہے، میرے سامنے شرر کا جو دیوان ہے اس میں ایک شعر بھی "ہجو یہ" نہیں ملتا۔

شرر کے والد کا نام حکیم شفا طلب خاں، بند رسورت کے رہنے والے، مرشد زاوہ آفاق عالی جا (میر احمد علی خاں) خلف حضرت غفران آب (آصف جاہ ثانی) کے ہمراہی طبیب اپنے عہد کے جملہ حکما میں ممتاز، شعر بھی کہتے تھے، ارسطو جاہ کی صبح میں ان کا ایک قطعہ میری نظر سے گزرا ہے۔ شرر اپنا اقاروف ایک شعر کے ذریعہ اس طرح کرتے ہیں یہ

شرر تخلص ہو جاتے ہیں یہ سارے معشوق اور عاشق
 "سراں پروانہ" کے لفظی لطائف ملاحظہ ہوں، شاہ سراج اور نگ آبادی ولی کے معاصر مشہور شاعر ہیں پروانہ شاہ پروانہ ان کے شاگرد بھی مرید بھی۔ استاد و شاگرد اور مرشد و مرید کے مراسم قلمی پرثوق و عاشق، سراج و پروانہ، روشن و مجلس کے الفاظ متجانسہ سے روشنی ڈالتے ہوئے شرر نے اپنی مثال پیش کی ہے

شرر کو رنجیت میں میر اسد علی خاں (تندر آبدی) سے ملز تھا، خان تندر میر و مرزا کے معاصر شرر اپنے لہذا کا اشعار میں صاف صاف اقرار کرتے ہیں یہ

فیض سخن ہو مجھ کو تنہا سے اے شررا کہنے لگا ہوں رنجیت اُن کی صلاح سے
 اے شرر! شعر کے کہنے کا ہوا دل بہشوق رنجیت خان تنہا سے بنانا سیکھا
 اے شرر! ملک کن سے ہو مروج تاہند حضرت خان تنہا ہی سے اشعار کے دھب
 شعر و شاعری کی عظمت، لوازم شعر کی ضرورت اور آداب شہرت پر، شرر کی شرفانیان دیکھنے کے قابل ہیں یہ

جاگ میں شعر و شاعری کی دھوم ہے جیسے سحر سامری کی دھوم ہے
 ایک ہوا استاد کمال جس کے ہوں شاگرد لاکھ شاعری کو نقص ہو لیوے جو عالم کی صلاح
 ہر گھڑی، ہر آن لازم ہو شرر غور سخن ہم نے اپنے شعر پر ہر آن ہر دم کی صلاح
 تحریر میں سخن کی دل ہو شرر پریشان اشعار جمع کیجیے دیوان کے برابر
 کوئی جہاں میں سمجھتا نہیں سخن کی قدر کرے ہو صرف تو بے جا شرر داغ افروز
 بنانا ہو زبان سے تو نرے کی کچھ عجیبائیں شرر مشہور عالم میں ترے اشعار ہوتے ہیں
 حیدر آباد کن کی وطنیت اور اس کے باشندوں کی چہل پہل کو شرر دیکھتے ہیں اور ضبط نظم

کر رہے ہیں سے

حیدر آباد کی کرتے ہیں صفت پیر و جوان آئے لوگ بسے شہر کہن میں چل کر
حیدر آبادی نخل پتے بستنی پوش ہیں کچھ، اس شہر پر کشمیر اور کابل شہر
شر کا زمانہ گو بہار جد شاداں (وفات ۱۲۶۱ء) کے دور سے تعلق رکھتا ہے لیکن شر نے
اپنے جن معاصرین کا ذکر کیا ہے ان میں کے اکثر دربار شاداں سے پہلے ہی گذر چکے ہیں۔

ان میں بعض شر کے دوست تھے اور بعض استاد بھائی اور یہ دو دربار صوفی صمدی کا
نصف آخر تھا، اس اعتبار سے یہ رے قائم کرنی پڑے گی کہ بہار اضواء کا دور شر کا باہل
آخری زمانہ ہوگا۔ معاصرین میں صرف شر نے شوق، مہر اور ایمان کا ذکر کیا ہے
اس شوخ بادہ خواہ سے پوچھا میں ایک روز ”ہم تجھ کو محکشی کے سوا کام اور بھی؟“
کہنے لگا یہ قال ہو اپنا بقول شوق ”ساقی! نشہ میں چور ہیں اک جام اور بھی“
پابند کیا دل کو یہ تہر کے مصرع نے ”یو والے! مبارک ہو زنجبیر بہارانی“

واسطے حضرت ایمان کے جلسہ میں شر دو ستولے کے یہ اشعار چلا آتا ہے
شوق (غالباً) ان کے استاد بھائی، محمد علی نام، اورنگ آباد وطن، جنھوں نے ۱۲۱۲ء
میں میرامن دہلوی کی (باع و بہار (چہار درویش) سے پہلے اس کے مشہور قصہ کو نظم کا
جامہ پہنایا تھا۔ جس کا ایک مکمل نسخہ میرے پاس بھی ہے رسالہ تاج حیدر آباد جلد (۳) نمبر ۱
بابت تیر ۱۲۲۲ء میں بھی اس پر مضمون چھپ چکا ہے۔

(۲) مہر علی شاہ تہران کے والد حضرت آصف جاہ اول کے ساتھ دہلی سے دکن آئے اور
فتح دکن کے بعد اورنگ آباد میں مقیم ہو گئے۔ تہر تبدیل لباس کر کے اپنے مرشد کی قبر پر
بیٹھ گئے۔ شر کے استاد حضرت تنہا کے ہم مکتب ہونے کے علاوہ روحانی اشتلاط بھی
رکھتے تھے (تذکرہ تنہا قلمی و حینستان شعرا ص ۳۰۲)

(۳) ایمان، شیر محمد خان نام، دکن کے شہور استاد، مجلہ مکتبہ جلد (۱) نمبر (۶) میں بادہ
کے عنوان سے ان کے حالات اور کلام کا انتخاب چھپ چکا ہے۔

اب شر کے حالات و واقعات معلوم کرنے کا ذریعہ ان کے کلام کے مطالعہ کے سوا کوئی اور
علم میں نہ آسکا۔ زیادہ سے زیادہ اور مطالعہ کلام سے ان کے معتقدات مذہبی کا اندازہ اشعار
ذیل سے کیا جاسکتا ہے۔

شر تخلص ہو جانتے ہیں یہ سارے مشوق اور عاشق
سراج چروانہ سال ہو روشن ہر ایک مجلس میں نام میرا
جب دیکھا ہوں میں حال ترا ہو گیا عاشق کمال ترا
ڈھیر پر عاشق کے تجھ کو ڈالنا لازم ہو چھوٹ
تربت پروانہ پر لے شمع روشن بگل چڑھا
صد کمر میرے دل کا بھی تھا ملا دبر ملا جان ملا دل ربا ملا
خود میں ہو خود بند ہو خود کا خود آئینہ روملا یہ عجب خود ملا
ششاد فناختہ سے لے لبلبوں گل پر مجھ سے تو نہ ملے دے دے دے ملا
تری ہر قسم کو میں کیا نہ کہوں نہ جفا ہی کیا نہ دفا ہی کیا
تجھے کون کہتے کہ راجہ کیا یہ جو تو نے کیا سو بھلا ہی کیا
اس ہر کے گلشن میں یہ رنگ نطسہ آیا
جو غنچہ نظر آیا دل تنگ نطسہ آیا
واں کچھ نہ نظر آیا جہاں قصہ فریدوں تھا
یا خاک نظر آئی یا تنگ نطسہ آیا
نامہ برکتیو بانی کہ بامیدصال شرح الفت کا لکھا یا ہو کہوت
پردہ زلف کو چہرے تھا کیا کہو اس قلم شام و صبح ہو کہوت
عشق میں کیا ہی حالت نہیں تھا کہوت کبھی لگا یا کہوت مجذوب
آہ کا شعلہ تاب تک پہنچا یہ جواں آفتاب تک پہنچا
چشم نبیائی اس نے پیدا کی جو کہ قطرہ جاب تک پہنچا
جس نے دیکھا وہ دیدہ بیدار نہ خیال اس کا خواب تک پہنچا
گرمی سے آہ کی شرارتوں کی ہے نالہ لے لے لے غم کی کی
یہ خیال خضر زری کو خواب میں زاہد کو گھر سے آدھیا نہ لے گیا
جس نے فرے سوا وہ کشتی کے ہو گیا وہ خطیثہ لذت پیمانہ لے گیا
اُس شمع کے جگمگ عاشق ہو گیا دل کو مہر بنا کے جو روانہ لے گیا
کیفیت کہ میں لبلبوں کی کیا کہو اس سبز خط کو دیکھ کے ان رنگ ہی

آہ آتش بن گئی اور انگ لگا بگیا ببقاری ہر دل چٹک پرا بگیا
زندگانی میں کچا ہو تنگ جس نے لے شر اُس شخص کا نرگوار بگیا
تجھ کو سو آپند کے کچھ سو جتا ہیں آنکھوں میں بھرا ہو ریا بگیا
بیراز ہو شر سے اس غلام بندے چل سامنے سے دھوئی ان ریا بگیا
یہ جیسی صورت تھاری کھی میں یہ جیسا لے یاد بگیا
نہ ایسا غنچہ کارنگ دیکھا نہ ایسی گل کی بہار دیکھا
ہیں صد تے یا تو تن ان ہوں پر ہیں موتی دندان تیرے بگیا
چمکے الماس میں تیرے دیکھی نہ لعل یوں آب دار دیکھا
شران گل خروں کے عشق میں لاپوٹو کہ تیرے گل جناب کو کہ دیکھا
شراب عشق کے مئے داغ گرم ہوا کہ جیسا تیل ہو روشن چراغ گرم ہوا
ہزار شاخ لے بل خزان کو لگئی بہار آتش گل سے یہ بلغ گرم ہوا
اکشاک پوچھ لے ملے کی سانی ہے تارے فدا کے اک ان میں بگیا
وہ غنچہ لب ہوا ہی ہم غنچہ تابندہ اندر نے شگفتہ گل مدعا کیا
اُس ہونو کو کیوں بل اس دل کا تھا کرنا نہ تھا یہ کام شر رتو لے کیا
یہ دل صد چاک اتوں کو خیال بگیا زلف کے کوچہ میں تیرے شل بگیا
ہمیشہ شام و صبح میں ہمیشہ چلا ہی جا ہے یہ دل کدور بگیا
ہے بندہ مطلق فراموش کا نعمت گرم ہو یا دھواں شر کہیں بگیا
میں مودن جبریل دل میں ہے کہیا پر بامیدصال اور مجھے جیسا تھا
ساقیا ہم تم الفت کی پیٹے ہیں تو اگر زہر بھی تیا تو ہیں نہ تھا
نیم جاکر چمن میں کہو تو لبلبوں کو سلام میرا
درو پڑھا ہوں رو گل پر فیض میں ہو کام میرا
ہمیشہ غمور دست ہوں میں ہو خواب میں بھی خالی تیا
شراب الفت خیر شیشہ دیدہ تر ہے جام میرا
بنا گیا ہوں عمارت بے ستون سخن کی میں ہو ہوں خسرو
زبان شیر ہو کہ بن دل دہن ہو شیریں کلام میرا

گل جل گیا ہوا آتش رخسار سوترے غنچہ دہن کو دیکھ کے دل بنگھی کا
 میخانہ ہونے لگا تھا ہوا سیریاغ ہو جس جگہ تو را تو دمان گاہی
 جن دم کیا خیال تھا نزدیک ہی کو مجھ سے دور کوئی فرنگ ہی کا
 کئے سے انسانی کوئی آستانہ پایا اس میں فنا جاں میں کوئی برفانہ پایا
 ایسی ہی کچھ کچھ دور عالم میں ہم کچھ آئینہ کے بھی دل میں نگہ صفائی پایا
 ہر وہی افلاک سے شام سوداغ کیا سخن کا غور ہو اللہ روبرو
 لئے ملے بر تواریح کے کوچ سے جلد پھر میں کیتا رہوں گا تری اوہ روبرو
 نیکو کے نام سے تجھ کو اس کے رنگ سے ہمراہ تیرے سے ہی خواہ روبرو
 اُس لعل رخ کاہوں میں گرفتار دور شام و صبح سے ہی مجھے تکرار روبرو
 کچھ تھا میں وہ طرہ دستار لکینے آنسو سے گلے کے ہوا روبرو
 بلبل مجھ بلبل سے ادھار سے گیا گل و کا دیوانا ہوں گلزار سے گیا
 اس کفر و ایمان کے قطع تو شکر کو تسبیح سے کیا مطلب ہے کیا مطلب
 تم جھوٹ کہو پر سچ کو کون سمجھیں تقریر سے کیا کام اور کرا سے کیا مطلب
 جس جا شہر کے دل سے وہی جا کر اُس بار سے مطلب ہو اغیار سے کیا مطلب
 یہ تو اوض میں جھکے ہو بسلام و تسلیم شیشہ ساغ کا کارے ساقی کا یہ خواہ
 شیشہ کے تن پر سر پائو کی دھماک جینے ہو شکل ادب صورت دستار ادب
 راز دل کا یہ شہر ہونے کا ہر گز آہ جاں نزار ادب یہ خونبار ادب
 فصل گل آخر ہوی پھرتی ہو گئی ہو خراں کے ماتھے سے بطحہ الاغیاد
 کس کس کوئی لکھتے یہ تختہ لالہ دین بن بن کس کی شمع سے ہو یہ خیال غلب
 اجین میں حضرت گل کی جگہ میں باغ و بستان میں مگر سخی میرا ان عین
 لکھ ہو کیا مرتبت میں ہو کمال غلب نصیب لاکر ہو تو وہ واہ نصیب
 یوں کہ اس گل لطف کی تناسلے کرم کی شمع سے مجھ پر کے لگا نصیب
 قلم سے کاتب قدرت نے جو لکھا ہو لکھا نہ سراہ غور و جزو براہ نصیب
 اور کیا ہو کہ ساقی اس بہر حیات مئی ہو پینے کیلئے آغوش میں محو حیات
 پشیمانی ہو جو گل و لکھا شرب زہر زنگہ کی لاؤں نہ ہر بار شرب

شراب حیرت دل ہو شراب اجرت کا شراب تہیے دہر شراب یا شراب
 مجھے جن میں کہا ایک دن گل کرنے لے آشراب جو خوشبو ہو خوشگوار شراب
 یہ بات سنتے ہی میخانہ کی طرف پہنچا کیا خرید و مان حال کے بے شمار شراب
 شراب لائے کیا عرض کی حد تیرے نہ بھولے جو پئے وہ ہی کا دکان شراب
 نیند آتی ہو مجھے دام قصور میں سر خیال زلف تیرا رات کو نہ بخواب
 ہر سخن مکر کیا یہ ہر مکر بات ٹھول ہم مجھے ہیں تری خوشی غنچہ کو ب
 رنگ دیکھا اس زمانہ کا بشر ہے نظریں کیا فزا اور کیا تب
 ہر تعب ہی تعب اس جن میں ہر گل غلب اس گل غلب غنچہ غنچہ غنچہ
 بے سبب منت میں تہا نہیں لی ہو اپنے ویرانہ کو کرنا ہی یہ آباد غنچہ
 اُس کی عاشق کی لذت کا مزہ کچھ جان شیریں سے گدہ ہی کیا فزا غنچہ
 اُس لعل رخ کے سامنے کیا آئے آفا شراب بلکہ ابر میں جھپٹ جائے آفا
 دیکھ جو کہ جہر انور کی اک جھلک بے شوش ہو کے گرا پئے غش کھا آفا
 جذب کرانک آہ لے آفا آفا جس طرح آگ پر لڑا ہے ہو سیاہ آفا
 بلغ ہو سیر ہو اور بار ہو امون گل بول ساقی کو شہر لائے شہی ناب آفا
 میں اس شہادہ کا کوئی نہ جھکوں گا بہت آغوش تو بلغم میں سرور آفا
 دام سے لغو نہ ہو رخ و دل آزاد چھوڑ دیتا ہی کپڑا کھد کو میا داب
 بھول جانا پھر کرنا ہی تری وضع بات سہتی ہو فراشوشی ہو جھکوا داب
 اُس نے کیا دوا چاہی کی لکھتے دور و تیرے سر مالہ نے کی فریاد داب
 اب تو رات آتش ز فرت دل جلا ہوا ہے شرابا ہو دیکھیں وہ تمام بجا داب
 چلے دل کے آنسو چلتے ہیں چشم ہے یا قوت میں آگ گوہر میں آب
 نذر کرنے جاں نہیں تیرا اتفاق ہے دل کو کرواتے براہ خلق طلب
 جس کو کیا سیر نہ چھوڑا وہ قید سے کہ بلا کا زلف مغرب کا بندہ
 وہ صنم کی اوکے شمار ہوں میں کہوں کیا بت ہوش باکی صفت
 وہ خدا کی قسم ہے خدا کی صفت وہ خدا کی قسم ہو خدا کی صفت

کس کو پہلے علم و احساس کی پہلی تہہ میں بے شمار یاد و غم کی بے
 ہنگامی سب ہنر کی بے ہنری عیب ظاہر ہوا کمال کے بعد
 لے شر پہلے سچ پھر کچھ کہہ ہے جواب سخن سوال کے بعد
 جب نکلتا ہے عرق کو وہ وہ ٹھیکہ تارے چھپ جاتے ہیں اور نہ تو چھپتا
 قمر ہو گلشن میں ہر دم ملیلو آواز اپنے ویرانہ میں ہم مرغ باغ کو درنا
 نکل ہی گئے ہوں نہ پر جو بات ان دنوں میں ہو کہ کب تک کب تک ہائیرا
 ہام ہو گئی جن میں شہر کی بوند گئے اتاری سے جن شہر کی بوند
 شربت وکل کی ہول کو تباہ آتش لہتہ سے یار کے ہونے کا بھی علم لیند
 ہزاروں نامہ میں ہیں ہر خوشی ٹپے نہیں سے لے کو سباز کا کاف
 رہبر و راہد تو آسکتا نہیں ہے خوش اس قدر خفہ میں نہیں کیا پاک
 تو نظر کے تو آرام نظر آتا ہے ورنہ دل کو کہیں انہیں آرام نظر
 کچھ آہ کا معلوم ہوا دل پر بھر گرتے ہی چشم سے اب نہت چکر
 سب فرہیں اس جہاں میں سرریاں کسی کو نہیں وطن کی خبر
 زلف کا لگی گناہوں میں جی کی ہو چکا گناہ خانہ دل کے درو دیوار پر
 داغ دل سے تو رنج آفتاب میں عین یہ ماسا اور ہیو سیاور ہو گھر اور
 تھاتا ہو لے شہر چرخش انکار اگر کا برائے چو نہ آہ آتش بل اور
 اپنے گھر میں تو مجھے ملتا نہیں کلمہ کے جانا ہوں رو دیوار پر
 آہ بھلی ہے کلیجا جب سر کر دل پر اس ظالم کے کچھ تاثیر کر
 باغ میں کچھ اگر تھو تو تو بھل تھا رنج پیر سے گل ہو نہ زلف نہ لٹا
 یہ سرس میاں دل پر تیرے جام شہر پر ساغر لیز قریاں شہر پر بل شاد
 ہو خدا اس رنج دل پر شہر باغ کا لا لہ لہار صد غمہ قریاں گل شاد
 رنج اصفی عاشق کے ہوں تیرا شوق کوئی سر ہے جیسا کلمہ ہو نہ کلمہ
 آج لے یار کریں سر عین میں کل کر منی میں خوب سی گھوکی میں جل کر
 گلو ہو خدا سے دل میں غلش ہنوز اسل تش بگر کی ہی ہو شہر ہنوز
 زلفی تیرے تو مجھے دکھا بہت شہر شہر سے ہو جام دل ہر لیز

جودیکھتے تھی تری چشم کو تو ہو کر زمیں پھینک دے ساغر شہر کا لیز
 چشم ترکیوں ہو انوکھا کیرے آردا ہجو کار و زہنت اور شہر دراز
 شربت مول سواد کا علاج ہو نہیں ہو گیا ہجو کے یار کا آزار دراز
 رہتے جام محبت کے شہر درو شہر عمر ہو کو تیری لے سانی ہو دراز
 ہو جا جدا بندہ گرد بندگی ہو ہے لیکن جدا ہو بندہ سے خدا ہرگز
 ہمسایہ تیرے زلف کا دل چاہتا رہتا ہو یہ دیوانہ ہمیشہ بلا کہ پاس
 آرزو ہی ایک ہی سہرو رواں دل ہے قدموں کے تیرے راتیں
 کر دیا ستوں کے تیں خانہ غراب و خضر زہی عجب بد ذات ہیں
 بن ترے لے ہی قاتل مر گئے کھینچ مت تلوار کر لے باپ ہیں
 ہو گیا کھن جس کا فر زبانی نقیض صبح کا حقہ بخت کیلی بیانی
 لے شہر و حال آل غمہ غفلت تھی تو نے ساری عمر کھینچا جانے خدائی نقیض
 ورق چل کر کھکتے ہیں بایں سخن کرتے نہیں عاقل فراموش
 شہر کو یاد ہی ہر دم یہ صبح فراموشی شدہ ازل فراموش
 دست بھیس کو جو دیکھ نظر بدو سر اسکا تو دل سے لگا دیو خانہ
 تیرا جن جگہ میں جمے ہو چھپی کی طرح دل سے کہے ہو بات ہی دمدم رہا
 اپنا یہ سب شہر خانہ کا طور کرتے ہیں ہر ردیف میں اسکا نہ رہا
 دوتی پر ہر کسی کی مت شہر کر اعتبار ہونے دیکھا ہی ہے اسکا نہ رہا
 آنکھوں میں ہو تصویر کچھ غافل ہو دل پر نقش و نگار خطا عین
 کیا بہار حسن کی تائید کو آتا ہو خطا دیکھ کر عارض کی سرخی نہ ہو جانا
 جب تو جن میں ہو تو غفلت کے کچھ نہا تجھ میں کوں میں بگشتاں نہیں غفلت
 کیا ہو آپ کے ہاتھ سلام نہ غفلت اگر تے بل لے لگے ظلم نہ غفلت
 کہے ہو دیدہ کے تواتر کا کلمہ نہیں ہوا شہر تھے آوارہ کا کلمہ
 نہیں ہو بار کا خفہ شہر کہ آتش ہے ہونے لگا ہوں آتش شہر کا کلمہ
 ایسی موت ہی میں کچھ ہو لے خون ہر گز لے آتش کا کلمہ
 کالی گناہیں اپنی لے جو مگر گریں اپنے کول لے وہ ہار لے

دیکھئے ہر بہت مند کو ترسے شرم رگل گل روزہ لگنے کو کہیں نہ بنگل
 چل دھوم سے آئی جو بار بار کھینچ لبلبل بھی گئی باغ میں سن کر بنگل
 شمشیر نگہ لگی کسی کی چرمین کٹ غنچہ گئے ہو گئی مگر ہے بنگل
 ہتھکے دیکھے ہر لگا لگا تماشہ ہیں آہ کی گریز جھڑتے شرم رگل
 کیا باراتی ہو ہیں گل ہر ترے رنج دیکھ لے گلشن میں بل ہر ترے رنج
 ماتھے سے اپنے اشارہ کر باقی ہے غم شاخ کو گل کی نہیں یار دہلائی ہویم
 مجھ کو اتنی جو اس گل پر ہیں کاشکے کہ نہکست گل رخسار گلشن لانی ہویم
 دیکھتا ہوں جس کو اس کا ہو اسیر یارے الفت کا یہ ڈالا ہو دام
 بن گیا جنوں دل فدا عشق حسن لیلی پر ترے شیریں کام
 میں نہیں ہوں کار فرما صفات ذات سے اللہ کی رکھتا ہوں کام
 کیا شر کو روز محشر کا ہے خوف یا رسول اللہ تیرا ہوں علام
 میکشہ ایکے ہو کیفیت آب بال ساغر ابر ہے لمبہ ز شرب اب بال
 چہرہ کو لے زلف کے کچھ کام بھی ہیں وہ صبح کو نہی جو جسے شام بھی یہ
 ساتی سجانہ کی کوئی ستانہ نہیں شیشہ اپنے میں نہیں چاہے اپنے نہیں
 ایک شہ عشق کا دونوں کے تکرار ہے شمع اپنے میں نہیں پروانہ اپنے نہیں
 کیا داں چپک کے کھلے جگہ سے درواہ زلف اپنے میں نہیں اور شانہ اپنے نہیں
 جو عدم کے ہون سے غم مصمم نہیں دور ترستی میں وہ مہلتے ہیں گنجے ہیں
 جاتا ہو انجیل کی حقیقت اول دن مصدق کے مہر جان بکایا بیٹے ہیں
 ہم دور سے وہ صورت اللہ دیکھتے ہیں جس طرح آسمان پر شمس دیکھتے ہیں
 مینا و ساغرے۔ ابرو ہوا وانی گرو تری چین میں بے دیکھتے ہیں
 نگینوں کے دل کو کرتی ہو دم لولہ ہم بھی ترے اثر کو آہ آدھتے ہیں
 تجھ سے شرم کہوں کیا اس خیم کا تماشہ نظروں میں ہم گم کو ہم شاہ دیکھتے ہیں
 مٹھن عشق کو دریاں کی احتیاج ہے بنیر شربت دیدار کچھ علاج نہیں
 شہو خوشی ہی میں کٹے جزندگی کے ہمیشہ زلیت کی کل کی پر کھنڈ ہیں
 آندہ دی جان دل تجھ پر مرنے والے عید کے رختانہ خوش کماں کر

دل تجھے دو باج دو ایسا دو کیا کچھ واسطے تو غم نہ کیا نہ کما سال کو
 دشمنوں نے کو یا بدنام میرے عشق کو دوستو اکس طرح راز دل نہاں کر لو
 ہو گیا ہوا بی بی یوں کا دیوانہ شرم و خوف سے پھرے ہیں گے کسے پتھر
 ہو قید زلف میں دل دلیکڑا توں طاقت نہیں ملا سکے بجز ناتواں
 بے اختیار گل کی طرح ہنس کے پھوٹا اس غنچہ لب کی دیکھے جو تھوڑا توں
 قاصد یہ کہتا ہے زبانی مرا پیام رکھتا نہیں ہو طاقت ہر تر ناتواں
 بس ہو مہر کی گم کی دستار سے تبا غلام نہیں یہ قابل شمشیر ناتواں
 کرتی نہیں جو دل پر اثر اس کے ہر شرم اسے اندر کی ہو تاثیر ناتواں
 جام کہاں ہو دم کہاں جاہ کہاں شرم زمرہ پھر صدم کہاں تم کہاں اور دم کہاں
 مجھ سے کہے تو دشمنی اس پر زیادہ رکھا کہتے ہیں جس کو دوستی ہوتی ہے اس کو کہاں
 نہیں کیا بہت دشمنی تم بھی نہیں دراز ایسی نہیں کوئی و نزل ہم بھی نہیں
 بنالغ ناصر عبد الم کا یہ پستلہ ہو آبی آب و آتش ہوا و گل ہم بھی نہیں
 آتش آہ لگی جب بگل کی تہ میں لعل اشک کے چھپے دیو تر کی تہ میں
 مثل کا کوئی نہ شگفتہ ہو یہاں غول وہ جو جھٹے ہوئے شریف مال کیاں
 مضرت ال میں شرم چشم بنائے شوق کچھ بلال کے نہ یاد و گھاس نہ لاویاں
 کیا اور یہ نو اس میں ہزار کردار گریز تو اس پر خود کردار کو دیکھو
 اس سر و خراں کی ملک سمجھو کئی؟ ام لکائی ایکارتی قرار کو دیکھو
 خوش وضع نہالے کوئی شمع تو اس کی دستار کو قرار کو گھار کو دیکھو
 اس شمع کے لکڑے لافانہ نکلتے ہو لعل شہ جرن بھی پروانہ نکلتے
 یہ گردش نلک بھی نہیں سیاسہ کم پیسہ جود کو خلق کے چون دانہ نکلتے
 آج جڑ پیتے ہیں کل کر لیس ہم غدا در میں تیرے ہو ملایا تو بے شمع
 جس طرح کچھ تنہا کرتا ہو خال تو آتی نہیں ہر دل کو تو اس خیال میں
 کیا جلتا ہے نل خانہ خراب تو؟ رکھتا ہو حیدار دوق حسن کمال میں
 کیا پوچھا ہو پھر تو کہوں کچھ کو انحر فصل ذکر سے اپنے جوہرے لال میں

جلد ۲، شمارہ ۵
 دہلائی ہویم

جہانگیر
یہ تیری صورت پر سرفرد ہو دل ایک جاں سے نہر از قربان
نہاں گل میں ہیں صدے غنچے، فدایو لالہ بہار قربان
شہر کو جو در دام اجداد بلا میم حق ہو احمد
ہیں جان دل تم پہ یا محمد ہمیشہ لیسل نہ ہار قربان
جلس میں شمع شبان کو گلا دل تعریف تر سب کی بڑھام کو گلا دل
ہندان لب مار جو بد نظری سے بھوس الماس کھلا دل انیس اور نہر جلا دل
غما جو اس حق سے خزانہ پر ہو بندہ جب پند ہو غزہ ہی کو خواہ یاد دل
گر خوشی کی جاکر دل روانہ آتش میں سمد کی طرح ظالم کیا کاشا نہ آتش
مزا ہو آگ میں الفت کی جلا شمع بجھو جلے ہو یہ تماشا کس لیے پروانہ آتش
زبان بلی ہی نہ اس کی نہ پاؤں پھلانا نہ ماتھہ چھلا
تھرکتی جس کی ہو بوٹی بوٹی قیامت آنھیں کات نہیں
اثر ملک و شر کسی نہ نہ ایک مالہ ہمارا پہنچا
خدا ہی جانے کہ ہر راتوں کو اپنی آہیں بھیک ہی
چھپے جو رہتے ہیں شرم و حیا کے ترپا وہ اپنے گھر میں رہے بے جا بھی نہیں
دھڑکی کی ہو ٹوں نہیں بھائی یا فوں گھر میں کا فر محل کو نہ پناہیں
اصل اپنے رنگت یاقوت و گور رنگت رنگت تیرا کچھ کو آتا ہو نظر آگیت
فصل کل آتی جو بلبل یہ نہر جو کہہ آتش گل سے ترانہ گھر ہو کہیں
کوئی جاتا نہیں گلو کی گاتی آقا صد اصحاب اس جگہ تیرا بھی گدہ ہو کہ
شعور کیا کہوں میں آتش الفت تیرا دیکھ لے دل مراحل باب کے شہر جو کہ
سرگادوں ابرو خم دار سے ایسے بھلی منہ نہ پھیریں جو دم تلوار سے ایسے بھلی
آرزو رکھتے نہیں ہیں اگر گھر راکھی خوش ہیں اپنے اشک بے شرم زاری بھلی
مخفف نہ لایا جو سبیم و زہر کا روپا بے غرض ہیں ہم دنیا بیلو ایسے بھلی
لے شر کر دیں گل و گلزار کو بے یار کو اشک سیریدہ خون سے ایسے بھلی
بہار رخ کے دیو اگلاں کیا بھلی ترے آزاد قد کے سروں کی کیا بھلی
نہ کیسی ہوسن آتش بنائے کی بھلی تری الفت بند کھڑا یاں کیا بھلی

جلو (۴) شمارہ (۳۳)
یہ گل ہشتہ میں لیل اور غنچہ کتر ہیں بہار بوستان کو خدا کیا بھلی
شر باتیں ہیں ان شاعر کی کو بھلی سخن کی قدر یہ مافذ ان کیا بھلی
او شر تر سے مقابل شہر میں غلی جو یہ سخن تیری زبان کاتے تلوار ہی
میسے گل گول نہیں تیا جو تانی آؤ اور کو پلانا ہو تراب خون لیا غنچہ میں دل کو
جلیں تیری محبت میں بیعت دل قبول کہیں بھلائی گل سے لگی ہو اگر غدار کو
مرا دل جو خیال نہ تھا ہو آہر سارہ شاہ دیوانہ بن گیا ہو کچھ لگان گندل کو
لگا اس سر و قد کی ایسا کی ہو کس بلاتنی ہو صاحب جنم کو ملک شاعر کو
شہزادہ دل خزانہ کھلا دیکھ دین زمین کو آسمان کو ہر کو مر کو تار کو
سلام شوق کہتا ہو صاحب اس رنگ کو کو نہ کہ کو شہر کاں کوں کو خطا کو بار کو
ادھر گھر کہتا ہے تو اوسانی جیسا نہ گلابی کو سب کو جام کو دنیا کو دار کو
بہار گل میں ہم تم ان کے ہاں چمن کو نہر کو شمشاد کو سبل کو شوق کو
بہے دما سبکی تر چمن آباد ہو جام صورت گل شیشہ انجن میں
شہر تری جس ہو اس غل پر شر ہر اک ہو شر از گلشن سخن میں سر
اشک گلے ہو یوں دیدہ تر ایک دیکھتے صد میں نہیں ایسے گھر ایک نہ
اس کا رخ بنے نقاب رخ ہو جواب پتیا ہو جام شراب و زہر ایک و
دل کے جلی میں نصیب کیا کہ جان غر رہتے ہیں اسے قریب تر شہر ایک نہ
مجھے بھلتی ہیں میں اس لب کی یاد وہ شہر کی کہانی تھنہ فراد رہتے
یاقوت کہیں ہو گل کہیں گھر قاتل بیت گیا ہو مرا جا بجا ہو
گاہ بے گاہ توں ہر جہیں لقا دن کجوات مجموع کجوات کجوات
کام تری ختم کار مردم آزاری ہو عشق کی ہرگز کسی عاشق کو ساری
قل پر گزراج ہو کیا بھی علاج ہو روز قیامت آج ہو شہر جو ہو جو
دل میں خال نہ لے جان کے آگ میں جام کی طرح جو ہنسی شہر کی طرح ہو
او شر انا کے طرہ میں نہ ہو غر دل نہ مارے عجب اب گھر میں غل
ایک صورت ہو شش آب میں کچھ بحر میں موج میں جواب میں کچھ
کس کی گلی ہو یہ صدا دم ساز ۳۳ مان میں تار میں ارباب میں کچھ

نظر آتا ہو عالم سستی جام میں نشیہ میں شراب میں کچھ
 ہلال ابرو کا شہرہ ہو جہاں میں زمیں تا آسمان اللہ اللہ
 شہرِ فضل نبی سے وقتِ آخر بہت گویا زبان اللہ اللہ
 اگر وہ صنم سوئے دیر و حرم کھینچ مشقہ جہیں اسی شان سے گذرے
 تو دیکھے برہن نہ بھرت کی صورت خدا کی قسم شیخ ایمان سے گذرے
 دن بدن عمر کھٹی جاتی ہے زلیست حسرت میں کٹی جاتی ہو
 بزمِ نندان سے وہ جب تیری شرارتیں جامِ ٹھٹھے شیشہ ٹھٹھے مٹھے بخورائے
 آگ میں برق جلا برکار کا بجائے ہوا دل نوزائے اگر آہ شہر بار بار ٹھٹھے
 نہ آنے کا بجانہ خوب کس کا تھم آیا وہ کیوں کر پاؤں سے اپنے خاکو باندھ کر
 بے سبب لڑتا نہیں وہ دوتو کچھ کی دھن کے سکھلایا بھی ہو
 مری خفاں سے ہو کو چہ تر اسدا آباد نہ میں ہوں تو رہے تیری یہ کلی کوئی
 دُرِ ندان کی چاہ جس کو دکھائی ہو تم نے میرے کی کئی اس کو کھلائی ہو
 دیکھ لو ہا کہ چہرہ پہ کلف ہو کہ کئی عیب لکھا ہو وہی جو کہ تر کھٹا ہو
 بلبل جس میں ہے تو آرام اور بھی کچھ فصل گل کے باقی ہیں ایام اور بھی
 ساتی عوض شراب کی تیا ہو تو دل ہونہ نش یہ میں گلفام اور بھی
 اس جامِ دل سے پیو غم کو رو نہ تیا ایسا جہاں میں ہو کوئی جام اور بھی
 سمجھا ہو اپنے دل میں خدا کا کیا شر مل کر ہوا بتوں سے تو نہ نام اور بھی
 برق و ش یار کی صورت جو نظر آتی ہو بارش اشک مجھ پر چہ نہ بانی ہو
 بیٹھے جو تیرے کوچہ میں کیوں کر مگر مکن نہیں زمین سے نفس قدم ٹھٹھے
 ماتم کے واسطے چلے طفیل اشک ساتھ سخت جگر آہ کے لے کر علمائے
 اور کو چہ نہیں تیا ہو یہ جلا دوں کو گر گر کا کاٹنا عاشق کا کلام آہو
 فلاخو بان عالم ہیں تمہارے حسن دل جو کہے

نثار آنکھوں کے، قربان زلفِ فرخ کے، صدف ابرو کے
 ساغرِ دین کہاں تھی ہوا اور ہو جس نے دیکھا ہو تیری آنکھوں کو وہ تو
 بات لگتا ہو کوئی تھا نہیں کاجی اور شراب نہیں میرا لگا گوشہ

اوشیخ مست جگرتا تو دیر حرم میں کیا کی کا زو سماں سبک میں شیشہ کے
 ماتی قسم تیری آنکھوں کی سیکڑوں کو بے ہوش کر دیا ہو دو جام ہو ملا کر
 ای شر کر کے کیا آب جگر آتش کا تیرے نالوں سے ہو میں دل خارا پانی
 وہ تر کس کی آنکھوں میں تم خاک الو جو دیکھے تمہاری طرف بد نظری سے
 بعد از ادب ہو او خوشید خوبی ترے رخ کو تشبیہ کر دوں قرے
 تری ش لب ہو میں گالیاں کیا نہ دستہ ہر اس کو مرے جو شکرتے
 جا تو گل و کے آگے کہدے نیم کوئی روتا ہو بلخ کے نیچھے
 نہیں پاتا کہیں شال اس کا مرگے اس سراغ کے نیچھے
 تیرے کوچہ سے گرد عاشق کی اٹھتی ہو اور بیٹھ جاتی ہو
 بتی الفت کی یہ ہو عشق کیا لگاتی ہو اور بھجاتی ہو
 نہ کند سے غرض ہو تمھے دارے دل را شاہی اس طالع جان آرا سے
 دل عاشق سے نہیں بات کوئی کی ہو ایک نکلے ہو صدائے شہ صد بار سے
 جلوہ گر ایک نور اس کا ہو چو طرف سب ملو اس کا ہو
 جس کے عاشق میں حضرت موسیٰ دل مرا کوہ طور اس کا ہو
 پروانہ سادل کیوں نہ ترے عشق میں حل جائے
 گر شمع بھی صورت تری دیکھے تو کچھ مل جائے
 شبتِ لعل میں نو کے پرانے پہ مع میں آں کی سیکڑوں کا ہے
 ماہِ دل اس آہ اں کا زور ہو کچھ اور عشق کے دریا میں لاکھوں تیرے لے اپنے
 تم نہ آہم سے بے باور مجھ کو جلیں آنکھوں سے بیاں لکھنے لے اپنے
 صبا کہ نہ زلف شکنیں سے کہ دیوانے یقین ہو تھے
 گرہ سے پیچ سے بل سے ترے واقف نہیں ہم تھے
 جلا یا اوشیخ شہر پیرا ہن دل جیبِ داناں تاک

جھکنے عشق کی آتش سے ہر دم آتش ہم تھے
 ہوا آہ دل نوزائے کامر درد آتی ہو نظر دور سے کہاں کی جوتی
 میاں نام لکھ شش تیرا اگر خوش تو مر کر زندہ ہونا عاشقوں کا تیرا

۵۶

میں لکھتے ہیں کہ میں سب سے پہلے اعلان تھا کہ ہوا نہ دھڑلے دل خرابا جو شریعتی ہو
 جنگ میں بے ہمتوں کا تقارار کچھ عجب ہے وقار بجا ہے
 اوی شریعہ باب مالہ دل شکر حق ساز و رستگار ہے
 اندر سے دامن زلفوں کے کمالے مرغ والیاب جا پڑا یاد کے پالے
 کیا تھر کیا تو نے شر اس کو ذیول کرتا ہی کوئی دہشت کو توں کے کھولے

جلد (۲) شماره (۵۶)
 کچھ کہستم گلابی تری گل لوگے جام بے خود ہو گئے اور تیرے دل کے
 ہر ایک گل کی کی میں رنگ کچھ ہی اور کچھ ہی
 کسی کی گفت و گو کچھ ہی کسی کی گفت و گو کچھ ہی
 شرفنا نوس میں سینہ کے شمع عشق ہی روشن
 جلاتا ہو مرے دل کو وہ ظالم شعلہ رو کچھ ہی

(۱) محبت کا راگ

اے محبوب! جب کہ چاند سر کے قد آور درخت سے سرگوشیاں کرتا ہے تو نے بلبل کی آواز کو نہیں سنا۔
 کیا تو نے اس کے گیت کو تیری شان میں گاتے نہیں سنا جسے اس نے گلو گیر آواز سے گایا تھا۔
 گیت کی پُرسرت لہریں جب کم ہو جاتی ہیں تو کیا تو نے دمشق کے گلاب کو روئے نہیں دیکھا
 اور شام کی ہلکی تاریکی میں کیا تو نے بلبل کی سینہ کو بی کو غور نہیں کیا۔

اے محبوب! تو نہیں جانتا کہ
 آہ بلبل کی دکھ بھری آواز میرا سکتا ہوا اگ محبت ہے اور گلاب کے آنسو میری تمنا بھری
 آنکھوں کے آئے ہیں جو میں نے تیرے انتظار میں رات بھر بہاے تھے۔

(ماخوذ)

(۲) محبوب سے خطاب

نغمہ میں وہ لطف نذر بلبل کے گیت سے دل اُچٹ گیا۔ پھول رو دکھا پڑ گیا۔ چاند نظروں میں پھیکا کیوں
 پڑ گیا حسن جبین ترین جن، آنکھوں سے اُتر گیا۔ کیوں؟ یہ میری نظر کا فرق ہے۔ ہاں وہ ایک
 صرف ایک جن ہے جس کا میں پرستار ہوں۔ وہ تیرا ہی جن ہے اے محبوب!
 میری تمام سہرتیں تیرے ایک قلم میں مضمر ہیں۔ میری سب آرزوئیں تیری ایک "ہاں اور نہیں" پر منحصر۔ تیری ایک آواز
 سرسبز بویقی ہے مگر یاد رکھ کہ تیری ہاں خواہی کی بوج ہے اور نہیں "موت کا پیغام" میرے قلب میں جان ڈالنا اور روح نکالنا
 تیرے مات میں ہے میں تیرا ہوں، ہمہ تن تیرا، میں تیری محبت کا بیابا ہوں۔

اے محبوب تو ہی میری بلبل ہے۔ تو ہی میرا گل ہے۔ تو ہی میری مددگار، اور تو ہی ان سب کا راز ہے، ان سب کا مجموعہ
 تمہارا بس کا صحن، کوٹ کوٹ کر کھو اگلا ہے جب تو مرے پاس ہو تو یہ حسن ترے سامنے ہم ہیں۔

کج دار و میرز

از

جناب مسعود صدیقی صاحب سسٹی کلج

حیدرآباد کے جاگیرداروں میں یوں تو عام طور پر بدت و روشن خیالی پیدا ہو چکی تھی مگر نواب غنیمت اللہ خان کا گھرانہ اپنی اعلیٰ سوسائٹیوں اور مغربی دیکھیوں کی وجہ سے بالکل ہی مسور و مجید و بوجھا تھا۔ غنیمت اللہ خان کا پیرا میا جمیل ابھی سات ہی سال کا تھا کہ اپنے دوست مسٹر گارڈن کی رائے کے مطابق اسے نئی تہا کے مشورینٹ پاؤلس گرامر اسکول میں بھجوا دیا۔ چند سال بعد جمیل جب تعطیل سر میں گھرایا تو اس کی وضع قطع عادات و اطوار تہذیب و معاشرت حتیٰ کہ رجحانات و خیالات بھی بدلے ہوئے تھے۔ ایک روز خان صاحب حسب معمول دیوانخانے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک ان کے بہنوئی نواب غنیمت اللہ حیدر رونق افروز ہوئے۔ خان صاحب کو خلاف معمول متفکر دیکھ کر نواب صاحب نے وجہ پوچھی۔ پوچھا لگے کہ یہ گارڈن کی رائے کے مطابق جمیل کو ایک یورپین درس گاہ میں بھیجنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی سے ہماری اور اس کی زندگی کے حالات میں ایک خطرناک نمایاں تفاوت واقع ہو گیا ہے۔ اگر آج تھیں یورپ اور معاشرت انگلستان پر عمل پیرا ہونا باعث تہذیب و شانستگی سمجھا جاتا ہے تو اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ السنہ مشرقیہ اور اسلامی علم و تہذیب کو یکسر گلدستہ طاق نسیان ہی بنا دیا جائے۔ کل میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے جمیل کو اپنے چچا زاد بھائی عقیل سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ”ہماری بڑی میڈم کتنی تھیں کہ عیسائی مذہب سب مذاہب سے اعلیٰ و افضل ہے جس کی فوقیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ عیسائیوں کی حکومت وسعت میں تمام حکومتوں کے رقبہ سے بڑھی ہوئی ہے“ عقیل نے کہا کہ حکومت و سلطنت کی وسعت حقانیت مذہب کی کیونکر دلیل ہو سکتی ہے؟ جب کہ اس کا دار و مدار راہ ترقی میں

مذہب کا مزین ہونے پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو کوئی بھی اس مذہب سے راہ ترقی میں قدم اٹھائے گا وہ یقیناً حکومت و سلطنت کے اعتبار سے معراج کمال پر جا پہنچے گا اس کے لئے مذہب کی کوئی تخصیص نہیں لہذا یہ عارضی ثروت و ترقی آخرت کی فلاح و بہبود کو مستلزم نہیں ہو سکتی۔ کیا تھیں یہ معلوم نہیں کہ آج خود یورپ کے بہت سے سنجیدہ حضرات اپنی تہذیب کے اس حصے کی تقلید کو جس کا صنعت و حرفت، علم و ہنر، ایجاد و اختراع سے کوئی تعلق نہیں، خراب اخلاق سمجھتے ہیں۔“ نواب صاحب نے جواب دیا کہ آپ بجا ارشاد فرماتے ہیں میں بھی اس کا قائل ہوں کہ علوم مغربیہ کے ساتھ ساتھ السنۃ مشرقیہ اور اسلامی علم و تہذیب سے بھی انتہائی وابستگی رہنی چاہئے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ انسان جس طرح اپنی عمر اور نشو و نما کے زمانے میں بہت سے جسمانی قالب بدلتا رہتا ہے اسی طرح اس کو مجبوراً یا ضرورتاً زمانے کے ساتھ اس کے مختلف سانچوں میں ڈھل جانا پڑتا ہے۔ خان صاحب نے فرمایا بیشک انسان کو مجبوراً یا ضرورتاً مختلف سانچوں میں ڈھل جانا پڑتا ہے مگر نہ اس حد تک کہ طرز معاشرت، رفتار، گفتار، عقائد، محبت، دوستی، دشمنی، لباس، آرائش، تعلقات وغیرہ وغیرہ سب میں ہی تبدیلی واقع ہو جائے۔ یہی تعلیم وہ پکارتی ہے جو اس کو اس کے ساتھ ہی خان صاحب یہ بھی فرمانے لگے کہ اگر اب اس کو وہاں نہ بھیجا گیا تو راج کل کا زمانہ ایسا نازک ہے کہ پھر تعلیم ہی سے ماتحت و مونا پڑے گا۔ البتہ السنۃ مشرقیہ اور مذہبی تعلیم کے لئے میں پرنسپل صاحب کو لکھ دوں گا کہ جمیل کے لئے اسلامیات اور اردو فارسی ادبیات کی تکمیل کا خصوصی انتظام کر دیا جائے۔ بالآخر نواب صاحب نے یہ کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کر دیا کہ آپ کی تجویز غیر مطمئن ہے اور اگر میں یہ کہوں تو بیجا نہ ہوگا۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز نیگوئی کہ دامن تو کن ہشیار باش

چند سال کے بعد جب جمیل کی ابتدائی تعلیم ختم ہو گئی تو خان صاحب نے اسے فوراً آکسفورڈ یونیورسٹی بھیج دیا۔ سینٹ پاولس گرامر اسکول کی اعلیٰ نشو و نما نے جمیل میں ایسی ذہنیت پیدا کر دی تھی کہ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی اور چھ سال کی متواتر جدوجہد کے بعد بالآخر ایم۔ اے کے امتحان میں بدرجہ اعلیٰ کامیابی حاصل کی۔ زان بعد جمیل سیول سروس کے لئے نامزد ہو گیا اور اپنی غیر معمولی ذہانت اور فطانت کی وجہ سے سیول سروس کے امتحان میں بھی اول آیا۔

خاندانی انگریز پرستی اور اپنی گوناگون قابلیتوں کی وجہ سے جیل ارباب حل و عقد اور ناخدا یا ان سلطنت میں پہلے ہی سے کافی رسوخ حاصل کر چکا تھا آئی سی۔ ایس کی ڈگری سونے پر سہاگہ ہو گئی۔ بزلٹ اوٹ ہوتے ہی اس کا نام وزیر آباد کی کلکٹری کے لئے پس ہو گیا اور کونسل سے بھی منظوری آگئی۔ اب کیا تھا واپسی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ آٹھ سال کے بعد اس ہندوستانی طالب علم کی بصد مسرت و کامرانی انگلینڈ سے روانگی عمل میں آئی۔

باب الہند بیسی پڑھیل کاشایان شان استقبال ہوا۔ مگر باپ کی علالت کی خبر نے اس کی خوشی کو چھپکا کر دیا۔ وہ پہلے حمید آباد روانہ ہوا۔ بیٹے کی کامیاب واپسی اور کلکٹری کی خبر خان صاحب کے لئے کچھ کم مسرت کا سبب نہ تھی لیکن سخت و شدید علالت نے انھیں اس مسرت و شادمانی سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع نہ دیا۔ درحقیقت نواب غضنفر اللہ خان کا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا تھا۔ ساٹھ سال کے قریب عمر تھی اور وہ بستر مرگ پر دراز تھے۔ وکن کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں خفیف سی روشنی تھی۔ سرد ہونٹ پھرک رہے تھے اور قریب تھا کہ وہ بصد حسرت و یاس اس جہان فانی سے منھ موڑیں کہ دروازے پر موٹر کے آنے کی آواز معلوم ہوئی۔ جیل کو معلوم تھا کہ باپ کی حالت نازک ہے اس لئے وہ نہایت تیزی سے باپ کے پاس پہنچا۔ مگر پہنچتے پہنچتے خان صاحب کا مرغ روح نفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔ غلین بیٹا مردہ باپ کی طرف کچھ اس طرح نگاہیں جمائے دیکھتا تھا گویا وہ اس دنیا ہی میں نہیں ہے اور باپ کا لاشہ بچان اس سے زبان حال بیکار کر رہا تھا۔

آخر شب دید کے قابل تھی قبل کی ٹرپ

صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

جیل پر اس ہوش ربا اور روح فرسا سانحہ کی وجہ سے کئی دن تک ایک سکتہ سا طاری رہا مگر اس نے اپنی حالت کو سنبھالا اور طبیعت سکون پذیر ہونے کے بعد اس نے وزیر آباد جا کر کلکٹری کا جائزہ حاصل لیا۔ جیل کی کلکٹری کی خبر صوبہ بھر میں باد صرصر کے تیز و تند جھونکوں کی طرح اڑی گئی۔ چونکہ جیل ہندوستانی کلکٹروں میں پہلا کلکٹر تھا اور دولت خاں جیل کے اعلیٰ اقتدار کے باعث چاروں طرف سے اس کی شادی کے پیغام آنے لگے۔ یوں نوجوان بھی پیغام آیا کسی نہ کسی حیثیت و نوعیت سے مافیہ ضرور تھا مگر جیل اور ان کی والدہ نے آنیز بل نواب سرا صغر حین کے ہاں کا پیغام منظور کر لیا

شاہدہ انریل سراسر صحر میں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ عربی، فارسی، اردو، انگریزی تعلیم کے بعد نقاشی اور شاعری کے بھی ابتدائی منازل طے کر چکی تھی۔ اس کے جذبات خواہیدہ بیدار ہو چکے تھے۔ حسن صورت، حسن ہمت اور نقاشی و شاعری کے بعد رہ ہی کیا گیا تھا۔..... عشق عشق جسے وہ بار بار اپنے قلب کی گہرائیوں میں تلاش کرتی تھی مگر پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ اپنی کشمکش حیات سے بے چارہ و تاب میں آجاتی تھی اور اس حیرت انگیز حیات کو کہ ہم کیا ہیں، کیوں ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کہاں جانا ہے؟ باوجود انتہائی تدبیر و کیا ست حل نہ کر سکتی تھی۔ وہ ابھی اسی کشتی کے سنبھالنے کی کوشش میں سرگرم تھی کہ جمیل کے اذکار جمیل آس کے کانوں تک پہنچے۔ مگر جمیل کے نام سے اسے زیادہ وحشت اس وجہ سے بھی ہوتی تھی کہ اسے یقین تھا کہ جمیل میری شاعرانہ دیکھیوں میں ضرور راج ہوگا اور اپنی غیر معمولی انگریزیت کی وجہ سے معلوم نہیں مجھے کس وضع قطع میں تراشے۔ مگر شاہدہ کے یہ دعاویات قلب ایک طلسم خیال سے زیادہ حقیقت نہ رکھتے تھے۔ وہ ابھی انہیں انکار پریشاں میں سرشار تھی کہ شادی کا مبارک و مسودہ دن آگیا اور جمیل کی برات بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اصغر آباد آئی ایک امیر لالہ ملی بیٹی اور متمول خاندان کا روشن چہرہ، بیاں شادی رچی اور خوب دھوم دھڑلے ہوا کئے۔ بالآخر شاہدہ بڑی شان و شوکت اور سطوت و جہت کے ساتھ باپ کے گھر سے سدھاری۔ وزیر آباد گورنمنٹ ہاؤس میں پہنچتے ہی شاہدہ شاہدہ نہ رہی بلکہ لیڈی جیل کھلانے لگی اور رفتہ رفتہ جمیل کے ساتھ سینما اور تھیٹر میں بھی آنے جانے لگی۔ شاہدہ فطرتاً نیک دل اور لہو و لعب سے متغیر تھی۔ اسے جمیل کے شدید و پیہم اصرار کے باوجود پردہ در پی بہت ہی دشوار معلوم ہوتی تھی مگر چاروں چار کیا کرتی۔ بالآخر چند ہی دن میں اس کا پردہ جمیل کی عقل پر پڑ گیا اور اب تو وہ کھلے بند دل اس طلسم خانہ عالم کی سیروسیاحت کرنے لگی۔ ایک دن میسن پارک میں بلیر ڈیکھنے لگی ہوئی تھی، شام کو بہت دیر سے گھر لوٹی۔ میز پر ایک وزٹنگ کارڈ پڑا یا جس کی خوبصورت تحریر اس امیر کا ثبوت دے رہی تھی کہ لکھنے والا کوئی نقاش یا مصور ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی نہ تھیں کہ شاہدہ پر بغیر اثر کئے رہ سکیں جمیل گورنر کے ساتھ سالانہ دورے پر گیا ہوا تھا۔ حریت مطلقہ اور آزادی کا ملہ حاصل تھی۔ دل میں سوز و گداز تھا اور اس میں شک نہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے اندر عشق رکھتا ہے۔ حیوانات کے دل میں بھی محبت سے لبریز ہیں تو نباتات اور جمادات بھی اس سے خالی نہیں تھیں کہ فلکیات میں بھی گرمی ہے تو عشق کی۔

اور نور ہے تو اسی کا۔ شاید نقاشی و شاعری کی وجہ سے یہ حرارت اور بھی سوا کھتی تھی اور پردے کی قیود کے اٹھ جانے کے بعد تو اس کے جذبات میں ایک تلاطم عظیم پاموچکا تھا۔ مسٹر جلالی (پریسٹر آئیٹلا) جمیل کا پیارا دوست اور ہم جماعت تھا۔ خوبصورت، خوش سیرت، شمشاد قد، آہو چشم، جادو نگاہ، اس سے سب کو محبت تھی۔

قدم ڈگمگائے نظم بکلی ہکی
جوانی کا عالم تھا سرشاریاں تھیں

کسی موکل کے ساتھ اس طرف آیا ہوا تھا۔ ایام قیام ولایت میں جلالی اور جمیل ایک جان دو قالب، ہلکے تھے اسے گزشتہ زمانہ یاد آیا اور دو چار دن جمیل کے ساتھ گزارنے کو اصرار ملا آیا۔ بنگلہ پر پہنچا تو کچھ خبر نہ لی سکا۔ ڈپر یہ لکھ کر چلا آیا کہ صبح ملوں گا۔ کس کو معلوم تھا کہ شاید وہ کئی صبح قیامت کی صبح ہو گئی۔ سویرے ہی اس کے انتظار میں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی۔ آٹھ بجتے ہی مسٹر جلالی ردیف افروز ہو گئے۔ وہ شاید ہسٹل سے مل کر یہ نہ سمجھ سکے کہ شاید کوئی انگلش لیڈی ہے یا انڈین۔ مسٹر جلالی اور شاید وہ کی ملاقاتیں چند ہی دن میں بہت کچھ منازل طے کر گئیں۔ جلالی کو جب اس کا پتہ چلا تو اس کا جذبہ عشق بھی موجزن ہوا۔ جمیل دروازے واپس آئے اور جلالی اُن سے مل ملا کر جلد ہی لاہور واپس ہو گئے۔ چونکہ موکلوں کے تقاضوں نے اُن کا نااطاقہ بند کر رکھا تھا۔ شاید وہ کاجنوں عشق دن بدن بڑھتا گیا۔ عشق جلالی نے اسے کسی کام کا نہ رکھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی حالت نہایت سقیم و ابر ہو گئی۔ یکایک جدائی کی وجہ سے افسردگی و اضمحلال اور بھی بڑھ گیا اور درحقیقت وہ بیمار معلوم ہونے لگی۔ اس کا جسم روز بروز لاغر ہوتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے اور غیر معمولی طور پر ٹھکین اور بھیا ناک دکھائی دیتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے ہاتھ بھی ہر وقت مریضوں کی طرح گرم رہا کرتے تھے جسے کہ آغاز شباب کی شوخی اور دلہنے نئے نئے جذبات اور کیفیات کا غیر معمولی موج یہ سارے امتیازات فنا ہو رہے تھے۔

نہ ذوق تماشا نہ شوق تحصیل

محبت اب اور بنیاریاں ہیں

اس کیفیت کو دیکھ کر جمیل گھبرا گیا اور اس نے اپنے منظونات کے ماتحت فوراً یونانی علاج ترک کر کے دنیا سے ہند کے مشہور ڈاکٹر کرنل ولسن کو دہلی سے بلائے۔ کئی عرصے کے لئے تار دیا مگر وہ اپنی نیرنگی

مصر و فیتوں کی وجہ سے فوراً نہ آسکا اس لیے جیل کو خود دہلی جانا پڑا تیسرے دن جیل واپس آنے والا تھا اور شاہدہ دل بہلانے کے لئے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی امریکن مشن اسکول کی عیسائی طالبات کے جگہ گھٹ کا تاشا دیکھ رہی تھی جو اتوار کے دن سہرے اور عمدہ لباس پہن کر تفریح کے لئے نکلا کرتی تھیں مگر شاہدہ صرف ظاہری آنکھوں سے اس کا نظارہ کر رہی تھی۔ باطنی آنکھوں میں تو کوئی اور ہی بسا ہوا تھا جس کے سبب سے اسے ذہنی درد و جانی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اُس کے دل میں جدائی کے لئے جاذب موجود ہے مگر وہ بے بس اور مجبور تھی۔ اس کا دور کرنا ایسا ہی ناممکن تھا جیسا کہ خود اپنی انفرادیت کو اپنے وجود سے علیحدہ کرنا محال ہے۔ اُس کا ضمیر اسے لعنت و لعنت کر رہا تھا جس سے وہ خوف زدہ اور پریشان تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح دل سے یہ احساس مٹ جائے جس کا وجود جیل کے حق میں صریح ظلم اور جس کی آرزو شرافت و انسانیت سے بعید ہے۔ وہ باور کرتی تھی کہ زوجیت کے فرائض شرافت کے طریقے اور مذہب کی پابندیوں سے انحراف کر کے زندہ رہنے سے موت کو بدرجہا ترجیح ہے۔ یہی وہ متضاد خیالات تھے جن کے سلجھانے کی جب کوئی سبیل نہ نکلی تو پہلے دیر تک سوچتی رہی اور پھر ایک فیصلہ کن انداز میں مینر کے پاس جا بیٹھی۔ ایک خط لکھ کر درانڈے کی میز کے اوپر رکھوا دیا اور خود اُن کی آن میں ریو الور کا نشانہ بن گئی۔ ریو الور کی آواز سن کر گھر کے تمام نوکر چاکر دوڑے مگر جب اس سانحہ عظیم کا پتہ چلا تو ہر شخص حیرت و استعجاب اور رنج و غم کے طے جلے جذبات سے مبہوت ہو گیا۔ غانا ماں جیل کو تار دینے کے لئے ڈاکخانے کی طرف دوڑا جا رہا تھا کہ جیل کا تار ملا جس سے معلوم ہوا کہ جیل آج ہی واپس آئے ہیں مگر ڈاکٹر صاحب کل آئیں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں جیل واپس آگیا مگر بنگلے میں گھستے ہی اُس نے ایک خاص قسم کی اداسی پائی۔ اُس کا دل بے اختیار کانپنے لگا جب اُس نے اچانک شاہدہ کی ایک تحریر درانڈے کی گول میز پر رکھی ہوئی پائی۔

جیل مائے جیل مشہور فارسی مثل ہے کچ دار و مرز یعنی ایک لبریز پارہ کسی کے ہاتھ میں مے کرے۔ سے کہنا کہ اسے ٹیڑھا کر لیکن خبردار پانی نہ گرے۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل ناممکنات سے ہے دینا میں جہاں لغزش کے صدمات واقع ہیں ایک ضعیف الفطرت عورت کے لئے یا جو دہانی ظری کمزوریوں کے جدید تمدن سے دوچار ہونا اور مصوم دہناخت مثل ہے۔ پیارے جیل اسی کشش کچ دار و مرز میں نیچے خود کشی اپنی عصمت نوازی و ہر پروری کا کوئی سامان نہ پایا۔ وہ جو عصمت جو ہمیشہ میرے عشق وجود میں تابندہ

و درختانِ رام ہے۔ ترغیب و محبت نے گو تنداؤں سے بھری ہوئی آغوش اس کے سامنے پھیلائی لیکن بے سود، تخیلات و جذبات نے اسے مانوس کرنے کی اگرچہ ہزارا کوششیں کیں مگر بیکار آج اسی جوہر عصمت کو خود کشی کے خواہن رنگیں میں سجا کر ہیرہ کی صورت میں پیش کرتی ہوں۔

خدا حافظ، تمھاری جاں نثار، شاہدہ

جیل نے اس تحریر کو بار بار پڑھا مگر خاک نہ بچھا، اس پر نیم دیوانگی کی سی کیفیت طاری تھی کہ اسی جذبہ کیفیت میں وہ قرطاسِ خون اس کے ہاتھ سے گر پڑا اس کے اٹھانے کی جستجو میں اس کی پشت پر بھی اس نے کچھ لکھا ہوا پایا جسے وہ دیتا ہانہ پڑھنے لگا۔

پیاری شاہدہ! آپ کا تقدس، آپ کی عصمت مآبی آپ کو میرے غربت کدہ پر شریف اللہ کی اجازت نہیں دیتا اور میری کمزوریاں و خود فراموشیاں میرے لئے مانع ہیں تو کتنے ملاقات ہو تو کیونکر ہو، خدا کے لئے آپ اپنے تقدس کو سمجھا لیجئے، میں اپنی خود فراموشیوں کو منالوں کا اور جلد کوئی ذریعہ ملاقات نکالنے کہ اب تاب نواں باقی نہیں۔

آپ کا۔ جلالی۔

اس تحریر کے نظر سے گزرتے ہی جیل پر سارا راز، دُور و دشمن ہو گیا، میل کے دل سے بے اختیار آہ نکلی، اس کی ساری مسرتیں غم و مہم میں تبدیل ہو گئیں، زندگی کے تمام دقائق انتہائے درد ہو کر رہ گئے، اس کا دل آنسو ہو کر بہ گیا۔ اسے رہ رہ کر اپنی کج روی اور غلطی پر مذمت ہوتی تھی اور شاہدہ کی مصہومانہ زندگی کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھرتی اور اس کو بار بار ملامت کرتی تھی کہ آہ تو نے نوعِ انسانی کے ایک بچہ فرد کا اپنے ہاتھوں سے خون کیا ہے اور سوسائٹی کے دامِ تزویر میں محصور کر کے اس کا رشتہ حیات توڑا ہے گرم گرم آنسوؤں کے قطرے بے نشان راستے طے کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آتے تھے اور اس کی آنکھوں کا نور اپنے ساتھ لے کر لامحدود فضا میں کھو جاتے تھے مگر یہ تاہم و تاسف بعد از وقت اور بیکار محض تھا چونکہ شاہدہ سولے نظارہ جمالِ خداوندی ساری کائنات کی طرف سے نگاہیں پھیر چکی تھی۔

تفہیم

طبیعیہ حصہ اول و دوم۔ مولفہ جناب علی احمد صاحب زاجیل پوری
قیمت حصہ اول پچھترہ حصہ دوم عہ۔ ایس۔ اے احمد ایڈ کمپنی
جیل پور (سی۔ پی) سے طلب کی جائے

اگر وہیں عام امراض اور بالخصوص عورتوں اور بچوں کی متعدد بیماریوں کے متعلق جو ذرا سی غفلت سے پیدا ہو جاتی اور بالآخر سینکڑوں ماؤں اور محصوروں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہیں بہت کم کتابیں پائی جاتی ہیں۔ جو بھی ہیں وہ زیادہ تر فنی حیثیت رکھتی ہیں اور گنتی کی چند ایسی ملیں گی جن میں طب کے اس اہم شعبے کو فنی طریقے پر اور عامۃ الناس کے مطالعہ و افادے کے لئے لکھا گیا ہو۔ تعلیم نسوان کی ترقی کے ساتھ ایسی بہت سی کتابوں کی ضرورت داعی ہوتی ہے جن کو خواندہ خواتین مطالعہ کر کے زندگی کے بہت سے ضروری شعبوں میں جن سے ان کی ان پٹھ بنیں خاطر خواہ معلومات نہیں رکھتیں مفید معلومات حاصل کریں اور اپنی اور اپنے بال بچوں کی بہت سی مشکلیں جو ناخواندگی و جهالت سے بہت زیادہ مشکل نظر آتی ہیں بہ آسانی حل کریں۔ طبیعیہ اس مقصد کو پیش نظر رکھ لکھی گئی ہے۔ اس کے حصہ اول میں عورتوں کی صنفی بیماریوں کے علاوہ حاملہ اور نرہ کی بیماریوں کا مفصل بیان اور تدابیر احتیاط و علاج پر شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے۔ پھر برائے بیان ایسا سلیس اور صاف اور تین ہے کہ عام خواتین جو طب سے قطعاً نا آشنا ہوتی ہیں بے تکلف اس کے مطالعہ سے اپنی صحت کی حفاظت اور متعدد امراض سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہیں نیز نئے المقدور اس امر کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ کتاب میں کوئی چیز ایسی بیان نہ ہو جو شریف خواتین کے مطالعہ کے لئے نازیبا سمجھے جاسکے طب میں جو امور ناگزیر ہیں ان کو بیان نہ کیا ہے مگر کتابت و متانت کو ماتہ سے جانے نہیں دیا گیا۔

اس کا دوسرا حصہ جس کا نام "بہار و اطفال" بھی ہے بچوں کی صحت کے لئے وقف ہے۔ اس میں بچوں کی پرورش ان کی صحت کی حفاظت عام امراض اطفال ان کی علامتیں اور علاج سب ہی سلیقے سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ نہایت مستان میں کم سن بچوں کی اموات جس درجے بڑھی ہوئی ہیں اس کے پیش نظر بلا خوف تردد کہ اجا سکتا ہے کہ ایسی کتابوں کے مطالعہ اور ان کی ہدایتوں پر عمل کر کے بہت سی اموات کو جو بالکل بے وقت اور قوم کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہو رہی ہیں روکا جاسکتا ہے۔

[illegible]

منجھ مکتبہ ابراہیمیمہ ادا دیا ہی محدودائش بنو
 صدر امداد گزرا

زندہ طلسمات

جس کو بانڈوگان حیدرآباد کے علاوہ مغز ٹکڑا اور ڈاکٹروں نے صد نامیوں پر امتحان کر کے سینکڑوں ٹیفٹ عطا کئے
زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ جسٹس ڈاؤنٹنٹ شدہ ہے جب ذیل امراض پر آنا فائز طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک اونی
اکڑ شہ ہے۔ مثلاً ہیفیہ بلیگ بجلز عیش متلی کھانسی۔ دوسرے بوا سیر غارش۔ سانپ بچھو کے زہر اور علقہ قسم کے درد کے
اکیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائے ایک بار ضرور آزمائے۔ پبلک کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے
یشی نمبر (۱) عد نمبر (۲) ۸ نمبر (۳) ۴۸۔ ایک درجن کے خریدار کو خرچہ دی۔ پی معاف ہوگا۔ خط و کتابت اور تار کا پتہ:۔

”زندہ طلسمات حیدرآباد دکن

و بحیثیت مال با

بیرونی استعمال کی پرتا شیر اور لا جواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزاء سے مرکب اور بالکل بے ضرر بنا
ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عورتوں
کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پبلک کے رد و بردش
کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ پراثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھر اور خاندان اس سے خالی نہ رہنا چاہیے
استعمال کے ساتھ ہی اپنا برتی اثر دکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد جو چند مرتبہ کے استعمال سے باطل کا فوراً جاتا ہے۔
علیٰ انھیں نعرے بیچ فاصلہ دے۔ درد دوسرے درجہ کے لئے زخم کے لئے اور طبعی ہوئے جسم کے لئے وغیرہ۔
ترکیب استعمال تھوڑی دوا لیکر دن میں تین چار وقت مقام باؤف پرٹیں اور اگر لافاز نہ ہو تو اس کے استعمال سے پہلے گرم پانی
کپڑا تھک کر اچھی طرح اعصاب کو بھانپیں اور صاف کریں جو اعصاب غرض امتحان طلبہ فایز خوشی تمیل کی جائے گی۔
نوٹ: ہائے دوا خانے میں ہر قسم کے تازہ ادویات کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے اور نہ جاننا نہایت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں

جیمز سٹیمپنٹ شیش بن و ڈقرب محکمہ مالکڑاری حیدرآباد دکن

ہندستان کی طباعت میں عظیم الشان انقلاب اور نوکرات مرفع چغتائی (یعنی) دیوان غالب مصور

جس کی پہلی اشاعت کے ۲۱۰ نسخے بحساب فی نسخہ مائت لاکھ کلدار فرخت ہو چکے
یہ شاندار مرفع اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اعلیٰ ترین معیار نظام غلام اللہ علی کے نام فنی اسم گرامی سے باجا از سرب
مختصر تفصیل

تعارف نامہ از ڈاکٹر محمد اقبال
(۱) مکمل متن دیوان غالب نہایت عمدہ طریق سے۔ (۲) مقدور خفہائے لغتی (از مصنف چغتائی) (۳) انتخاب کلام
(۲۱) قصاویر جو چار رنگوں میں مندرجہ ہلاک یورپ کے ایک ہر فن کار خانہ سے تیار کرائی گئی ہیں۔
(۲) قصاویر حضرت چغتائی کی بہترین مصاعی کا اعلیٰ نمونہ ادب لائن ہلاک ذریعہ تیار کرائی گئی ہیں
(۲) قصاویر جناب چغتائی کے پسلی خاکوں سے بنوائی گئی ہیں۔
(۹) قصاویر عام رنگوں اور بانی ہلے رنگوں میں تیار ہوئی ہیں۔

کتاب کی جلد نقلی مراکو کے چمڑے سے تیار کرائی گئی ہے جس پر طلائی ٹیل بوئے اور کتاب کا نام کندہ ہو چکا و لیم کاغذ پر تہا نقاش
چھپی ہے
قیمت ان تمام فرمیوں کے باوجود صرف لکھنؤ کے عثمانیہ دیکھی گئی ہے۔
مکتبہ البرہمیہ نے مالک محروسہ کار عالی میں فروخت کا انتظام اپنے ذمہ لیا ہے

مکتبہ ابراہیمیلہ ملادوا، سی (محدود) اشین روڈ حیدر آباد کن
نوٹ:۔ مکتبہ کے شیکمیں کتاب کا ہر وقت ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے

نیزنگ راپور سے دہلی کو منتقل کر دیا گیا

اس عظیم انقلاب کے ماتحت جنوری ۱۹۳۱ء کا تمام پروگرام تبدیل ہو گیا۔ اس لئے

امیر نمبر

جس کے جنوری ۱۹۳۱ء میں شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اب ایک ماہ کی تاخیر سے آخر ماہ فروری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوگا اور امیر نمبر کی بجائے

دہلی نمبر

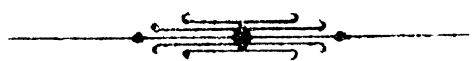
جنوری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوگا۔ یہ نیزنگ کے انقلابی پروگرام کی یادگار ہوگا اور ہر حیثیت سے قابل قدر اور کامیاب ہوگا۔ آئندہ جملہ مراسلت اور ترسیل زر حضرت عشرت رحانی مدیر نیزنگ دار السلطنت دہلی کے نام ہونی چاہئے۔

۱۹۳۰ء سے رسالہ کے لئے جس قدر آرڈر موصول ہوئے ہیں ان کی تعمیل دہلی سے ہوگی۔ نیزنگ کے قدیمی معاون اور قدردان حضرات سے امید ہے کہ وہ نیزنگ کی بدستور معاونت فرمائیں گے اور یہ کاغذ ضرورت مجھے اپنے گرامی ناموں سے یاد فرماتے رہیں گے۔

معزز معاصرین اپنے رسائل اور اخبارات بدستور راپور کے پتے پر ارسال فرماتے رہیں۔ نیزنگ دہلی سے ان کی خدمت میں پہنچتا رہے گا۔

محمد عزیز اللہ خان مدیر نیزنگ

مجلہ مکتبہ خریداری میں مزید بہت



جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مہلعات مکتبہ ایساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور دوسری کتابیں کمیت یا دفعات نقد خرید کر اپنے ان کے نام پر سالانہ بھر کے لئے باقائت خریداری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مہلعات مکتبہ اہنیتس پرچہ کی دستی دگر کتابیں بدفعات یا کمیت نقد خرید کر نیگے ان کی مدتیں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ باقائت حاضر ہوگا۔ کمیت خریدنے والے حضرات کے نام رسالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے ان کو ایک سید و بکاگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جو وقت حسب ادائیگی رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسید میں منظم محلہ مکتبہ کے پرنسپل یا رسالہ نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کہی آپس میں مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبعہ مع کتبہ ابراہیمیہ پٹیشن روڈ حیدر آباد دکن

دارالاشاعت مکتبہ برہم پورہ دہلی محمد و آقا و کن

کا

عبدالرحمن و محمد
ماہوار علمی ادبی

مکتبہ

فلائی

عبدالقادر سروری ام آں

شکرا

عمر بنی

سید محمد ام

مجلہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیلہ داد باہمی محدو کا ادارہ ہے۔
یہ علمی و ادبی رسالہ جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین
درج ہونگے حجم کم سے کم چار جز ہوگا۔

بظرافتیا طیرچہ بذریعہ شفیقٹ آف پونٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول
نہو تو فیضی ہوئے گی۔ ۲۰ تاریخ تک بھالہ بنبرخیری اطلاع دی جائے۔
قیمت سالانہ (۵۰) سہ معمول ڈاک منگی چھ ماہ کے لئے (۵۰) فی پرچہ ۶
اشتمارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (۵۰) نصف کیلئے (۲۰)
اور چوتھائی کے لئے ۵۰ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتمار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۰
ہ فیصد کی کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت منظم محلہ مکتبہ مکتبہ ابراہیمیلہ
ادب اہی شیشین روڈ میدان آباد کن سے کیجئے۔

مجلہ مکتبہ

جلد (۴) بابۃ ماہ افندار ۱۳۳۹ شہ م جنوری ۱۹۲۰ء شماره (۴)

تصاویر
(۱) قطعو دوم (۲) باغ عام کا ایک خوشنما منظر
فہرست مضامین

صفحہ

- | | | |
|------|--------------------------------------|------------------------------|
| (۲۱) | ع - مس | (۱) شذرات |
| (۵) | از جناب احمد عبدالحمید صاحب | (۲) اورنگ زیب کی دکنی جہات |
| (۱۴) | عمر یاسنی | (۳) مصحفی کا تذکرہ ہندی |
| (۴۳) | شیر حسن صاحب - قیس | (۴) فراہ دہانی (افسانہ) |
| (۴۴) | حکیم مرزا قاسم علی بیگ صاحب - انگریز | (۵) غزل |
| (۴۵) | مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی - اے | (۶) خود امانتی (سلسلہ گزشتہ) |
| (۵۲) | سید قادر حسین صاحب قادر | (۷) سوال و جواب پو غزل |
| (۵۳) | عزیز احمد صاحب | (۸) اصنام خیالی - (افسانہ) |
| (۵۹) | الو اشجع صاحب - محبت | (۹) غزل |
| (۹۰) | س - م | (۱۰) تنقیدیں |

شذرات

اسب زور کے ٹمبرہ آفاق مدیر سرگاردون نے ایک دعوت میں جو سر سیکڈونلڈ اور سر لائڈ جارج کی طرف سے مدیر موصوف کے اعزاز میں ترتیب دی گئی تھی، اپنے چند مدیرانہ اصول کو نہایت خوبی سے بیان کیا۔ یہ اصول ایسے ہیں کہ ان کو تمام ادبیات صحافت جو اس پیشہ کو عزت اور کامیابی سے انجام کو پہنچانا چاہتے ہیں، اپنا سطح نظر بنا سکتے ہیں اس دعوت کے موقع پر مدیر اور جدیدہ زیر آغوش ہرطائفہ نے سرگاردون کے اصول کی بڑی طرح سراہی کی۔ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ ”دوستی بڑی قابل قدر نعمت ہے۔ لیکن ایک مدیر جب ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا ہو تو اس کو بروقت دوستوں کے کھونے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ ورنہ وہ خود گم ہو جائیگا۔ صحیفہ میں ”کردار“ کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے قائم کرنے کے لئے خود میں نے یہ کیا ہے کہ ہمیشہ میں طویل مقالے مضمون نگاروں سے اہم موضوعات پر لکھواتا۔ جرح کے خیالات بالکل آزاد اور غیر متعصبانہ ہوتے۔ اور لوگوں کے سامنے ان چیزوں کو پیش کرتا تھا جو وہ نہیں طلب کرتے۔“



گذشتہ جلسہ عطاءے اسناد کے موقع پر جامو انگریز کے علیا مین کو مخاطب کرتے ہوئے، گنگا ناتھ جھانے ہندوئی اور باب تعلیم کی ذمہ داریت اور چارن جامعات کے ایک تاریک گوشہ پر بصیرت افروز روشنی ڈالی۔ انہوں نے نہایت شہ و مد کے ساتھ حاضرین کو یہ محسوس کروانے کی کوشش کی کہ جب سے ہماری ہندوستانی جامعات وجود میں آئی ہیں ہم ایک عجیب دھوکے میں مبتلا ہیں کہ ہماری تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک کہ ہم ہندوستان کے باہر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بنائیں اس سے مقررہ مقصد یورپی جامعات کے ہندی متعلین کی تحقیق مقصود نہیں تھی۔ بلکہ وہ اس غلط فہمی کو دور کرنا چاہتے تھے کہ ہم کو کبھی اس قسم کے تنصبات میں مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ یورپ کی کسی جامعو کا فارغ التحصیل ہر صورت میں ہندی جامعات کی پیداوار پر برتری رکھتا ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری جامعات کی تزیل ہوئی ہے۔ بلکہ ہم ایک بھاری سلاطے کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہم اپنے ملک کے علمی کاسول اور عدالتی اور دوسرے حکمران عہدوں کے لئے انہماک کو غیر مالک میں بھیج کر کام سکھانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ہم دوسرے ملک کے لوگوں کو اپنے ملک اور مقام کی ضروریات کے علم کے بغیر بھی اعلیٰ عہدوں کی ملازم کر لیتے ہیں اس کا برا نتیجہ ہکولازما ہر روز دیکھنا پڑ رہا ہے۔



اس جینے میں جامو عثمانیہ کے علیا مین کو عطاءے اسناد کے موقع پر ملک کے ایک بلند خیال عہدہ دار لو اب

سر نظامت جنگیہ نے ایک خط لکھا۔ اس خطبہ کے کئی اہم پہلوؤں میں سے ایک پہلو عربی و فارسی زبانوں کے مطالعے کی ترویج سے متعلق بھی تھا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قرون دنیا کی وسیع ترین، علمی، اور حاکم زبان عربی تھی۔ یونانی اور رومی علوم و فنون کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کرنے کے علاوہ اور مغربی اقوام میں بیداری پیدا کرنے اور ان کی مروجہ ترقی کی تعمیری کرنے کے قطع نظر بھی عربی زبان کئی چیزوں سے اہم ہے۔ مسلمانوں کے تمدن اور کلچر کے علاوہ یونانی، رومی، ہندی، عربی اور ہسپانوی تہذیب کا بھی یہ بڑی حد تک پتہ چڑھے۔ ہر نورخ، اور سکھر کے لئے جو اپنی تحقیقات کو قرون وسطیٰ ایران کی تک پہنچایا اس سے آگے بڑھانا چاہتا ہے، اسی زبان کے مطالعہ کے بغیر جا رہے ہیں۔

یہی حال فارسی کا بھی ہے۔ آٹھ نو سو سال پہلے اور گزشتہ صدی کے ختم تک بھی یہ زبان نہ صرف ہندوستان، بلکہ وسط ایشیا کی حکمران زبان رہی ہے۔ مغلوں کے درخشاں عہد میں ان ممالک اور خصوصاً سارے ہندوستان کے لئے یہ مشترک الہام تھی۔ اپنے پیچھے قدیم ایرانی تمدن کی عظیم نشان تھی، زیر رکھتے ہوئے، ہندوستان سے سو گرتے کرتے اس نے کئی ایسی ہندی زبانیں جن کو پرورش کیا سنوارا، مہذب بنایا، اور آگے بڑھنے کا گھر سکھادیا۔ ہمارے مورخ، معلم، تدریس اور ماہر لسانیات کے ذخیرہ میں اس کی کمی، یقیناً گمراہ کن ہے۔

ہم ایشیائی اس قدر احسان فراموش، اور غیر منطقی نہیں ہو سکتے کہ ان زبانوں کے مطالعہ کی ہمت شکنی کا خیال دل میں لاسکیں۔



برہمنی ”تدنی حیثیت“ سے ہندوستان سے قریب تر ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس کا ثبوت ”دی دوتاخ اکاڈمی“ کا قیام ہے۔ کچھ سالوں سے ہند برہمنی علمی ادارے ہندوستانی طلبہ اور محققین کو وظیفہ بھی عطا کر رہے ہیں تاکہ وہ جو مافیہ حاکم اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور ان دو برسے لکوں کے تعلقات کی ایک کڑی ثابت ہوں۔ ہم نے گزشتہ سال چار ہندوستانی طلبہ کو جرمن وظائف عطا ہونے کی تفصیل لکھی تھی۔ اس دفعہ بھی ہندی ادارہ ”دی دوتاخ اکاڈمی“ نے ہندوستانی طلبہ کے لئے تین وظائف کا اعلان کیا ہے۔ یہ زراعت، انجینئرنگ اور طبعیات کی تعلیم کے لئے ہندوستان کے بہترین طلبہ کو عطا کئے جائیں گے۔ جنہیں جرمن ہی میں رہ کر تعلیم پائی ہوگی۔ وظائف کی مقدار ۱۰۰ مارک یعنی ۲۰ پونڈ ماہانہ ہوگی جس سے صرف تعلیمی اخراجات کی کفالت ہو سکتی ہے دوسرے مصارف طلبہ کو ادا کرنے ہونگے جو زیادہ اہم نہیں ہیں۔ کیونکہ جرمنی میں ایک ہندوستانی کفایت شمار طالب علم ماہوار ۱۵۰ سے ۲۰۰ مارک یا ۸ سے ۱۰ پونڈ میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ وظیفہ صرف ایک سال کے لئے عطا ہو رہا ہے۔ خاص صورتوں میں اس مدت کی توسیع بھی کی جاسکے گی درخواست گزار کی کے



شرائط صرف اس قدر ہیں کہ اسیدوار کسی ہندوستانی جاسو کا طلب نام ہو۔ اور جرمن زبان جانتا ہو۔
ہیں معلوم ہے کہ جاسو ہندوستانی سائنس کے طلبہ کو اس قسم کی ضرورتوں کے لئے نہایت خوبی کے ساتھ تیار کیا
جا رہا ہے۔ انہیں جرمن زبان سے بھی فی الجملہ آگاہی ہے۔ اس صورت میں کیا یہ ممکن نہ ہوگا کہ ام، ایس، سی کے طلبہ
بھی ان وظایف کے لئے فہمت آزما لیں کریں۔ اس میں روپیہ سے زیادہ ملک اور قوم کی وقعت ہمارے مد نظر ہے۔
درخواستیں ذیل کے پتہ پر اپریل ۱۹۳۱ء تک پہنچ جانی چاہیں۔



اس سال ادبیات کا نوبل پرائز جرمن کے ایک افسانہ نگار طاس مان کو ملا۔ طاس مان موجودہ جرمن معنفین میں
مہربان سے بلند پایہ مصنف ہیں۔ ان کے کئی ناول اور مختصر قصے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شخصیت نہایت مطمئن،
ناموش دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس خاموشی کی تین طوفان پوشیدہ ہوا کرتا ہے۔ سڑمان نے نہایت معمولی طور پر زندگی کا آغاز
کیا۔ ۱۸۹۸ء کو ریل کوکب میں پیدا ہوئے۔ ۱۹ سال کی عمر میں خاندان کے ساتھ میونخ گئے جہاں یہ ایک بیمہ کمپنی میں ملازم
ہو گئے۔ اس خدمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادبیات اور انسانیت کا مطالعہ شد و مد کے ساتھ کیا۔ ۱۹۱۷ء میں ان کا
پہلا ناول ”گفائلن“ شائع ہوا۔ اس کی کامیابی نے انہیں ادبیات کے لئے وقف کر دیا۔ اس کے بعد پلے درپلے ”بڈن
بروکس“ ”رائل ہائی سن“ ”دھن ان وینس“ ”ٹونیو کراجر“ اور کئی ایک ناول اور مختصر قصوں کا ایک مجموعہ شائع کیا۔
سڑمان کی کردار نگاری بڑے اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے۔ اسلوب میں تھوڑی سی جھلک ظرافت کی بھی ہوتی ہے۔ انسان اور انسانیت کے وہ بڑے
واقف کا ہیں۔ یہی اسوہیں جن کی وجہ سے وہ آج جرمنی کے جڑی کے ناول نگار سمجھے جاتے ہیں۔



انہوں سے کہ ہندوستان اور اس کے کارنامے یورپ میں ذرا بھی روشناس نہیں۔ یورپی اقوام کی معلومات کا دائرہ ہندوستان
متعلق اس قدر محدود ہے کہ وہ ہر ایک ”انڈین“ کو ہندی کے بجائے ”ہندو“ سمجھتے ہیں! ان کے ذہنوں میں اب تک ہندوستانیوں کا خیال وہی
ہے جو گونڈ، بھیل، سنال اور ٹوڈا اقوام کی تصویروں کو دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کی تشریف شایہ وہ اس زیادہ نہیں کر سکتے
کہ اس میں ایک جذبہ قوم چند خوشی و غم سے اور سانپ آباد ہیں! ان روشن خیال اقوام کے ذہنوں سے یہ تاریکی دور ہو تو ہمیں یقین ہو کہ
اور بہت سے ہندی عالم اور ادیب اور شاعر نوبل پرائز کے مستحق تصور کئے جاسکتے۔ ہماری نظریں اردو کے سراقبال اور پرچم چند شاید کسی بڑے
ادیب کے مرتب نہیں رکھتے۔



اورنگ زیب کی کنی چھٹا

(جناب احمد عبدالحی صاحب)

سرزمین دکن قدرت کی فیاضیوں سے الامال ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اورنگ زیب سے قبل ان فیاضیوں سے بہت کم فائدہ اٹھایا گیا۔ اس لئے اورنگ زیب نے دکن کا عہدہ انتظام کر کے غیر آباد اور ویران علاقوں کو آباد کیا۔ کاشت کاروں کو بہت دلائی اور ان کو کاشت کے لئے خزانہ سے روپیہ عطا کیا۔ اور عالمگیر نے محسوس کیا کہ خزانہ شاہی بغیر مالگڑاری کے سمور نہیں ہو سکتا اس لئے زراعت میں خاص توجہ مبذول کی۔ چنانچہ مالگڑاری کے انتظامات کے لئے دکن کے چار صوبوں کو دو حصوں میں منقسم کیا۔ پہلا پائین گھاٹ اور دوسرا بالا گھاٹ۔ بالا گھاٹ کا انتظام مرشد قلی خاں کے سپرد کیا گیا۔ اس کی ذمہ داری سے مالگڑاری میں ایک کثیر اضافہ ہوا۔ اس نے عالمگیر کو اس سالہ میں خاص مدد دی اور محنت شاقہ اٹھا کر سلطنت اور خزانہ شاہی کی خیر خواہی کر کے عالمگیر کی خوشنودی کا بآہوا ہوا۔ اگر مرشد قلی خاں عالمگیر کا ٹوڈر مل کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ ۱۶۵۷ء میں دوسرا علاقہ بھی اسی کے حوالے کیا گیا۔ اس نے یہاں پر شمالی ہند کے بندوبست اور مالگڑاری کے طریقے رائج کئے۔ اور متدین بگنائے شاعر راست باز اور ایماندار حکام کا انتخاب کیا عالمگیر کی خاص توجہ اور مرشد قلی خاں کے علمی تجربے کی وجہ سے محکمہ مالگڑاری میں ایسی نمایاں ترقی ہوئی کہ اکبر اعظم کے عہد سے شاہ جہاں تک عہدیم النشاں ہے اگر اکبر کے عہد میں مالگڑاری ایک کروڑ پونڈ اور شاہ جہاں کے عہد میں دو کروڑ تائیس لاکھ پونڈ تھی تو عہد عالمگیر میں چار کروڑ پونڈ ہو چکی تھی۔ چنانچہ اورنگ آباد اور اس کے قرب و جوار میں تمام علاقے سرسبز اور شاداب دکھائی دیتے تھے۔ کاشتکاروں کی حالت قابل اطمینان ہوتے ہی مالگڑاری میں اضافہ ہوا اور پیداوار کی زیادتی سے قہیتوں میں کمی ہو گئی جس سے دکن میں اطمینان اور سکون کی زندگی بسر ہوئے لگی۔ لوگ روپیہ میں دھائی من گہیوں اور دال خریدتے تھے دودھ اور دہی کی تو افراط تھی۔ اور گہی روپیہ میں چار سیر ملتا تھا۔

جب دکن میں متول بڑھا تو تجارت کو فروغی نہ ہوا۔ یہاں کے تجارتی جہاز دور دور از کے متول ممالک تک جاتے تھے۔ یورپ اور دیگر مغربی ممالک میں یہاں کا کپڑا زیب تن کیا جاتا تھا۔ وہ اپنی شادیوں اور تہواروں میں ان ہی کپڑوں کی پوشاک پہنتے تھے۔ لاہار سے مچھلیاں جایا کرتیں۔ جو مالک مغربیہ کی سرد آب و ہوا کے لحاظ سے کثیر مقدار میں فروخت ہوتی تھیں۔ حامل جیسے اب نکلین لگائے جلتے ہیں پہلے ایسے نہ تھے۔ اس سے تجارت کی ترغیب ہوتی تھی۔ لوگوں کو اکتساب دولت کا ایک گونہ شوق ہو گیا تھا اسی طرح ایشیا۔ یورپ۔ برنگال وغیرہ سے یہاں مل آتا تھا۔ فولاد کا کام نرنول میں ہوتا تھا۔ یہاں کے قالین اور دریاں دور دراز تک جاتی تھیں۔ مسوئی ٹیم کے بزرگ گاہ سے جہاز بنگال، سیام، چین جاتے تھے۔ تمباکو اور سیندھی کی معقول تجارت ہوتی تھی جس سے ہندوستانی تاجروں کی دولت الیگزینڈر کی اُس جماعت سے کئی گنا زائد ہو گئی تھی جس کو اُس نے ہندوستان جانے کی ترغیب دلائی تھی۔ دو آنے میں سو مچھلیاں بکتی تھیں، چند کوڑیوں میں سیرگوشٹ اور دیگر ضروریات کی چیزیں نہایت آسانی اور ارزانی سے خریدی جاتی تھیں ان واقعات سے عہد عالمگیری کی خوشحالی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب تجارتی جہاز مالک مغربیہ کو جایا کرتے تو عموماً دریائی ٹیڑھے اُن کو لوٹ لیتے تھے جس سے تاجروں کو نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اسی لٹے اور نگ زیب نے اُن کے اسناد کے لئے چالیس ہزار فوج کا دستہ سیدی خاں کے زیر نگرانی قائم کیا تاکہ اُن کی بوقت ضرورت سرکوبی کی جائے۔

الگزارہی کے انتظامات کے علاوہ فتوحات دکن کا اثر حکومت کے دوسرے شعبوں پر پڑے بغیر نہیں جا سکتا۔ چنانچہ ہر حکمہ سے کابل اور ناہل عہدہ دار علیحدہ کر دئے گئے۔ اُن کے معاوضہ میں صنعتی قابل اعتماد اور تجربہ کار لوگوں کو منتخب کیا گیا۔ علاوہ ان میں منصبدارہی کا پُرانا قاعدہ بند کر دیا گیا۔ اور نوادہ و تر جاگیروں کی عوض تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ اس سے جاگیرداروں اور منصبداروں کو پیر پھیلانے کا موقع نہ ملا۔ یہی عمل حکمہ فوج میں کیا گیا اور اس حکمہ میں میر خلیل خاں سے خاص طور پر مدد ملی۔ اس نے فوجی قابلیت کے علاوہ اعلیٰ طبیعت بھی پائی تھی۔ جب عالمگیری نے اس کو توپ خانہ کا دارغہ مقرر کیا تو ایک قلیل عرصہ میں اُس نے نمایاں ترقی کر کے تقریباً پچاس ہزار سالانہ کی بجٹ دکھلائی۔ ان اندرونی انتظامات سے دکن کی حالت بدل گئی۔ اس وقت دکن میں عام خوشحالی تھی اور لوگ نہایت سہولت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کو ایسا دو اختراع کا بھی شوق پیدا ہوا اور صنعت و حرفت کو عروج ہوا۔ دکن کا متول تھوڑے ہی عرصہ میں انتہائی کمال کو پہنچ گیا۔ اور نگ آباد میں ہمد کے تھان نہایت نفیس تیار

ہو کر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ فرانس، انگلستان، پرتگال تک جایا کرتے تھے۔ بیدریوں کو بیدری کام میں شغف تھا۔ وہاں نفیس اور رنگارنگ کے گنڈیاں، حقے، ڈبیاں، غرض کہ مختلف چیزیں نہایت پختہ اور عمدہ تیار ہو کر دور دور تک بھی جاتی تھیں۔ جگہ جگہ کا سوا لکھ نہایت ہی خوشبودار ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ اُس کے باہر بھی عورتیں استعمال کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ وکن کی ٹرڈت کا اندازہ یہاں کی عالیشان اور بڑے عمارتوں سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اورنگ آباد کا وہ مقبرہ جو تاج محل کی طرز کا ہے اورنگ آباد کی وہ بڑی مسجد جہاں اب بھی جموکی نماز ہوتی ہے۔ غرض یہ تمام دکن کے صنعتی ذوق اور اعلیٰ مذاق کا اظہار زبان حال سے کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پانی کا انتظام جو سڑی کے مضبوطیوں کے ذریعہ سے ہم پہنچایا گیا تھا اس قدر اعلیٰ تھا کہ اُن قدیم نلوں کی پینگی اور اُن کا سبدا اور سال معلوم کرنے میں آج کے روشن خیال انجینیر بھی قاصر ہیں۔

اندرونی انتظامات اور اصلاحات کے بعد عالمگیر نے بیرونی تعلقات کی طرف توجہ کی۔ اُس وقت دکن میں خود مختار ریاستیں تھیں۔ ان میں آسے دن جھکڑے اور خانہ جنگیاں ہوتی تھیں۔ جس سے ملک میں امن و عافیت مفقود ہو چلا تھا۔ اورنگ زیب کے مقابل گو لکنڈہ اور بیجا پور کی خود مختار ریاستیں تھیں۔ گو لکنڈہ نہایت زرخیز مقام تھا۔ یہاں کا مول بطور شمالی پیش کیا جاتا تھا۔ تجارت فروغ پر تھی۔ برہمن اور بھوجری ملت کچھ کم زور تھی۔ مگر اس دولت کے ساتھ ریاست کی حالت قابل اطمینان نہ تھی۔ انتظام کی غربابی سے کوئی سلطنت دیر یا نہیں رہ سکتی۔ والی ریاست کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بیان کا وزیر میر جلد اپنے ذاتی مفاد کا زیادہ خیال رکھتا تھا۔ اپنے غیر معمولی اثرات کی وجہ سے کرائنگ کا علاقہ فتح کر کے اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ اس پر عبداللہ قطب شاہ نے اُس کے بیٹے اور ماں کو قید کر کے اُس کا پورا مال ضبط کر لیا۔ میر جلد کے اس طرز عمل پر بادشاہ سے خود اُس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور بجائے اُس کے کہ وزیر اور بادشاہ مل کر ریاست کے معاملات طے کرتے ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ ایسی حالت میں اورنگ زیب ہر ممکنہ کوشش کے استعمال پر بھی خرچ نہیں ملا۔ اسی اثناء میں میر جلد نے منیلا سلطنت کی ہمداد چاہی۔ اس سے مغلوں کو مداخلت کا خاصہ موقع ملا۔ مگر قطب شاہ نے اورنگ زیب کی ہدایت کی تعمیل نہیں کی تو اورنگ زیب نے فوج کشی کر کے اُس کی خبر لی۔ چونکہ یہ اورنگ زیب کی شہزادی کا زمانہ تھا۔ اس لئے مرکزی حکومت کے احکامات کی بنا پر مجبوراً صلح کرنی پڑی۔ اسی طرح بیجا پور کی بدعنوانیوں کی تنبیہ کی گئی تو عاقل شاہ نے افضل خاں کے

شورہ سے معافی چاہی۔ جب ایک کسں لڑکا عادل شاہ ثانی کے نام سے تخت نشین ہوا تو بھیدر اسمی کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس نے سفلیہ حکومت نے دوبارہ مداخلت کی۔ اس وقت اورنگ زیب جس کے ہمراہ میر جلد تھا دہلی کے فرمان کی بنا پر صلح کر لی۔

۱۶۶۷ء میں شاہ جہاں کی علالت اور تخت نشینی کے جھگڑوں کی وجہ سے اورنگ زیب دکن چھوڑ کر شمالی ہند روانہ ہوا۔ اور تخت نشینی کے بعد بھی ایک عرصے تک ذاتی طور پر اس علاقے کا ارادہ نہ کر سکا۔ گوجیا پور اور گولکنڈہ کی ریاستیں معاہدہ کے لحاظ سے مغلوں کی شہنشاہی قبول کر چکی تھیں۔ لیکن سلطنت کے کارپردازوں کی مصروفیت کی وجہ سے ان کا خراج ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے علاقوں میں مرہٹے بھی زور پکڑ رہے تھے۔ یہ لوگ ملکِ عنبر کے اصول پر عمل پیرا ہو کر پیشہ کار کشکاری سے ترقی کر کے سپاہِ زندگی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ اودیہ ہمنیہ سلطنت کے درباروں اور ملکِ عنبر کی فوج میں ہرگز قزاقانہ جنگ کے مستند دل سے واقف ہو گئے تھے۔ یہ مردانہ وار حملہ نہیں کرتے بلکہ اچانک اور پیچھے سے چھاپے مارتے تھے اور تعاقب کے وقت وہ گھائیوں اور غیر مانوس مقاموں میں چھپ جاتے تھے اس طرح یہ لوگ جہاں اثر کے پورے علاقوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اکبر و جہانگیر کے زمانہ میں ان کو کافی فوجیں فراہم کرنی پڑیں۔ کیونکہ باہمی عناد کے علاوہ شمالی دشمنوں کا مقابلہ درپیش تھا۔ ملکِ عنبر کے انتقال کے بعد اس کی مرتب کردہ فوجیں منتشر کر دی گئیں اور اس کی جاگیریں ساہو کو عطا کی گئیں۔ جب ملکِ عنبر کا لٹکانچ خاں مغلوں سے جا ملتا تو شہنشاہ نے اس کے باپ کی جاگیریں ساہو سے ولادیں۔ اس کے بعد اس کی بیجا پور کی ملازمت اختیار کی تو دوبار بیجا پور نے اس کی خدمات کے صلہ میں پونا اور سوپا کی جاگیریں عطا کیں۔ مگر جب ساہو کا بیٹا سیوا عنفوان جوانی اور آغاز شباب کو پہنچا تو اس کا عروج برسرِ تنزل ہو گیا۔ یہ پوتے کے دادا جی کارکن کے زیرِ تعلیم و نگرانی رہا۔ اس کو فنِ سپہگرمی اور سیر و شکار کا طبعی ذوق تھا۔ پہاڑوں کے پھیل اور کوئی اس کے حمد و سعادوں تھے۔ وہ ہوش سنبھالتے ہی جنگلوں اور گھائیوں میں گھومنے لگا۔ موقع پا کر اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیجا پور کے آس پاس کے قلعوں پر چھاپا مارتا تھا۔ ان مقامات کے انیسوں کے شور و فرباد پر حکومت کی طرف سے کوئی توجہ مبذول نہ کی جاتی تھی۔ اور عموماً یہ اعمال کو رشوت کے ذریعہ سے اپنا بنا لیتا تھا۔ حکومت کی ان بے اعتنائیوں کی وجہ سے اس کو نئے نئے گُل کھلانے کا موقع ملا۔ گوجیا پور دکن میں زبردست حکومت تھی مگر اس کی انتظامی حالت بدترین ہو گئی تھی۔ جس سے سیوا نے اپنی طاقت

بڑھائی۔ اس کے جھنڈے کے نیچے سات ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادہ جمع تھے۔ اس نے دکن میں لوٹ مار سے بد امنی پھیلانی۔ دکن کی سلطنتوں کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر مرہٹوں نے مال غنیمت کے علاوہ مقبوضات بھی حاصل کئے۔ اس طرح انہوں نے ایک متحدہ سلطنت قائم کر لی۔ سنبھا اپنے باپ سیوا کا جانشین ہوا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں پر بھی اُس کی بے رحمی اور بے دردی کا دست دراز تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان غرض سب کے سب اُس کے حرکات قبیحہ کے شاکِ تھے۔ اُس نے باپ سے بغاوت کی۔ جب سیوا نے سخت مواخذہ کیا تو مغلوں کے سایہ عاطفت میں آ گیا۔ عنانِ حکومت ہاتھ میں آئے ہوئے کچھ عرصہ بھی نہ ہوا تھا کہ سنبھا نے برآن پور کے بیرونی مقامات کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ اب عالم سکیمہ کو راجپوتوں کی مہم سے فراغت ملنے کی وجہ سے شمالی ہند سے اطمینان ہو چکا تھا۔ اسی اشنائیں برہمپور کے معزز طبقہ کا محضرِ موصول ہوا تو سنبھا کی گوشمالی اور اپنے مقامات کی حفاظت کی غرض سے وہ برآن پور ہوتے ہوئے آدرنگ آباد پہنچ گیا۔ شہزادہ معظم نے سنبھا کے تقریباً کل قلعے تباہ و تاراج کر دئے مگر موسم کی خرابی اور بارش کی کثرت سے لشکر میں وبا پھیل گئی تو معظم احمد نگر واپس ہوا۔

اسی زمانہ میں شہنشاہ نے بیجا پور کا رخ کیا۔ چونکہ والی بیجا پور باجوہ دبا گلزار اور ہم مذہب ہونے کے تحت تیموری الٹ دینے کے لئے ہمیشہ مرہٹوں کی مدد کرتا تھا۔ یہ اپنے وعدہ کا پابند نہ تھا اور نہ اس پر شاہی خطاب و عتاب کا کچھ اثر ہوتا تھا۔ اسی لئے شہزادہ معظم اس مہم کے لئے مقرب ہوا۔ مگر فوج کی کمی کی وجہ سے وہ محصور ہو گیا۔ تو اس کی کمک کے لئے فیروز جنگ کا انتخاب ہوا۔ اس بہادر سپہ سالار کی مدد سے بیجا پور کا محاصرہ کیا گیا۔ مگر اجناس کی فراہمی اور ساز و سامان کی فراوانی نے بیجا پوریوں کو ڈٹ کر لڑنے کا موقع دیا۔ اسی اشنائیں شاہی فوج میں کشتگی اور باہمی ناچاقی پیدا ہو گئی شہنشاہ نے کمال استقلال و مسانت سے آکر اُن کو غیرت دلائی اور اُن کے دلیرانہ جذبات کو اکسایا۔ اس طرح اُن میں بہادری اور سرفروشی کی ایک روح دوڑادی۔ الغرض شہنشاہ نے غازی الدین سپہ سالار کی شجاعت کی بدولت ریاست بیجا پور سلطنتِ مغلیہ کا ایک صوبہ بن گئی۔

جب سیوا اینجنہاری کے خطاب سے ناراض ہو کر جشن سالانہ کو خیر باد کہا اور حیدر آباد آیا تو ابوالحسن دالی حیدر آباد نے اُس کی ہمت بڑھائی، جنگی ساز و سامان اور مال و متاع سے مدد کی تو اُس کو کھیل کھیلنے کا موقع ملا۔ اُس نے ایک یلوس اور محصور شخص کی اعانت کی جس کی دولت پہلے ہی

لٹ چکی تھی اور عمارتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ غرض ابوالحسن کی وجہ سے سیو کو ترغیب ہوئی کہ شاہی مقبوضات پر از سر نو چھا پڑے اور کمزوروں پر ظلم ڈھائے۔ ابوالحسن مرہٹوں کا بڑا حامی تھا اور اُن ہی کے معاونت سے مغلیہ تخت و تاج کو تاراج کرنے کا درپے تھا۔ گویا اس کی بسرا سی خیال میں ہوئی تھی کہ مرہٹوں کو دولت اور لشکر سے مدد کر کے مغلوں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے۔ تانا شاہ نے اپنے اس خیال کو کامیاب بنانے میں مکانی کوشش کی۔ یہ عیش و عشرت کا بندہ۔ کھیل تماشاؤں میں منہمک، خواہشات نفسانی و نفس پرستی میں اپنی زندگی بسر کرتا تھا اور ہمیشہ نشہ میں مست اور سرشار عصیاں کاری و بدشعاری عین اُس کا دستور و غرور و نخوت کا نشہ ہمیشہ چڑھا رہتا تھا۔ غرض دنیا جہاں کی تمام برائیوں کا مجسمہ تھا۔ اس کے علاوہ اُس کے زمانہ میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ اُن بد پر طرح سے سختیاں اور پابندیاں عاید کر دی گئی تھیں۔ حکومت مادیانہ دت کی تھی۔ اس نے مسلمانوں کو نقصان ہی نہیں پہونچایا بلکہ ظلم و تعدی سے کام لیا۔

سید مظفر کی اعانت اور کمال استعدادی سے ابوالحسن کو لکندہ کے تخت و تاج کا مالک ہوا تھا۔ یہ نہایت ہی زیرک اور خیر خواہ ریاست تھا۔ مگر ابوالحسن نے اُس کو مغزول کر کے مادنا کو وزارت کا منصب عطا کیا۔ سیوانے ان امور کے تحت دربار شاہی سے فرار ہونے کے بعد ابوالحسن سے مدد لی اس کے علاوہ ابوالحسن نے والی بیجا پور کو ایک خط لکھ بھیجا کہ تم شاہی افواج کا نہایت شجاعت و استقلال سے مقابلہ کرو۔ میں ادھر سے سنبھا کی نگرانی میں چالیس ہزار فوج بھیجتا ہوں۔ اب مالکیہ کے غم و استقلال کا پتہ چلتا ہے۔ ابوالحسن نے باوجود باجگزار ہونے کے خدام شاہی کے خلاف مرہٹوں کو مدد دی اور عین محاصرہ بیجا پور کے وقت سنبھا کو مغلوں کے خلاف اکسایا۔ اور کثیر افواج کے ساتھ ہم پر پہونچنے کی ترغیب دلائی۔

اس کے علاوہ کئی سال سے خراج بھی ادا نہیں کیا گیا تھا۔ سلطنت کو کسی طرح سے اس ریاست کے قول و فعل کا اعتبار نہ تھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں پر مرہٹوں کا جادو پوری طرح چل گیا تھا۔

والیان قطب شاہی اہل تشیع سے تھے اور امرا و رؤسا عموماً اسی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ شہزادہ معظّم اسی فرقہ کا ہم خیال تھا۔ بادشاہی امر ابھی اس سے دلی ہمدردی نہ رکھتے تھے۔ مگر اُس کی بڑائی اور مردم آزاری دربار سے انکل کر شہر میں خاص و عام ہو گئی تھی۔ اُس کی تنگ ظرفی اور مغلوں سے فصاحت چھپی ہوئی نہ تھی چونکہ دلی عہد کو اس سے محبت تھی۔ اُس نے جنگ سے بچانے کے لیے پیغام

دیا کہ مادنا کو علیحدہ کر کے قید کر دیا جائے۔ شاہی مقبوضات واپس کر دئے جائیں۔ اور خراج کی باقیات ادا کر دی جائیں۔ گو لکنئہ سے اس کا جواب نہایت ہی سخت ملا۔ مقابلے کے لئے فوج بھیجی گئی۔ دکنی لشکر نے بڑی جوانمردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مزید برآں شہزادہ معظم نے رعایت سے کام لیا۔ جس پر عالمگیر نے ناخوشی کا اظہار کیا۔ اس پر بھی جیت عالمگیر کے ساتھ رہی۔ کئی مہینوں کی لڑائی کے بعد مغل فوجیں حیدرآباد میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو گئیں۔ تانا شاہ اور اُس کے ساتھیوں نے قلعہ گو لکنئہ کو اپنا مقام امن و عافیت بنا کر پہلی شرط کو مجبوراً تسلیم کر لیا۔ معظم نے خراج میں سالانہ اضافہ کر کے حیدرآباد کو خالی کر دیا۔ اُس نے پھر رعایت سے کام لیا۔ مگر ابوالحسن نے اپنے اس عہد کا ایذا نہ کیا بلکہ فوج مقابلے کے لئے بھیجی۔ تو آوزنگ زیب نے گو لکنئہ کا احصار کیا۔ یہ قلعہ بجا پور کے مقابل نہایت ہی بلند اور مستحکم تھا۔ یہاں کا محمول یہاں کے لڑنے والے یہاں کا جنگی ساز و سامان، بجا پور سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ اُس کو کافی موقع ہاتھ آنے کی وجہ سے فوج کو عدد کی کمی کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ ادھر شہنشاہ کے ایرانی ساتھی اس جنگ کے قطعاً خلاف تھے۔ معظم کو ابوالحسن سے دلی ہمدردی تھی۔ اس پر موسم کی خرابی، بارش کی کثرت، اشیاء و محتاج کی قلت سے محاصرین کے بلند حوصلے پت ہو گئے۔ مگر عالمگیر اتنا مستقل ارادہ اور بلند حوصلہ تھا کہ ان عواید و امور موافق سے کبھی باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنی دھن کا پٹکا اور خیال کا سچا تھا۔ معظم اپنی سازشوں کی وجہ سے فراست میں لے لیا گیا۔ اور بعض اہل سازش کو سزائیں ہوئیں۔ آخر الامر تانا شاہ کے رفیقوں نے مایوس ہو کر عالمگیر کی سیادت تسلیم کر لی۔ پھر سالار فیروز جنگ نے انتہائی کمال اور استقلال سے دکنی فوج کا ایک عرصہ تک مقابلہ کیا۔ اور گو لکنئہ کی طرف سے عبدالرزاق نے نہایت ہی مستقل مزاجی اور اولوالعزمی کے ساتھ قوم اور ملک کی حفاظت و حمایت کے لئے اپنی جوانمردی اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ چنانچہ اس معرکہ میں اُس کے بدن پر نیش سے زائد کاری زخم لگے۔ اس محاصرہ سے امراتنگ آگئے اور قلعہ کے نگہبان سردار نے خود شہر نیاہ کا دروازہ کھول کر مغلوں کی ہمت بڑھائی اب کیا تھا کہ محاصرین شہر میں گھس پڑے۔ گو یا طلب شاہی سلطنت آٹھ مہینے دس دن کے محاصرہ کے بعد مغایہ سلطنت کا ایک صوبہ بن گئی۔ گو اس معرکہ قتال کی وجہ سے آوزنگ زیب کو مر ہوئوں کے سد باب کا موقع نہ ملا۔ مگر شہنشاہ کی قربت اور مصروفیت جنگ کی وجہ سے مر ہوئوں کی مجال نہ ہوئی کہ پھر اس عرصہ میں کہیں اور ہاتھ ماریں۔ سبھانے اس دور کی وجہ سے اس کی زندگی بسر کرنی شروع کی مگر عالمگیر کے ادھر سے فارغ ہوتے ہی

فیروز جنگ نے بیجا پور کے وہ جنوبی مقامات اور مقبوضات جن پر سہو قابض ہو گیا تھا چھین لئے۔ اور سنبھا کے مفد اند خیالات اور باغیانہ جذبات کے استیصال کے لئے مقرب خاں مامور کیا گیا۔ یہ بہادر کمال شجاعت سے سنبھا کے تعاقب میں نکلا اور خبر پاکر اُس دشوار گزار گھاٹ کی طرف یلغار کرتا ہوا اچانک پہنچ گیا جہاں سنبھا اپنی دو تین ہزار فوج کے ساتھ محو عیش تھا۔ سنبھا کو سوائے جنگ کے بھاگنے کا موقع نہ ملا گو بادشاہی لشکر زاید نہ تھا مگر اُس کے سامنے مرٹوں کی فوج ٹھہر نہ سکی۔ اور سنبھا کسی مندریں چھپ گیا۔ مقرب خاں بھلا اُس کو کہاں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کو اور اُس کے بال بچوں کو گرفتار کر کے دربار شاہی میں لے آیا۔ سنبھا نے یہاں پہنچ کر باوجود اس عالم بایوسی کے شہنشاہ کو منغلات سنائیں اور سعانی نہیں مانگی۔ اس لئے وہ قتل کر دیا گیا۔ اس کی ماں اور بیٹے کے ساتھ خاص مراعات برتے گئے۔ سنبھا کے بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت عالمگیر کے شاہانہ اور فیاضانہ سلوک کے ساتھ ہوتی رہی۔ اس کے بعد رام راج کے ہاتھ مرٹوں کی عنان حکومت آئی۔ مگر مرٹوں کی خود مختار ریاست قائم نہیں رہ سکی۔ چونکہ رام راج جو برار کے علاقوں میں چھاپہ مارتا اور آوارہ پھرتا تھا حقوڑے ہی عرصہ میں مر گیا۔ اس لئے اُس کی بیوی تارا بانی نے رہنمائی پر کمر باندھی۔ اس نے عالمگیر کی مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مرٹوں فوج دو تین گروہوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اُن کو گولکنڈہ اور بیجا پور کے مسخر ہونے کے پہلے کافی امداد پہنچتی تھی۔ اور وہاں کے امرا اور زمیندار اُن کی بد نظمی اور ظلم تو جہی سے متروک اور کرش ہو گئے تھے۔ الغرض مغلوں کے خلاف مرٹوں کو مدد ملتی تھی۔ اور قدرت نے انہیں کچھ ایسے بہار دے رکھے تھے کہ جس سے وہ قزاقانہ طریقہ سے لڑ بھڑکتے تھے۔ اس وقت مرٹوں کے جرگے پریشان حال تھے۔ چونکہ اُن کو لوٹ مار کے علاوہ جو مستقل آمدنی کا ذریعہ تعلقہ مفقود ہو گیا تھا۔ عالمگیر نے انتہائی زمانہ پیری میں بھی اپنی استقامت اور بلند وصلگی کو کبھی نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اپنی وفات کے دو برس پہلے مرٹوں کے تمام بلند اور سنگین قلعے مسخر کر کے محفوظ مقامات پر اپنا تسلط جایا بست کر رکھ کر فتح سے کوئی شے کی تسخیر مکمل ہو گئی۔ جس سے مرٹوں حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب مرٹوں کا کوئی ماسن نہ تھا۔ یہ لوگ بے یار و مددگار ہو کر قزاقوں اور ڈاکوؤں کی طرح آوارہ گردی اور مردم آزاری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہجہاں کے زمانہ میں ان کی قوت بڑھ چکی تھی۔ جب عالمگیر کا سابقہ پڑا تو اُن کی طاقت انتہائی عروج پر تھی۔ مگر اورنگ زیب کی اعلیٰ قابلیت اور غیر معمولی سعی و اقبال نے بڑے بڑے

سورما اور علم برداران بغاوت کا خاتمہ کر دیا۔ غرض اس کی آخری زندگی تک مغلیہ سلطنت میں نئے مقبوضات شامل ہوتے رہے۔ جو حکومت کی رفعت اور استحکام کا ثبوت ہے۔

جس وقت دکن کی ریاستیں بدعنوانیوں کا گھر بن گئی تھیں اور جب کہ وہ بلندی سے پستی اجالے سے تاریکی اور انتہائی ضلالت کی طرف جا رہی تھیں تو قانون قدرت کے مطابق ان کی ماہیت عالمگیر کے زیر دست ہاتھوں نے بدل دی۔ ایسی حالت میں ان ریاستوں کا دم ختم ٹوٹ گیا اور وہاں بدعقلیہ سلطنت کے صوبہ دار قائم ہو گئے۔ ان سے مرکزی حکومت دور ہو گئی، خبریں ملنے میں کئی دن درکار ہوتے تھے۔ جنوبی ریاستوں پر سافت کی وجہ سے حکومت کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ اب چونکہ مرہٹوں کی کوئی مستقل حکومت باقی نہ تھی۔ ان کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ لٹیروں اور ڈاکوؤں کی طرح مختلف ٹکڑوں میں منقسم ہو کر دور دور پھیل گئے تھے۔ اور موقع پا کر چھاپے مارتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے بعض بندرگاہوں کو بھی لوٹ لیا۔ ایسی حالت میں شہنشاہ نے نوادار دکنگیرزوں اور پرتگالیوں کو اپنی حفاظت آپ کرنے کا حکم نافذ کیا۔ کیوں کہ حکومت ان کے نقصان کی ادائی سے زیر بار ہو چکی تھی۔ اور یہی سلسلہ ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا۔ اس طرح نوادار دکنگیرزوں کی خوب بن آئی اور ہندوستان میں ان کی نئی طاقت پیدا ہو گئی جو آئندہ چلکر مغلیہ سلطنت کے منزل کا بالواسطہ سبب بنی۔

چونکہ ابوالحسن شیدہ ریاست کا ڈوبتا ہوا آفتاب تھا۔ اس سے اہل تشیع کو خاص لگاؤ اور انت تھی۔ اس کی سلطنت کا جراح نگل ہونے کے بعد اس فرقہ کے تعصب کا تاثر شعل ہوا۔ اور ان کے غیظ و غضب کی آگ بھڑکی اور یہ بھی مغلیہ سلطنت کی خرابی کا ایک باعث ہوا۔

عالمگیر کی عہداری کے قبل دکن میں مختلف خود مختار راجدہانیاں تھیں۔ ہر راج دہانی کا قانون ہی نرالا تھا۔ مگر اس نصرت و فتح کی وجہ سے پورا دکن ایک ہی شہنشاہ کا مطیع و متقاد ہو گیا۔ ایک ہی قانون ہر گوشہ دکن میں رائج ہو گیا۔ ایک ہی عدالت تھی جو اہل دکن کی قسمت کا فیصلہ کرتی تھی۔ اور ایک ہی سکے تھا جو دکن میں جاری تھا اور ان سب کا تعلق مغلیہ حکومت سے تھا۔ غرض ایک ہی پیشہ سے دکن کی کھیتی سرسبز ہوتی تھی۔ گو دکن کو مرکزی حکومت سے اطلاعیں دیر سے ملتی تھیں اس کے علاوہ راستہ دشوار گزار تھا تاہم عالمگیر نے مسافروں کی حفاظت کے لئے باجا جو کیاں اور برتے رکھے تھے۔ اگر مسافروں کو کوئی گزند پہنچتا اور وہ لٹ جلتے تو بدرفتوں سے اس کا سخت

مواخذہ کیا جاتا تھا جس سے مسافروں کی آمد و رفت اور فرامین کے وصولی میں کوئی خوف و تامل نہ تھا۔ اگر کسی طرح سے ہوشیاری احکامات اور اس کے مروجہ قانون کی تعمیل یہاں عمل میں آتی تھی۔

ابتداءً دکن کی ریاستوں میں منق و منجز پھیلا ہوا تھا۔ اُس کا انداد اور نگرانی حکومت کی جانب سے خاطر خواہ نہ تھی۔ ادھر مرہٹوں کی لوٹ مار، جبر و تعدی اور اُن کے قتل و غارتگری سے ملک میں طوفان بے تمیزی اور بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ انصاف نام کو نہ تھا۔ مگر اورنگ زیب کے فتوحات کے بعد دکن میں امن و عافیت کی منادی کر دی گئی تمام کمرشل اور باغیوں کا ایک سرے سے اتصال کیا گیا کسی ملک کی بقا و حیات کا انحصار وہاں کے امن و عافیت پر ہے۔ عالم گیر اس نظریہ کے موافق رعایا کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔ ایسی حالت میں اس کے اعتدالی پسند احکام کے سامنے رعایا تسلیم خم کرتی تھی۔ گو اس وقت موجودہ زمانہ کی طرح ذرائع آمد و رفت سہل نہ تھے مگر فرامین کی تعمیل بروقت ہوتی تھی اور ڈاکے اور پورٹس بہت کم سنائی دیتی تھیں۔

اس کے علاوہ مذہبی آزادی عام تھی۔ اور حکومت اُن پر بجا تصرف اور وعدہ خلافی سے راج نہیں کرتی تھی۔ ہر قوم ہر طبقہ اور ہر انسان اپنے خیال میں آزاد تھا۔ چنانچہ غارے ایلور اجواوگر کے دامن میں ہیں وہ برہمنہ مورتوں سے بھرے پڑے تھے۔ وہاں ہندو نہایت آزادی کے ساتھ تہوار مناتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا دوسرا مرکز اور جائے عبادت و قربانی اجنڈہ تھا۔ وہاں بھی غارے بولہلو کی کثرت تھی اسی طرح بہت سے مندر تھے جہاں تیرتھ کے لئے دور دراز کے ہندو زائرین بھی کسی پرانہ کے آتے تھے۔ اور عرصہ تک یہاں اُن کا جھگڑا رہتا تھا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کے مطالعہ کے بعد ہر انصاف پسند عالم گیر کا وجود دکن کے لئے باعث آزادی و مذہبی رواداری، خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سرزمین دکن ایک عظیم الشان وسیع ملک تھا۔ جہاں مختلف راج دھانیوں پر سر اقتدار تھیں۔ آج بھی یہاں کے بڑے بڑے قلعے اور مندر گاہیں اُن کے تمول اور مذہبی تخیل کا ثبوت دیتی ہیں۔ گو اورنگ زیب کا اُن پر تسلط ہو چکا تھا، مگر اُس نے اُن کے حقوق کی حفاظت اور رعایا کی حالت کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ جنہوں نے بیدار ورنگل اور گولکنڈہ وغیرہ کے قلعے دیکھے ہیں، اُن پر انہوں نے قدیم مندر گاہوں کا نشاہدہ کیا ہوگا۔ ان کو محفوظ دیکھ کر کوئی عقلمند خواہ وہ کسی مذہب کا ہو مذہبی رواداری کا خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جب اورنگ زیب نے دکن کو فتح کیا تو اپنے ساتھ اپنا تمدن بھی لایا۔ یہ مذہبی حکومت کو اسلامی آئین و قوانین کے مطابق چلا آتا تھا۔ اگر کے عہد میں جو ریس رائج تھیں وہ کم و بیش شاہ جہاں کے دور تک جاری تھیں۔ اگر عالمگیر اسلامی شعار اختیار نہ کرتا تو بہت ممکن تھا کہ تیموری سلطنت ہندو سلطنت سے تبدیل ہو جاتی۔ سنہ شمسی جو اگر کے عہد سے چلا آتا تھا اُس کو سن قمری سے بدل دیا پوشاک اور درباری تمدن جو ہندوئی طرز لیا ہوا تھا اُس میں بھی تبدیلی کر دی۔ اُس نے تمام درباریوں اور عام باشندوں کو اسلامی مسادات کا سبق سکھلا کر بادشاہ پرستی کو مٹایا۔

ان فتوحات سے نہ صرف امور سلطنت اور فوجی معاملات میں استحکام ہوا بلکہ علم و سخن کا آفتاب بھی چمکا جس طرح سکندر کے حملوں سے ہند کو منجملہ اور چیزوں کے علمی اور ادبی ذخیرہ ملتا تھا اسی طرح اورنگ زیب کے ان فتوحات سے اردو زبان کی نشوونما کے لئے راستہ کھل گیا۔ اس نے دلی کی بہت بڑھائی جس سے اُس کا اردو حکام دار السلطنت میں قبولیت عام کی سند حاصل کرنے کے قابل ہوا۔ اُس سے دوسروں کو بھی شوق کی کاشت ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سے شاعر پیدا ہو گئے۔ اس کے علاوہ اُس نے ایک مجلس منعقد کی جس میں علماء، فضلا بلائے گئے تھے۔ اُن کی مدد سے اورنگ زیب نے مختلف کتابوں سے مواد لے کر اسلامی قانون کی ایک جامع کتاب بنائی جس کو "فتاویٰ عالمگیری" کہتے ہیں اس کتاب کے اکثر قوانین آج بھی حکومت برطانیہ میں رائج ہیں۔ ہر موضع اور تعلق میں حدیث و فقہ کی تعلیم کا انتظام کیا۔ اور محنتی اور شوقین طلباء کو خزانہ شاہی سے وظائف مقرر کئے۔ ان کی ذہنی اور دماغی قابلیتوں کو اچھی طرح پرورش کیا تاکہ وہ آئندہ اپنی زندگی اپنے ملک اور سلطنت کی خدمت میں وقف کر سکیں۔ بیجا پور اور گولکنڈہ کے مسخر کرنے اور مرہٹوں کے امتیصال کے لئے اورنگ زیب دکن میں ایک عرصہ تک رہا۔ اس کو مرکزی حکومت سے اطلاعیں فاصلہ کی وجہ سے وقت پر نہیں ملتی تھیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر سکھوں نے زور پکڑا اور خاصی طاقت فراہم کر لی۔ جس سے انہوں نے پنجاب پر چھاپہ مارا۔ اس کے انداد کے لئے عالمگیر کو اپنی توجہ صرف کرنی پڑی ان ہی اسباب کی بنا پر دکن بہت جلد فتح نہیں ہوا۔ گو حکومت کی جانب سے اُن کا مستقل انتظام کیا گیا تاہم انہوں نے اورنگ زیب کی عدم موجودگی میں اپنی طاقت مستحکم کر لی تھی۔ جس سے حکومت کو خاص توجہ مبذول کرنی پڑتی تھی۔ شمالی ہند سے فوجیں کئے مہینوں کے بعد دکن آتی تھیں جس سے مغلوں کو ایک بڑی رقم خرچ

کرتی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ دکنی ریاستوں کا تنول کچھ کم نہ تھا۔ اس لحاظ سے منگلوں کا روپیہ بھی کافی صرف ہوتا تھا۔ غرض ان فتوحات سے دکن میں مستقل لڑنے والے پیدا ہوئے۔ اور ایک اعلیٰ فوج مرتب ہوئی جس میں جنگجو اور سلج سپاہی تھے ضرورت کے وقت وہ غنیمت کا مقابلہ کرتی اور ملک میں اطمینان و سکون کا باعث ہوتی تھی۔ دشمنوں کا ایک ایک کر کے خاتمہ کیا گیا۔ مرہٹوں کی بڑی طاقت منتشر کر دی گئی۔ اب ان کا کوئی مان نہ تھا۔ جب دکن میں امن و نظم قائم ہو گئی تو صنعت و حرفت میں اہل ملک نے ترقی کی اور اُس میں اعلیٰ شغف حاصل کیا۔ کسی ملک کی ترقی اور عروج کا راز و مدار وہاں کی صنعت پر ہے۔ انگلستان کو لیجئے اُس نے جو آج نمایاں ترقی کی وہ محض صنعت و حرفت کی بدولت ہے۔ صنعت کی ترقی تجارت پر ہے۔ اہل ملک کے جہاز و درازہ کے مالک کو جایا کرتے جس میں ان کے صنعتی ذوق اور اعلیٰ مذاق کی چیزیں ہوتی تھیں۔ اس سے اُن کے تعلقات وسیع اور اثرات قومی ہوتے گئے۔ زراعت کو نمایاں ترقی ہوئی۔ کیونکہ یہاں شالی ہند کے وہ اصول اختیار کئے گئے جو وہاں کے اعلیٰ ترین اصول تھے۔ اس سے پیداوار میں اضافہ ہوا۔ دکن کا تنول بڑھا۔ اور حکومت کو کافی مالگزاری وصول ہونے لگی۔ دولت کی کثرت سے تکلف اور راحت کی چیزوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اُس کا اظہار عالیشان عمارتوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا تمدن اور ان کا طرز معاشرت جنوبی ہند پر پڑے بغیر نہیں رہا۔ چنانچہ اس وقت تک بھی مغلیہ تمدن کا اثر دکن میں زندہ ہے اور اُس کے اثرات ہر شعبہ زندگی میں پائے جاتے ہیں۔

مصطفیٰ کا تذکرہ ہندی

(از: برہمچاری)

مصطفیٰ کے تذکرہ ہندی کے محلو اس کے لیے آب حیات (آزاد) تذکرہ شعرا (حسرت موہانی) اشوہی بھارت
(مرتبہ مولوی عبد الماجد صحیفہ مصطفیٰ) (مرتبہ بی راقی ہوسوی) مصطفیٰ کا تذکرہ (مضمون مولوی عبد السلام ندوی) (مرتبہ سالہ مبارک
اکٹ ۱۹۱۳ء) دیکھنے کی ضرورت تھی، دیکھا، جس میں مولوی عبد السلام صاحب ندوی کے مضمون کے سوا، مصطفیٰ اور مصطفیٰ کی
شاعری ہی شاعری ہی جب آپ کا جی چاہے آب حیات میں :-

(مصطفیٰ)

والہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈا ہی بھڑوے

(انشا)

ڑتے ہوئے آئے ہیں مصطفیٰ و مصحفن

پڑھ لیجئے!

اور زیادہ سے زیادہ مصطفیٰ کے ساٹ دیوان تھے یا ان کے اتنے شاگرد، مصطفیٰ کے شاگردوں میں شیخ ناسخ
بھی ہیں یا انہوں نے مصطفیٰ کے ساتھ دیوان لکھے بھی یا نہیں؟ اس بحث سے اردو ادب اور تاریخ کو شاید آتنا فائدہ
نہیں پہنچ سکتا جتنا مصطفیٰ کی تالیفات میں تذکروں کی تحقیقات سے پہنچ سکے گا۔ مصطفیٰ کے تذکرہ ہندی کی تحقیق خود
مصطفیٰ کے تذکرہ کی روشنی میں کرنی زیادہ بہتر ہوگی، اس تحقیق سے پہلے مصطفیٰ کی شخصیت کو بھی مصطفیٰ کے قلم سے دیکھیں
وہ اپنے باب میں کیا کہتی ہو :-

(تذکرہ فارسی)

مصطفیٰ - مولف اس مجموعہ - فقیر حقیر غلام بہانی کہ مصطفیٰ تخلص میکند اور انیز لازم آمد کہ در ردیف
اشعار خود را ہم زینت تذکرہ نماید تا بدیں واسطہ داخل ملتہ مجلس یا راں باشد

(تذکرہ ہندی)

”مغنی نمائند مولف اس تذکرہ کہ غلام بہانی نام دارد و تخلص مصطفیٰ میگذازد و بزرگانش اباعن جدا
نوگری خانہ بادشاہ کردہ انداز ایا اے کہ تفرقہ شدیدے در سلطنت راہ یافتہ سلطنت خانہ اس

مجلہ کتبہ
 رویہ ہمہ نجاک سیاہ برابر شدہ۔ ہم از متع دنیا بہرہ دانی داشتند۔ ایں فقیر چونکہ سبخت و طالع
 آہنا داشت ناچار از آغاز شباب بہ مقتضای موزونی طبع مصروف تحصیل علم بود۔ چنانچہ فیض
 صحبت بزرگان اول از تکمیل نظم و شعر زبان فارسی و تحقیق محاورہ و اصطلاحات آل فراغت حاصل
 کردہ بہ مقتضای رواج زمانہ آخر کار خود را مصروف ریختہ گوئی داشتہ۔ برائے آنکہ رواج شعر فارسی
 در ہندوستان بہ سبب ریختہ کم است۔ و ریختہ ہم فی زمانہ پایہ اعلیٰ فارسی رسیدہ بلکہ از سپر گردیدہ
 چندال مصروف فارسی نمائندہ است۔ دو از دہ سال در شاہجہاں آباد بدور نجف خاں مرحوم گوشہ
 عزلت خنیدہ۔ زبان ریختہ اردو سے معلیٰ کمال دریافت نمودہ۔ و ہرگز برائے تلاش معاش در ان حشر
 اجساد اموات برد کس ز رفتہ۔ اگرچہ بہ سبب فارسی گوئی در ایران مسلم الثبوت فارسی گوہم ہمہ مدھی شود
 اما نام برآوردہ ریختہ است۔ و آل چہ دریں مدت تصنیف و تالیف کردہ ایں است :-
 و دیوان فارسی زبان فصیح کہ یکے در جواب مولانا نظیری نیشاپوری ہنوز با تمام داشت و یکے
 بطور خود تمام۔

و دیوان ہندی۔

و دو تذکرہ یعنی فارسی و ہندی۔

و یک و دیگر شاہنامہ با تمام تائب نامہ حضرت شاہ عالم بہادور بادشاہ غازی و غیرہ
 و یک دیوان ہندی کہ در شاہجہاں آباد گفتہ۔

مع مودہ دیوان فارسی اول کہ زبانش بطور جلال اسیر و ناصر علی بود پسند رفتہ میجو است کہ
 کلام خود را آخر ہمہ صاحبان نویند۔ اما حرف الیم برآں آورد کہ بردیف میم داخل باشد لہذا مخرقا
 خود را شامل ایں جبریدہ کردہ شد تا بر صفحہ روزگار یادگار بماند

(انتخاب)

ناہے تھنئی میں جب سے شعر عرفی کا
 ہمیشہ مات گریباں سے ہے مرا گستاخ
 بسا عتہ کہ کشائی قبا بسا دور
 کہ میکشاد کسے بند ایں قبا گستاخ

کریں گے خواب راحت یا یہی جنجال ہو گا
 خدا جانے کے بعد از مرگ کیا احوال ہو گا

رفتہ رفتہ مجھ کو سوچے ہے جنوں ہو جائے گا
مفت میں ظالم کسی کا در نہ خوں ہو جائے گا

عجلہ کبیتہ
یہ خیال اک دن اسی صورت فزوں ہو جائے گا
ان خنائی ما توں کو پردے میں رکھو ہر خدا

کچھ وہ بھی مجھ کو دیکھ کے حیران رہ گیا
سینہ میں جس کے ٹوٹ کے پیکان رہ گیا
کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا؟

کل میں جو راہ میں اسے پہچان رہ گیا
سمجھے وہ صید جستہ مرے اضطراب کو
شوخی تو دیکھ تیر کو سینہ سے کھینچ کر

کہیں بے پی ہے تو نے یا اٹھا ہو نیم خوابی

نظر آتے ہیں پردے تری آنکھوں کے گلابی

تو سینہ کے روزن کوئی دکھلانے نہ پاؤ

وہاں روزن دیوار بھی اب بند ہوئے ہیں

شعر از دیوان دوم

چمن میں کہتے ہیں پھر موسم بہار ہوا
تو کہو ہنس کے میں صدقے ترے شمار ہوا

قفس سے چھوڑ دے تو اب تو ہم کو اے صیاد
صبا جو پوچھے خبر صفحہ کی تجھ سے وہ شوخ

تو میں دو چار برس کو کہیں ٹل جاؤں گا
اور ظالم یہی کہتا ہے کہ ”کل جاؤں گا“

مرض عشق سے گرا اب کے سنبھل جاؤں گا
مجھ کو قاصد کے تغافل نے تو مسارا ہی ہو

میں نے رومال سمجھ دیدہ گریاں پہ رکھا

آگیا یا رکاد امن جو مرے ہاتھ کبھو

میں چاک کر کے اپنا گرمیاں اڑا دیا

پردہ اٹھا کے اُس نے جو سینہ دکھا دیا

دل یہ کہتا ہے ”تو جا! میں تو نہیں آنے کا“
کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا

قصہ کرتا ہوں جو اس در سے کہیں جانے کا
بھیج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے مدام

جو خط بھیجوں تو خط کو آگ پر رکھ دے ہو وہ ظالم
جو قاصد جائے تو قاصد کے دہاں پر رے نکلتے ہیں

پھر قیامت ہے جو وہ شوخ چھپالے منہ کو
خواہ دیوانہ کہے خواہ وہ وحشی مجھ کو

از دیوان سوم

جو دیکھے ہو نقشے کو ترے وہ یہ کہے ہو یہ۔
سارا بدن انسان کا چہرہ ہی پر ہی کا۔

چھپ چھپ کے وہ گھر غیر کے ہمان گیا تھا
کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے
چوری کی نظر میں وہیں پہچان گیا تھا
یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا
سن بات مری میں ترے قربان گیا تھا
جانے کانہ لے نام شب وصل ہے پیارے

کب میں یاروں کے تیش دیکھ پکارا نہ کیا
پر کس نے مری تربت پہ گزارا نہ کیا

ہندی ہے کہ قبر ہے خدا کا
ہوتا ہے یہ رنگ کب حسنا کا

دھویا نہ گیا خون مراتب سے تیسری
کم نجات یہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

کافہ کا ورق یہ پائے صورت (قطع) نقاش اسے بناے صورت
چہرے پہ نظر ہمیں ہسرتی اشد سے تری صفاے صورت

بیٹھے ہے جو کوئی اُس بت پر فن کے برابر
کیا جانیے اُس تیغ کو کیا سوچھے ہے اُس دم
اُس دوست کو ہم سمجھے ہیں دشمن کے برابر
پھر جائے ہے آ آ کے جو گردن کے برابر

مصطفیٰ کے تذکروں کے متعلق یہ لکھا جاتا ہو کہ :-

مصطفیٰ نے ایک تذکرہ فارسی شعرا کا لکھا اور دو تذکرے اردو شعر کے لکھے،

گارساں داسی نے ہندوستانی مصنفین اور اُن کی تصانیف کے عنوان سے جو رسالہ لکھا ہے اُس
مصطفیٰ اور مصطفیٰ کے تذکروں کی نسبت یہ تحقیق کی ہو کہ :-

”اٹھارویں صدی کا آخری تذکرہ مصطفیٰ کا ہے یہ بھی فارسی میں ہے سنہ تالیف ۱۲۰۹ م (۱۷۹۴-۹۵ء)
میں نے اس مصنف کے متعلق جو کچھ اپنی کتاب تاریخ ادب میں لکھا ہے، اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں
ایک تو یہ کہ خان ہمیر کی رائے کے بموجب جو انھوں نے میری کتاب کے تبصرے میں ظاہر فرمائی ہے اُن کے
نام کا تلفظ (بیفتح میم) کرنا چاہیے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اسے قرآن یعنی مصحف سے نسبت ہے۔

شیفۃ کا قول ہے کہ مولف دہلی میں پیدا ہوا تھا اور وہ ہندوستانی اور فارسی میں اپنے فن کا استاد تھا
شیفۃ سے اُن کی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی اور ان سے دوستانہ تعلقات تھے۔ شیفۃ نیز کریم الدین کا بیان ہے کہ
مصطفیٰ نے ریختہ کے چھ دیوان لکھے ہیں۔ بہر حال فرح بخش (لکھنؤ) کے دیوان مائے مصطفیٰ کے قلمی نسخے میں صرف
چار دیوان ہیں اور یہ چاروں ہندوستانی زبان میں ہیں۔ مصطفیٰ نے فارسی میں بھی کئی دیوان لکھے ہیں اور فارسی
شعرا کا بھی ایک تذکرہ لکھا ہے اس کے علاوہ ایک شاہنامہ بھی لکھنا شروع کیا تھا جو نامتام رہ گیا اس میں
شاہ عالم تک کے عہد کے واقعات منظوم کئے ہیں۔

مصطفیٰ نے اپنا اردو شعرا کا تذکرہ میر حسن خلیق کی فرمائش سے لکھا جس میں محمد شاہ کے عہد سے لیکر
اپنے وقت تک کے شعرا کا حال درج ہے اور جن کی تعداد تقریباً ایک سو پچاس ہے مولف نے خاص کر اپنے
ہم عصروں کے حالات بیان کرنے میں عالی ظرفی کا اظہار کیا ہے۔

مصطفیٰ نے بڑی عمر پائی تھی کیونکہ اُن کی وفات گلشن بے خار کے چھپنے سے دس سال قبل یعنی ۱۸۲۲ء
کے قریب ہوئی، لیکن کریم الدین اُن کی وفات کا سال سلسلہ بتاتے ہیں۔ ان کی شہرت اُس دور کے آخر
ہوئی شروع ہوئی جس میں سودا جرات اور انشا کا دور دورہ تھا وہ حاتم کے ہی ہم عصر رہے ہیں جیسا کہ حاتم کے
دیوان زادہ کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے۔ حاتم جو دلی کے مشاعروں میں موجود تھا، ان کے بہت سے اشعار
نقل کرتا ہے۔ سرور نے کوئی ۷۰۰ مضمونوں میں ان کے کلام کا انتخاب دیا ہے۔“

(رسالہ اردو، جنوری ۱۹۲۵ء)

مصطفیٰ کے فارسی تذکرہ اور ایک اردو تذکرہ کے وجود کا تو پتہ نہایت آسانی کے ساتھ چل جاتا ہے۔ لیکن بعض لوگ جہاں دیوانوں کی تعداد سات بتاتے ہیں وہاں یہ بھی لکھتے ہیں کہ:-
”مصطفیٰ نے اردو شعر کے دو تذکرے بھی لکھے“

بقول مولوی عبدالسلام ندوی کہ:-

اس تذکرہ کے بعد اگر مصطفیٰ نے شعرے اردو کا کوئی تذکرہ لکھا ہے تو ہم کو اس کا حال معلوم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ تذکرہ زیر مضمون کے خاتمہ کی عبارت سے ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یقین ہو گیا ہو کہ مصطفیٰ نے ایک اور تذکرہ بھی لکھا ہے، خاتمہ کی عبارت ملاحظہ کیجئے:-

خاتمہ

”بیرضیہ میرا تیرے نظر مبصران کو میری غنی و محتجب نامہ مکملت میں کتاب تذکرہ غلام سہبانی ولد ولی محمد بن درویش محمد کہ مصطفیٰ شہرت داد از شہتت حواس و پریشانی خاطر ناما سعدی زمانہ کجا فرصت آن داشت کہ بتصنیع احوال و اشعار شعرا سابق و حال پر داختمہ نقضہ میں ہریدہ را بروے کار آرد۔ اما اکنون کہ بہ پیروی بخت سعید و رضویہ پر نور مرشد زادہ آفاق مرزا محمد سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہ باز یافتہ ہمیشہ مورد گوناگوں مہربانی آں مہر سپہر تملافت و جہانداری می باشد فرصت را غنیمت شمرده محتوش آیں تذکرہ ہا کہ از چند سال بطاق نیاں افتادہ و صحافت نمودہ و درستہ ساختہ۔ احوال اکثرے در و بشرح و بیسط سطور است۔ و احوال بعضے از متقدمین و متاخرین کما فیجبی آگاہی بعض براوقات آہنہا حاصل شدہ بطور بیاض سمت تحریر یافتہ“

خاتمہ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ (۱۲۰۹) ہجری سے پہلے مصطفیٰ نے اس تذکرہ کو لکھا تھا گونائے گوناگوں مصائب کی وجہ سے وہ اس پر نظر ثانی نہ کر سکے، مرشد زادہ سلیمان شکوہ کی سرکاریس جب آئے تو انھیں اتنی فرصت مل گئی کہ نظر ثانی کر کے تذکرہ کو صاف کر لیا، اور جن شعر کے حالات و واقعات نہیں معلوم ہو سکے ان کے کلام کو ایک بیاض کے طور پر الگ لکھ ڈالا، اگرچہ تذکرہ کی اثنا بیاض سے ہی ہوتی ہی لیکن بیاض اور تذکرہ دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں، بیاض کو کبھی تذکرے کے نام سے یاد نہیں کر سکتے؛ مصطفیٰ کا یہ دوسرا تذکرہ اردو خواہ بیاض ہی کیوں نہ ہو جب تک ہمدست نہ ہو سکے اس سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، ان کا بھی ایک تذکرہ بہت قابل قدر ہے۔ ”گارساں داسی“ نے مصطفیٰ کے اس تذکرہ کے شعر کی تعداد تقریباً اکیسویں کا بیان کیا ہے۔ میرے پیش نظر تذکرے میں ایک سو نو اسی شعر کی تعداد ملتی ہے۔ مصطفیٰ نے خاتمہ سے پہلے

پانچ شاعر عورتوں کا بھی حال ایک تمہید کے ساتھ لکھا ہے اگر ان کو بھی شریک کر لیا جائے تو ۱۹۴ کی تعداد ہوتی تو چنانچہ فہرست سے ظاہر ہوگا۔

فہرست شعرا

نمبر شمار	تخلص	نام	نمبر شمار	تخلص	نام
۱	آفتاب	شاہ عالم بہادر شاہ	۱۸	اختر	میر اکبر علی
۲	آصف	نواب وزیر آصف الدولہ	۱۹	آشفۃ	بھورے خاں
۳	آبرو	شاہ مبارک	۲۰	افسر	غلام اثر فرس
۴	اوباش	شیخ امیر الزماں	۲۱	بیدار	میر محمد سی
۵	الہام	شاہ لؤل	۲۲	بیان	خواجہ احسن الدین خاں
۶	اثر	محمد میر	۲۳	بے تاب	
۷	الم	صاحب میر	۲۴	بے جان	غریز خاں
۸	امیر	نواب محمد یار خاں	۲۵	بے باک	میر غفیر علی
۹	امجد	مولوی امجد	۲۶	بقا	بقا اللہ خاں
۱۰	اسد	میر امانی	۲۷	برق	میان شاہ وہبی
۱۱	احسن	مرزا حسن علی	۲۸	پروانہ	پروانہ علی شاہ
۱۲	آشفۃ	مرزا رضا قلی	۲۹	پروانہ	راجہ جونت سنگھ
۱۳	امین	امین الدین خاں	۳۰	بشر	میر بشارت علی
۱۴	افسوس	میر شیر علی			
۱۵	اتھر	مرزا جواد علی			
۱۶	اکبر	عزیم ہتھو			
۱۷	انشا	میر انشاء اللہ خاں	۳۱	تباں	میر سید علی

۳۲	تجلی	عرف میاں حاجی	۵۲	حائم	شیخ ظہور الدین
۳۳	تنہا	شیخ محمد عیسیٰ	۵۳	حشمت	محتشم علی خاں
۳۴	تصور	سید احسان حسین	۵۴	حیف	میر چراغ علی
۳۵	تنگین	سید سیادت علی	۵۵	حضور	لالہ بال کنت
۳۶	تکلی	لالہ نیکارام	۵۶	حکیم	محمد پناہ خاں
			۵۷	حقیقت	میر شاہ حسین
۳۷	شنا	میر شمس الدین		خ	
۳۸	شائب	میاں شہاب الدین	۵۸	خاکار	میر محمد یار
			۵۹	خلق	میر احسن
۳۹	بخشش	محمد عابد	۶۰	خلیق	میر احسن
۴۰	جوش	رحم الد		د	
۴۱	چاندانہ	شاہزادہ ولیعہد	۶۱	درد	خواجہ میر درد
۴۲	جرات	قلندر بخشش		ذ	
۴۳	جوان	بہادر علی شاہ	۶۲	ذوقی	شاہ ذوقی
۴۴	جوان	مرزا نعیم بیگ		ذ	
			۶۳	رضا	مرزا احسن رضا
۴۵	حسن	میر حسن	۶۴	رفت	مرزا قاسم علی
۴۶	حیرال	میر حمید علی	۶۵	زنگین	سعادت یار خاں
۴۷	حن	خواجہ حسن	۶۶	زفاقت	مرزا اکھن
۴۸	حسرت	جعفر علی	۶۷	رضا	میر رضا علی
۴۹	حجام	فنایت اند	۶۸	زند	نواب مہربان خاں
۵۰	حدیثی		۶۹	رسوا	ہفتاب رائے
۵۱	حیرت	میر مراد علی	۷۰	راغب	مرزا سبجان علی بیگ

شهرت	۹۰	تر		
شوق	۹۱	نظار	میر جیون	۴۰
ص		نزار	میر مظفر علی	۴۱
صفدری	۹۲	زمان	سید محمد زمان	۴۲
صابر	۹۳	س		
صادق	۹۴	سائل	مرزا محمد یار بیگ	۴۳
میر صادق علی		سوز	محمد میر	۴۴
ض		سعادت	میر سعادت علی	۴۵
میر ضیا الدین	۹۵	سکندر		۴۶
ط		سوزان	مرزا احمد علی خاں	۴۷
طپش	۹۶	سر سبز	مرزا زین العابدین خاں	۴۸
طالب	۹۷	سلیمان	مرزا سلیمان شکوه	۴۹
محمد اسماعیل		سلیم	میر سلیم پنهوی	۵۰
طالب حسین خاں		سودا	میرزا رفیع	۵۱
ع		سبقت	مرزا مغفل	۵۲
عارف	۹۸	شیدا		۵۳
عظیم	۹۹	شرف	شیخ شرف الدین	۵۴
عاقل	۱۰۰	شگفته	مرزا سیف علی	۵۵
عاشق	۱۰۱		مرزا ابراهیم	۵۶
عاشقی	۱۰۲		محمد رضائی	۵۷
عظیم	۱۰۳			۵۸
عشق	۱۰۴			۵۹
غ				
غضنفر	۱۰۵			
غیرت	۱۰۶			
غلامی	۱۰۷			
غضنفر علی خاں				
شاه غلام محمد				

نواب عماد الملک	نظام	۱۷۰	عالم شاہ پیرزادہ	محزول	۱۴۸
نصیم اللہ	نعم	۱۷۱	.	محبت	۱۴۹
مرزا علی قسلی	ندیم	۱۷۲	.	مست	۱۵۰
میاں عسکری	نالال	۱۷۳	.	مقصود	۱۵۱
میاں نصیر	نصیر	۱۷۴	میاں محمدی	مایل	۱۵۲
.	خیف	۱۷۵	.	مایل	۱۵۳
.	نوا	۱۷۶	میر قمر الدین	منت	۱۵۴
.	نادر	۱۷۷	شیخ ولی اللہ	محب	۱۵۵
و	.	.	میاں نور الاسلام	منظر	۱۵۶
شاہ واقف	واقف	۱۷۸	.	ممنون	۱۵۷
.	وحشت	۱۷۹	خواجہ مسترم خاں	محترم	۱۵۸
منظر علی خاں	والا	۱۸۰	میر نثار اللہ	مصدر	۱۵۹
میر محمد علی	وہم	۱۸۱	میاں شرف الدین	مضمون	۱۶۰
ہ	.	.	شاہ فرمل	مزل	۱۶۱
میر جوان	ہادی	۱۸۲	میاں معین الدین	معین	۱۶۲
میر ہاشم علی	ہاشم	۱۸۳	مرزا علی نقی	مشر	۱۶۳
مرزا محمد کاف	ہاتف	۱۸۴	الہی بخش خاں	معروف	۱۶۴
ہدایت خاں	ہدایت	۱۸۵	صنیر علی	مروت	۱۶۵
میر شمس الدین	ہوش	۱۸۶	شیخ غلام بہانی	مصطفیٰ	۱۶۶
انعام اللہ خاں	یقین	۱۸۷	میر عبدالرسول	نثار	۱۶۷
مصطفیٰ خاں	یکزنگ	۱۸۸	محمد امان	نثار	۱۶۸
میاں یکرو	یکرو	۱۸۹	محمد شاکر	نباہی	۱۶۹

مستورات		
دولہن گیم	۱۹۰	زوجہ عسا و الملک
جینا بیکم	۱۹۱	زینت نازک
		مونی

مصنفی نے اس تذکرہ سے تقریباً دس بارہ برس پہلے فارسی کا تذکرہ (عقد ثریا) لکھا ہے جس کا تذکرہ اس تذکرہ میں جا بجا آگیا ہے عقد ثریا میں ایسے بانیں شاعروں کا ذکر ہے جنہوں نے اردو میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سے میر محمدی بیدار، رائے جس وقت نگہ پروانہ، مرشد زادہ جہاں دار شاہ جہاندار، شیخ طہور الدین حاتم، خواجہ میر درد، بید میر سودا، میرزا رفیع سودا، اشرف علی خاں نقی، محمد قیام الدین علی قایم چاند پوری، کیمزاجان جاس مظہر میر محمد تقی میر، امیر قمر الدین منٹ، عباد الملک نظام کے حالات بھی اس تذکرہ میں ملتے ہیں۔ یہ شعر مصنفی کے فارسی اور اردو تذکروں کے گویا مشترک شاعر ہیں، ان دونوں تذکروں کے مشترک شعرا کے حالات بالقابل مطالعہ کرنے سے مصنفی کے تالیفی زور و ضعف کا اندازہ ہو جائے گا کہ ایک ہی مولف ایک ہی شاعر کی نسبت دس بارہ برس پہلے کیا رائے رکھتا تھا اور اس کے بعد احوال سے متاثر ہو کر کس حد تک اپنی تالیفی قوت کو ایک حال پر رکھنے میں کامیاب ہوا ہے اس کے متعلق ترتیب نقل یہ ہوگی کہ شاعر کا حال پہلے تذکرہ سے نقل کیا جائے گا اور اس کے بعد تذکرہ اردو سے انتخاب کلام کے ساتھ فارسی کی علامت (الف) اردو کی (ب) ہو۔

بیدار

(الف) بیدار میر محمدی۔ از شاہ میر شعراے ریختہ گو است۔ گاہ گاہے فکر شعر فارسی ہم کردہ و میکند از دست (۱۱) شعرا میں۔

(ب) بیدار کہ میر محمد علی نهم دارد۔ وہ میر محمدی بیدار مشہور رست شاگرد مر قنوی قلی بیگ ذوق تخلص کہ شاعر فارسی گذشت، جو اہمیت محمد شاہی۔ قنات حال خود را بہ لباس درویشی آراستہ دارد یعنی طمع گیر دی بر سر بلج می بندد و دیگر لباس او بطور دنیا و اناں است۔ در عجب ہم لے استقامت دارد و یوان ریختہ اش مشہور زبانش بیارشتہ و رفتہ کم کم فکر شعر فارسی ہم میکند چنانچہ اشعار فارسی خود را نیز از قلم چند غزل و رباعی و دو دم قصیدہ کہ در لغت و منقبت وغیرہ گفتہ بہ پشت سر ورق دیوان خود نوشتہ داخل ساختہ چوں اعتقاد بجناب مولوی قمر الدین

مجلد کتبہ
بیار داشتہ ہر گاہ کہ از عشرت سرے در دہرہ غازی الدین خاں برے دیدن آں بزرگ می آمد گاؤگا ہی با فقیر
ہم اتفاق ملاقات می افتاد و صحبت شعر بہ میاں می آید حالاسیگویند کہ از چندے در اکبر آباد رونق افزاست
دیوانش از نظر فقیر گذشت انتخاب دوست سے

ایک ملنے کو نہ کم کیجئے گا	ہم پہ سو ظلم و ستم کیجئے گا
غارت دیر و حرم کیجئے گا	گر یہی زلف ہی کھلے ہے
یہی بیت اس کو رقم کیجئے گا	جی میں ہو آج بجائے مکتوب
کہئے کس آن کر م کیجئے گا	نہر بانی سے پھر لے بندہ نواز
کچھ بھی خبر ہو قافلہ آگے نکل گیا	گزرے ہو شب شباب ہوار و زو شب اخیر
منزل ہو دور خواب سے اٹھ، دن تو دھل گیا	قابل مقام کے نہیں بیدار یہ سرے
اشک تھا بیدار یا یہ آگ کا پر کا لہ تھا	ہو گیا کرتے ہی میری چشم سے دامن کے پار
کہ بسدا ہوں نہ یار جانی پر	حیف ہے ایسی زندگانی پر
کچھ تو آیا ہے مہر بانی پر	حال سن سن کے ہنس دیا میرا
میں کشمکش میں دست و گریباں کی ہوں منہ	ہے بعد مرگ گور میں شور جنوں مہنوز
میں چشم و دل گھر اس کے جہاں چاؤ چلے	مقدور کیا مجھے کہ کہوں وہاں کہ یہاں ہے
محو خیال یار رہے ہم جہاں رہے	نے میکدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا
حیراں ہے دل کہاں نہ ہو کس کے ماں ہے	بیدار زلف کھینچے ادھر چشم یار ادھر
لاوے ہر گل کے گلے لگ یار کو کر یا د ہم	کیا ہوے گلشن میں اگر اے عزیزاں شاہم
دیکھ لیوں تیری صورت پھر کہ اے جلاہم	قتل تو کرتا ہے آخر کھولے آنکھیں ٹکایک
یا دعا یا سلام کچھ بھی ہے	قاصد اس کا پیام کچھ بھی ہے
پاس ناموس و نام کچھ بھی ہے	تو جو بیدار یاں پھر سے ہے خراب
اے میں قربان کیوں تو برہم ہے	جانی تک تو نہیں ہو تجھ سے دریغ
کچھ ہمیں کہنا ہے پیارے آئے	اٹھ کے لوگوں سے کنارے آئے

کچھ تو کی تاثیر نالے نے جہ سے آئے تم مدت میں بارے آئے
 نصیحت سے بیدار کیا فائدہ جو ہو آپ ہی اُس کو سمجھائیے
 سلام بھی ہو زمانہ میں اور دماغ بھی ہے ہمارے یار نے قاصد سے کچھ کہا بھی
 جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہو گئے شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہو گئے
 جی میں بیدار تیرے ملنے کے آہ کیا کیا خیال رکھتا ہے
 یوں مجھ پر جفا ہنسنا کیجیو پر غیر کو تو نہ پیار کیجیو
 کہاں ہے طالع بیدار یہ کہ ایسا ہو کہ سر دھرے مری زانو پہ یار سوتا ہو
 صورت اُس کی سا گئی جی میں آہ کیا آن بھاگئی جی میں
 توجہ بیداریوں ہو مار کٹ ایسی کیا بات آگئی جی میں
 ان کہنے کو نہ جا چھوڑ کے اس وقت مجھے بات رہ جائیگی اور دن تو گزر جاتے ہیں
 تیری ہم خاطر نازک سے خطر کرتے ہیں ورنہ نہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
 یہ وہی فتنہ و آشوب جہاں ہے بیدار دیکھ کر پیر و جواں جس کو حذر کرتے ہیں
 آہ مت پوچھ کہ کس طرح کئی شب تجھن صبح کی رو رو گئے لگ درو دیوار کے ساتھ
 آئینہ دیکھ تو اس منہ سے تجھے ہے طوطی دعویٰ ہم سخنی اُس لب و گفتار کے ساتھ
 اُس آئینہ رو کے ہو معتبابل معلوم نہیں کہ دھر گئے ہم
 اُس پری صورت بلا انگیز کو دیکھا نہیں ناصحو معذور ہو کر مجھ کو سمجھاتے ہو تم
 حالت بیدار اب کیا کیجئے آگے بیاں وقت ہے اب بھی اگر تشریف فرما تے ہو تم

پروانہ

الف - پروانہ - اسٹیشن ریلے جونت سنگھ است والدش راجہ مینی بہادر نائب مختار
 سرکار علیین مکانی وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر بودہ وحالہ در آوان دولت
 وزیر اعظم دستور معظّم نواب آصف الدولہ بہادر دام اقبالہ در کنج از داخستہ بالجملہ ریلے
 مذکور در عمر کی اکثر کتب فارسی تحصیل نمودہ و دو اوین تذکرہ اساتذہ فراہم آوردہ قدرت
 شعر گوئی و وقت طبع بدرجہ بلوغ بہم رسانیدہ گوے سبقت از ہزاران خودر بودہ ہزار

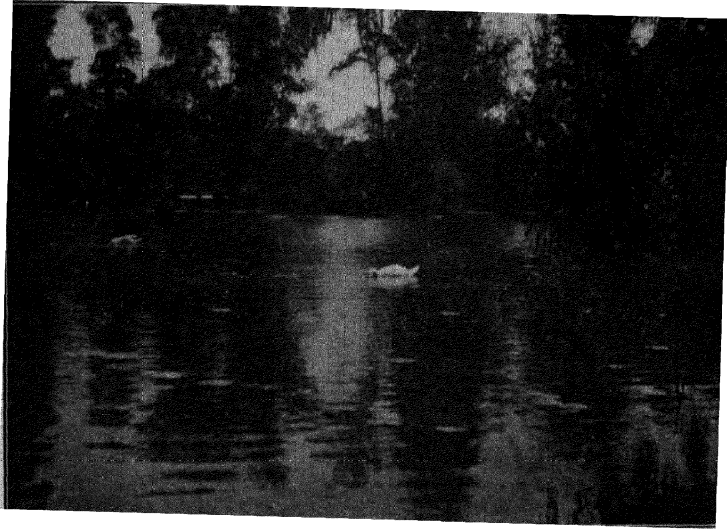
ایں خیر نامے کم کم خیال بد گیر سے فنون غریبہ مثل طب وریل و سمیر کتب توایح و توشن
خط شکستہ مانا بہ شفیقا میر و لرد۔ اصلاح شعر فارسی از رے سرب سنگہ دیوانہ گرفت۔
چوں از چند سے خیال شعر ہندی ہم دامن گیر جالش شدہ وریں فن تعین آتا دے ندارد
و بقوت فارسی ریختہ را بخوبی بسر انجام میر ساند۔ بقصاید ہم دست انداز است و ازیں
جہت است کہ جوش بہ شعرے ریختہ بیا ر وارد۔ دیوان فارسی قریب دو ہزار بیت
بر بیاض دیدہ شد ز بانش عاشقانہ شستہ و رفتہ است۔ از انتخاب اوست۔ در ہست
شعر نقل کیے ہیں۔

حسب۔ راجہ جہونت سنگہ پر وائے تخلص عرف کا کا جی پسر راجہ مہنی بہادر کہ رکن رکیں نواب شجاع الدولہ حرم
بود جوان خلق و ذی شعور است پیش ازیں شعر فارسی میگفت و از نظرے سرب سنگہ دیوانہ میگذاشت چنانچہ
اشعار فارسی پیش فقیر در شاہ جہاں آباد بواسطت مرزا قنیل رسیدہ بودند در ہاں ایام داخل تندرہ شدند اما در
روز نامے کہ مولف از شاہ جہاں آباد لکھنؤ رسید چوں غالبانہ ہمیشہ متاق ملاقات می مانند خبر آمدن این خاکسار
شفینہ بیار بہ و لکھنؤ واپاک پیش آمدہ و از ہاں ایام عطف عثمان فکر شعر فارسی بہ طرف ریختہ کردہ خود را شب
روز در گفتن شعر ہندی مصروف داشت تا ایندم کہ عرصہ دو آزدہ سال شدہ باشد شق او بیار رسا و نچتہ گردیدہ
در گفتن قصیدہ و غزل طور مرزا رفیع را مسلم میدارد و اکثر بر صد معنی نامے تازہ بیت میگذاشت و پیش از آمدن فقیر
کہ ہنوز آغا ز شوق او بود و اعتقاد بہ ہمرسانہ مثل میر تقی و میر حسن و میان بقاد آمد و غیرہ داشت اکنون از
تہ دل بہ فقیر رجوع گئی دارد و درستی اشعار در شش موقوف شورہ ایں ہیچدان با اعتقاد افادہ ایں ہم خوبی است
والاشعار پیش از ہیچ صاحب طبعیتی کم نیت از دست۔ شعر

کھا تیغ نگہ جب تری گھائل کو غش آیا گویا وہ دم نزع میں بسل کو غش آیا
کرنے کو کیا قتل یہ خوں بہتہ جو دیکھا پھیرا نہ گیا سامنے قاتل کو غش آیا
ایک دن دیکھا نہ تو عاشق کی غم خواری کرے بے وفا تجھ سے کوئی کب تک وفاداری کرے
دیکھتے ہی اُس کو چہرہ پر سحالی آگئی ز غفرانی رنگ جو تھا اُس میں لالی آگئی

جہاں دار

الف۔ جہاندار پسر شہزادہ جہاندار شاہ کہ جہاندار تخلص میفرماید از بکہہ در جمیع فنون گویا



باغ عام نا ایک خوشنما منظر

روزگار و وحید زمان است بہ مقضائے موزونی طبع فکر شعر ہندی و فارسی چنانچہ باید
می کند از دست۔

ب۔ جہاندار تخلص شاہزادہ ولی عہد خورشید رکاب صاحب خطاب کہ از بس علو ہمت و مومنزلت مرتبہ
عالی جا ہی خود را بہ اوج افلاک رسانیدہ دوست در بارش ہنگامہ ابریاں را سرد ساختہ با وصف استغنائی
مزاج کہ خاصہ بادشاہت خود را بہ کعب و علم و ہنر نیز مصروف داشتہ و کمالات بیار در ذات با برکاتش
جمع آمدہ معہدہ مقضائے موزونی طبع گاہ گاہ ہے خیال شعر ہندی و فارسی نیز می فرماید از دست شعر
قصہ ہر چہ کیا یکھنے کا ٹیبل نے وضع نالہ کی مرے اُس سے اڑائی نہ گئی
کہاں طالع جو پہنچیں اُس کے در تک رہے دوری سے ہم اُس کو گر تک
رسانی میرے نالہ اور دُعا نے کہاں پائی اجابت اور اثر تک
بجھاؤں شمع ساں کیا اب جہاندار شہر عشق تو پہنچا جگر تک
مرکس کے انتظار میں یہ بے اسبل گیا آنکھیں جو یوں کھلی رہیں اور دم نکل گیا

(باقی)

فرمانِ ثانی

ایک دردناک افسانہ

(ممتاز ادیب سید شیر حسین قیس، استعلا جاسٹس عثمانیہ)

(۱)

”فردوس ہند کشمیر کی آبادی سے تقریباً دو فرلانگ پر ایک طرف غماز میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے جس کے اطراف ہندی کی باڑ لگی ہوئی ہے۔ سامنے ایک چھوٹا سا تالاب ہے۔ اُس کے گرد چند بزرگ پتھر پائے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ایک حصار کھینچ دیا ہے جو اس دلفریب منظر کی خوبصورتی کو دوبالا کر رہا ہے۔“

شام کا وقت ہے سورج زرد پوش ہو چکا۔ کہیں کہیں سے تارے سیاہ ابرو میں سے چمک رہے ہیں۔ ظلمتِ شب ترقی کر رہی ہے۔ معمول کے خلاف آج اس جھونپڑی میں اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن بھی نظر نہیں پڑتے۔ آج بوڑھا جس کی عمر ساٹھ سال کی ہوگی بسترِ مرگ پر پڑا آخری سانس لے رہا ہے۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں سوج چہرہ اس امر پر دلالت کر رہے ہیں کہ عالمِ شباب میں وہ جوان رعنا ہو گا۔ ایک چھوٹا لڑکا جس کی عمر ۱۲ سال کی ہوگی بازو بیٹھا آنسو بہا رہا ہے۔ وہ بار بار مریض کے منہ پر منہ لٹا رہا۔ اور درد انگیز آواز میں کہتا ہے ”پیارے بابا، بات تو کیجئے۔“ لڑکے کے گریہ سے باپ چونک جاتا ہے اور تسلی دیتا ہے۔ اور اپنی نایاب نظر میں دردِ روازہ پر ڈال کر بچہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن آنسو اس موقع جا نکاہہ پر نہ کوئی پرسان حال اور نہ تعزیت دار۔

آنکھ بچے کا وقت تھا۔ مریض نے اپنی نحیف آنکھیں کھولیں۔ اُس کی پتلیاں حلقہ چشم میں گردش کرنے لگیں۔ اُس نے خورشید کے سپرد ہاتھ پھیرا اور آبدیدہ ہو کر کہا ”بیٹا مست روا اللہ۔ نگہبان ہے۔ جس کے تم گیت گایا کرتے ہو۔ لیکن آنسو۔۔۔ آنسو! آج زمیندار صاحب بھی نہیں آئے جن سے

میں کچھ کہہ لیتا۔ . . . دفترا کسی کی چاب نے اس کا قطع کلام کیا۔ اس نے گردن بلند کی۔ خورشید کی آنکھیں دروازے پر چمک گئیں۔ بوڑھا کسان چلا اٹھا۔ ”میرے آقا“ اور نقاہت سے اس کی گردن پھر تکیہ سے جا لگی۔

اُس نے زمیندار صاحب سے التجا کی کہ وہ خورشید کو اپنے سایہ عاطفت میں رکھیں۔

زمیندار صاحب نے دلاسا اور اطمینان دلایا۔ بوڑھے کسان نے ہچکی لی۔ خورشید پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی۔ دو گرم آنسوؤں کے قطرے اُس کی آنکھوں میں آئے۔ اور اُس آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر لیں۔

خورشید کا دایلا جھونپڑی کو ماتم کردہ بنارہ تھا۔

دوسرے روز زمیندار صاحب تجھیز نو تکفین کے بعد خورشید کو گھر لے آئے۔ اور اُس کے لئے

ہر چیز کا انتظام کر دیا۔

خورشید نوروز کا اکتوا بیٹا تھا۔ وہ نہایت تیز فہم اور پھر تیز تھا۔ اُس کی آنکھیں گول و سیاہ تھیں۔ رنگ گورا تھا۔ وہ ایک ہنس مکھ لڑکا تھا۔ وہ ایک نوخیز امنغنی تھا۔ اُس کی آواز میں ایک خاص درد تھا۔ وہ اکثر اپنے باپ کے سکھائے ہوئے گیت گاتا تھا۔ جس کو زمیندار بہت شوق سے سُنا کرتے تھے اُن کی نظریں وہ ایک اچھا امنغنی تھا۔ اُس کی نغمہ سرائی میں عجیب کیفیت تھی۔ ایک وجدانیت۔

زمیندار نعیم خاں کو نوروز اور خورشید سے بہت محبت تھی۔ اور ہمیشہ اُن کا خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک سخی اور باعزت شخص اور ایک بڑے زمیندار تھے۔

(۲)

خورشید کو ایک دوسری فضا میں داخل ہو چکا تھا۔ اور اُس کو ہر قسم کا آرام مل رہا تھا۔ مگر باپ کا قصد وہ رہ کر رہا تھا۔ لیکن وہ بچہ تھا اس لئے وہ بہت جلد کھیلنے کو دلے لگا۔ اُس کا حُسن اور بشارت عود کر آئی۔ اور خورشید پھر وہی خورشید تھا۔

نعیم خاں نے اُس کی تعلیم ایک مولوی صاحب سے شروع کروادی جو اُن کی لڑکی ملہا کو پڑھایا کرتے تھے۔

ملہا نعیم خاں کی جیتی لڑکی تھی۔ اُس نے آٹھویں سال میں قدم رکھا تھا۔ وہ ایک حسین بچی تھی۔ اُس کے بال جبر و دمہ کی طرح تھے۔ اُس کی آنکھیں مینخانہ فطرت کے جام تھے۔ جو ہمیشہ مستانہ و مخمور رہتیں۔ اس کے سُرخ پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح سُرخ تھے۔ ”وہ حسن کا حسین ترین نمونہ ہو گی۔“

اُف! اُس کی کافر جوانی کس بلا کی ہوگی۔ یہ تھے خیالات جو ہر شخص اُس کو دیکھ کر قائم کرتا تھا۔ وہ ایک نیرنگی سراپا ناز۔ لعبتِ حسن تھی قابلِ الفت۔

مکان کے اندر رونی حصہ میں ایک خوبصورت سا باغ لگا ہے۔ جس میں خورشید اور سہ لقاھیلا کو دا کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو حسن کی جیتی جاگتی موتیں اچھل کود رہی ہیں۔
چھ سال اسی طرح گزر گئے۔

عالمِ طفلی گزر چکا۔ اب دونوں شباب کی مستیوں میں چور ہیں۔ اُن کے پیمانہ دل محبت سے بھرے ہوئے ہیں۔ اُن کی آنکھیں الفت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

(۳)

ایک روز خورشید شام کے وقت اپنے الگ کمرہ میں بیٹھا ایک رسالہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس نے پچیسویں ورق کی مَرخی۔ ”افسانہ محبت“ دیکھی جو ایک مشہور افسانہ نگار کے قلم کا نتیجہ تھا۔ اُس کی آنکھیں لفظ محبت سے چپکے لگیں۔ جب وہ اس حصہ مضمون پر پہنچا تو اُس نے آنکھیں جھپکائی۔ ”اے محبت، تو ایک پھول ہے جس کی خوشبو بے نشا ط تمام جہان اور تمام قلوب کو جہکار ہی ہے۔ تو ہماری حیاتِ مستعار کو فرحت دینے والی شے ہے۔ آہ تو ایک جذبہ ہے۔ بے پایاں۔ کیف آؤ روح پرور، تو ایک شمع ہے اور تیرے کئے پر دانے۔ اے محبت تیری دنیا مختلف۔ تیری ادائزالی۔ تیرے نام لیوا جدا۔ اُن کے خیال اور۔ اُن کے روزِ غلطہ۔

یہی! مجنون، شیریں فرماؤ، قیس و لبنی غرض کئے تیرے شکار ہوئے۔ تو نے انہیں در بدر پھرایا۔ آشفہ حال و بدنام کیا۔ تو نے انہیں دیوانہ بنایا ایک کو نجد کی گرم ریت میں تڑپایا اور مارا مارا پھرایا۔ دوسرے کو تیشہ کا نشانہ بنایا۔ لیکن انہوں نے تیرا دامن نہیں چھوڑا۔ اور مرتے دم تک تیرا ہی اے محبت دم بھرتے رہے۔ اُن کا انجام حسرت و افسوس کے سوا کچھ نہیں۔

اے محبت، اے قدرتی جذبہ، اے سرتِ زالمہ تو کس قدر ایک سہمی ملی کی طرح چپکے چپکے ان معصوم ہستیوں کے قلوب میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ ”یہاں پر خورشید رکا اُس نے اپنی حالت پر غور کیا۔ اُس کے جذبات اسے دریائے محبت میں ڈھکیل رہے تھے اُس نے پھر بڑبڑانا شروع کیا۔
”اے محبت حیف تو تیری صورت میں معصوم دلوں میں بڑھتی ہے۔ تو انہیں رسوا کرتی ہے۔

عالم جوانی میں تو عشق کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تو کبھی خوشی کے آنسو ڈالتی ہے۔ اور کبھی خون کے۔ تیرا دنیا کے ایجنٹ کیٹدی اور ریڈیسی کے دو درمے پیش کرتا ہے۔

اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور وہ کسی گہرے خیال میں ڈوب گیا۔ دو منٹ گزر گئے۔ ہنوز اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ اُس کی پتلیاں اندر ہی اندر محرک تھیں۔ اُس کے ہونٹ جنبش کر رہے تھے۔ اُس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اُس کے منہ سے ایک لخت نکلا پیاری سی لقا۔ ”وہ کچھ اور کہنے والا تھا۔ مگر وہ کہہ نہ سکتا تھا۔ اُس کی زبان رک گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہیں۔ اُس کا چہرہ فق اور ساکت تھا۔ کیونکہ اس کے سامنے ملتا محبت بھری نگاہوں سے کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرہ پر لمبی سی مسرت کی سرخی تھی۔ اُس کا انداز قابلِ پریش تھا وہ دونوں کی نگاہیں محبت کی بہترین ترجمان بنی ہوئی تھیں۔ خورشید کے مرتش ہاتھوں سے رسالہ نیچے گر پڑا۔ ملتا نیچے جھکی۔ اُس نے رسالہ اٹھایا اور خورشید کی جانب بڑھا کر کہا۔ ”ہتیا میں ناقہ دخل انداز ہوئی۔ آپ۔۔۔ آپ پڑھنے میں جاتی ہوں یہ کہہ کر وہ پٹی۔ خورشید نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ملتا اُس کی طرف مڑی۔ اور اُس نے دیکھا کہ خورشید گردن نیچی کئے کسی تذبذب میں ہے۔ وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ اُس نے نہایت بیباکی سے ملتا کے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ ملتا نے اپنے ہاتھ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہ کی۔ وہ شرم سے سرنگوں تھی۔ اس کا دل اچھل رہا تھا خورشید نے اس کے چہرہ پر نظر ڈالی۔ ملتا نے اپنے ایک انداز میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ جس کو خورشید ہی کے دل نے خوب سمجھ لیا۔ اُس کی شرمگین نگاہیں محبت پاشی کر رہی تھیں اور اُس کے ہونٹ خفیف سی اسکرابٹ سے جنبش کر رہے تھے۔ انہوں نے پُر محبت نظروں سے ایک دوسرے کو پیامِ محبت دیا۔ خورشید خوشی اٹھ کھڑا ہوا۔ ملتا نے ایک شوخ ادا سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور وہ چوکھٹ نک تیزی سے چلی گئی۔ وہ چوکھٹ پر زکی اُس نے گردن پھیر کر خورشید کو دیکھا۔ وہ ہنسی۔ مگر یہ ہنسی زمانہ طفل کی ہنسی سے جدا گانہ تھی۔ اس ہنسی سے محبت کے پھول جھڑپے تھے خورشید دونوں ہاتھ پھیلائے اُس کی طرف بڑھا۔ ملتا نے اب کھڑا ہونا مناسب نہ سمجھا اور ہرنی کی طرح کلیلیں مارتی محن میں بھاگ گئی۔ اور خورشید پر اس کے اس انداز نے ایک بجلی گرا دی اور وہ دردِ اذہ سے چٹا ملتا کو وہ رہی سے دیکھا کھڑا رہا۔

(۴)

دوسرے روز نسیم خاں اپنے کاروبار پر لاہور جانے والے تھے۔ اس لئے انہوں نے سب کو تاکید کر دی کہ خورشید کا خیال رکھیں اور اُسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ اور گھر پر اپنے پیچھے بھائی شاہد کو چھوڑ گئے۔

شاہد ایک سخت اور عاقل شخص تھا۔ اور اس کے یہ خیر میں تھا کہ کسی نہ کسی کو برا دکر دے۔ جب سے کہ خورشید سن بلوغت پر پہنچا تھا۔ اسے خوف تھا کہ کہیں نہ لقا اس سے نہ بیاہی جائے وہ چاہتا تھا کہ اپنے لڑکے کے حوالے سے جو کسی طرح نہ لقا کئے قابل نہ تھا نہ لقا کی شادی ہو۔ نسیم خاں کی خورشید پر روز افزوں محبت اور عنایت جیسا کہ ان پر حق تھا اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ وہ کسی طرح نہیں چاہتا تھا کہ خورشید اپنی آئندہ زندگی اس گھر میں گزارے اس کے علاوہ وہ اُن کی نگاہوں سے تاڑ گیا تھا کہ ان میں محبت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اکثر خاں کو نسیم کے پاس بھیجا کرتا کہ لقا اور نسیم اس کو چاہئے لگیں۔ مگر نہ لقا دور ہی سے اُسے آنا دیکھ کر چہرے میں ہوا جاتی اور کسی کام میں مشغول ہو جاتی۔ وہ عاقل سے دور ہی رہنا پسند کرتی تھی کیونکہ وہ اول تو صورت کا اچھا نہیں تھا اور دوسرے اُس کے دھتک بھی ناگوار تھے۔

خورشید نے اُردو فارسی میں کئی کتابیں ختم کر لی تھیں اور نسیم کا ارادہ تھا کہ خورشید کو بہت جلد اسکول میں داخل کر دینا چاہئے۔ وہ ایک لڑکا تھا اور مولوی صاحب اُسے محبت سے پڑھاتے تھے۔ نہ لقا بھی ذہین تھی۔ مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ تین چار روز سے اُن کو سبق اچھی طرح یاد نہیں ہوتا۔ چونکہ وہ سخت اور تند مزاج تھے اس لئے انہوں نے خورشید کو تنبیہ کی۔ اور نہ لقا کو سمجھایا۔ مگر خورشید اب محبت کا پتلا بن گیا تھا۔ جب کبھی کتاب لیکر بیٹھا تو فوراً نہ لقا کا خیال دماغ میں بندھ جاتا۔ اس لئے وہ سبق یاد نہ کر سکتا تھا۔ وہ بولنا کچھ چاہتا تھا لیکن اُس کی زبان سے کچھ اور نکلتا تھا۔ کیونکہ اُس کی ملکہ حسن سامنے رہتی تھی مولوی صاحب نے ایک روز سبق یاد نہ کرنے پر اُسے دتین چھڑا دیں۔ خورشید جس نے کبھی اب تک مار نہ کھائی تھی اپنی موجودہ غیر معمولی تبدیلی پر روئے لگا۔ نہ لقا کے بھی آنسو نکل آئے اور وہ پانی پینے کے بہانے سے اٹھ کر چلی گئی۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد شام کے وقت دونوں باغ میں لے۔ دونوں اُداس تھے مگر یہ صرف تھوڑی دیر تک حالت رہی۔ نہ لقا نے خالوشی کو توڑا اور کہا ”بیٹا اے یہ وقت تفریح کا ہے نہ کہ رنج کا“ اور اُس نے خورشید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہ کھڑی ہو گئی۔ خورشید نہایت خوشی سے اٹھا اور دونوں باغ میں ایک طرف ٹہلنے لگے۔

خورشید کو ملتا تھا۔ مجھ سے محبت تھی۔ گروہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کون جذبہ چمکیاں لے رہا ہے۔ کونسی شمع جلتی ہے جو اس کے قلب میں روشن ہے۔ وہ کونسی بوئے نشاط ہے جو اُس کے دماغ کو مسطر کر رہی ہے۔ وہ کونسا فطرتی خیال ہے جو اُس کے دل میں سوچیں مار رہا ہے۔ اسی لئے وہ جذبات کو ملتا تھا پر افشاء کر سکا۔ لیکن اب وہ سمجھا اس مضمحل راز محبت کو جو اُس کے دل و دلی میں گدگدی کر رہا تھا۔

خورشید و ملتا تھا خاموش اُٹھ رہا تھا۔ ملتا تھا بار بار اُس کو کنکھیں سے دیکھ رہی تھی۔ مگر خورشید اُس کے حُسنِ عالم سو نہ سہ درجہ متاثر تھا۔ وہ نہیں سمجھتا تھا کہ کس طرح اپنی محبت کو ظاہر کرے۔ وہ کہہ رہی تھی میں پُر تھا۔ کہ ابا آپ ہے کہ ”عشق معشوق کے دل میں پہلے پیدا ہوتا ہے۔“ سچ ہے۔ عورت صبر و حیا کی دیوی ہے اور اُس کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ اُس میں ڈوبی رہتی ہے۔ اس کی محبت ایک پتھر کی گلیز ہے۔ وہ اس راز کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھتی ہے۔ اور جب یہ بار اُس سے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنے جذبات اپنے حیاتِ عریاں کر دیتی ہے۔ چاہے اُسے معلوم ہو کہ اُس کا انجام بُرا ہے۔ اُس وقت اُس کا دل قابو نہیں رہتا۔ وہ آپس سے باہر ہو جاتی ہے۔ وہ نہیں سمجھتی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ جب وہ دل بچہ کر بڑھتی ہے تو تیرب اُس کے دل میں ایک سکون پیدا ہو جاتا ہے۔

ملتا کو خورشید سے کبھی کی محبت ہو گئی تھی۔ اور وہ کسی موقع کی متلاشی تھی کہ اپنے راز محبت کو اُس پر ظاہر کرے۔ اس نے بار بار خورشید کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ مگر خورشید جواب دینے سے قاصر رہا۔ لیکن اب خورشید اس کا پرستار بن چکا تھا۔ اور ملتا نے جب سے اس کی زبان سے ”پیاری ملتا“ سنا ہے معلوم ہو گیا کہ خورشید کو اُس سے محبت ہو چکی ہے۔ ملتا اب اپنے جذبات کو روک نہیں سکتی تھی۔ اُس کے جذبات میل بے پناہ کی طرح امنڈ رہے تھے۔ یہ اُس کے لئے بہترین موقع تھا۔

وہ چلتے چلتے رکی اس جگہ جھاڑوں کا بہت جھنڈ تھا۔ اور شام کی ملکی سی تاریکی سے اور اندھیرا ہو گیا تھا۔ خورشید بھی ختم گیا اور اُس نے ملتا کی طرف دیکھا۔ اور ملتا نے اپنی شرمیلی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ خورشید کا ایک ہاتھ ملتا کے مونڈھے پر تھا۔ اس کا دل اور مضبوط ہو گیا۔ ”بہن! میں کس دن سے چاہتی تھی کہ آپ سے اپنا راز دل کہوں۔ مگر۔۔۔ مگر کوئی موقع نہیں ملا کہ بیان کرتی۔“ وہ کہتے کہتے رگ گئی۔ اُس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ خورشید آگے سننے کے لئے بیٹاب تھا۔ وہ ملتا کے بالکل قریب ہوتا گیا۔ ”آہ مجھے۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ سے محبت ہے۔“ ملتا نے رکتے رکتے کہا اور وہ تڑپ کر خورشید کے

سینہ سے لگ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے حائل تھے۔ اس کی پیشانی پر چند پسینہ کے قطرے نمودار ہو گئے تھے اس کا سر خورشید کے سینہ پر تھا، زلفیں کبھری ہوئیں تھیں۔ اور آنکھیں بند۔ خورشید نے محسوس کیا کہ ملہ تھا کا دل دھڑک رہا ہے۔ اس نے اپنا منہ اُس کے سر پر رکھ دیا اُس نے کہا ”پیاری ملہ تھا۔“ یہی شہزادی میں ایک غریب خاندان کا لڑکا اس قابل نہ تھا کہ تم محبت کرتیں۔ میں اس قابل ہوں کہ تیری راہ محبت میں اپنے کو سدا دوں۔ خود کو قربان کر دوں۔ تری شمع حسن پر جل مروں۔ میرے بدن کا رنگ گیارہ رنگ تیری محبت کا گیت گاتا رہے گا۔ میں تیرا ہوں۔ بلکہ تیرا غلام۔ میں ہمیشہ تجھ سے محبت کروں گا۔ چاہے اس راہ میں کتنے ہی آفات کتنے ہی روڑے کیوں نہ ہوں۔“ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ برابر بولتا جا رہا تھا۔ اس پر ایک کیفیت طاری تھی۔ معاً ملہ تھا چونکی۔ اس نے درختوں میں سرسراہٹ کی آواز سنی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ”آہ! خورشید“ اس نے چلایا۔ خورشید نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ شاید سامنے کھڑا غضب آلود نگاہوں سے خورشید کو دیکھ رہا تھا۔ خورشید ہکا پکھا ہو کر بھاگا۔ ہریالی پر بھسلا اور وہ زور سے زمین پر گر پڑا۔ اور اُسے ہوش نہ تھا۔ ملہ تھا دوسری روش سے اپنے کمرہ میں بھاگ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ وہ شرم اور رسوائی سے پانی پانی ہو رہی تھی وہ روئے روئے نیم ہوش ہو گئی۔

شاہد نے ملہ تھا کی والدہ سے سب حال کہہ سنایا۔ اور وہ غصہ سے سُرخ گئی۔ دونوں نے خورشید کو مکان سے باہر کر دینے کا نتیجہ کر لیا۔

(۵)

دوسرے دن صبح کو خورشید نے جب آنکھ کھولی تو اپنے کو اپنی پرانی جھونپڑی میں پڑ پایا۔ اُس کا داغ چکارا ہوا تھا۔ ملہ تھا۔ پیاری ملہ تھا اُس نے چلایا۔ اس نے اپنے گرد دیکھا۔ اسے ساٹھا ساٹھا ہو گیا۔ وہ وحشی کی طرح اپنے بال نوچ رہا تھا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ شدت غم سے ابھی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ یہ وہی جھونپڑی تھی جس میں کہ وہ پیدا ہوا تھا۔ اور جس جگہ اُس نے اوائل زندگی سرت و شادمانی سے گزاری تھی جس کی موجودگی باعث زینت تھی۔ آہ اب وہ خستہ حال بے یار و مددگار پڑا تھا۔ جھونپڑی کا سر بوسیدہ حصّہ ایک ہیبت صورت اختیار کیا ہوا تھا۔ جس میں پڑیوں اور کوشوں نے آشیانہ بنا رکھا تھا۔ خورشید کی حالت ناگفتہ تھی۔ وہ کبھی ہنسنا ایک دیوانے کی طرح کرتا ایک مظلوم کی طرح۔ وہ مظلوم جو محبت کے ہاتھوں تباہ ہوا ہو۔

اُس کے بال خاک آلود تھے۔

وہ شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اُس نے اب نعیم خاں کے مکان جانا باعثِ ذلت سمجھا۔ وہ نہایت بے سرو سامانی کی حالت میں صوبکا پیاسا چلا جا رہا تھا۔ راستہ چلنے والے اُس کو نہایت غور سے دیکھتے جاتے تھے۔ مگر وہ گردن نیچی کئے چلا رہا۔ وہ تھک گیا۔ اُس کی جیب میں چند پیسے پڑے تھے۔ جن سے اُس نے اپنا پیٹ بھرا۔ اتفاقاً اُس کا گزر قلعہ کی طرف ہوا۔ جہاں لوگ اُس دن کے پروگرام بورڈ کے پاس کھڑے تھے۔ اُس نے مناسب سمجھا کہ وہ قلعہ میں نوکر ہو جائے۔ وہ مجبور تھا کیونکہ دنیا میں اب اُس کا کوئی مددگار نہ تھا۔

دوسرے روز وہ قلعہ میں نوکر ہو گیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد نعیم خاں لاہور سے واپس آ گئے۔ شاہ نے خورشید کے بابت تمام کہہ سنایا اور اس قدر بھاری پر الزامات لگائے کہ نعیم اُس کی باتوں میں آ گئے۔ مگر وہ نہایت رحم دل تھے۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ خورشید کو اُس کی جھوٹی بیوی میں دیکھ آئیں۔ کیونکہ انہیں اس سے ہمدردی اور محبت تھی۔

شام کو وہ جھوٹی بیوی میں گئے۔ لیکن وہاں خورشید نہ تھا۔ جھوٹی بیوی اُداس اور خالی تھی۔ نعیم کا دل کپھل گیا۔ انہیں خورشید کی در بدری کا خیال آیا اور وہ آبدیدہ ہو گئے۔ اور گھر واپس آئے۔

ملاقات اب وہ بدلتا نہیں رہی۔ وہ صورت دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ شرم کے مارے اپنے کمرہ ہی میں رہتی مگر خورشید کے لئے ہمیشہ تڑپتی۔ وہ بلی ہو گئی تھی۔ اور کھانا پینا بھی کم ہو گیا تھا۔ والدین نے مناسب ہتھکنڈا اس کی جلد شادی کر دی جائے۔ لہذا چند ماہ کے بعد اس کی زندگی اسی سے وابستہ کی گئی جس سے وہ بھاگتی تھی۔ جس کی صورت سے وہ بیزار تھی۔ جس دن سے اس نے سنا کہ اُس کی شادی حامد سے ہونے والی ہے وہ نہ رونا و قطار روتی۔ اُس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ عورتیں سمجھاتی ہیں مگر اُس کو کھیا کی قسمت میں ہی لگا تھا کہ روتی رہے۔ بلکہ مرتے دم تک کسی کی جوگیں بنی رہے۔ لوگ سمجھتے کہ اُس کا رونا قہور سے عرصہ کے لئے ہے جیسا کہ بیابانی ٹرکیاں ریا کرتی ہیں۔ مگر یہ کیلیمندوم کہ اُس کے آسوا اُس کے دل کے کڑے ہیں۔ اُس کی آہیں جلنے ہوئے کتاب کے صفحے ہیں جو زندگی بھر جلتے ہیں گئے اور اُس کا رونا اُس کی حسرتِ ناک موت کے وقت سب کو خون کے آنسوؤں والا لایگا۔ یہ شادی نہیں تھی کسی کی بربادی تھی کسی کے موت کا پیش خیمہ۔

حامد اپنی خوش قسمتی پر پھولارہا سماتا تھا۔ اور اُسے بیشک تمہارے آرام و آسائش کے لئے تمام چیزیں جوچھ وہ فراہم کر سکا تھا فراہم کریں مگر تمہارا ان سب سے بے اعتنائی۔ اُس کا دل خورشید کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کے

اس کے دن خورشید کی ادیس اُس کی راتیں — ہسٹیک راتیں آہوں میں کٹتی تھیں۔ اُس کی زبان پر ”خورشید - خورشید“ تھا اُس کے دماغ میں اسکی محبت بسی ہوئی تھی اس کا چاند سا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ سسرال والوں میں سے کسی نے اس کے بالوں میں تیل ڈالا تو ڈالادرنہ وہ اپنی زیبائش سے بالکل لاپرواہ ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ مسکراتی تک نہ تھی۔ سسرال والے کہا کرتے ”عجیب منخوس لڑکی ہے کہ ہمیشہ روتی ہی رہتی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ کچھ کام کرتی ہے“ مہ لقا یطیعے سختی ہے۔ اور رونے لگتی ہے۔ سرنگوں ہو کر آنکھوں پر ہاتھ لگا لیتی ہے۔ موت کو پکارتی ہے مگر موت نہیں آتی چند دن بعد اُس نے خود کو ہنجالا اور گھر کا دھندلا کرنے لگی۔

(۶)

خورشید نے تھمڑ میں شریک ہوتے ہی اپنا نام خدا حسین سے بدل دیا۔ اُس کی قدرتی آواز اور خدا داد حسن نے اُس کو بہت جلد لوگوں کی نظروں میں کھپا دیا اور وہ مشہور ہو گیا۔ وہ اکثر انگلیں پارٹ لیتا اور اس خوبی سے ادا کرتا تھا کہ بہت سے لوگ دیتے۔ اُس کی انگلیں نہایت خوبصورت تھیں۔

غزالہ ایک سترہ سالہ حسین ایمرس تھی۔ وہی تھمڑ کی جان تھی اور لوگ اس ہی کی وجہ سے زیادہ آیا کرتے تھے۔ وہ کشمیری حسن کا بہترین نمونہ تھی۔ جب سے اُس نے خورشید کو دیکھا تھا اس وقت سے وہ اُس کی دیوانی ہو گئی تھی۔ وہ اُسے حسن کا فرشتہ سمجھتی تھی۔ غزالہ چاہتی تھی کہ کسی طرح خورشید کو اپنے دام الفت میں پھانسنے۔ مگر خورشید اُس کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا۔ اُس کی نظروں میں اب تک مہ لقا کی محبت کو غزالہ کی محبت پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔ شام کے چار بجے ہوں گے اُس دن کے ڈرامہ کا یہی ختم ہو چکا۔ غزالہ ایک بیٹی سا لڑھی میں بیوس خورشید کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ خورشید کرسی پر گردن جھکائے کسی خیال میں غرق تھا۔ وہ کانپتی ہوئی لنگے بڑھی۔ اُس نے ہنسی کر لیا تھا کہ آج خورشید پر اپنی محبت جملائے گی۔ مگر خورشید کو اُس کی پاپ تک نہ سالی ہوئی وہ عالم طفلی کے تصور میں محو تھا۔ مہ لقا کی پیاری صورت اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اُس کا خیالی مجسمہ اُس کی نظروں میں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ واقعی مہ لقا سامنے ہے۔ ”مہ لقا“ وہ فطوحشی سے چلا آیا۔ اُس کی انگلیں کھل گئیں۔ اُس نے غزالہ کو دیکھا۔ بلکہ غور سے دیکھا۔ غزالہ ساکت تھی۔ خورشید نے زور دیکر پوچھا۔

”غزالہ یہاں کیسی کھڑی ہو۔“

”بھیک مانگنے“ اُس نے متا بھری نظریں ڈال کر جواب دیا۔

”گا ہے کی“

”محبت کی“ اُس کے ہاتھ ملے ہوئے تھے۔ گویا احتجاج کر رہے تھے۔

”کس سے؟“ اُس نے ذرا برا نگینہ ہو کر سوال کیا۔

”آپ سے“ اور وہ نیچے دوڑا نہ ہو کر بیٹھ گئی۔

”مجھ سے۔ غزالہ یہ نامکن ہے۔ غزالہ تم میرے پیچھے نہ پڑو۔ آہ میرے دل میں کسی اور کی محبت کے شعلے ہیں۔ بشرے کسی طرح بجھ نہیں سکتے۔ جب میں مردوں کا تو یہ شعلے میری خرسِ مستی کو آگ لگا دیں گے۔“ غزالہ خورشید کی نظروں میں نہر ملی ناگن معلوم ہو رہی تھی۔ غزالہ نے چاہا کہ خورشید کے گلے میں بائیں ٹالے مکر خورشید نے ایک جھڑکی دیکر اُسے ہٹا دیا۔ اُسے غصہ آگیا اور اُس نے فوراً باہر چلے جانے کو کہا۔ غزالہ کا دل کیڑا اور بغض سے لبریز ہو گیا۔ وہ مکرہ کے باہر چلی گئی۔

اُس نے سوچا جو کہ خورشید براتقا کا دیوانہ ہے اس لئے اُس کے متعلق ہر کی بات سُننے کا یقین کر لیا۔ اُس نے خورشید کو برا بکرا کرنے کی ٹھان لی۔ اور وہ واقعی میں نہر ملی ناگن ثابت ہو رہی تھی اُس نے ایک چھو کرے کو الگ بلا کر کچھ کان میں کہا اور ایک روپیہ اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ لڑکے نے سر ملایا اور وہ چلا گیا۔

(۷)

تھیں کے پردگرم بورڈ کے پاس ایک جم غفیر ہے۔ لوگ ٹوٹے پڑے ہیں۔ بورڈ پر شیریں فراڈ جلی قلم سے لکھا ہوا ہے۔ سب اس کھیل کو دیکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اور خوش ہو رہے ہیں۔ تمام شہر میں آج کے پردگرم کی دھوم ہو گئی۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ خدا کا اس ڈرامہ میں کام دیکھے۔ حامد نے بھی تہیہ کر لیا کہ آج وہ اور براتقا دونوں اس ڈرامہ کو دیکھیں گے۔

۹ بجے براتقا اور حامد قصبہ ہال میں پہنچ گئے۔ اور براتقا نانہ حصہ میں چلی گئی۔ جو اسٹیج سے قریب تھا۔ لوگ ہال میں کچھ کچھ بھرے تھے۔

حمہ کے بعد کھیل شروع ہوا۔ خدا بجنسہ فرما د معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نہایت خوبی سے اپنا پارٹ ادا کر رہا تھا۔ اُس کی آواز سوز و درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس کے آنسو واقعی میں جاری تھے۔ لوگوں کے دل پسے جا رہے تھے۔

براتقا نے خورشید کو پہچان لیا۔ اُس کے دل کو ایک گونہ خوشی حاصل ہوئی۔ ”خورشید“ اُس کی زبان سے خود بخود آہستہ نکل گیا۔ اگر اُسے اپنی عزت کا خیال نہ ہوتا تو اسٹیج ہی پر جا کر خورشید سے ملتی۔ وہ خوشی سے زلزلہ

ہو رہی تھی۔

آدھ گھنٹہ کا وقفہ ختم ہوا۔ اور پھر کھیل اسی خوبی سے ہونے لگا۔

کھیل کا آخری سین شروع ہونے والا تھا۔ کالمک پورہی تھی۔ اور فرما د اپنے پارٹ کی تیار سی کر رہا تھا۔ ایک دیکھ بھری آواز سے وہ چونکا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک لڑکا اُس کی طرف دو تار آ رہا ہے۔ لڑکے نے قریب آ کر کہا ”مرقا“۔ مرقا کو آپ جانتے ہیں۔ میں اُس کے خالو کے پاس لوگوں میں آہ مرقا کالج صبح کو انتقال ہو۔ ہو گیا اور وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ خورشید نے سنا۔ اُس نے سچ سمجھ لیا۔ وہ دیوانہ کی طرح اشیخ پر آیا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ اُس کی زبان رک رہی تھی۔ اُس نے بسول اٹھایا ”آہ مرقا“ ایک بے ساختہ چیخ اُس کی زبان سے نکلی مرقا نے ایفے خوار شیرنی کی طرح سلسنے کی چلن توڑ دی۔ اور وہ اشیخ کی طرف بے ساختہ بھاگی۔ مگر آہ اس درمیان میں خورشید نے بسول مار لیا تھا۔ تمام اشیخ خون سے رنگین تھا۔ ”خورشید“ پر ایسے ”خورشید“ مرقا نے چلایا۔ وہ خورشید کے پاس پہنچی۔ خورشید نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ ”مرقا“ اُس نے سستی ہوئی آوازیں کہا۔ مرقا اس سے پٹ لگئی۔ اُس کی چیخوں سے تمام اشیخ گونج رہا تھا۔ خورشید نے مرقا کو ایک مرتبہ ادھر دیکھا اور اُس کے چہرہ پر ہلکی سی سسکاہٹ باقی تھی۔ جو مرقا کو دیکھ کر اُس کے ہتھ پر ظاہر ہوئی تھی۔ مرقا نے بیہوشی کے عالم میں ایک صبح ماری۔ اُس کے دل کی حرکت بند ہو گئی اور وہ لہری کی رو میں پاک رو میں ملکر پرواز کر گئیں۔

عائد نے اس خبر جاننا سے تمام عزیزوں کو مطلع کیا۔ نعیم سر کڑ کر رہ گئے۔ اس ناقابل برداشت غم کی وجہ سے اُن کا دماغ خراب ہو گیا۔ دوسرے روز ایک پہاڑی دامن میں دونوں بازو بازو دفنائے گئے۔ لوگوں کا بہت مجمع تھا۔ ان جوان موتوں پر لوگ رو رہے تھے۔

خورشید کی قبر پر ”فراد ثانی“ کندہ کیا گیا اور اُس کے سر پر ”سرد“ اور مرقا کے سر پر ”گلاب“ درخت لگائے گئے۔

بنتے ہیں کہ ایک عجیب چڑیا دو گلاب کے پھول توڑ کر ان قبروں پر رکھ دیتی ہے۔ اور ایک غمناک گیت گاکر اڑ جاتی ہے۔ اُن کی قبور پر اس قدر حسرت چھائی رہتی ہے کہ چرواہے اور جانور تک دور سے نکل جاتے ہیں۔ اور نزدیک نہیں آتے۔

غزل

انجمن لوی حکیم مرزا قاسم علی بیگ صاحب کراچی آبادی

چند چند

صبح دم تھا نالہ بلبل غم نہیں نا گل بھی کرتا تھا چمن میں خندہ دندان نا
 جلوہ حیرت کا نقشہ ہر تیری صورت کا عکس ہائی کیا آئینہ اظہار ہے حیراں نا
 آبلوں کے زخم جذب شوق میں پھٹنے لگے کیا کشش ہے نوک خار دشت کی پیکاں نا
 حشر ریا کر دیا وضع خرام ناز نے ہے قیامت بھی تیرا سن اب داماں نا
 بعد مدت کے ہو گم قابل جو روستم یہ تمہارا ظلم بھی کیا کچھ نہیں حساں نا
 پسین کو چھوڑ کر بھی قید عریانی میں ہیں ہو گیا ہے خانہ تنہم کو اب زنداں نا

ہے زباندانوں کا مجمع جمع ہیں سب اہل فضل

حیدر آباد دکن اخگر ہے ہندوستان نا

خود اعانتی

از

(جناب مرزا نام علی بیگ صاحب بی - اے)

(بلسلسہ سابقہ)

دولت مند اشخاص بھی خواہ وہ کتنے ہی اعلیٰ مراتب اور اعزاز رکھتے ہوں اگر کوئی بغیر فانی شہرت نامور حاصل کر سکتے ہیں تو وہ محض ذاتی محنت اور قابلیت کے ذریعہ کیونکہ گونا گونا گویا ابالی ملک جس کسی قدر زمین کا مالک بن سکتا ہے لیکن علم اور عقل و دانش کسی کی میراث نہیں۔ دولت مند آدمی دوسروں سے جو کچھ کام لیا ہوا ان کی محنت کا معاوضہ ادا کر سکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ دوسروں سے اپنا دماغی کام کر والے یا دوسروں کا دماغ خرید لے حقیقت میں یہ اصول کہ ہر شعبہ زندگی میں کمال محض محنت ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے ایک دولت مند پر اسی طرح صادق آتا ہے جس طرح کہ دُور اور گھر ڈیر جن کی در سگاہ ایک کشفہ وز کی دکان تھی نیز یہ اصول ہولیر پر بھی صادق آتا ہے جس کا مدرسہ ایک پتھر کی کان تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ دولت اور عیش انسان کی اعلیٰ تربیت اور تعلیم کے لئے نہیں ہیں ورنہ دنیا پر مارا میں ایسے اشخاص کی ہرین منت نہ ہوتی جنہوں نے ادلئے اندراج سے ترقی کی۔ آرام و آسائش کی زندگی انسانوں کو دشواریوں سے مقابلہ کرنا نہیں سکھاتی۔ نیز اس قسم کا احساس بھی پیدا نہیں کر سکتی جس کی کہ محنت اور عمل کے لئے سخت ضرورت ہے حقیقت میں نفسی ایک مصیبت ہے لیکن انسان خود اعانتی کے ذریعہ اس کو اپنے لئے باعث برکت بنا سکتا ہے اور جس کی وساطت سے ایک راست باز مصلحت مند اور مستقل مزاج انسان ترقی کر جاتا ہے۔ لیکن کا قول ہے کہ ”لوگ دولت کا صحیح مصروف جانتے ہیں اور نہ اپنی قوت کا۔ دولت کو ضرورت سے زیادہ اور قوت کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ خود اعتمادی اور نفس کشی انسان کو اپنے پیالے سے پینا۔ اپنی غذا کھانا۔ قوت بیری کے لئے کوشش کرنا اور حاصل شدہ نعمتوں کا بہترین استعمال سکھاتی ہے۔“

دولت سے آرام اور کاپالی کی بے حد ترغیب و تحریص ہوتی ہے اور کاپالی کی جانب لوگ قطراتاً مائل نظر آتے ہیں۔ لیکن عزت و شہرت تو انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ جو دو لقمہ نگہرانوں میں یا ستمول ماحول میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی نسل کی فلاح و بہبود میں بڑی کوشش کرتے ہیں اور تہنشات کو ٹھکراتے اور عملی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس ملک کے ستمول افراد کے لئے یہ امر باعث فخر و عزت ہے کہ وہ کابل نہیں بلکہ ریاست کے کاروبار اور خصوصاً اہم و نازک معاملات میں وہ خاص اور غیر معمولی حصہ لیتے ہیں۔ جنگ بین مولائے کے موقع پر ایک افسر نے جس وقت وہ کیچڑ اور دلدل میں سے اُس کی رجسٹ کے قریب سے گزر رہا تھا یہ الفاظ کہے۔

اس زمانہ میں بھی باٹوئیل کے سر و نشیب اور ہندوستان کی حلیٰ زمین اس بات کی شاہد ہے کہ ہمارے ملک کے طبقہ شرفاء نے بھی اسی قسم کی اعلیٰ نفس کشی اور عملی زندگی بسر کی ہے۔ اکثر دلیر اور عالی منش ذی مرتبہ اور ستمول افراد نے اپنے ملک کی خدمت کی انجام دہی میں اپنی جانوں کو خطرے میں ڈالا اور ذاتی اغراض کا ملکی سفاد پر اختیار کر دیا۔

ستمول طبقوں نے بھی فلسفہ اور سائنس میں شہرت حاصل کی مثال کے طور پر فلسفہ جدید کے پوت بیکن اور سائنس دان اورسٹر۔ بائیل کیا ڈنڈش ٹالیسٹ اور اس قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر کو طبقہ امریکا زبردست کاریگر تصور کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ دولتمند نہ ہوتا تو یقیناً ایک زبردست موجد ہوتا اس کی صنعتی قابلیت کا حال تھا کہ اُس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک صنعت نے جس کو اُس کے رتبہ کا علم نہ تھا اس کو ایک موقع پر ایک بڑے کارخانہ کے فورس کی خدمت قبول کرنے مجبور کیا تھا۔ اس کی ایجاد کردہ بڑی راس دور میں یقیناً اپنی نوعیت کا وہ نہایت غیر معمولی اور نادر آلہ ہے جو اس کے زمانہ تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

شعبہ ریاضیات اور ادبیات میں خصوصاً اہم اعلیٰ طبقوں کے اکثر جفاکش اشخاص کو پاتے ہیں ان شعبوں میں بھی دیگر شعبوں کی طرح محض محنت و مشق اور مطالعہ ہی کے ذریعہ ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ وزیر اعظم یا پارلیمنٹ کے لیڈر کو بھی لازمی طور پر جفاکش اشخاص میں سے ہونا چاہیے۔ پارسلن ڈربلی۔ رسل۔ ڈسریلی۔ اور گلاڈسٹن اسی قسم کے افراد تھے انہیں TEN HOURS BILL سے سابقہ نہیں پڑا انہوں نے پارلیمنٹ کی مصروفیت کے زمانہ میں شعبہ روزنامہ کام کیا ہے۔ سر رابرٹ پیل کی مستی عہد حاضر کے اسی قسم کے محنتی دشمن اشخاص ہی میں سے تھی وہ سلسلہ دماغی کام کرنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے اور اپنا کوئی وقت ایگلا

نہیں کیا۔ اُن کی زندگی حقیقت میں اس امر کی ایک عجیب و غریب مثال تھی کہ ایک محدود اختیار اور قوی والا شخص بھی اپنی انتھک محنت سے کس قدر کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ پارلیمنٹ کی شرکت کے چودہ سال کے دوران میں وہ بے اندازہ مشقت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دیانت دار راستہ باز انسان تھے۔ انہوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا اُس کو عملی سے پائے تکمیل کو پہنچایا۔ اُن کے تمام تقاریر سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ تحریری یا تقریری ہر معاملہ کے متعلق کافی سطا لیا اور غور و خوض سے کام لیا کرتے تھے۔ وہ ضرورت سے زیادہ بخاش تھے۔ اور تقریر کرتے وقت حاضرین کے گونا گوں طبایع کا انہیں خاص خیال رہتا تھا اور وہ اس بات کو مد نظر رکھ کر تقریر کیا کرتے تھے۔ علاوہ اس کے اُن کی ذات میں عملی کام کی صلاحیت۔ اُدو العزمی۔ اور اپنی کوشش کے نتائج کے صحیح استعمال کی قابلیت بھی موجود تھی ایک لحاظ سے اُن کو اکثرین پرفورمیت حاصل تھی۔ ان کے اصول زمانہ کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتے گئے۔ اور بڑھائے گئے اُن کی طبیعت کو سجا افسردہ کرنے کے بشاش بنانے کا کام کیا مرنے تک وہ نئے نئے نقطہ نظر کو تسلیم کرنے آمادہ رہتے تھے اور اگرچہ کہ اکثرین کا خیال تھا کہ وہ حد سے زیادہ محتاط تھے لیکن انہوں نے اپنی گذشتہ زندگی کی توصیف اسی طرح نہیں کی جس طرح۔ کہ اُن کے لئے تعلیم یافتہ دماغوں کا خاصہ بلکہ مرض ہوا کرتا ہے۔

لارڈ برولام کی ان تھک محنت قریب قریب ضرب المثل بن گئی ہے۔ اُن کی پبلک مصروفیتوں کا زمانہ (۶۰) سال سے بھی زائد ہے۔ جس میں انہوں نے قانون۔ ادبیات۔ سیاسیات اور سائنس کے شعبوں میں عبور حاصل کیا۔ اور سب میں شہرت حاصل کی۔ یہ بات کہ۔ امتیاز انہیں کس طرح حاصل ہوا۔ اکثرین کے نزدیک ایک معہ بنی رہی۔ ایک مرتبہ بریامیول رومانی سے کسی نئے کام کی انجام دہی کی استدعا کی گئی تو اُس نے عدیم الفرستی کا عذر کر کے اُس کام کے کرنے سے معافی چاہی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ”اُس کام کو بردہام کے پاس لے جاؤ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے پاس ہر کام کے لئے وقت ہے۔“ حقیقت یہ تھی کہ بردہام کا ایک سنٹ بھی رائیگاں نہ جاتا تھا۔ علاوہ اس کے اس کی جسمانی قوت بہت زبردست تھی زمانہ پیری میں جبکہ اکثر اشخاص اپنی بدقت لہجہ آئی ہوئی فرصت سے لطف اٹھانے اور غالباً اپنا وقت آرام کر سہی پر گزارنے کے لئے دنیا سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں لارڈ بردہام نے تو انیس نو کی کال تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا اور اُس کے نتائج پیرس اور لندن کے مشہور سینٹھک حلقوں میں پیش کئے اسی زمانہ میں اُس کی قابل تعریف تصنیف (MEROE SCUMIE LIFE OF THE REIGN OF GEORGE III)

کے سودے زیر طبع تھے اور وہ دارالامرا کے قانونی معاملات اور سیاسی مباحثات میں یوراحصہ لیا کرتا تھا۔ سٹی اسمبلی نے ایک مرتبہ بروہم کو یہ مشورہ دیا کہ وہ بین قوی آدمیوں کا کام انجام دیا کرے لیکن لاڈ بروہم کو محنت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ کوئی کام اُس کو مشکل اور دشوار نظر نہ آتا تھا بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کام کا شوق طبیعت ثانی بن گیا تھا اور ہر بات میں کمال پیدا کرنے کا شوق اس میں اس درجہ موجود تھا کہ اُس کے مطلق یہ کہا گیا ہے کہ اگر بروہم کفشدوزہ ہوتا تو جس وقت تک وہ انگلستان کا بہترین کفشدوزہ بن جاتا اُس کو چین نہ آتا۔

اسی شہبہ کی دوسری جگہ کشہتی سرای بلورٹن کی ہے ایسے مصنفین جنہوں نے اس کے ساوی کام کیا بہت کم ملیں گے نیز کسی نے اس کے برابر مختلف شعبوں میں دستگاہ حاصل نہیں کی۔ لیٹن نے ناول نگاری - شاعری - ڈرامہ نویسی - سوانحی - مضمون نگاری - مقرر - اور سیاست میں شہرت حاصل کی بلور کو آج واحد میں ترقی حاصل نہیں ہو گئی بلکہ تدریجی طور پر حاصل ہوئی۔ آرام طلبی اور سہل نگاری سے ہر محنت نفرت تھی اور دوسروں پر سبقت لے جانے کا شوق اس کے دل میں ہمیشہ رہا کرتا تھا موجودہ انگریزی مصنفین میں بہت کم ایسے مصنف ہیں جنہوں نے اُس کے برابر تصنیفات لکھے اور اعلیٰ امتیاز حاصل کیا۔ بلور کی ذاتی محنت ہر تقریف کی مستحق ہے۔ شکار - نشان اندازی - عیش و آرام کی زندگی - کلبوں کی سرپرست - تماشہ گھروں کا لطف و تفریح - موسم گرما میں لندن کے دلفریب مناظر کی سیر ہزاروں فرحت بخش لطائف غیر حاکم پیریں دیا یا روم کا سفر یہ تمام چیزیں ایک خوش نصیب اور عیش پسند انسان کو اپنے طرف اہل کرتی ہیں اور وہ ہر قسم کے سلسل کام کی انجام دہی پر مستعد و آمادہ ہو جاتا ہے لیکن یہ تمام باتیں حاصل ہونے کے وجہ ممکن تھا کہ بلور اعلیٰ مدارج کے حصول اور ادبی زندگی سے محاکر کر دیا ہوتا۔ لیکن ان کے باوجود اس نے محنت کو اپنا اور صبا بچھونا بنایا۔ بائرن کی طرح اس کی پہلی ادبی کوشش (کھاس اور خود رو پھول) کے عنوان کی ایک نظر تھی لیکن ناکامیاب ثابت ہوئی۔ دوسری کوشش فاکس لیڈ نامی ناول کی شکل میں ظاہر ہوئی لیکن اس میں بھی بلور کو ناکامیابی نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں ایک پست ہمت انسان انشا پر داری کا خیال ترک کر دیا ہوتا۔ لیکن بلور ایک مستقل مزاج اور عالی حوصلہ آدمی تھا کامیابی کا غم کر کے اُس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ محنت سے کبھی جی نہ جراتا تھا کافی مطالعہ کے ذریعہ اُس نے وسیع معلومات حاصل کئے ناکامیوں ہی سے اُس کی ہمت بڑھتی گئی۔

اور اسی کو ترقی حاصل ہوئی۔ ایک سال کے اندر فاک لینڈ کے بعد (یلبام) نامی کتاب شائع ہوئی اور بلور کی باقی ماندہ ادبی زندگی کے تیس سال کے دوران میں کامیابیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

سٹرڈس رائس کی ہستی بھی اس بات کی ایک مثال ہے کہ انسان محنت و جفاکشی کی بدولت اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اس کی پہلی کوشش بلور کی طرح ادبی تھیں اور اُس نے کئی ناکامیوں کے بعد ہی کامیابی حاصل کی۔ لوگوں نے ڈکٹر سٹیل آف ٹرائے اور رولوشنری ایک نامی تصانیف کا مضحکہ اُڑایا اور انہیں محض ادبی جنون تصور کیا گیا لیکن اُس نے دوسرے شعبوں میں اپنی کوشش جاری رکھی اور اس کے تصانیف کانگرس بی۔ سی بی۔ اور ٹرانکڑس کی جفاکشی کا ثبوت ہیں پیل کو دارالعلوم میں مقرر کی حیثیت سے بھی پہلے پہل ناکامی ہوئی اس کی تقریر کو اڈلفی کے ایک مضحکہ خیز نقل یا سٹو سے بڑھی ہوئی چیخ و پکار سمجھا گیا۔ اگرچہ کہ اُس نے تقریر نہایت شاندار کی تھی لیکن ہر جگہ پر قہقہہ ہوتا تھا۔ کامیڈی کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہپا بلٹ بھی اُس کے مقابلہ میں کوئی چیز نہ تھی۔ اُس نے اپنی تقریر ایک ایسے جملہ پر ختم کی جس میں ایک پیش گوئی مضمر تھی۔ جب اُس کی فصاحت پڑھ کر کیا گیا تو اُس نے کہا کہ ”میں نے اکثر بہت سے کام شروع کئے اور آخر کار ان میں کامیاب رہا اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں لیکن ایک وقت ایسا آئے گا جب کہ آپ میری تقریر کو توجہ سے سینگے۔“ یہ وقت یقینی آیا اور ڈسرایلی نے پارلیمنٹ کی توجہ کو اپنے طرف مبذول کرانے میں کس طرح کامیابی حاصل کی اس امر کی بن دلیل یا نظیر ہے کہ محنت اور مستقل مزاجی سے کیسے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ڈسرایلی نے محض صبر و تحمل اور محنت سے اعلیٰ رتبہ حاصل کیا۔ ایک مرتبہ ناکام ہونے کے بعد اکثر نوجوانوں کی طرح وہ پست ہمت ہو کر گوشہ نشین اور افسردہ دل نہیں ہو گیا بلکہ دلچسپی سے کام کرتا گیا۔ اُس نے بڑی کوشش سے اپنے نقائص معلوم کئے۔ حاضرین کی طبائع کا مطالعہ کیا اور فن تقریر میں کافی مہارت حاصل کر کے اپنے دماغ کو پارلیمنٹ کے معلومات سے بھر دیا۔ اُس نے تحمل کے ساتھ کامیابی کی امید پر اپنا کام جاری رکھا اور رفتہ رفتہ ترقی حاصل کی آخر میں اُس نے پارلیمنٹ سے بجائے قہقہوں کے خراج تحسین حاصل کیا اس سے اُس کی پہلی ناکامی کی تلانی ہو گئی اور بالآخر اُن کی آرزو پارلیمنٹ کا ایک قابل اور موثر مقرر تسلیم کر لیا گیا۔

جس طرح ان مثالوں اور آئندہ صفحات پر دی ہوئی باتوں سے واضح ہوتا ہے اگرچہ کہ ذہنی

محنت اور کوشش سے بڑے بڑے نتائج پیدا ہو سکتے ہیں تاہم اُس کے ساتھ ساتھ ہیں اس بات کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ سفر زندگی میں ہم کو دوسروں سے جو مدد ملتی ہے اس کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے شاعر ورڈز نے خوب کہا ہے کہ "دوسروں کی مانتھی اور ذاتی آزادی و خود مختاری۔ دوسروں پر اعتماد اور خود اعتمادی یہ دونوں چیزیں کو بظاہر متضاد نظر آتی ہیں لیکن ان میں چولی داسن کا ساتھ ہے ہر شخص تعلیم و تربیت کے بارے میں محکم سے پیری تک دوسروں کا کم و بیش رہن منت ہوتا ہے اور عموماً اچھے اور زبردست آدمی اس قسم کی مدد کو تسلیم کرنے تیار نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر الکیس ڈی ٹاکیو کی کاہل زندگی کو لیجئے وہ ایک مستول گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا باپ فرانس کا ایک مشہور امیر تھا۔ اور اُس کی ماں اُسے شرنس کی پوتی تھی۔ صرف اسی سال کی عمر میں زبردست خاندانی اثرات کی بدست سے وہ بمقام مد سے حج آڈیٹر مقرر ہوا لیکن یہ خیال کر کے کہ اُس نے ذاتی قابلیت سے یہ عہدہ حاصل نہیں کیا اُس کو چھوڑنے اور اپنی ذاتی کوشش سے آئندہ ترقی کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ بعض لوگ اس حرکت کو "ایک احمقانہ اور باطل خیال" تصور کریں گے لیکن ٹاکیو کی نے مستقل مزاجی کے ساتھ اسی خیال کے مطابق عمل کیا چنانچہ اُس نے لازمت ترک کی اور مالک متحدہ امریکہ کے سفر کی عرض سے فرانس سے روانہ ہونے کا سامان ہیا کیا اس کے سفر امریکہ کے تجربات اُس کی مشہور تصنیف "جمہوریت امریکہ" کی شکل میں شائع ہوئے اُس کے ہم سفر اور رفیق گیسٹو ڈی بیو کینٹ سنے اُس کی ان تھک کوشش کا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ "ٹاکیو کی کی فطرت کمالی کے بالکل خلاف واقع ہوئی تھی اور خواہ سفر میں ہو یا حضر میں اس کا دماغ مصروف کار رہا کرتا تھا۔ جو دن بیکار گزرتا اُس کو وہ بدترین تصور کرتا اور تھوڑے وقت کا نقصان بھی اُس کو ناگوار گزرتا تھا" ٹاکیو کی نے خود ایک دوست کو لکھا کہ "زندگی میں کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب کہ انسان کام سے بالکل بچت ہو جائے کیونکہ پیری میں جوانی سے زیادہ نہیں تو قریب قریب اس کے مساوی محنت کی ضرورت ہے۔ میں انسان کو دنیا میں ایک ایسے مسافر سے تشبیہ دیتا ہوں جو ایک سرخط کی جانب سفر کرتا جا رہا ہو جس قدر بلند یہ رہا وہ جائے اُس کو چاہئے کہ رفتار تیز کرے روح کا بڑا مرض افسردگی ہے اور اس خطرناک نقص کو دور کرنے کے لئے انسان کو صرف مصروف دماغ کی اعادہ ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایسا شخص

کی مدد کی بھی ضرورت ہے۔ ذاتی محنت اور خود اعتمادی کی ضرورت کے متعلق اکیرونی کی قطعی رائے کو کچھ ہو
 کوئی شخص بھی اس اعانت کی قدر کو تسلیم کرنے کے لئے جس کے لئے تمام انسان دوسروں کے کم و بیش
 احسان مند ہوتے ہیں ٹاکیو کوئی سے زیادہ تیار نہ ہو گا۔ ٹاکیو کوئی اُس کے دوست ڈی کر گو۔ سے اور اسٹو فلس کے
 احسانات کا شکر گزاری سے اعتراف کرتا تھا کیونکہ اول الذکر سے دماغی اور آخر الذکر سے اخلاقی ہمدردی
 اور مدد حاصل ہوئی تھی اس نے ڈی کر گو کے لئے لکھا ”آپ ہی کی وہ ذات ہے جس پر مجھے اعتماد ہے اور
 جس کا اثر میری زندگی پر بہت گہرا اور اچھا پڑا ہے۔ میری زندگی پر اگر یہ کہ اکثر لوگوں کا اثر پڑا ہے لیکن انہوں
 خیالات کی ایجاد اور اخلاق پر جتنا اثر آپ کی ذات کا پڑا ہے اتنا کسی کا نہیں پڑا۔ ڈی ٹاکیو کوئی نے اپنی بیوی
 میری کے ان خیالات کا بھی اعتراف کیا جس کی مدد سے اس کا دماغ صحیح و سالم رہا اور وہ اپنی تعلیم کا سیلابی کے
 ساتھ جاری رکھ سکا اس کا یقین تھا کہ ایک شریف اور نیک طینت بیوی اپنے شوہر کے اخلاق کو بتدریج
 اعلیٰ بنا سکتی ہے اور ایک بد طینت اور دنی اطیع عورت شوہر کے لئے یقیناً محرب اخلاق ہوتی ہے۔
 N.P غرض انسانی کردار کے بنانے میں ہزار ہا فطری اثرات کو دخل ہے اور مثال دیند و فصلی
 زندگی اور علم ادب۔ درست آشنا و ہمسائے۔ ماحول اور آباد و اجداد کے خوش کا جن کے اعمال صالحہ
 اور اچھے باتیں ہم بطور ترکہ حاصل کرتے ہیں ہم پر خاصہ اثر پڑتا ہے لیکن یہ اثرات اگر یہ کہ زبردست ہوتے
 ہیں اور انہیں ہم تسلیم بھی کر لیں تاہم یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ انسانوں کو اپنی خوشحالی اور فلاح
 و بہبود بذات خود حاصل کرنی چاہئے۔ اور یہ کہ عقلمند اور نیک آدمی دوسروں کی مدد کا خواہ کتنا بھی نہیں
 کیوں نہ ہو اُس کو چاہئے کہ اپنی مدد آپ کرے اور دوسروں کی مدد کا محتاج نہ ہو۔

سوال جواب

جناب سیدقا در حسین صاحب قادر

کہا:۔ تم ہو جس۔ بولے:۔ یہ مانا !
 کہا:۔ ہر درد دل۔ بولے:۔ کہ ہوگا
 کہا:۔ مریا ہوں۔ بولے:۔ کچھ سبھی؟
 کہا:۔ بے چین ہوں۔ بولے:۔ کہ قسمت !
 کہا:۔ تم چاند ہو۔ بولے:۔ یہ دھتہ؟
 کہا:۔ ظالم ہو۔ بولے:۔ غلط ہے !
 کہا:۔ اچھے ہو؟ بولے:۔ للہ الحمد !
 کہا:۔ بنیہ رہو؟ بولے:۔ کہ ہاں !
 کہا:۔ کب سے؟ کہا:۔ گزر ازمانا !

کہا:۔ آؤں۔ تو بولے:۔ کون ہو تم؟

کہا:۔ قادری۔ کہا:۔ ہرگز نہ آنا !

اصنامِ خیالی

(ان جناب عزیز احمد صاحب)

(۱)

تاریکی شب نے آفتاب کے رُخِ اکٹیش پر ایک ہلکا سا نقاب ڈال دیا تھا۔ مگر جانہ اس غلٹ گندہ میں آفتاب کا سفیر بن کر اب بھی غلٹ کو نور میں، سوز کو ساز میں، اور خیالات کو احساسات میں تبدیل کر رہا تھا۔ بادل بہت دور اُفق پر پڑھیلے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔

اور اب آپ خیال کیجئے کہ شہر اور اُس کے جنوں خیز نگاہوں سے دور، سبز پوش پہاڑوں میں ستاند و ندی کے کنارے کسی چٹان پر بیٹھ کر رات کی خاموشی، قری کی دلاویزی، منظر کی خوبی سے محفوظ ہونا کتنی دلچسپ شغل ہے۔

کہنہ سال شاعر ندی کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ندی کا شفاف اور سرد پانی اُس کے پیروں کو چھو رہا تھا۔ ایک طرف پہاڑوں کا سنان اور دوسری طرف سیدان تھے جن میں بہت دور پر کچھ روشنیاں آبادی کا پتہ دے رہی تھیں۔ آسمان پر چند ستارے نظر آ رہے تھے یا یوں کہیے کہ زمردیں سمندر کی تہ میں چنید سوئی چمک رہے تھے، چند ابدار موتی جن کا جوہری اگر کوئی تھا تو شاعر کا دل۔

ندی کی روانی سے ایک ہلکی سی مدہم آواز نکل رہی تھی۔ گیت کی طرح نرم اور شیریں۔ شاعر کے دل سے بھی ایک آواز نکل رہی تھی ایک نرم اور مسلسل گیت۔ جس میں وہی روانی تھی۔ وہی غلٹ تھی۔ دور بہت دور کوئی ملال کشتی کھے رہا تھا۔ اُس کے گانے کی مدہم آواز۔ فیض کی خاموشی کو چیرتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

شاعر نے ایک آہ بھری ایک سرد آہ۔ "کاش میرے نغموں میں بھی یہی سادگی ہوتی جو اس ملال کے نغموں میں ہے۔ کاش میرے نغموں میں بھی یہی جادو ہوتا۔" اور پھر اُس نے چاند کی طرف ایک نگہ باز

سے دیکھا۔ اور مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ اُس کی خاموشی سُرّتِ دالم کا ایک دلکش اجتماع تھی۔ اور پھر وہ گانے لگا رہی۔ مدبھرے گیت۔ روح افزا لہجے۔ فضا میں پریشان گم کردہ آئینا طاروں کی طرح منڈلانے لگے۔ شاعر نے چاند کی طرف ایک ازدارانہ قسم کے ساتھ نظر ڈالی۔ چاند اپنے اسے میں اس طرح فروزاں تھا جیسے تخت پر کوئی بادشاہ ہو۔ شاعر نے اُسی بادشاہ کو اپنے گیت میں شاعر کا رہا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اُس کے نعنوں سے طرب اندوز ہو رہا تھا۔ شاعر کائنات کے ذرے ذرے کا ازدار تھا۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ شاعر کے دل کا۔

شاعر کے لہجے وہ نغمے جن میں سردی رموز پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جو کائنات کی دلی گہرائیوں کے ازدار ہوتے ہیں اُس کے دل سے نکل نکل کر اُس کے نکل نکل کر فضا کو اپنی شیرینی سے اپنی دل آویزی سے وجد میں لا رہے تھے۔ میرے دل پر بھی اثر کے بغیر نہ رہ سکے۔ (ناظرین۔ میں معافی چاہتا ہوں کہ یہ کہنا بھول گیا کہ میں بھی ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھا ہوا۔ قدرت کے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا) میں اُٹھا اور دبے پاؤں شاعر کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

غالباً شاعر نے میرے قدموں کی آہٹ سن لی۔ مڑ کر میری طرف دیکھا۔ اور بیکہ کسی قسم کا استعجاب ظاہر کئے ہوئے کہنے لگا۔ ”تم بھی غالباً میری طرح فطرت کی گہریزوں سے دامن بھرنے آئے ہو جا“ میں نے سرسری طور پر سر ہلادیا۔ مگر یہ دیکھتے بغیر نہ رہ سکا کہ شاعر کے دل میں بے پایاں سُرّت کا ایک طوفان ہے۔

”ایک زمانہ میں میں بھی تمہاری طرح جوان تھا“ شاعر کہہ رہا تھا۔ ”اور جب میرا دل بھی جوان تھا تو میں اور اگر میرا دل ایک نو شکفتہ پھول تھا جس میں جن تھا اور تھک۔ مگر اب — اب کیا چند مہجانی ہو رہی ہیں کیا اور بس“

میں ایک خیریں احساس بخودی سے شاعر کی باتیں سن رہا تھا۔

”شبابِ دل کی انگلیں دل کے ونولے اب سب ایک خواب و خیال معلوم ہوتے ہیں شبابِ میرے لئے کسی محبت کی یادگار نہیں۔ میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔ کسی غوربت سے نہیں۔ تاہم پھر مجھے محبت تھی ہر شے سے ہر چیز سے مجھے سخت محبت تھی۔ کائنات کی ہر شے سے مجھے محبت تھی اُس حیات سے جو کائنات کی زندگی کا باعث ہے اُسی ہستی سے جو کائنات کی رگ رگیں

طاری و ساری ہے۔ مجھے محبت تھی۔ اور اب بھی ہے۔ اب بھی مجھے اُس جاودانی حُسن سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ وہ جاودانی حُسن جو اپنی ساری خوبیوں کے ساتھ ایک کانٹے میں بھی اُسی طرح جلوہ افروز جیسے کہ گلاب کے کسی تازہ خوشبودار پھول میں۔ میں ایک نامعلوم ہستی کا عاشق ہوں۔ ایسی آہنی کا۔ جسے میں اب تک نہ جان سکا۔ آہ اُس کی محبت میں کس قدر لطف ہے جس کو ہم نہیں جانتے۔ مگر محبت آہ محبت فانی نہیں۔ شبابِ رخصت ہوا۔ دل بچھ گیا۔ مگر محبت باقی ہے۔ جیسے کسی مرقعائے ہوئے پھول میں بھی حُسن باقی رہتا ہے اُسی طرح میرے شکستہ دل میں بھی محبت باقی ہے۔

اور اسے اجنبی میں اس رات کو اس دور دراز مقام پر محض اس لئے آیا ہوں کہ آرام اور اطمینان سے اُس نامعلوم حُسن کی ایک جھلک دیکھ لوں۔

شاعر بے خودی میں کہتا جا رہا تھا۔ اُس کے الفاظ رات کے سناٹے میں بہت دلکش معلوم ہو رہے تھے۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

”اے اجنبی، تو میری محبت کی داستان کو دلچسپی سے سنے گا۔“ شاعر نے سوال کیا۔

میں نے سنا تر لہجے میں اپنا اشتیاق ظاہر کیا۔

شاعر کہہ رہا تھا:-

(۲)

بہت دنوں آہ بہت دنوں کی بات ہے کہ میرے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل تھا۔ میرے خون میں حرارت تھی، میری آنکھوں میں کشش تھی۔ اور میری ہستی ایک برق تھی۔ برق جو میرے خیال میں ساری دنیا کو جلا دینے کے لئے کافی تھی۔ اُسی طرح چاندنی میں بیٹھ کر میں شراب پیتا۔ تو ایک خاص لذت ایک خاص حظ، میرے دل میں اشتیاق کا ایک مجنونانہ جدید پیدا کر دیتی۔ ایک اشتیاق۔ ایک مجنونانہ اشتیاق۔ مجھے بے خود کر دیتا۔ مجھے ہر چیز حاصل تھی۔ دولت، عزت، شباب، حُسن، طاقت تمام وہ چیزیں جن کی دوسرے متنا کرتے رہ جاتے ہیں، مجھے میسر تھیں۔ میں مسرور تھا، مطمئن تھا۔ مگر میرا دل۔ میرا دل مطمئن نہ تھا۔ وہ دھڑکتا رہتا تھا۔ اُسے کسی چیز کی تسنا تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں میرے سکون و اطمینان کو ایک کاوش و اضطراب میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ بیتاب تھا۔ ہاں بے تاب اور بے قرار میرے پاس ایک چیز کی کمی تھی جس کے سامنے وہ تمام نعمتیں جو مجھے میسر تھیں

بیچ نظر آتی تھیں۔ آہ اے اجنبی مجھے محبت کی تلاش تھی۔

فطرت نے میرے پہلو میں ایک حسّاس اور درد آشناد دل بنایا تھا۔ جو ایک نغمہ کو سن کر ایک پھول کو دیکھ کر دھڑکنے لگتا۔ میرے دل کی تعمیر محبت سے ہوئی تھی اور وہ محبت کا جویا تھا۔ محبت اے حقیقی محبت آہ تجھے پانا کسی قدر دشوار ہے۔ تیرا راستہ کسی قدر گمراہ کن ہے۔ لیکن تو خود کتنی بڑی نعمت ہے۔

محبت! ایک فطری جذبہ ہے جو خدا نے ہر انسان کو ودیعت کیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ ایک کڑی ہے۔ جس میں ساری کائنات منسلک ہے۔ انسان کو دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے محبت ہی کا سبق دیا گیا۔ پہلے اُس نے ماں سے محبت کی پھر وہ جوان ہوا اور اپنی محبوبہ سے محبت کی اور پھر بڑھا ہو گیا تو اپنی اولاد سے محبت کی۔ یہ تو عام محبتیں ہیں جو ہر شخص کے لئے بنائی گئی ہیں۔ مگر حقیقی محبت کچھ اور ہی ہے۔ اے اجنبی حقیقی محبت وہ ہے جو حُسن کے ساتھ کی جاتی ہے۔ بچہ کی محبت چراغ سے یا بلبل کی محبت پھول سے، اس حقیقی محبت کی مثالیں ہیں۔ بچہ چراغ کی او کو دیکھتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ دنیا کیا ہے، وہ خود کیا ہے، اور چراغ کیا ہے۔ مگر وہ صرف چراغ میں ایک نور دیکھتا ہے۔ ایک حسین یہ نور، اسے متیاب کر دیتا ہے۔ اُس کی روح بھی نور ہوتی ہے، اور چراغ کے نور کی ہم آہنگی سے وہ متیاب ہو جاتی ہے۔ سچی محبت ہے۔ میں بھی ہی قسم کی حقیقی محبت کا خواہاں تھا۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ کتنی راتیں میں نے اس اُبھرنے والی اور کاوش میں کاٹی ہیں۔ میں محبت کرنا چاہتا تھا۔ میری رگ رگ میں محبت بسی تھی۔ مگر آہ میرا کوئی محبوب نہ تھا۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے میں محبت کر سکتا۔

اور آخر کا میں نے محبت کے لئے ایک چیز انتخاب کر لی۔ ایک حسین اور بے چین ہستی۔ یعنی

عورت

اے اجنبی عورت میں نے عورت کو اپنے دل کے معبود بنا کر بٹھایا۔ آہ حُسن حُسن کیا شے ہے۔ ایک آگ ایک شرار

میں کہہ آیا ہوں کہ جوانی کے دنوں میں میرے خرد خال کافی دلکش تھے۔ عورتیں میری طرف محبت بھری، اور مرد و حاسدانہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ مگر میں ان معمولی باتوں پر مطلق غور نہ کرتا۔ میں اپنے کو ایسا انسان سمجھتا تھا جو سوسائٹی کے بندھنوں سے آزاد ہو۔

نہیم کے یہاں جلسہ رقص تھا، اس نے مجھ کو خاص طور پر مدعو کیا۔ گانا ہوا، قہقہے لگائے گئے، شراب کی بوتلیں خالی کی گئیں۔ میں بھی کسی قدر دلچسپی، کسی قدر تعجب، اور کسی قدر تنفر کے ساتھ لوگوں کی حرکتیں دیکھتا رہا۔

نہیم نے میرا ہاتھ دبا کر کہا ”ریاض، تم بڑے احمق ہی رہے۔ ان دلچسپیوں میں حصہ لو۔ مرد خدا شاعر ہونے کا تو دعوے ہے اور موسیقی سے بالکل آستا نہیں ہوتے۔“

میں نے منس کر جواب دیا ”تاثر کا اظہار قہقہوں سے نہیں ہو سکتا۔“

مگر نہیم نے اہستہ سے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا۔ مرد خدا۔ دنیا میں صرف چند شعر لکھ لینا یا سیر ملا لینا کافی نہیں۔ ذرا سامنے دیکھو۔ عورتیں تمہاری طرف کس طرح دیکھ رہی ہیں۔ اگر تمہاری جیسے بڑی بڑی دلکش آنکھیں میری بھی ہوتیں تو پھر کیا تھا۔ افسوس ہے کہ حسن تمہارے قدموں پر گر رہا ہے اور تمہیں خبر نہیں۔“

خیر میں نے اس دن سے سوسائٹی میں دلچسپی یعنی شروع کی۔ اور آخر کار میں نے اپنے لیے ایک محبوبہ انتخاب کر لی فرض کر لو کہ اس کا نام یاسمین تھا۔ ۱۰۱ یاسمین۔ کیونکہ وہ یاسمین کی طرح نازک اور حسین تھی۔ اور اس کا اصلی نام ’افسوس‘ ہے میں نہیں بتا سکتا۔

اب میں اس کا مالک تھا۔ مجھے حسن مل گیا تھا جو فو دمیری پر تشش کر رہا تھا۔ آہ وہ عورت۔ اس کا تنہم، اس کی آنکھیں۔ اب یہ سب چیزیں یاد آتی ہیں۔ خیر تو اسے اجنبی۔ اب میرے پاس ایک عورت تھی۔ تنہم کو کبھی کسی عورت کے ساتھ محبت کا اتفاق ہوا ہے؟ حرارت کا وہ مرد میں مجسمہ اپنے اندر کس بلا کی دلکشی رکھتا ہے۔ مگر میں بیچ کہتا ہوں۔ بالکل بیچ کہ اب بھی میں مطمئن نہ تھا۔ میرے دل میں کتنا سا کھٹک رہا تھا اور برابر بڑھتا رہا۔ عورت مرد کے جذبات کی تسکین کر سکتی ہے۔ عورت زندگی کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ مگر شاعر کا دل؟ کیا شاعر کا دل بھی حرارت کے اس مرد میں مجسمہ ہے جس کی حرارت فی الاصل برودت ہے، نیکیں پاسکتا ہے؟ آہ نہیں۔ تو نہیں جانتا کہ شاعر کے دل میں کس بلا کی وسعت ہوتی ہے۔

اے اجنبی میں نے سُن پالیا تھا۔ مگر محبت نہیں پالی تھی۔ عورت میں حسن ہوتا
لیکن کامل نہیں..... میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ عورت کا حسن بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ بھول کا حسن۔
مگر اصلی حسن اور ہی چیز ہے۔ آہ میں نے سُن کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ چراغ کا حسن اُس کے خوبصورت
فانوس میں نہیں بلکہ اُس کی روشنی میں تھا ہے۔ اُس کا فانوس روشنی کو بڑھا دیتا ہے۔ مگر خود روشنی نہیں۔
بس بالکل بی حال دنیا کی تاملتہ چیزوں کا ہے۔

تو پھر سُن کیا ہے؟ ایک نامعلوم شخص نے بچہ چراغ کے نور کو دیکھا ہے۔ لیکن
نہیں جانتا کہ یہ نور کیا ہے۔ تاہم وہ اُس نور سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح ایک نور ہے جو کائنات میں
نہاں ہے۔ مگر ہم اُسے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ نور ایک راز عیاں ہے۔ جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔
میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا۔ اور صحیح نتیجہ پر پہنچا۔ اب میں اس نامعلوم نور سے محبت کرنے لگا۔
آہ..... ایسی چیز سے محبت کرنا جس سے ہم ناواقف ہوں، کس قدر لطف
رکھتا ہے۔

اور اسی نور کے راز عیاں کو معلوم کرنے میں میں نے ساری عمر گنوا دی۔ میری مگر ٹھیک
گئی۔ میرے بال سفید ہو گئے میرے چہرے پر جھڑیاں پڑ گئی۔ مگر میں مطمئن ہوں۔ کیونکہ میرا دل محبت
سے مالا مال ہے۔ میں نے محبت میں سرشار ہو کر اس راز عیاں کو معلوم کرنا چاہا۔ میرے نفس نے سُن کو
میرے شعر پڑھ کر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ مجھے کائنات کا راز معلوم ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں کائنات
کی قلم پینچ گیا ہوں۔ مگر..... اے اجنبی میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ اب تک میں اُس
نامعلوم حسن کا راز معلوم نہیں کر سکا۔ اور جس دن مجھے وہ راز معلوم ہو جائے گا مجھے دنیا میں رہنے
کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ مگر اے راز عیاں..... اے مقدس راز.....“

(۳)

شاعر خاموش ہو گیا۔

دور بہت دور تیار سے سرگوشی کر رہے تھے ”شاعر نامعلوم حسن کے راز عیاں سے خردوار
ہو چکا ہے، اسی لئے وہ اس قدر حیران اور پریشان ہے۔“
اور غالباً وہیں شاعر سے کہہ رہی تھیں ”تو منزل پر ہے۔ مگر اپنے کو منزل سے دور سمجھ رہا ہے۔“

میں نے کہا "اے شاعر۔ تو کائنات کا 'حُسنِ قدیم' کا راز داں ہے تو حُسنِ قدیم کا پیغام
سنانے والا ہے۔ اے میرے شاعر تو فطرت کی کائنات کی گہرائیوں کا راز دار ہے ایک
شاعر کے لب پر ایک دِلگداز سا تبسم نمودار ہوا جس کے بعد اُس کی روح بھی اُس اُنیاں
کو اور زیادہ اُلجھانے کے لئے 'نامعلوم حُسن' سے ہلکار ہو گئی
ستارے ایک ایک کر کے 'شاعر' کے مُردہ جسم پر روشنی ڈالتے ہوئے رخصت ہونے لگے۔

غزل

از جناب ابوالشجاع صاحب محبت

شکایت ہم کو دل سے ہر زنگوہ کوئی دہرے
گراں کچھ گاہے وہ بھی کس سے ہو مقرر سے
ارادہ ان کا جانیکا ہو شاید اب مٹ گھر سے
اکہی جلیان چکس گھٹائیں چھائیں سینہ پر سے
اگر وہ میر گھر آئیں تو صدقے جان اُن پر سے
بٹائیں گروہ گھر اپنے تو چلتا جاؤں گھر سے
کسی بے در و ظالم بیوفا کا فز کی فرقت میں
بہت لوے بہت چنچے بہت پے بہت تر سے
بتا دو نکا کہ اکدن رُحم فرما ہو گا تو مجھ پر۔
سیری فریادیں میں کی لینگی داد پتھر سے
دُم نظارہ دیکھو بھی عیاں کیا ہے یہاں کیا ہے
تہا رہے چشمِ افسوس ہمارے دیدہ تر سے
پریشاں حال دہن چاک گھرائی ہوئی صورت
ہو معلوم تم آتے ہو شاید غیر کے گھر سے
عدو سے آج ٹھیری وصل کی تم کیا چھپاتے ہو
سمجھتے ہیں سمجھنے والے دل کی بات تو رستے
تیرا گھر ہر کہ گھر میں کچھ نہیں آتا۔
ہزاروں سر لگے ہیں اُدب کا فرتے رستے

سرمقتل یہ خنجر محبت اس طرح تر دیا
نکابیں جھک کر تیرا دل کی درد انگیز نظر سے

تفتیش

اوب (ماہوار) مدیر مولوی سید اعظم حسین ضخامت (۴۴) صفحات سالانہ چند لکھو - پتہ دفتر ادب کی گنج جو راہ لکھنو۔

لکھنؤ سے یہ نیا سالہ اردو ادب کی خدمت گزاری کے شوق میں اور ظاہری و معنوی دونوں نوع کی فوجیوں سے آراستہ شائع کیا جا رہا ہے۔ آج کل عامیانہ مذاق کے رسائل کی کثرت اور ظاہری زیبائش کے پرچوں کی زیادتی نے اچھے مذاق کی نشوونما میں ایک طرح کی رکاوٹ سی پیدا کر دی ہے اور اچھے فن کے بے تمیزی میں سنجیدہ رسائل کا خاص و عام کے دلوں میں گھر کرنا اور روز بروز زیادہ مقبولیت پانا مشکل نظر آتا ہے۔ اس حوصلہ شکن صورت حال نے اردو کے نئے نئے کئی سیاری پرچوں کو بند ہونے پر مجبور کر دیا اور بہت سے پرچے کس میر سی کے عالم میں ہیں جو کبھی تو تصاویر میں رنگین پیدا کر کے اور کبھی اپنے بلند معیار سے نیچے اتر کر پبلک کو اعانت کے لئے اپیل کرتے رہتے ہیں۔ ان ناموافق سی فصا میں بلکہ لکھنؤ سے ادب کا اجرا ہوا ہے اور یہی سرت ہے کہ اردو ادب کا یہ نوموود تین ماہ سے زیادہ کا ہو گیا ہے اور اس میں توانائی اور تنومندی روز بروز زیادہ ہوتی نظر آرہی ہے اس وقت اس کے جو نمبر شائع ہو چکے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہم اس رائے کے قائم کرنے پر آمادہ ہیں کہ ادب سنجیدگی کے ساتھ ادب اور اس کے تعلقات پر اعلیٰ پایہ مضامین پیش کرے گا۔ اس کے علاوہ علم و فن کے دوسرے موضوعات پر بھی اچھے اچھے مضمون اس کی زینت ہو گئے ہیں وقت تک ادبی تنقید اور ادبی تحقیقات کے مضامین اور بالخصوص پروفیسر سعود حسن رضوی صاحب ادب کی خاموش تحقیقات کے نتائج جو اس پرچے میں شائع ہوئے ہیں اس امر کی کافی ضمانت ہو کر آئندہ اس پنج پر اس میں بہت کچھ شائع ہوگا۔ پروفیسر سعود حسن صاحب نے جو خوش قسمتی سے خطوطات کا ایک نیا کیزہ ذخیرہ بھی رکھتے ہیں، ماہ ماہ اپنے تحقیقاتی مقالات سے اس رسالے کی اعانت

خاص کا وعدہ کیا ہے۔ یہ مضامین چونکہ اُردو نئے قدیم سے متعلق ہوں گے اس لئے ”اوراق پارینہ“ کی طرف سے بالترام دیے جائیں گے۔ مدیر ادب مولوی سید اعظم حسین صاحب اپنے اچھے ذوق اور عمدہ انتخاب مضامین کے لئے نہ صرف قابل مبارک باد بلکہ ہر طرح قابل اعانت ہیں۔ بعض نمبروں میں نقصا دیے بھی گئے۔ مگر علمی اور مضامین سے متعلق۔ رسالے کی طباعت کتابت ہر طرح دیدہ زیب ہے۔

جن

(دہوار) مدیر مولوی نیاز فتح پوری۔

سالانہ چندہ عالم۔ پتہ دفتر نگار شعبہ (جن) نظیر آباد لکھنؤ۔

دفتر نگار اور خود مدیر نگار مولوی نیاز فتح پوری کے سحر طراز قلم سے یہ رسالہ جو اردو رسائل میں اپنی نوعیت کا واحد ہے، جنوری سے نکلنے لگا ہے۔ سحر طراز میر کو جن اور جنیات (یا علم اجنبی) وغیرہ سے بڑا لگاؤ نظر آتا ہے۔ وہ اکثر و بیشتر ایسے حالات و واقعات کو بنور سننے رہتے ہیں جو جنوں کے متعلق کسی بات کی طرف رہنمائی کرتے ہوں۔ اس رسالے کے اجرا سے اُن کا مقصد ایک تو جنوں کے متعلق علمی حیثیت سے مضامین شائع کرنا ہے اور دوسری طرف وہ پہلک کے جذبہ تجسس و عجوبہ پسندی کی ضیافت کے لئے جگہ جگہ سے جنوں کے متعلق شنیدہ دیدہ اور تراشیدہ غرض ہر قسم کے قصے کہانیاں اور واقعات چھاپنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ کاہرہ ازان جن اپنے قارئین سے امیدوار ہیں کہ جنوں کی نسبت جو کچھ بھی انہوں نے سنا ہو یا ان کے حافلوں کے کسی کو نہیں کوئی بات ہی اگر وہ کے متعلق ہو تو اس کو جس طرح بھی بن پڑے لکھ کر دفتر میں بھیج دیں تاکہ اس کو صاف تنگ بین رنگہ کہ جن کے اوراق پر لایا جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جن ایک مفید رسالہ ثابت ہو گا۔ موجودہ زمانے میں جب کہ روایات کا غلبہ ہماری رگوں کو اگلے زمانے والوں کی لطافتوں سے محروم کر کے روز بروز ہمیں غصتی آدمی یا کل بناٹا جارہا ہے، بعض لوگ خود ماویت کے مرکز یعنی یورپ میں ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو ایت سے متاثر اور گھٹیف شدہ دل و دماغ کو ایسے ہی واقعات و کیفیات کی بحث میں الجھا کر تفرق اور تفریح کا سامان ہم پہنچا دیتے ہیں جیسا کہ اس رسالے سے توقع کی جاتی ہے۔ سائنس اور عقل کے دور حاضر میں جب فلسفہ ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ وغیرہ کا فلسفہ ٹوٹ چکا ہے ایسے رسالے اور کتابیں جن میں مدعا نیالت وغیرہ عالمانہ مباحث کا ادعا بھی ہوتا ہے مخلص مخلص کے ہر جذبہ کی تسکین و تسلی کے لئے ضروری ہیں جس سے لوگ دنیا کی

حقیقتوں کے لحاظ سے تھکاوٹ اور بیزاری محسوس کر کے خیالات کی دنیاں چکر لگانے لگتے ہیں۔
اور ایسے سیاسی جلوؤں سے قلبی کثافت اور گرانی روح دور کرنا چاہتے ہیں۔
دیوان تاباں | مرتبہ جناب سید پادشاہ حسن صاحب۔ چھوٹی تقطیع (۹۲) صفحات۔ قیمت ۵۔
ملنے کا پتہ: محمد اعظم معین الدین سوداگر سالار جنگ بلڈنگ حیدر آباد دکن۔

بزم ادب نظام کالج کے سلسلہ مطبوعات اُردو کی یہ دوسری کڑی ہے۔ میر عبدالحی تاباں۔ دور
میر تقی کے ان چند جدیدہ شاعروں میں ہیں جن کی وجہ سے یہ دور اُردو ادب کی تاریخ میں خاص امتیاز
رکھتا ہے۔ قدرت نے انہیں بہت ہی حسین و جمیل پیدا کیا تھا۔ اور یہ اپنے عہد میں یوسف ہند
کہلاتے تھے۔ عین جوانی میں کثرتِ بادہ نوشی سے مرضِ استقامت مبتلا ہو کر دھیمی جلی کو لپیک کہا اور اس عہد کی اُردو
شاعری کی بزم کو بہت نقصان پہنچا گئے۔ تاباں، حاتم کے شاگرد تھے اور جو کچھ استاد سے حاصل کرتے
تھے اُس کو اپنی طبیعت کی برائی اور جولانی سے بہت زیادہ کارآمد بنالیتے تھے۔ اُردو کے تقریباً
ہر ایک قدیم تذکرے میں اس جواں مرگ شاعر کا ذکر ملتا ہے مگر بہت سے اسور انتشارِ بیاں کی وجہ
سے اور بعض واقعی بہم وغیرہ معلوم رہ گئے۔ سید پادشاہ حسن صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ
انہوں نے بڑی تلاش اور کوشش سے اُردو شاعری کے ایک گم شدہ ستارے سے پبلک کو روشناس کرایا
اور تاباں کی حیات پر بعیرتِ افروز طریقے سے روشنی ڈال کر تذکروں کے بہت سے ابہام رفع کر دیے۔
نیز شاعری پر بھی خاصی دلچسپ بحث کی ہے اور تاباں کے کلام کی خوبیاں اور خرابیاں بے لاگ نظر دکھائی ہیں۔
تاباں نے زیادہ عمر نہیں پائی تھی اور غالباً تیس چالیس کے درمیان سن میں ان کا انتقال ہو گیا اس لئے
قدرتِ اُن کے کلام کی مقدار زیادہ نہیں۔

اس پر بھی بعض انتخاب کرنے والوں نے اُن کے کلام کو کانٹا چھانٹ کر کے بہت کم کر دیا۔ پیش نظر نسخہ
میں جس کو بحالات موجودہ کلیات ہی کہنا چاہئے، تاباں کا جس قدر کلام بھی مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے
علاوہ تذکروں کے انتخابات سے مل سکا شریک کر لیا گیا ہے۔ دورِ میر تقی کی شاعری کے تمام محاسن بہت
جستہ تاباں کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور بالخصوص زبان کی لطافت، لوج اور دیگر خوبیوں کے لحاظ
سے اس دور کی شاعری کو جوا امتیاز حاصل ہے اس کے مد نظر دیوان تاباں متعلین ادب اُردو کے مطالعہ
کی چیز ہے۔ میر تقی نے اپنے تذکرہ نکات اشعار میں جو حقائق کا تذکرہ کیا ہے، تاباں کو مرتبہ

بتایا ہے اور دیگر تذکروں کے بیانات سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ ۱۱۶۵ء قبل انتقال کر گئے تھے۔ دیوان تاباں کی زبان بارہویں صدی کے نصف اول کا بہترین نمونہ ہے اور اردو زبان کی وقت بوقت کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے مطالعہ میں اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔

اردو میں سستے مگر ناقص ایڈیشنوں کا جو عرصہ سے رواج چلا آ رہا ہے اس نے ہمارے ادب و ادبیات ظاہری حیثیت سے نہایت کمزور اور بدنام بنا دیا ہے۔ نیز اہل کار و بار کی کم علمی اور بے پروائی سے ہمارے اکثر شاعروں کے دیوانوں کا یہی حال ہے کہ اگر ایک طرف خراب کاغذ اور بڑی تقطیع اور غلط طبع سے بدنام ہیں تو دوسری طرف بدنام اور کمزور اور اغلاط سے مملو۔ تاباں کا کوئی اچھا مہیو دیوان تو سرے سے مفقود ہے۔ دیوان کے نام سے جو انتخاب شائع ہوئے وہ بھی عام کتابوں کی طرح غلطیوں سے معمور نکلے۔ چونکہ اس نسخہ کی ترتیب میں قلمی نسخوں کا مقابلہ کر کے غلطیاں دور کر دی گئی ہیں، اور طباعت و کتابت کے بھی ظاہری اوصاف سے یہ نسخہ متصف ہے اس لئے توقع ہے کہ اردو ادب کے نفاست پسند قارئین اس کے مطالعہ سے بہر طور محفوظ ہوں گے۔

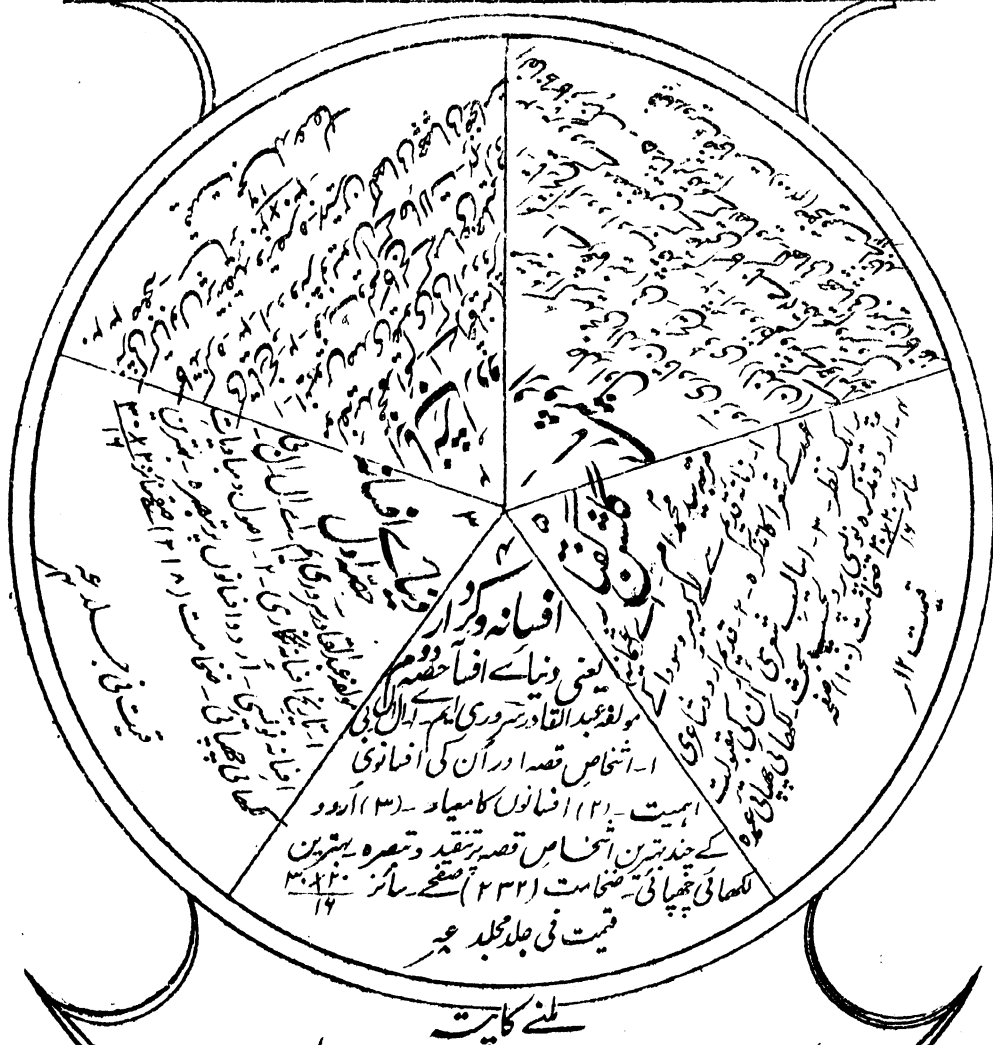
پیرودہ | از جناب محمد فضل الرحمن صاحب لکچرار سٹی کالج جھوئی تقطیع (۸۴) صفحہ قیمت عد۔
لئے کا پتہ:- مکتبہ ابراہیمیہ، اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔

یہ ایک تین ایکٹ کا ڈرامہ ہے جس کا موضوع اُس کے نام سے بالکل ظاہر ہے۔ آج کل تبدیلی حالات کے مد نظر سماجی اصلاحات کی جس قدر زیادہ ضرورت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ حیات عامہ میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے ساتھ اس کی طرف بھی گاہے ماہے ہمارے لیڈروں اور رہنماؤں کی توجہ ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اب تک سماجی اصلاح کا کام وسیع اور منظم پیمانے پر نظر نہیں آتا تھا تاہم انفرادی کوششیں اکثر موقعوں پر بڑی تندی و تیزی سے جاری ہیں اور بغفلہ مفید نتائج بھی پیدا کر رہی ہیں۔ ہندوستان میں بالعموم اور مسلمانان ہند میں بالخصوص پیرودہ کو سماجی اصلاح میں بہت بڑی رُکاوٹ سمجھا جاتا ہے اور مصلحین کی ایک جماعت کا یہ خیال کیا بلکہ یقین ہو چلا ہے کہ جب تک عورتیں پردہ نہ اٹھا دیں گی اور مرد عورتوں کو صنف نازک سمجھکر اُن کے ساتھ رعایت اور قوائے انسانی میں اپنے برابر سمجھکر نہ صرف اپنے مساوی بلکہ اپنے سے ایک حیثیت سے بالا قرار نہیں دے گئے ہندوستان ترقی و رفعت کے لیے نہایت زیادہ دیر اندہ انہی خیالات کی نشرو

اشاعت کا آلہ ہے اور چاہے دست مصنف نے تین ایکٹ میں موجودہ رواجی پردے کی جس طرح برائیاں کھول کر رکھ دی ہیں۔ علماء کا اس ڈرانے میں بڑا برا حصہ ہے اور خوب مضحک طور پر ان کو پیش کیا گیا ہے۔

تاریخ [ادبی ادب مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری کتابی تقطیع ضخامت تقریباً ایک سو صفحات۔ سالانہ چندہ مع خرچ ڈاک ۸۰۔ دفتر تاریخ کوٹلہ اکبر شاہ حیدر آباد دکن۔

مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری اردو دنیا میں تاریخی معلومات اور تحقیقاتی مضامین کے لیے خاصی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ کی اردو کے قدیم سے جو اردو کے ابتدائی دور کی ادبی تاریخ ہے، اکثر اردو داں واقف ہوں گے۔ حکیم صاحب تاریخی و اثریات سے جو شغف رکھتے ہیں، اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ آپ کی ادارت میں اس موضوع پر کوئی خاص فنی حجاب جاری ہو تو ضرور اعلیٰ پایہ ہو گا۔ چنانچہ تاریخ جس کے اس وقت تک تین نمبر نکل چکے ہیں توقع کے موافق ہے۔ اس کے اعلیٰ پایہ مضامین اور تاریخی معلومات ضرور اہل ملک میں تاریخی دلچسپی رکھنے والوں کے لئے عمدہ سامان ضیافت ہیں۔ تاریخی کتابوں پر بہ التزام طویل ریویو بھی شائع ہوتے ہیں۔ نیز دکن کی تاریخ پر بطور خاص مقالات کی اشاعت اس کا ایک قابل ستائش مقصد ہو گی۔ آباد کی تاریخ پر ابھی تک کچھ بھی کام نہیں ہوا اور ہمارا ماضی جس کی غلطت و رفعت کا سرسری سا اندازہ ملے ہوئے آثار اور دیکھتے ہوئے گہندوں اور قلعوں سے ہوتا ہے، ہمارے لئے راز سر بستہ ہی ہے اس کا اہمیت اور درس حال ہونا تو بڑی بات ہے ہم سرے سے یہ بھی نہیں جانتے کہ ہمارے حال کا دامن جس ماضی سے وابستہ ہے وہ کیا بلحاظ تمدن و تہذیب اور کیا بلحاظ شوکت و حکومت ہمارے لئے کس طرح موجب افتخار ہے۔ حکیم صاحب کی یہ کوشش قابل شکریہ ہے اور امید ہے کہ تاریخ کے متعلین اس سلسلے میں گہری دلچسپی لے کر دئے، سننے اور قلمے اس کی اعانت سے دریغ نہ کریں گے۔



منہج مکتبہ ابراہیمیہ اداو باہمی محدودائشیں و
 حدرامادکن

زندہ طلسمات

جس کو باشندگان حیدرآباد کے علاوہ منتر نکلا اور ڈاکٹروں نے صدمات نہیں دیئے۔ یہ تھا کہ سینکڑوں ٹیفٹ عطا کئے
زندہ طلسمات ملکی ہونے کے علاوہ جسٹس ڈاؤنٹنٹ شدہ ہے۔ جب ذیل امراض پر آنا فائزین طلسمی اثر دکھانا اس کا ایک اپنے
کرشمہ ہے۔ مثلاً ہیفہ۔ پلگ۔ بگڑ۔ جیش۔ متلی۔ کھانسی۔ دم۔ بواسیر۔ خارش۔ سانب۔ بچھو کے زہر اور ملہ قسم کے درد کے
اکیر کا حکم رکھتی ہے۔ آزمائے ایک بار ضرور آزمائے۔ پلگ کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے قیمت بالکل قلیل رکھی گئی ہے
شیشی نمبر (۱) نمبر ۲۲، نمبر ۲۳، نمبر ۲۴، ایک درجن کے خریدار کو خرچہ دی۔ بی معاف ہوگا۔ خط و کتابت اور تار کا پتہ۔

زندہ طلسمات حیدرآباد دکن

وہجیہ سال بام

بیرونی استعمال کی پرتاثر اور لاجواب دوا

یہ دوا بیرونی استعمال کے لئے آپ اپنی نظیر ہے جو زیادہ تر نباتات کے بہترین اجزاء سے مرکب اور بالکل بے ضرر
ہو چکی ہے جو اقسام کے اعصابی اور اندرونی درد وغیرہ کے لئے اکیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس کو سالہا سال کے تجربہ اور عورتوں
کے بعد اعلیٰ ترین طبی اصول پر تیار کیا گیا ہے اور متعدد طبی آزمائشوں کے بعد ہم کامل یقین کے ساتھ اس کو پلگ کے رو برو پیش
کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ پراثر اور کم قیمت دوا دستیاب ہونا تقریباً غیر ممکن ہے۔ کوئی گھور اور جانناں اس سے خالی نہ رہنا چاہئے
استعمال کے ساتھ ہی ایسا برتی اندر بکھلاتی ہے اور خواہ کیسا ہی شدید درد ہو چند مرتبہ کے استعمال سے باطل کا فائدہ جاتا ہے۔
علیٰ الخصوص نفرس وجع مفاصل۔ درد و سر۔ درد و سہل۔ بچھو کے زہر کے لئے۔ زخم کے لئے اور طبعی ہوئے جسم کے لئے وغیرہ وغیرہ۔
ترکیب استعمال تھوڑی دوا لیکروں میں تین چار وقت مقام ماف پر لیں اور اگر آواز نہ ہو تو اس کے استعمال سے پہلے گرم پانی میں
کچل کر اچھو کر اچھی طرح ادھوا لیں اور صاف کریں جو اصحاب بغرض امتحان طلبہ ایس۔ بی۔ بی۔ کی جائے گی۔
نوٹ ہمارے دوا خانے میں ہر قسم کے تازہ ادا دیات کا ذخیرہ ہر وقت تیار رہتا ہے اور جو کتابت احتیاط کے ساتھ تیار کئے جاتے ہیں

جیمس سینڈپنی سٹینٹ سٹیشن بروڈ وئیر محلہ مالگری حیدرآباد دکن

ہندستان کی طباعت میں عظیم الشان انقلاب اور لوگوں کی مرفحہ چہختالی (یعنی) دیوان غالب مصور

جس کی پہلی اشاعت کے ۲۱۰ نسخے بحباب فی نسخہ مع اسٹالہ کلدار فرست ہو چکے
یہ شاندار مرفحہ اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ اعلیٰ حضرت حضور نظام غلام اللہ علیہ السلام کے نام میں اسم گرامی سرباجا از منسوب
مختصر تفصیل

تعارف غلام ازاد اکرم محمد اقبال
(۱) مکمل متن دیوان غالب نہایت عمدہ طریق سے۔ (۲) مقدمہ سخنہائے لفظی (از مصور چہختالی) (۳) انتخاب کلام
(۲۱) تصاویر جو چار رنگوں میں مذربو بلاک پیریکہ ایک ہر فن کارخانہ سے تیار کرائی گئی ہیں۔
(۲) تصاویر حضرت چہختالی کی بہترین مناسی کا اعلیٰ ترین ڈاؤٹ لائن بلاک ڈیو تیار کرائی گئی ہیں
(۲) تصاویر جناب چہختالی کے پیشانی خاکوں سے بنوائی گئی ہیں۔
(۹) تصاویر عام رنگوں اور بانی ہلے رنگوں میں تیار ہوئی ہیں۔

کتاب کی جلد فنی مراکو کے چمڑے سے تیار کرائی گئی ہے جس پر طلائی نیل بوئے اور کتاب کا نام کندہ ہو چکا اور غلام ازاد کا پتہ لکھا ہے
قیمت ان تمام فریموں کے باوجود صرف نصف سے کم عثمانیہ دکھی گئی ہے۔

مکتبہ ابراہیمیلہ ملا دباہی (محدود) اشین روڈ حیدر آباد دکن
نوٹ:- مکتبہ کے شوکیں میں کتاب کا ہر وقت ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے

نیزنگ راپور سے دہلی کو منتقل کر دیا گیا
اس عظیم انقلاب کے ماتحت جنوری ۱۹۲۲ء کا تمام پروگرام تبدیل ہو گیا۔ اس لئے

امیر نمبر

جس کے جنوری ۱۹۲۳ء میں شائع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اب ایک ماہ کی تاخیر سے آخر ماہ فروری ۱۹۲۳ء میں شائع ہوگا اور امیر نمبر کی بجائے

دہلی نمبر

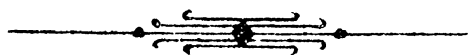
جنوری ۱۹۲۳ء میں شائع ہوگا۔ یہ نیزنگ کے انقلابی پروگرام کی یادگار ہوگا اور
ہر حیثیت سے قابل تدارک کامیاب ہوگا
آئندہ جملہ مراسلت اور ترسیل زر حضرت عشرت رحانی مدیر نیزنگ اور السلطنت دہلی
کے نام ہونی چاہئے

۱۹۲۳ء سے رسالہ کے لئے جس قدر آرڈر موصول ہوئے ہیں اُن
کی تکمیل دہلی سے ہوگی۔ نیزنگ کے قدیمی معاون اور قدرداں حضرات
سے اُمید ہے کہ وہ نیزنگ کی بدستور معاونت فرمائیں گے اور یہ کما حقہ ضرورت
مجھے اپنے گرامی ناموں سے یاد فرماتے رہیں گے

معزز معاصرین اپنے رسائل اور اخبارات بدستور راپور کے پتہ پر
ارسال فرماتے رہیں نیزنگ دہلی سے اُن کی خدمت میں پہنچتا رہے گا

محمد عزیز اللہ خان مدیر نیزنگ

مجلہ مکتبہ خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ ایساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور دوسری کتابیں کمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے ان کے نام سالہ سال بھر کے لئے بل قیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یا پچیس روپے کی درستی دیگر کتابیں بدفعات یا کمشت نقد خرید کر لیں گے ان کی خدمت میں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجا مکتبہ بل قیمت حاضر ہوگا۔ کمشت خریدنے والے حضرات کے نام سالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے ان کو ایک سیدھی بجائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہیے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب احوال رقم سینہ کی تکمیل ہو جائے وہ رسید میں منظم محلہ مکتبہ کے پس بھیج دیں رسالہ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اشیاء مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبوعہ: مکتبہ ابراہیمیہ ٹرین روڈ حیدرآباد دکن

دارالاشاعت بیتہ برہمیداد و باہمی محدود آباد کن

کا

عبد محمد
ماہوار علمی ادبی

مکمل

ملک

عبد القادر سروری ام آں

شکرا

عمریسی

سید محمد امجد

مجلہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود کا ماہوار رسالہ ہے۔

یہ علمی و ادبی رسالہ جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین درج ہونگے حجم کم سے کم چار جز ہوگا۔

منظر اختیار پرچہ بذریعہ ٹریفک آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول

نہو تو فصلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (سو) مع محصول ڈاک پکی چھ ماہ کے لئے (پچاس) فی پرچہ ۶۔

اشتہارات کا نرخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (۵۰) نصف کیلئے (۲۵)۔

اور چوتھائی کے لئے ۱۵ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲٪

۵ فیصد کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خطوط بابت منظم محلہ مکتبہ۔ مکتبہ ابراہیمیہ

امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے کیجئے۔

مجلہ مکتبہ

بابتہ ماہ فروردی ۱۳۳۹ شمسی فروری ۱۹۶۳ء

”ایک راگنی“

تصویر :-

فہرست مضامین

جلد (۲)

شمارہ (۵)

۲

از مدیر

شذرات

۵

از جناب ابوالحاجہ محمد ثبات علی صاحب قریشی

شاعری اور ترجمانی حیات

۱۰

توفیق الرحمن صاحب توفیق بی۔ اے

غزل

۱۱

مسعود الرحمن خاں صاحب ندوی

محبت کی فتح (افانہ)

۱۴

مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے

خود اعانتی (مسل)

۲۹

عمر یافعی

مصحفی کا تذکرہ ہندی

۳۵

از جناب محمد حمید الد صاحب بی۔ اے

قلم کی سرگزشت

۵۲

شبیر حسن صاحب قلیس

ایشیا ر محبت

۵۹

از قاسمی صاحب حیدر آبادی

محرم سے بدتر عید

۶۰

ابوالفضل صاحب رازچاند پوری

مشاہدات (رباعیات)

۶۱

”س‘م“

تفتیدیں

شذرات

مجھ روز پہلے سٹرابالڈ دن نے اپنے ایک خطبہ میں عوام کی معلومات سائنس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ عوام سائنس کے حقائق سے اس قدر بے بہرہ ہیں کہ جو نظریے سائنس داں کے پاس فرسودہ ہو جاتے ہیں وہ ان کی معلومات کا سراپہ بنے رہتے ہیں حالانکہ سائنس کی تحقیقات کے لیے کوئی نقطہ انتہا نہیں ہے انھیں خیالات کو اپنا موضوع بناتے ہوئے جان نیکلن نے سائنس کی تعلیم اور اس کے مقصد پر بحث کی ہے حقیقت یہ ہے کہ خود سائنس داں اپنی تحقیقات سے عوام کو مانوس رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں رکھتے۔ اکثر صرف اسی کو بغفل سمجھتے ہیں کہ وہ مدرسوں سے ایسے سائنس داں پیدا کر رہے ہیں جن پر بند کی مہریں ثبت ہیں۔ یہی بات کہ عوام کو سائنس سے کہاں تک تعلق ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے اس کی ضرورت نہیں ان میں سائنس کی ٹھوس معلومات بھری جائیں، بلکہ یہ کافی ہے کہ ان کی نظر سائنس تک ہو جائے اور وہ چیزوں کا مطالعہ اور مشاہدہ سائنس تک نقطہ نظر سے کرتے لگیں۔

جامعات کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ اس کا جواب سر سئی وی واسن نے اپنے ایک مضمون میں یہ دیا ہے کہ جامعات قومی ترقی اور استفادہ کا بہترین مرکز بن سکتی ہیں اگر ان کی توجہ اصلی داغی مشاغل کی طرف منحرف ہو جائے انہیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا جامعات کے سامنے سے ہٹا جا رہا ہے اور اس کی جگہ صرف خشک تعلیم اور امتحانات کی باضابطگی لیتی جا رہی ہے جامعہ میں معلم اور معلم دونوں کی مخصوص اور غیر معمولی قابلیتوں کے بروئے کار لانے کی غرض سے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی جانی چاہئے۔ یہی جامعہ کا مطمح نظر ہے جس کی طرف عموماً ہندی جامعات کی رفتار نہایت سست معلوم ہوتی ہے۔ سرو واسن کے خیال میں معلم اور معلم کی مخصوص پوشیدہ غیر معمولی قوتیں اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتیں جب تک جامعات میں اعلیٰ تحقیقات اور ریسرچ کی فضا نہ پیدا ہو جائے اس موازنہ سے جب ہم ہندوستان کی جامعات پر نظر ڈالتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے تقریباً سب میں ریسرچ اعلیٰ علمی تحقیقات پانچ کے اوپر تک گناہوں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ جدھر دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ جامعہ کارجان ایک کارخانہ بننے کی طرف جس سے صد ہا ادھورے ندیا فٹہ منشی بن کر نکلتے جا رہے ہیں اس سے خلیفہ یا فتوں کی توہین ہمارا مقصد نہیں کیونکہ ملک کو ان کی جیسی کچھ ضرورت ہے ظاہر ہے لیکن انھیں میں سے چند ایسے بھی پیدا ہوں جو علمی تحقیقات میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ کرنے کی غرت حامل ہو۔ اس مقصد کو ہندی

جامعات جس قدر پھیلاتی جا رہی ہیں اسی قدر تمدنی اور علمی حیثیتوں سے وہ مغربی اقوام کی کورانہ تقلد بلکہ مجہول عادمِ منتہی جا رہی ہیں۔

یورپ کے ”خصوصی ماہرین“ بھی عجیب بلائے ناگہانی ہوتے ہیں ان میں سے بعض تو بلاشبہ اپنے مینہ موضوع پر بڑی حد تک وسیع نظر رکھتے ہیں لیکن انہیں کے ہمارے بہت سے خود ساختہ خصوصی ماہرین بھی پاؤں پھیلائے لگے ہیں اسلامی ممالک میں آج کل جو بے چینی کش کش حیات کی پیدا ہو گئی ہے اس کو دینِ عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہی ہے لیکن سب سے زیادہ عجیب نقطہ نظر شاید ان ماہرین خصوصی کا ہے جن کے متعلق بعض ارباب صحافت کا خیال ہے کہ وہ اس اسلامی ہیجان کے بڑے تقاد اور شاہد ہیں اسی طرح کے ایک ماہر خصوصی سٹر لطفی لیونین نے ”انٹرنیشنل ریویو آف مشن“ میں ایک مضمون ”اسلام سے بناوٹ“ کے عنوان لکھا ہے جس کے معنی خود اسلامی اصطلاح میں ”ارتداد“ کے ہوں گے۔ ان بزرگ کی نظر غایت اپنے اثر تمجنوں کی طرح ”آزاد ترک“ پر بڑی طرح جی ہوئی ہے، آزاد ترک کی روایتی تلوار ان کے دل پر آئے کا کام کر رہی ہے وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانانِ عالم خصوصاً ترکوں میں تمام اسلامی عقاید سے باغیانہ خیالات پیدا ہو گئے ہیں۔ تاریخ اسلام میں مذہب اسلام اور حضرت محمد کے ارشادات پر کبھی ایسی تنقیدیں نہیں ہوئیں جیسی گذشتہ دس سال سے ترکی میں ہونے لگی ہیں۔ اس کے بعد وہ ترکی تمدنی معاشرتی اور قومی زندگی میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کا ایک خاکہ کھینچ کر اپنے طور پر یہ ثابت کر لیتے ہیں کہ یہ سب کچھ اسلام سے بناوٹ کے طور پر ہو رہا ہے۔

ان بزرگ کے مطلب واپس کو اگر ہم صحیح مان لیتے ہیں تو پھر خود اپنے آپ پر اعتماد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ہم اب تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ ترک ہوں یا افغانی و ایرانی، مصری ہوں یا عرب اور ہندی و چینی سب کے دل میں عقیدتی احساس مذہب کی جگہ، اصلی اور مادہ دینِ فطرت کی طرف واپس ہونے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔ عقیدوں سے قطع نظر تمدن و معاشرت میں بھی وہ ایک سیاری اور بین القومی نقطہ پر آنا چاہتے ہیں۔ یہ قومی تحریک کا سوال ہے۔ جس کا نتیجہ اس قدر پیش پا افتادہ نہیں ہے جیسے ہمارے خصوصی ماہر سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں اب رہا تبصرہ کا حق وہ ہر ایک کو حاصل ہے۔

یہ خبر ہندوستان کے علمی حلقوں میں مسرت کے ساتھ سنی جاے گی کہ پروفیسر بنولے کمار سنگھار پروفیسر معانیات کلکتہ یونیورسٹی کو ادارہ ہند کی تحریک پر بھیرائی وزارت تعلیمات نے میونخ کے کنسل اسکول میں بوڑ



ہندوستانی سائل پر لکھ دینے کے لیے ایک سال کے واسطے مقرر کیا ہے۔ اس تقرر کا مقصد ظاہر ہے جرمنی میں کئی سال ہندوستانی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کی متواتر سعی کی جا رہی ہے جس کے لیے سربراہ اور دہ مہندی ملک کو وظیفے بھی عطا ہوتے رہے ہیں۔

کچھ سال ہوئے کہ بلدہ حیدر آباد دکن کے ایک روشن خیال مولوی عبد المجید صاحب نے ”صفۃ الاسلام“ کے نام سے ایک اصلاحی اور تبلیغی انجمن مسلمان آوارہ گرد لڑکوں کے لیے قائم کی تھی جس میں ایک کافی تعداد مسلمان بچوں کی نہ صرف پرورش پاتی رہی بلکہ علم اور صنعت کاری سے بھی بہرہ اندوز ہوتی رہی۔ مولوی عبد المجید صاحب کی سعی اور ان کے شریک کار مولوی میر تقی علی صاحب کی امانت سے عرصہ تک انجمن کا کام خوب ترقی پذیر رہا۔ صفۃ الاسلام کے عروج و کمال کے زمانے میں ان دونوں بزرگوں نے اس کو مرکزی انجمن بنا کر اس کی ذیلی انجمنیں، ”انصار الصغہ“ کے نام سے اکثر محلوں میں قائم کیں جن کا مقصد آوارہ گرد بچوں کی تعلیم اور اصلاح معاشرت تھی۔ گلبرگہ، مغلیہ پورہ، سلطان شاہی، سلطان پورہ میں انصار الصغہ کی انجمنیں قائم تھیں جہاں تک ہمیں علم ہے ان میں سے اکثر انجمنیں ناواقف کارار اکین کی نفاذیت کی بدولت یا شخصی دلچسپی پر انحصار کی وجہ سے اب صرف قسم کھانے کو باقی رہ گئی ہیں۔ سلطان شاہی کی انجمن جوابدہ سمکٹ ہی تھی۔ اسکے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اس کے حدید متہد مولوی میر مظہر علی صاحب وکیل بایکورٹ نے اس کے اجاز کا ذمہ لیا ہے باقی انجمنوں میں گلبرگہ کی انجمن بذات خود ایک مرکز بنی ہوئی شاندار پیمانے پر کام کر رہی ہے۔ سلطان پورہ کی انجمن غالباً سلطان شاہی کی انجمن سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ مغلیہ پورہ کی انجمن کے متدیر متہد علی صاحب کی ہمت پر صدر آرا آفریں ہے کہ موصوف کی مستعدی وہ اب تک برابر کام کیے جا رہی ہے اور ترقی بھی کر رہی ہے انجمن نے اپنا ایک کتب خانہ بھی قائم کیا ہے اس کا کام بھی اطمینان بخش طریقہ پر جاری ہے لیکن جب تک اسکی زندگی میں نئے نئے معاونین کے ہاتھ دلچسپی کے ساتھ نہ بڑھتے رہیں اس کے ابھرنے کی امید نہیں۔ اسی خیال کو مد نظر رکھ کر کتب خانے کے مہتمم جناب محمد محمود علی صاحب نے امداد کیلئے اپیل شائع کی ملکوں کے ارتقا میں اشاعت علم کی بنیادی ضرورت پر کچھ لکھنا تفصیل حاصل ہو تاہم ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہو کہ بڑودہ دیہی ریاستوں میں ایک بہت ہی اچھوتی ریاست ہے لیکن وہاں اشاعت علم کے لیے جس قدر نظام مرتب اور مروج ہے اس کو کتب خانوں ہی کو بڑا دخل ہے بڑودہ لائبریری تحریکات خود برطانوی ہند سے بھی پیش پیش ہیں۔ حتیٰ کہ ویرلے بیارد اپنے گذشتہ دو مہینے ریاست کی طرف سے دعوت کے موقع پر ہمارا جہ صاحب کا جام صحت بخور کر رہے ہوئے بڑودہ کی چھوٹی سی ریاست کی وہ تعریف کی کہ یاد ہی رہے گی۔ ہماری اس وسیع مملکت کے مستطیع باشندوں سے توقع ہے کہ وہ مہتمم صاحب کی اپیل پر اجاڑ کتبوں فرخیز یا تم سے غرض جس طرح ممکن ہو کتب خانہ کی مدد فرمائیں گے کیونکہ یہ بلدہ کے حاجی کتب خانوں میں ہے جو عوام کی توجہ کی امید میں کام کر رہا ہے اور اس طرح کہ دوسرے نام نہاد کتب خانوں کی طرح نہیں۔

شاعری و ترجمانی حیات

از جناب ابو محمد بنشارت علی صاحب فرشتی (کلیہ جامعہ عثمانیہ)

میتھو آرنالڈ کی تعریف کے مطابق شعر انسانی زندگی کی ایک تفسیر ہے۔ فطرت انسانی کی تحلیل امور ممکنہ سے نہیں اس لئے شاعری کی جامع اور مانع تعریف ممکن نہیں۔ تعریف اگر ٹھیک ٹھیک ہو جائے تو اس کے صریح معنی یہ ہیں کہ اس میں تحلیل و تقسیم کا امکان موجود ہے۔ انسان کے خیالات کے اظہار کے لئے کتم عدم سے بہت سے فنون و جز ہیں آئے جیسے رنگ روپ کے اظہار کے لئے مصوری اور نقاشی آواز اور زبان کی ترجمانی کے لئے موسیقی اور شاعری۔ چونکہ شاعری زیادہ احساسی ذہنی اور روحانی ہے اس وجہ سے قدرت کی طرف سے اس میں یہ مادہ رکھا گیا ہے کہ وہ قلب انسانی کے لئے باعث مسرت اور تسکین دہ ہو اس لئے اس کی عمارت کی بنیاد ایسی مستحکم اور مضبوط ہونی چاہیے کہ اس میں تیز لزل کا احتمال نہ ہو۔

فطری شاعر سے صحیح معنوں میں وہ مبارک ہستی مخاطب ہو سکتی ہے جس میں مجاز اور حقیقت کے درک و ادراک کا مادہ ہو ایسے شاعر کا کلام جاہلیت سے ملو ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے مشاہدات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے تو وہی سما ہماری آنکھوں میں بندھ جاتا ہے اور ہمارے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں۔ شاعری کا مقصد صرف یہی نہیں کہ انسان میں طمانیت قلب کی جھلک پیدا کرے یا یہ کہ جذبات میں پاکیزگی اور حیات تازہ پیدا کرے یا روح کو جلد اور صیقل بخشنے۔ بلکہ شاعر قدرتا عام انسانی ہستیوں سے زیادہ قوت تمیز و امتیاز اور احساس رکھتا ہے اور اس کے تجارب عام انسانی دنیا سے زیادہ گہرے اور وسیع ہوتے ہیں۔ اگر بہ امعان نظر سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اسرار حیات کی ترجمانی کا نام شاعری ہے۔ اس لئے شاعری کا تمام میٹرل زندگی اور زندگی کے متعلقات میں یہ کوئی ڈھکوسلا یا خیالی بات نہیں بلکہ دنیا کے نامور شعرا اور نقاد اس کو ماننے آئے ہیں چنانچہ مولانا حالی لکھتے ہیں۔

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہے ہرگز یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لاسکے۔ اس کی بڑی دوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دیکر اس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس

جس طرح سمار عمارت تیار کرنے میں اینٹ مٹی اور چوڑے کا یا بڑھئی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے اسی طرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترتیب دینے میں کسی ایسے مصالح کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفسِ ہلاک میں وجود ہو۔ وہ مصالح کیا ہے یہی دنیا کے حالات جو روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں خواہ وہ انسان سے علاوہ رکھتے ہوں یا زمین آسمان چاند سورج پہاڑ اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے یا پھر لکڑی اور جھینگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا اور شعر کی بنیاد محض فرض اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی اس کی مثال اُس عمارت کی سی ہوگی جو عمارت بنانے کے لئے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مصالح کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی۔ لے

۱۔ مقدمہ شعر و شاعری میں شرائط شاعری کی سلسلے میں یوں رقم طراز ہیں : —
اگرچہ قوتِ تخیل اس حالت میں ہی جب کہ شاعر کے معلومات کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہو۔ ایسی معمولی ذخیروں سے کچھ نہ کچھ نتائج نکال سکتی ہے لیکن شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ضرور ہے کہ نسخہ کائنات اور اس میں سے خاص کر نسخہ فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ انسان کی مختلف حالتیں جو زندگی میں اس کو پیش آتی ہیں ان کو تعمق کی نگاہ سے دیکھنا جو امور مشاہدہ میں آئیں اُن کے ترتیب دینے کی عمارتِ ذالنی کا کائنات میں گہری نظر سے وہ خواص اور کیفیات مشاہدہ کرنے جو عام آنکھوں سے مخفی ہوں اور فکر میں مشق و مہارت سے یہ طاقت پیدا کرنی کہ وہ مختلف چیزوں سے متحد اور متبی چیزوں سے مختلف خاصیتیں فوراً اخذ کر سکے اور اس سرمایہ کو اپنی یاد کے خزانے میں محفوظ رکھے۔

مولانا شبلی بھی حالی کے ہم خیال ہیں۔ چنانچہ شعر کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں : —
شاعری قوتِ تخیل کا انکشاف ہے۔ دراصل یہ وہ فن ہے کہ جس کے ذریعے سے لفظوں کا استعمال کر کے پردہ تصویر پر خیالی نقش و نگار ثبت کئے جاتے ہیں جو کام مصور رنگوں کے استعمال سے لیتا ہے وہی کام شاعر الفاظ کے ذریعے سے نکالتا ہے۔ شاعری جذبات اور خیالات کی بولتی ہوئی تصویر اور حسن و حقیقت کی تشریح سے یہ انسانی قلب کے کیفیات کو سرسری ملی زبان کے ذریعہ معترض بیان میں ملتی ہے۔ لے

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری بھی شاعری کی جو تعریف کرتے ہیں وہ قابل غور ہے : —
 شاعری کو اکثر شاعر نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز جذبہ اور وجدان ذہن اور تخیل کے
 لحاظ سے تقسیم کیا ہے مگر یہ تقسیم خود انکی ناریسی کی دلیل ہے۔ شاعری انکشاف حیات ہے جس
 طرح زندگی اپنی نمودیں محدود نہیں شاعری بھی اپنے اظہار میں لائقین ہے۔ کونسا نغمہ ہے جو
 اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔ جمال اتنی ہر شے میں رونما ہے آفرینش
 کی قدرت جو صفات باری میں سے ہے شاعر کو بھی ارزائی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کا خانہ ایزدی
 میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔ ۱۷

روحی فداہ آقائے نامدار سرکار دو عالم صلعم غفرہ اور ام القیس پر ناقدانہ روشنی ڈالکر ان کی شاعری کی جو حمد و ثناء فرمائی ہے
 اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اشعار کائنات انسان اور انسانی تعلقات سے مملو ہیں۔ ان سے سیاسی ماحول،
 رسم و رواج، مسرت و غم، عوام کی طرز معاشرت، ترقی و تادمی کی نفسیاتی کیفیات، شجاعت، بہادری، جان بازی، ابتلا،
 اضحیٰ، محرم، عشق و محبت کے جذبات غرض یہ کہ فطرت انسانی اور کائنات کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ انہوں نے
 قدرت کے ناز و مال و دولتوں میں سے زندگی اور قوت جس کے وہ خود حصہ دار ہیں تمام انسانی ہستیوں کو جو انکی دنیا نے
 علیین میں سیر کرنا چاہتے ہیں حصہ دار بنایا ہے۔ بہر حال شاعری دراصل تخیل و احساسات کی وساطت سے زندگی
 کی ترجمانی کا نام ہے۔ علی گڑھ میگزین کے قابل مدیر کا یہ کہنا بالکل سچا ہے : —

علم ادب بالخصوص شاعری کا سب سے بڑا فرض عوام کے ضمیر میں اس نئی دنیا کا مفہوم اور اہمیت
 واضح اور روشن کرنا ہے جو بقول علامہ موصوف ”فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور

اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کرائی ہے“ ۱۸

مولوی ظفر علی خاں نے جنگ طرابلس کے سلسلے میں اقبال کے شعلہ جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس میں وہ شاعری
 کی کامیابی کا انحصار اسی پر بنتا ہے کہ وہ زندگی کی ترجمان ہونے کے علاوہ اقتضائے وقت اور زمانہ کے وافی
 ہو۔ ”گروہ علما و شعرا میں وہی لوگ کامیاب ہو سکے جو اپنے اقوال کے ذریعہ سے اہل زمانہ کے خیالات و جذبات
 کی ترجمانی کا حق ادا کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں“

۱۷ رسالہ تحفہ حیدرآباد بابۃ شعبان المعظم ۱۳۳۲ھ

۱۸ وہ وقتہ ماخوذ از دیباچہ کلیات اقبال مرتبہ عبدالرزاق صاحب مددگار صدر محاسب۔

آگے چل کر وہ شاعری کی کامیابی اور بقائے دوام کے لئے پھر اس امر پر زور دیتے ہیں کہ زمانہ کی رفتار پر نظر رکھی جائے اور اس کے مطابق شاعر اپنے تئیں فکر کو گرم جولاں کرے۔

اس بنیادی اصول کو مد نظر رکھ کر جن شعرا نے شاعری کے کوچے میں قدم رکھا ہے اور زندگی کو بخوبی سمجھنے اور اس کی صحیح ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے وہی دنیا میں با عظمت شاعر کہلاتے رہے ہیں۔

اوپر ہم نے دو جگہ مولانا حالی کی کتاب سے اقتباسات پیش کئے ہیں۔ موضوع کی اہمیت کی بناء پر مزید توضیح کے لئے ہم یہاں دو اور مختصر سے اقتباس پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے اس نظریہ کی اہمیت زیادہ ملل ہو جائیگی۔

”اس میں فطرت انسانی کے دفاقی و غوامض سمجھنے کا ایک خدا داد ملکہ ہوتا ہے اس سے آگے بڑھ کر

اس کی مزید توضیح یوں کرتے ہیں۔ ”اس کا اصلی مقصد فطرت انسانی کی کرید اور واقعات دہر سے متاثر ہو کر دل کی بھر اس نکالنی ہے“ لے

لے جارح مور جو ارش ادبیات کا بڑا حامی گزرا ہے شاعری کی دو قسمیں قرار دیتا ہے۔ ایک وہ شاعری جس میں شاعر صرف اپنے جذبات احساسات اور واردات قلبی کا اظہار کرتا ہے۔

دوسری وہ شاعری جس میں شاعر اپنی قوت تخیل سے واقعات و اشیا کی اصل حقیقت و ماہیت کو زیادہ واضح کر دیتا ہے۔

اول الذکر شاعری ہر زمانہ اور ہر ملک میں کیساں تاثیر رکھتی ہے مگر باوجود تاثیر کے اپنی قلبی واردات و کیفیات کی وجہ سے ایسی شاعری سچی شاعری کہلانے کی مستحق نہیں کیونکہ یہ واردات قلبی عارضی وجود رکھتے ہیں اور ان کی بساط فتنش آب سے زیادہ نہیں۔ اس لئے ایسی شاعری کو بقا اور عظمت حاصل نہیں ہو سکتی۔ سچا تذکر میں تغیرات اور انقلابات ممکنات سے ہے مگر اشیا اور واقعات کے استقلال کی بنا پر یہ شاعری ابدی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ خیالات کے مد و جز کے تحت اس میں بھی گٹھاؤں بڑھاؤ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی خاص ملک یا خاص زمانے میں موثر سمجھی جائے مگر اشیا اور واقعات تعین کی بنا پر شاعری بھی ابدی ہوگی اسی کو ڈاکٹر عبد الطیف یوں ادا کرتے ہیں :-

شاعر طرح طرح کے تجربات محسوس کرتا ہے اور ان میں کا ہر تجربہ اس کے ذہن کے ایک پہلو کا

لے دیا چودھوان حال۔

۱۹۲۸ء بابت جنوری ۱۹۲۸ء

۱۹۲۸ء ملاحظہ ہو۔۔۔ QHALI BAY-SAMATEF P. H. D. اور مجلہ عثمانیہ بابت بہمن واردی ہیئت ۱۳۴۸ء۔

جلد دوم، شمارہ ۵۵

مجموعہ

آئینہ بردار ہو۔ اس پہلو کی ترجمان بجائے خود موثر ہو سکتی ہے اور بڑا شاعرانہ تجربہ بڑھتے ہوئے احساس ہم آہنگی سے گیل مل کر اعلیٰ شعر کی صورت میں ٹپک پڑتا ہے۔

متذکرہ مثال اور اقتباسات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ شاعری کا براہ راست تعلق زندگی سے ہے، گویا اُس کی صاف توضیح یہ ہے کہ شاعری کی بنیاد زندگی ہے، شاعری کی تخلیق زندگی سے ہے۔

شاعری کا ارتقا اور عظمت زندگی پر اسی لئے اسرار حیات اور دقائق جو عام طور پر لاپرواہ سمجھے جاتے ہیں۔ شاعران کے حجاب، ہر سببہ روز کو روزگار نوامیس فطرت و حیات کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ بہر حال شاعری کسی طور پر بھی زندگی سے بغاوت نہیں کر سکتی اگر وہ انحراف اور بغاوت کرے تو گویا قضا و قدر سے انحراف اور بغاوت ہے جیسے سفر میں منزل مقصود کا حصول مقصد اعظم ہوتا ہے۔ شاعری کا مقصد اعظم یا منزل مقصود زندگی ہے۔

شاعری اور زندگی کا قدیم سے چولی دامن کا ساتھ ہے ”قوتوں کے چین میں اگر ہم کوئی ادب پاتے ہیں تو وہ ہمیں شاعری ہے جب فن کتابتِ بطن عدم میں تھا اور صرف حافظہ ہی انسان کے لئے ایک کتب خانہ کی حیثیت رکھتا تھا اس وقت بھی شاعری بڑھ کر تھی اور لوگ سینہ بہ سینہ اشعار یاد رکھتے چلے آتے تھے بلکہ شاعری کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے اسے اپنے رسم و روایات اور فضل و ہنر کے سانچوں میں ڈھال لیا۔ اسی جگہ سے یہ خیال چلا ہے کہ شاعری ایک الہامی چیز ہے اور خدا کی ہدایات کا مظہر ہے“ ۱

انہیں اسباب و علل کی بنا پر شاعر اور شاعری ہمارے اعتماد اور یقین کے مستحق ہیں اور شاعری سے متمتع ہونا عقل و فراست کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ وہ ہماری زندگی ہے اور ایسی زندگی جس کو روحانی زندگی کے نام سے مخاطب کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اعلیٰ ترین رجحانات، ارفع عقائد، پیاری امیدوں، شدید غموں اور مقدس تصورات اسرار حیات اور نکات زندگی کی عقدہ کشا ہے اور یہی ذوق صحیح قاری کے دل و دماغ کو لطیف تحریکات سے ملو کر دیا ۲

اگر الفاظ کے ذریعہ فطرت کے اسرار روز و روشن میں لائے جاتے ہوں، روح کی تکلیف دور کیجاتی ہو، پوشیدہ مائل فنا ہو جاتا ہو، ہمدردی کا جذبہ بخشش میں لایا جاتا ہو، نصیحت کے گھونٹ پلائے جاتے ہوں، تجربہ کی تاریخ لکھی جاتی ہو۔ ماضی و حال اور مشرق و مغرب ایک رشتہ میں منسلک کئے جاتے ہوں

۱۔ مجلہ عثمانیہ جلد اول شمارہ چہارم، ص ۲۲ ضلی مضمون شاعری اور حیات انسانی۔

۲۔ محمد امیر صاحب اورنگ آبادی بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔

تو پھر واقعی شاعری قوموں کی زندگی کا ست ہے ۔

شاعری حرکت میں لانے والی قوتوں اور انٹ یا دوں کا خزانہ ہے اور ان انمول خوشوں کا دلاویز ذخیرہ ہے جو دنیا کے بازاروں میں کبھی کبھے نہ آئی ہوں شاعری اُن لوگوں کے لئے جو نہایت ہی قید اور تکلیف میں ہیں آزادی کا فزہ اور زندگی کا سانس ہے شاعری غیر فانی ہے اور حادثات سے آزاد“ لے

غزل

(از جناب توفیق الحسن صاحب توفیق ۔ بی ۔ اے ۔ علیگ)

گو اراشوق سے ہر ظلم بہر بیداد کر لینا	دل رنجور پاس خاطر صیاد کر لینا
جھائیں ہم چٹنی چاہنا صیاد کر لینا	مگر پہلے خیال خاطرنا شاد کر لینا
یہ بولی گردشِ قسمتِ نفس میں دل جو گھبرائے	کبھی نالہ کبھی شبیوں کبھی فریاد کر لینا
نفس میں بھی نظر آجائینگے جلوئے گلستانے	نظر کو قید محسوسات سے آزاد کر لینا
بہار آئے اگر اے ہمہ صغیر و صحن گلشن میں	ایسرانِ نفس کی بے بسی بھی یاد کر لینا
نفس سے چھوٹ کر آئے نہ آئے کیا گلچیں	تو اب صحنِ گلستانِ شوق سے آباد کر لینا
چمن دلا کر میری مصیبت یاد آجائے	تو اک دینِ شکوہ ہمیری صیاد کر لینا

نشاط و عیشِ عالم سے اگر فرصت ملے محکو
تو ذکرِ خیر سے توفیق کو بھی یاد کر لینا

محبت کی فتح

(از جناب سعید الرحمن صاحب قنداری)

خلیق الزماں صوبہ مدراس کے نہایت کامیاب و مقدر طبقہ و کلا میں تھے وہ عرصہ تک سلسلہ تعلیم ممالک یورپ میں رہے اب عرصہ سے یو۔ پی۔ کے شہور شہر اور ہندوستان کے واحد دارالعلم علی گڑھ میں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ وہ مغربی و مشرقی تہذیب و تمدن کے کامیاب نمونہ تھے۔ اپنے خاندان میں پہلے شخص تھے جو بغرض تعلیم یورپ گئے۔ ان کے سواے ایک لڑکی مضمون کے اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ اردو فارسی کے علاوہ مضمون کو انگریزی کی ضروری تعلیم بھی دی گئی تھی۔ لڑکیوں کے سلسلہ مناکحت کے بارے میں وہ کسی قدر وسیع خیال رکھتے تھے وہ زبردستی کے رشتہ کے بہت سخت مخالف تھے۔ گھر میں چونکہ ایک بچی تھی لہذا سب کی محبت کام کر رہا تھا وہی تھی نیز اپنے حسن ظاہری اور سلیقہ و تہذیب کے لحاظ سے بھی مضمون انتہائی محبت کے جانے کے قابل تھی۔

”آہ — کشوری! میں اس دل کو کیا کروں۔ لاکھ لاکھ کوشش کرتی ہوں کہ یہ سنبھل جائے مگر محبت کسی پہلو چین نہیں پڑتا۔“

مذکورہ بالا الفاظ مضمون نے اپنی ماما سے کہے وہ ایک بے وفے بیٹھی گردن جھکائے ڈوپٹے کے پلو کو توڑ رہی تھی بی بی — آپ کہاں ہیں نیچین کی باتیں چھوڑئے، شخص صرف چار یوم کا جہان ہوا اور اس کے حالات کا کسی کو علم نہ ہو وہ کہاں تک ان نوازشات کا تحمل ہو سکتا ہے۔ اور پھر بجائے خود بڑی حد تک ہر وقت دیوانگی کے اثرات اس پر قائم۔ کشوری نے کہا اور کہہ کر بغیر غار مضمون کو دیکھنے لگی۔ کشوری تم کیا جافو میں اس کے اس اندازہ دیوانگی و محویت کی قلیل ہوں۔ ہائے ان جذبات سے تم کو کیونکر باخبر بناؤں جو سینہ کا انداز ہی انداز سنگار ہے ہیں اور جن کی تیش سے میں اپنے تمام جسم کو سخت ادیت میں مبتلا پاتی ہوں۔ میں جب قدر اس دیوانے کی شکل کو بھولا دینے کی کوشش کرتی ہوں وہ اور میرے لئے مصیبت ہوئی جابر ہی ہے۔ آخر اس آزار سے پناہ و دوری کی کیا شکل ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ اب میں اس نتیجہ تک پہنچی ہوں کہ تم ان تک میری تحریر پہنچا دو آئینہ میری قسمت جب قدر جو کچھ دکھلائے دیکھنا اور سہنا پڑیگا۔ مضمون نے کہا اور بادیدہ پر کم کشوری کو دیکھا۔

احمد دوپہر کو خلیق الزماں صاحب کی کوٹھی واقع متصل نمائش گاہ لپٹا ہوا اپنے خیالات میں منہمک تھا کہ اتنے

جلد (۴) شمارہ (۵)

واردہ کی مالک تھی اس کا خیال تھا جس پر وہ بہت مضبوطی سے قائم تھی کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسری زندگی کا فیصلہ کریں اور یہی وجہ تھی جو اس نے ایک مختصر تحریر خاصہ ان میں رکھ کر احمد کو روانہ کر دی تھی وہ صرف یہ جانتی تھی کہ احمد بمبئی پریسیڈنسی کالونی گریجویٹ اور اس کے والد کا مہمان ہے اس سے زیادہ اسے کچھ علم نہ تھا پرچہ کا جواب ایک شعر کے ذریعہ دیا گیا اس نے ذرا جرات سے کام لیکر مفصل تحریر لکھی

”احمد صاحب۔ طرز مخاطبہ کی معافی۔ آپ نے میرے لیے کیوں سامانِ ہلاکت و بربادی پیدا کئے
آخر میں ہی تو ہوں؟ مسافروں کا کیا آج بیان کل وہاں
اک جا رہتے ہیں عاشق بد نام کہیں.....

آپ ”محروم مسرت“ کیوں ہیں ”ذہر“ کی شکایت آپ جیسے خوش قسمت شخص کو بجائے حیرت و
استعجاب ہے آپ نے سرائے سامانِ بخش و انطرب کیوں نہیں کیا اسکی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی؟
پھر اس پڑھو یہ کہ تم مسافر ”ریاضِ جہنم“ محروم مسرت نہیں مآپ ہمیشہ یہاں رہنے کے لئے تشریف نہیں لائے
یہی تخلیقات ہیں جس کی وجہ سے میں سخت پریشان و سراسیمہ ہوں۔

تھوڑی سی بھیک مانگتی ہوں عنایت و محبت سے چند لمحات اور اک غریب و مہجور درد مند
محبت کی بیٹا چند منٹوں میں سن لو۔ خدا نام کو اس کا اجر دیکھا۔

محمد منصور

احمد مذکورہ تحریر کو پڑھ کر دلگ رہ گیا منصور کی جرات بیباکی سے وہ متاثر نظر آتا تھا مگر اس کے مذہب میں جس
نازک کے کس فرد کی دل آزاری بھی جائز نہ تھی اس نے اسی اصول پر غور کرنے ہوئے منصور کی تحریر کا حسبِ ذیل جواب دیا
”آپ کا مبتلا نامہ ملا۔ نوازشات کا مشکور مسافر نوازی کا ممنون۔ آپ کے خط میں واقفیت ہو
یا نہ ہو مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے لئے اس میں سامانِ جرات بہت کافی ہے۔ اگر میری وجہ
اس غریب کی موجودگی آپ کے لئے سببِ آزار و تکلیف ہوئی تو اللہ اس کو معاف کر دے مجھے پیری
رام کہانی بہت ہی دردناک ہے میرا یہاں اجنبیانہ قیام کسی ہستی کی تلاش و جستجو کا حامل ہے جس کی
ہم اک اور اپر میں اپنی کل ہستی فروخت کر چکا ہوں اب اس میں میرا کیا ہی مجبوریاں ہیں جس کی وجہ سے
میں شاید آپ کے لئے باعثِ کلفت ثابت ہوا۔

آپ کی محبت سرانگھوں پر محبت میری نزدیک نام ہے ہر اک بے غرض انہماک اک خود فراموشی

محبت کا اور اس میں میرے لئے راحت و آرام ہے۔ اس لذت کی ہلاکت آپ سے کیا بیان کھلا
آپ کے لئے یہ مقام بالکل اجنبی ہے۔ خدا را اس خار و ابر سے اپنے دامن کو بچائے آپ جیسی نازنین
اور یہ دشوار پسندی را محبت۔

اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں۔
مجھے توقع ہے کہ آپ نے میری تحریر سے کوئی غلط راہ قائم نہیں کی ہوتی۔ آپ کی جملہ عنایتوں و
احسانات کا مشکور۔

احمد

تحریر کو پڑھ کر منظور کو انتہائی اذیت ہوئی اسے قطعی توقع یہ تھی کہ احمد صبیحہ وارفتہ مزاج نوجوان اس کے جذبات
کو یوں ٹھکرایگا۔ منظور نے صرف احمد سے یہ کہا تھا کہ چند لمحات دید مجھے وہ صرف اس خواہش کو لئے ہوئے ہو کہ اگر
ایک بار احمد سے لطف ہم کلامی حاصل ہو گیا تو دشوار ہے کہ ایسے منظر کو احمد صبیحہ رفیق القلب انسان دیر تک برداشت کر سکے
”محبت کرنے والا چاہتا ہے کہ محبوب کی زندگی کو بھی اپنی زندگی کی طرح تباہ کر دے محبوب خود اپنی بربادیوں
میں معین ہو جاتا ہے۔ اس لئے محبت ہلک ترین نفرت ہے وہ شخص جس سے براہ راست نفرت کی جائے اپنی ہستی
کے تحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن محبت کی فریب کاریاں انسان کو خود اپنی ہلاکتوں پر مجبور کر دیتی ہیں۔ وہ
ہر دل جو حسن سے متاثر ہو تا رہتا ہے خود اپنی ہستی سے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ اس کی انفرادیت کا احتمال اس کا باعث
ہے کہ اسے دوسری ہستیاں اپنے وجود سے اہم تر نظر آتی ہیں۔ رفتہ رفتہ جذبات محبت کسی خاص محبوب کے محتاج
نہیں رہتے۔ بلکہ اک جذبہ مخصوص طاری ہو جاتا ہے“ اور یہی اصلی محبت کا آل ہے۔ عورت عشق و محبت کے پیچیدہ
مرحلہ میں بہت جلد نتیجہ حاصل کر لیتی ہے وہ خود جب کسی کو چاہتی ہے تو اس کا دل اس کا بھی متمنی ہوتا ہے کہ میں جس
سے محبت کر رہی ہوں وہ بھی مجھے چاہے اسی نظریہ کا حاصل تھا جو اس نے احمد کو تحریر میں ظاہر کیا اسے یقین تھا کہ لیک
بالفکو کے بعد احمد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ منظور سے تغافل برتے منظور نے کسی ناجائز و خلاف اخلاق امر
کی جانب احمد کو دعوت نہیں دی تھی بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ جائز طور پر اپنی ہستی احمد کے قدموں میں ڈال دے۔

احمد نے منظور کے خط کا جواب جس انداز میں دیا تھا اس پر وہ دیر تک غور کرتا رہا وہ اب طرح طرح کے
خداشات میں مبتلا و خراب نظر آتا تھا اس کو علی گڑھ آتے ہوئے تقریباً پندرہ دن چھو گئے وہ اپنے اوپر فخریں کر رہا ہے
کہ کیوں اس قدر دن فضول اپنے علی گڑھ میں گنوائے تعلیم کا حرج علیحدہ گھر والوں کی پریشانیاں جدا اس کی روح کو

(جلد ۴) شمارہ (۵)

اذیت پہنچا رہی تھیں۔ اور پھر منصور کے لئے حادثے نے اُس کی عقل کو خرچ کر دیا تھا وہ خاموشی سے ان حادثات پر غور کر رہا تھا کہ ملازم نے خلیق صاحب کا لفافہ لاکر پیش کیا جس کی عبارت حسب ذیل تھی۔

”عزیز احمد۔ تم اس عذیم القہستی کو نظر میں رکھتے ہوئے مجھے معاف کرو گے کہ میں زیادہ وقت تمہارے پاس نہ گذار سکا تمہاری شرافت و قابلیت تمہاری سنجیدہ الطوار و عادات نے گھر بھر کو تمہارا گرویدہ بنا رکھا ہے اب تمہاری جدائی کسی پہلو بھی گوارا نہیں ہو سکتی۔

اک خاص معاملہ میں تمہاری توجہ مبذول کرانی چاہتا ہوں تمہاری سعادت مندی اور ان تعلقات کی بنا پر جو تم نے چند روز میں حاصل کر لئے ہیں اس کی جرأت ہوئی۔ میری لڑکی منصور جس کے لئے میں تم سے زیادہ پسندیدہ و نوجوان نہیں پاسکتا چاہتا ہوں کہ اس کو تمہاری خدمت کے لئے پیش کر دوں تمہارے طرز عمل سے مجھے امید و توقع ہے کہ تم میری اس جائز خواہش کو رد کر کے میرا دل نہ دکھاؤ گے اور اس معاملہ خاص میں جو شبہات تمہارے دل میں ہوں ان کو تم بذریعہ نظر جلد صاف کر لو گے۔

فخلص خلیق

تھر پڑھ کر احمد کی حالت متغیر ہو گئی واقعات سے پردہ اٹھ گیا دریائے حیرت میں غوطہ زن تھا سگڑ کو کبھی جاتا کبھی بھجاتا وہ مجنونانہ حرکات میں محو کس بڑے اہم مسئلہ پر غور کرناں نظر آ رہا تھا۔ ابھی وہ اپنے تخیلات میں محو و منہمک تھا کہ دروازہ کا پردہ متحرک ہو کر نظر آیا اور ایک ذی روح ہستی سر تا پا برق میں ملبوس سامنے آ کر رک گئی اس نے ہزار کوشش کی کہ یہاں سے نکل بھاگے اب برق کس کے چہرے سے علمدہ تھا یہ منظر دیکھ کر احمد کرسی پر گر پڑا اس کا سر چکر رہا تھا آنکھیں پتھر کی گئیں وہ بالکل از خود رفتہ تھا۔ سچ ہے کہ محبت اک آسمانی شعاع ہے جو انسانی عقل کو خیرہ کر دیتی ہے یہی حال منصور کا احمد کی محبت میں ہوا جس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا۔ آدھ گھنٹہ کی اس خاموشی کے بعد احمد ہوش میں آیا وہ جلد سے جلد اس مقام کو چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر مجبور تھا منصور کا برقع جسم سے جدا تھا وہ احمد کے قدموں میں سر رکھے بیٹھی تھی احمد منصور کی اس حرکت پر دل میں سخت نادم و منفعل تھا وہ خاموش تھا کہ اس سین کا کیا انجام ہونے والا ہے منصور کے آنسوؤں سے احمد کے پاؤں تر اور نظر آتے تھے احمد صبیحہ رقیو القلب انسان ایسے دردناک منظر کو کب تک برداشت کر سکتا تھا اٹھا منصور کو ہاتھ لگا کر قدموں سے جدا کرنا تھا کہ منصور احمد کے آغوش میں تھی اور یہ ہوش زانو پر سر رکھ کر احمد وہیں فرش پر بیٹھ گیا تھوڑے عرصہ میں ہوش آیا احمد نے کہا ”اپ کیوں میری

جلد (۲) شماره (۵)

بربادی کے درپے ہیں منصور کو اب ہوش آچکا تھا منصور کو نہ اپنے ناموس و عزت کا خیال تھا اور نہ اس بے پرہی کا وہ بالکل مہبوت تھی اور اپنی زندگی کا فیصلہ سننے کے لئے بیتاب۔ احمد اس سکر آمیز شباب کشیدہ قاتمی اور محبت سے بڑی حد تک موم ہو چکا تھا آخر الامر اس نے دل پر جبر کے منصور سے پوچھا ”آپ اس غریب الدیار شخص سے کس امر کی متمنی ہیں۔“

اس گفتگو و انداز محاط کو سکر منصور کے چہرے پر اٹھار گشت گشتی پیدا ہوئی وہ بہت سنبھل ضبط کیا بے اختیار ہو کر احمد کو لپٹ گئی دینک روتی رہی اب وہ کامیاب تھی احمد زخمی ہو چکا تھا اور مجبور و مایوس ہو کر منصور کے قدموں میں نظر آتا تھا۔ وہ منصور کے عالم آشوب جس سے مسخ ہو چکا تھا اب سوائے اقرار کے اس کے لئے کوئی چارہ نہیں تھا۔ منصور کی ہر خواہش پر بیک کہنا اب اس کا فرض عین تھا۔

احمد بڑی حد تک اپنے آپ کو مضبوط دل و دماغ کا انسان سمجھتا تھا مگر یہ اس کے شباب کا قریب اور جوانی کا دھوکا تھا وہ ہمیشہ مادہ ہلاک نظر آتا اس کے زخم کو صرف ذرا سے نشتر کی فیر تھرتھی جو منصور کی تھوڑی سی فوج میں حاصل ہو گیا۔ پہلے منصور کو اپنے سینہ و نشانہ کی عوامی نیکی مطلق پروانہ تھی اور اب وہ اپنے ہاتھ بھی احمد کو دکھانا پسند نہیں کرتی تھی۔

محبت کا تعلق روح سے براہ راست ہے تعلق از دواج میں مبتلا ہو کر بھی اس میں وہی لطافت باقی و ساری رہتی ہے احساس مند دل و دماغ صرف اس کی لطافت و نزاکت ہی میں سرشار رہنا سرمایہ زندگی سمجھتے ہیں محبت اک قسم کی خوشبو ہے جس کا پوشیدہ رہنا ناممکن ہے۔

صبح کو احمد جب سو کر اٹھا تو بجائے مردانے کے زنانے میں اپنے آپ کو پایا منصور اُس کے پہلو میں تھی اب وہ ایک غریب الوطن مایوس قسمت نوجوان احمد نہ تھا بلکہ حسین منصور کا چہیتا شوہر اور خلیق الزماں کا عزیز داماد بھی تھا۔ یہ ہے دراصل ”محبت کی فتح“

ادائے حق محبت عنایت سے زود دست و گرنہ خاطر عاشق بھیج غور شدید ست
پیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست نکاہ اہل محبت تمام سو گند ست

خود اعانتی

(انجمنہ نفاصر علی میگ صاحب بی۔ اے)

سلسلہ سابقہ

(۲)

انگریزوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی محنت کا جوش اور شوق ہے تاریخ ماضیہ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں نیز موجودہ زمانہ میں بھی مثل سابق ان میں یہ صفت خاص طور پر پائی جاتی ہے سلطنت برطانیہ کی اساسی اور صفی برتری انگلستان کے عوام (Commons) کی اسی جوش سے قائم ہوئی اس قوم کو جو زبردست ترقی حاصل ہوئی ہے وہ خاص کر افراد قوم ہی کی ازادانہ محنت کا نتیجہ ہے اور کاشتکاروں مفید آلات اور مشینوں کے موجود مصنفین یا فن کاروں نے ہی اپنی دماغی اور جسمانی محنت سے قوم کو بنایا ہے محنت کا یہ جوش اس قوم کا اصل اصول یا مطمح نظر ہی نہیں رہا بلکہ اس کا محافظ اور مصلح بھی بنارہا اور اس سے وقتاً فوقتاً ان کے قوانین کے انحطاط اور دستور کی خامیاں دور ہوئیں۔

بین کی (N.R.) قوم نے محنت کو جو اپنا اوڑھنا بھوننا بنایا وہ اس کی مناسب اور بہترین تعلیم ثابت ہوا جس طرح تن دہی اور جانشانی کی محنت سے ہر فرد کی مفید تربیت ہوتی ہے اسی طرح ریاست کی تربیت بھی ہوتی ہے۔ محنت اور مفوضہ کام کی انجام دہی ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور قدرت نے ہر دو کا ثمرہ مسرت و شادمانی قرار کیا ہے ایک شاعر کا قول ہے کہ خدا نے محنت کو اس راہ پر رکھا ہے (Elysian Fields) کو جاتی ہے یہ بات یقینی ہے کہ انسان جو روئی اپنی ذاتی محنت سے پیدا کرتا ہے اس کے مماثل کوئی روئی خوش ذائقہ نہیں ہوتی محنت ہی سے انسان کو زمین پر قابو حاصل ہوا اور وہ جہالت کے غار سے نکلا ہے۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب انسانی میں محنت کے بغیر ذرا بھی ترقی نہیں ہوئی محنت صرف ایک لازمہ اور فرض ہی نہیں بلکہ ایک برکت ہے صرف کاہل وجود انسان ہی اس کو برا سمجھتے ہیں محنت ابتداء ہی سے انسان کے رگ و پے، دست و بازو اور دماغ میں لکھی گئی ہے بالفاظ دیگر یہ کہ محنت انسان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور اس کی گھٹی میں پڑی ہے اور دماغ اور دست و بازو کی باقاعدہ محنت سے اطمینان قلب اور مسرت حاصل

ہوتی ہے محنت کی درس گاہ میں بہترین علمی دانشمندی سکھائی جاتی ہے اور محنت مشقت کی زندگی بھی جیسا کہ ہمیں آگے چلکر معلوم ہوگا اعلیٰ درجہ کی دماغی قابلیت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

یہ بنی، ہیوبل جس سے بڑھکر محنت کی قوت اور کمزوری کا حال کسی کو معلوم نہ تھا اپنا تجربہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ محنت شائد میں بھی انسان کو فوجت حاصل ہوتی ہے نیز اس سے ذاتی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ ایسا انداز کی محنت کو بہترین معلم اور محنت کی درس گاہ کو اعلیٰ ترین درس گاہ سمجھنا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ محنت ہی کی درس گاہ وہ مقام ہے جہاں انسان کو کارآمد بننے کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہ آزادی کا سبق سیکھنا اور دلیرانہ محنت کا جو کرنا ہے۔ ہیوبل کا یہ بھی خیال تھا کہ ایک میکانک کی تعلیم یعنی اصلی اور عملی اشیا کا روزمرہ سابقہ اور انسانی زندگی کا گہرا تجربہ جس سے اس کے ذاتی جوہر ظاہر ہوتے ہیں میکانک کو سفر زندگی کو آسانی سے طے کرنے کے زیادہ اہل بنا دیتا ہے اور حقیقت میں اس کی ترقی میں کسی نوع تعلیم و تربیت سے زیادہ مدد و معاون اور موزوں ہوتا ہے۔

یہ بنی، ادنیٰ اشخاص نے جو معمولی صناعات سے تھے مختلف شعبہ جات زندگی مثلاً ٹرانسپورٹ، تجارت، علم و ادب اور فنون میں شہرت حاصل کی۔ ایسے ہی اشخاص کے حالات سے جن کا اس کے قبل سرسری طور پر ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مفلسی تنگدستی اور محنت سے جو مصائب پیدا ہو جاتے ہیں وہ کسی صورت میں ناقابل عبور نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے ایجادات اور کارہائے نمایاں جن سے قوم کو زبردست قوت اور دولت حاصل ہوئی ان کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو بلاشبہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ایجادات کا بڑا حصہ معمولی انسانوں ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے جس کے سبب ہم ان کے احسانمند ہیں۔ اگر شعبہ ایجادات سے ان کی کارکردگیوں کو خیرا کر دیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ حقیقت میں قوم کے بنانے میں دیگر اشخاص کو بہت مقصور و اخل بہت ہے۔

یہ بنی، موجودوں نے دنیا کی چند بڑی بڑی صنعتوں میں جان و الدی اور انہیں چاکر کر دیا۔ سوسائٹی اپنے اکثر بڑے بڑے اختیارات عیش و آرام اور آسائشوں کی وجہ ان کی رہن منت ہے اور انہیں کی محنت اور قابلیت کا لطیف ہے کہ ہماری روزمرہ زندگی ہر بات میں زیادہ آسان آرام دہ اور خوش کن ہو گئی ہے۔ ہماری غذا، لباس، فریخہ، شیشہ جن سے مکانوں میں روشنی داخل ہوتی اور ہم سردی سے محفوظ رہتے ہیں۔ گیس جس سے ہماری سڑکیں روشن و منور ہوتی ہیں ہر سہارے سمندری جہاز اور شعلہ کی بیل بہت سے اوزار جن سے ہمارے ضروریات اور آرام و آسائش کی بے شمار چیزیں بنتی ہیں غرض یہ تمام باتیں بہت سے اشخاص اور دماغوں کی کوشش اور قابلیت کا نتیجہ ہیں۔ انسانیت (MANKIND) اسی قسم کے ایجادات کی

جلد (۲) شمارہ (۵)

وجہ خوش حال ہے اور ان سے انفرادی مرفعہ حالی اور قومی آسائش میں اضافہ ہونے سے انسان دن بدن ان کے فوائد سے مستفید ہو رہا ہے۔

بین 'پی' بخاری انجن کی ایجاد جس کو تمام گاؤں کا بادشاہ کہنا چاہیے ہمارے زمانے کی ہے لیکن اس کا خیال صدیوں قبل پیدا ہو چکا تھا دیگر ایجادات و انکشافات کی طرح اس میں بھی بتدریج ترقی ہوئی ایک شخص کی محنت مشقت کے ثمرات جو اس وقت بالکل غیر مفید معلوم ہوتے تھے اس کے جانشینوں تک منتقل ہوئے جانشینوں نے ان ثمرات کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی کوشش سے اس میں تھوڑا اضافہ کیا اس طرح اس تحقیق کی تکمیل کی گئی جس تک جاری رہی چنانچہ ہیر و آف الگزنڈریا کے ذہن میں جو خیال پیدا ہوا وہ کبھی فروغ نہ پاس نہیں ہوا بلکہ تم گندم کی طرح مصری مٹی کے ہاتھ میں پوشیدہ رہا نہ تو پایا اور بالآخر عصر جدید کی سائنس کی پوری روشنی میں ظاہر ہوا۔ نظریہ اور اصول کی حد سے آگے بڑھنے اور میکاٹکوں کے ہاتھ میں عملی طور پر استعمال ہونے سے قبل بخاری انجن کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ یہ عجیب و غریب مشن صبر و استقلال جان توڑ تحقیق مشکلات اور ان پر دلیرانہ مشقت سے غلبہ کی گہمی شاندار نظیر پیش کرتی ہے۔ انسان میں خود اعانتی کی جو قوت ہے یہ مشن اس کا ایک مجسم مظاہرہ ہے اس مشن کی تکمیل میں حسب ذیل افراد نے حصہ لیا۔

فوجی انجینیر سادری، ڈارٹ کا آہنگر نیوکومن (GLAZIER) کا لے انجن کا ملازم یا سٹر سیکول انجینیر اسٹیمن اور سب سے زیادہ (MATHEMATICAL INSTRUMENT) بنانے والا جھانکش مستقل مزاج اور ان تھک جیس واٹ بلا کا جھانکش آدمی تھا اس کی زندگی کے حالات نیز تجربہ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ زبردست قدرتی طاقت اور صلاحیت رکھنے والا شخص بڑے کام نہیں کر سکتا بلکہ وہ شخص کر سکتا ہے جو اپنی قوتوں کا بلا کی جھانکشی اور باقاعدہ ہنرمندی سے بہترین استعمال کرتا ہے۔ یہ ہنرمندی محض محنت، تن دہی اور تجربہ سے حاصل ہوتی ہے اس کے زمانہ کے بہت سے اشخاص اس سے زیادہ معلومات رکھتے تھے لیکن اپنے معلومات کو عملی جامہ پہنا کر مفید بنانے میں واٹ نے جس جھانکشی سے کام لیا ایسا کسی نے نہیں کیا سب سے زیادہ حقایق کی تلاش میں واٹ نہایت مستقل مزاج رہتا تھا (واٹ نے استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا) اس نے خود کو اس عملی شوق کا عادی بنایا جس پر دماغ کے جملہ اعلیٰ اور عملی صفات کا زیادہ انحصار ہوتا ہے سڑیہ پچر تھ کی رائے تھی کہ انسانوں میں دماغی قابلیت کے اعتبار سے جو اختلاف ہوا کرتا ہے اس کا انحصار افراد کی قوتوں کے زبردست تفاوت کی نسبت زیادہ تر شوق و دلچسپی کی ابتدائی تعلیم پر ہوتا ہے

جلد ۴، شمارہ ۵)

ین بی یچین ہی سے واٹ کو سائنس سے سابقہ پڑا کیونکہ وہ سائنٹیفک کھلونوں سے کھیلا کرتا تھا۔ یا یوں کہا جاسکتا ہے کہ سائنس گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ باپ کی بخاری کی دوکان میں جو (QUADRANTS) پڑے رہتے تھے وہ اس کی (OPTICS) اور علم ہیئت کی تعلیم کا باعث ہوئے اور خرابی صحت نے اس کو (PHYSIOLOGY) کے اسرار کی چھان بین کی ترغیب دی اور جس وقت وہ تنہا شہر میں تفریح کیا کرتا تھا اس وقت اس کی توجہ علم نباتات اور تاریخ کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئی جن ایام میں وہ (MATHEMATICAL INSTRUMENT) بنانے کا کام کیا کرتا تھا اس کو ایک موسیقی آلہ بنانے کا آڈر ملا اگرچہ اس کو موسیقی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس نے علم (HARMONICS) کا مطالعہ کر کے کامیابی کے ساتھ آلہ تیار کیا۔ اسی طرح جب جامعہ گلاسگو کے نیو کومن کے تیار کردہ بخاری انجن کا چھوٹا نمونہ مرمت کی غرض سے واٹ کے ہاتھوں میں دیا گیا اس نے حرارت بخار اور (CONDENSOFIAR) کے متعلق اس وقت تک جو کچھ انکشافات ہو چکے تھے ان کا مطالعہ شروع کیا اور اس کے ساتھ ساتھ میکائیکس اور مشینوں کی ساخت کے علم کے مطالعہ میں بھی مصروف رہا۔ واٹ کی ان مصروفیتوں کے نتائج آخر کار (CONDENSING) بخاری انجن کی شکل میں نمودار ہوئے۔

ین بی یچین دو سال تک واٹ نئی ایجادوں کی دھن میں لگا رہا۔ اس عرصہ میں اس کو مرمت کی کوئی توقع نہ تھی نیز اس کی حوصلہ افزائی کرنے والے احباب بہت کم تھے اس پر بھی وہ اپنا کام جاری رکھا اور (QUADRANTS) کی تیاری و فروخت مختلف موسیقی آلات کی تیاری و درستی۔ تعمیر کام اور سٹرکوں کی پیمائش۔ نہروں کی تعمیر کی نگرانی یا دیگر مفید کام کے ذریعہ وہ اپنے خاندان کی پرورش کرتا رہا آخر کار واٹ کو برٹش گورنمنٹ کے میسنجیورین جیسا شخص جو ایک باہرہوشیار مخنثی اور دور بین آدمی تھا اور جس نے CONDENSING ENGINE کو مروج کروانے کا بیڑا اٹھایا تھا ہاتھ بٹانے کے لئے لگایا ان دونوں کو جو کامیابی نصیب ہوئی وہ اس وقت ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ین بی یچین، کئی ماہر موجدوں نے وقتاً فوقتاً بخاری انجن میں اپنی کوشش سے جدید قوت کا اضافہ کیا اور بہت سے اصلاحات کر کے اس کو قریب قریب تمام اغراض صنعت مثلاً سواری۔ کل۔ جہاز رانی۔ باربرولی۔ غلہ کی پسائی۔ طباعت کتب۔ سکہ سازی اور لوہے کو پٹینے صاف اور درست کرنے کے قابل بنا دیا۔ مختصر یہ کہ اس کو ہر ممکن کام کے جس کے لئے قوت درکار تھی قابل بنا دیا۔ انجن میں جو مفید اصلاحات

جلد ۲۴ شمارہ (۵)

ہوئے انہیں کی ایک اصلاح (Trevithick) کی مجوزہ تھی جس کو آخر کار جارج سٹیفن اور اس کے بیٹے نے ریلوے انجن کی شکل میں تکمیل کو پہنچایا۔ ریلوے انجن کی ایجاد سے بہت سے اہم اور ضروری سماجی انقلابات رونما ہوئے اور انسانی تہذیب و ترقی کے لئے بلحاظ نتائج واٹ کی ایجاد کردہ (CONDENSING ENGINE) سے زیادہ اہم اور مفید ثابت ہوئے۔

بین پی واٹ کی ایجاد کا پہلا عظیم الشان نتیجہ جس سے صنایعوں کے قبضہ میں غیر محدود طاقت آگئی صنعت کپاس کی ایجاد تھی۔ صنعت کی اس زبردست ترقی کی بنا کا تعلق سر رضرڈ آرکس ریٹ سے ہے جس کی عملی قوت اور قابلیت اس کی میکینیکل قوت ایجاد سے زیادہ قابل تعریف تھی۔ آرکس ریٹ کی ذاتی قوت ایجاد پر بھی واٹ اور اسٹیفن کی طرح اعتراض کیا گیا ہے واٹ کو بخاری انجن اور اسٹیفن کو ریلوے انجن سے جو تعلق تھا آرکس ریٹ کو پارچہ بانی کی مشین سے وہی تعلق تھا۔ اگرچہ مکملہ کے لیوس پال نے آرکس ریٹ سے ۲۰ سال قبل سیلون کی پارچہ بانی کے طریقہ کو (PATENT) کرایا تھا لیکن اس کی تیار کردہ مشین اس قدر نامکمل ہے کہ ان سے اطمینان بخش طریقہ پر کام نہیں لیا جاسکتا تھا اور ایجاد عملی حیثیت سے ناکام ثابت ہوئی تھی۔ مشین کے متعلق جو مشہور معلومات تھے واٹ نے انہیں فراہم کیا اور اپنی کوششوں سے ان میں اضافہ کر کے مشین کو ایک جدید اور آہل کل کی شکل میں تیار کر دیا۔

بین پی واٹ کے ذریعہ پر صنعتی تصنیفات کا جب کبھی زبردست اثر پڑتا ہے تو اس وقت عموماً اکثر اشخاص کے دماغوں میں ایک ہی خیال سما یا رہتا ہے چنانچہ بخاری انجن سٹیفن اسپتار برقی اور دیگر ایجادات کی حالت مجسمہ ایسی ہی ہے بہت سے ناقابل دماغ کسی ایجاد کی فکر میں مصروف رہتے ہیں لیکن آخر کار ایک قابل دماغ اور عملی قابلیت والا شخص میدان میں اکھڑا ہوتا اور ایجاد کو اپنے ہاتھ میں لیکر اصول کو اس پر مطبق کرتا ہے اور اس کی کوشش سے ایجاد مکمل ہو جاتی ہے جو ہی ایجاد پائیدار و تکمیل کو پہنچی ہے تمام معمولی موجودوں کے حلقہ میں اس کا بڑا چرچا شروع ہو جاتا ہے وہ اس ایجاد کی دوڑا شرط میں اپنے آپ کو نیچے پاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ واٹ اسٹیفن اور آرکس ریٹ جیسے اشخاص کو کامیاب موجود ہونے سے جو شہرت اور حقوق حاصل ہوتے ہیں ان کی حاصلت کرنی پڑتی ہے۔ بین پی واٹ اکثر بڑے اور مشہور انگریز مینیکلوں کی طرح رچرڈ آرکس ریٹ بھی معمولی ٹکڑا نے کا آدمی تھا۔

بین پی واٹ کے والدین نہایت مفلس تھے اور ماں باپ کے تیرہ بچوں میں آرکس ریٹ سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے کبھی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی۔ مثل نوشتہ و خواندہ کر سکتا تھا۔ بچپن میں وہ ایک اصلاح ساز کے ہاں کار آموز کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اصلاح سازی کا کام سیکھنے کے بعد اس نے مقام بولٹن اپنی دست پر

اصلاح سازی کا کام شروع کیا یہاں اس نے ایک چھوٹا مجروحہ کرایہ پر لے رکھا تھا جس پر یہ الفاظ لکھے گئے تھے۔
 ”اصلاح ساز کے ہاں تشریف لائے۔ صرف ایک منٹ میں اصلاح بنائی جاتی ہے۔“ اس کا اثر یہ ہوا کہ
 دیگر اصلاح سازوں کے پاس بہت کم کاہک آنے لگے جس کی وجہ انہوں نے بھی آرک ریٹ کی طرح ایک منٹ میں
 اصلاح بنانا شروع کیا اس پر آرک ریٹ جس نے اپنا کل رو بار چلانے کا مصمم ارادہ کر چکا تھا یہ اعلان کر دیا کہ
 ”نصف منٹ میں اصلاح بنائی جاتی ہے۔“

چند سال کے بعد اس نے اصلاح سازی کا کام ترک کر کے بال فروش بن گیا اس زمانہ میں (Wigs) پوشی کا
 رواج تھا اور (Wigs) سازی اصلاح سازی کی ایک خاص شاخ سمجھی جاتی تھی آرک ریٹ (Wigs) کے لئے بال
 خریدنا شروع کیا لاہور میں بال حاصل کرنے کے خیال سے وہ نکاشاٹھ کے بال فروشی کے تمام میلوں میں جایا کرتا تھا
 جن میں عورتیں لاپس بال خریدنے کی غرض سے آیا کرتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آرک ریٹ اس مقصد میں کامیاب
 رہا۔ وہ کبھی کبھی ایک قسم کے کیسیادی خضاب کا بیوپار بھی کیا کرتا تھا لیکن اس کے اصلی کردار کے باوجود معلوم ہوتا ہے
 کہ اس نے اپنے خورد و نوش کے مصارف سے زائد آمدنی پیدا نہیں کی۔

پیشہ (Wigs) پوشی کے رواج میں تبدیل ہونے سے (Wigs) سازوں پر مصیبت آئی اور آرک ریٹ کو
 میکانیکی قابلیت رکھنے کی وجہ آخر کار مشن سنان یا موجود بننا پڑا پارچہ بانی کی ایک مشن کی ایجاد کی بہت سی کوششیں کیں
 اور آرک ریٹ نے دوسروں کے ساتھ اپنی چھوٹی کشتی کو بھی ایک لاکھ کے سمندر میں ڈالنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس کے
 مخالفوں نے (SELF TAUGHT) اشخاص کی طرح آرک ریٹ اپنا فرصت کا وقت دائمی حرکت والی ایک مشن کی ایجاد میں
 صرف کرتا تھا اور اس مشن کی مدد سے پارچہ بانی کی مشن (SPINNING MACHINE) کا کام لینا آسان تھا۔ اس نے
 اپنے گزشتہ تجربات پر اس قدر غافلتانی سے عمل کیا کہ اس کو کاروبار کی پروا نہ رہی اس کا قلیل سرمایہ جاتا رہا اور
 وہ انتہائی مغلسی کا شکار ہو گیا۔ اس کی بیوی کیونکہ اس وقت اس کی شادی ہو چکی تھی بہت بے صبر واقع ہوئی
 تھی کیونکہ آرک ریٹ کھانے کو کچھ نہیں نصیب دیتا تھا اور وہ پیر کی بربادی سمجھتی تھی۔ اس نے خشم آلودہ ہو کر اپنے
 شوہر کے تیار کردہ ٹوٹے اس توقع سے ضایع کر دیے کہ اس طرح تو بھی خاندان کے مصائب اور مغلسی کا ازالہ
 ہو جائیگا۔ آرک ریٹ ایک پر جوش اور ہندی آدمی تھا۔ بیوی کے اس طرز عمل نے اس کے لئے اشتعال طبع
 کا کام دیا اور اس لئے فراہمی سے علیحدگی اختیار کی۔

پیشہ (Wigs) دو سال سفر میں آرک ریٹ کی (KAY) نامی ایک شخص سے ملقت ہوئی یہ شخص وارنٹن کا

ایک گھڑی سارنٹھا اس نے آرک ریٹ کو اس کی مادی حرکت والی مشن کے بعض اجزاء کی ساخت میں مدد دی۔ پارکلیا جانتے کہ (KAY) نے آرک ریٹ کو سیلنوں کی پارچہ بانی کا حصول بتلایا۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس اصول کا خیال پہلے ہی آرک ریٹ کے دل میں اس وقت پیدا ہوا جس وقت اس کو ایک سرخ آہنی گھڑے کو اپنی سیلنوں میں سے گزر کر لے آیا۔ پارکلیا کو کھینے کا اتفاق ہوا تھا اس واقعہ کے اسباب خواہ کچھ بھی ہوں آرک ریٹ کے دماغ میں یہ خیال مستحکم ہو گیا چنانچہ اس نے جس تدبیر سے اس کی تکمیل ہو سکتی تھی اس کی کھوج شروع کر دی اور (KAY) کو اس مسئلہ میں کوئی دخل نہ تھا۔ آرک ریٹ نے اپنا بال فراہمی کا کاروبار ترک کر کے اپنی مشن کی تکمیل کے لئے خود کو وقف کر دیا۔ اور اس کے ہدایات کے بموجب جب (KAY) نے اس مشن کا ایک نمونہ تیار کیا تو آرک ریٹ نے اس کو پرسنل کی فری گرامر اسکول کے کمرہ میں رکھا۔ شہر کا قایم مقام ہونے کی وجہ اس نے اس بحث طلب انتخاب میں رائے دی جس میں جنرل برکٹن کو ناگامی ہوئی تھی۔ آرک ریٹ اس قدر تنگدست تھا اور اس کے کپڑے اس قدر چھٹے پرانے تھے کہ کئی اشخاص نے چندہ کر کے اس قدر روپیہ جمع کیا کہ وہ آرک ریٹ کے لئے (Poll Room) میں جانے کی حیثیت کے موافق لباس فراہم کرنے میں کافی ہوا۔ ایک ایسے شہر میں جہاں بہت سے کاریگر دستی محنت کے ذریعہ معاش پیدا کرتے تھے آرک ریٹ کی مشن کی نمائش خطرناک چیز ثابت ہوئی۔ مدرسہ کے باہر وقتاً فوقتاً بدشگون شکایات سنی جاتی تھیں (KAY) کو اس کی (FLY SHUDILE) کی ایجاد کی وجہ مجمع نے گھیر لیا جس کی وجہ وہ نکاسا ر چلے جانے پر مجبور ہو گیا نیز غریب ہارگریوس جس کے (SPINNING JENNY) کو بلاکمرن کے ایک مجمع نے اس واقعہ کے چند روز قبل پارہ پارہ کر دیا ان دونوں کا جو کچھ حشر ہوا اس کو مد نظر رکھتے ہوئے آرک ریٹ نے یہ ہوشیاری کی کہ وہ اپنے گھڑے کو ایک غیر خطرناک ایسے محفوظ مقام پر منتقل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اپنی مشن کو لیکر ناٹنگھم چلا گیا جہاں اس نے مقامی ساہوکاران سے مالی امداد کی درخواست کی اور مسز ریٹ نے اس کو اس شرط کے ساتھ پیشگی روپیہ دینے رضامندی ظاہر کی کہ ایجاد کے منافع میں اس کو حصہ دیا جائے جس مدت میں مشن کی تکمیل کی توقع تھی اس مدت میں تکمیل نہ ہونے سے ساہوکاروں نے آرک ریٹ کو مشورہ دیا کہ وہ مسز اسٹریٹ ایٹ نیٹس سے درخواست کرے مسز اسٹریٹ پائیا بانی کی مشن کا موجود تھا اور اس کو اس مشن کا حق پیشیٹ بھی حاصل تھا۔ اسٹریٹ نے آرک ریٹ کی مجوزہ ایجاد کی بلحاظ اس کی خوبیوں کے بڑی قدر کی اور آرک ریٹ کے گھڑے جس کے لئے قیمت آزمائی کی راہ اب بالکل صاف ہو گئی تھی شریک ہو گیا ناٹنگھم کے گھڑی ساز چارلز آرک ریٹ کے نام سے حق پیشیٹ حاصل کیا گیا اور یہ ایک قابل یادگار واقعہ ہے کہ پیشیٹ ۱۹۶۹ء میں حاصل کیا گیا یعنی اسی سال جبکہ

جلد (۲) شمارہ (۵)

واٹ نے اپنی بخاری ابن کاتھ پیٹنٹ حاصل کیا تھا۔ نانگلم میں پہلے ایک کمپاس کی گرنی قائم کی گئی جو گھوڑوں کے ذریعہ چلتی تھی اس کے چند روز بعد ہی ڈربی شائر میں بمقام کرامفورڈ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر دوسری گرنی تیار کی گئی جو پانی سے گھومنے والے پیسے سے چلتی تھی اور اسی سبب سے پارچہ بانی کی مشن کو (WATER FRUNE) کہا جانے لگا۔

یہ ’بی آرک ریٹ کی کوششوں کا یہ پیش خیمہ تھا مشن کے دیگر ضروری اجزاء کی تکمیل ہونے لگی تھی اس میں آرک ریٹ ہمیشہ رد و بدل اور اصلاحات کرتا رہتا تھا حتیٰ کہ وہ قابل استعمال اور سجد مفید ہو گئی لیکن کامیابی محض طویل اور محمل کوشش سے حاصل ہوئی کیونکہ چند سال تک اس کام میں آرک ریٹ کوسٹ ہمتی ہو چکی تھی نیز اس کو کوئی فائدہ بھی نہ تھا کثیر سرمایہ اس کے نذر ہو جاتا تھا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تھا جب ترقی کے آثار نظر آنے لگے تو جس طرح (CORNISH) کے کان کن بولٹن اور واٹ پر ان کے بخاری ابن کا منافع لوٹ لینے کی غرض سے ٹوٹ پڑے تھے لہذا شائر کے صنایع بھی جدید مشن کو توڑ دینے کے خیال سے آرک ریٹ پر حملہ آور ہوئے آرک ریٹ کو کاریگروں کا دشمن ٹھہرایا گیا اور کارے میں اس نے جو گرنی تیار کی تھی اس کو ایک مجمع نے زبردست پولیس اور فوج کی موجودگی میں برباد کر دیا۔ اگرچہ آرک ریٹ کے تیار کردہ اشیاء بازار میں سب سے بہتر تھے اور لوگوں کو اس کا اعتراف بھی تھا لیکن لکشاڑوالوں نے انہیں خریدنے سے انکار کیا۔ نیز انہوں نے آرک ریٹ کو اپنی مشنوں کے استعمال کا حق پیٹنٹ دینے سے انکار کیا اور عدالت میں سخت ضرر پہنچانے کی غرض سے متفق ہو گئے آرک ریٹ کا حق پیٹنٹ ضائع ہونے سے راست بازار اشخاص کو سخت ناگوار ہوا مقدمہ ختم ہونے کے بعد جس وقت آرک ریٹ کا اُس ہوٹل پر سے جہاں اس کے مخالفین ٹہرے ہوئے تھے گذر رہا تو ایک نے چلا کر کہا کہ ”ہم نے پرانے اصلاح ساز کو شکست دیدی“۔ یہ سنکر آرک ریٹ نے جواب دیا کہ ”کوئی پروا نہیں میرے پاس ابھی ایک استر باقی ہے جو تم سب کی اصلاح کرے گا“ اس لئے اسکاٹ لینڈ میں لکشاڑ۔ ڈربی شائر اور نیولینارک مقامات پر جدید گرنیاں قائم کئے مسٹر اسٹرٹ کی شرکت ختم ہونے پر کرامفورڈ کی گرنیاں بھی اس کے قبضہ میں آگئیں اور اس کی گرنیوں کے تیار شدہ اشیاء کی خوبی کا یہ حال تھا کہ نہایت قلیل عرصہ میں اس کی کاہلہ پر پورا قابو حاصل ہو گیا اس نے قیمتیں مقرر کئے اور دیگر کمپاس کاتنے والوں کی نگرانی بھی کی۔

یہ ’بی آرک ریٹ زبردست کردار۔ استوار دلاوری اور زود فہمی والا آدمی تھا اور اس میں ہلکی کاہلہ بھی صلاحیت موجود تھی۔ ایک مرتبہ اس کا وقت سخت اور مسلسل محنت میں صرف ہوا کیونکہ اس کو اپنے بے شمار

جلد (۴) شمارہ (۵)

کارخانوں کا انتظام کرنا پڑا بعض اوقات وہ صبح کے چار بجے سے شام کے نو بجے تک کام کرتا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں اس نے انگریزی قواعد پڑھنا شروع کیا اور کتابت اور علم ہجاء میں ترقی کرنے لگا۔ ہزار محنت پر غالب آنے کے بعد اس کو اپنی کوشش کا ثمرہ ملا جس سے اس کو اطمینان حاصل ہوا۔ اس کی پہلی مشن کی ساخت کے ۱۰ سال بعد ڈربی شائر میں اس کو اسفند راعز حاصل ہو گیا کہ وہ شہر کا (HIGH SHERIFF) بنادیا گیا اور چند روز بعد جارج سوم نے اس کو (KNIGHT) کا خطاب عطا کیا۔ ۱۷۹۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ خواہ مفید ہو یا مضر آرک ریٹ انگلستان کے موجودہ فیاکٹری سسٹم کا بانی تھا۔ فیاکٹری سسٹم بلاشبہ افراد اور قوم ہردو کے حق میں توقیر دولت کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوا۔

بین پنی، برطانوی صنعت کی دیگر بڑی شاخوں میں جھاکش اور محنتی اشخاص کی ایسی ہی مثالیں ملتی ہیں جو ان کے ہمساویوں کے لئے باعث منفعت اور قوم کے حق میں طاقت اور دولت کا ذریعہ تھے۔ ذیل کے افراد کا شمار اسی قسم کے اشخاص میں کیا جاسکتا ہے۔

بلبر کے اسٹرنس، گلاسگو کے ٹینٹس، یڈس کے مارٹلس اور گائٹس سپلیس ایٹھش ورنٹس۔ برلینس فیلڈنس۔ الیشٹنس، ہیروڈس اور لنکا شائر کے اینس ورنٹس۔

انہی کی اولاد میں سے بعض اشخاص انگلستان کی سیاسی تاریخ میں شہرت حاصل کر چکے ہیں جنوبی لنکا شائر کے سپلیس بھی ایسے ہی مشہور و معروف تھے۔

بین پنی، خاندان پیل کا بانی جو گزشتہ صدی کے وسط میں گذرا ہے ایک معمولی کسان تھا اس کا ہول ہاؤز نامی ایک کھیت بلاک برن کے قریب واقع تھا جہاں سے بعد میں وہ مچھلہارون کے کوچہ کے ایک مکان میں منتقل ہو گیا رابرٹ پیل کے ذمہ کئی لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش تھی لیکن بلاک برن کی اراضی ذخیرہ نہ ہونے سے اس کے لئے زراعت میں کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔ بلاک برن ایک زمانہ تک کسی خانگی و تجارتی کام پر نہ تھا جس کی صنعت بلاک برن گریس کے نام سے موسوم تھی اور جس میں شہر اور قرب و جوار کے بنے ہوئے سن کے بانے اور سوتی تانے استعمال کئے جاتے تھے۔ کارخانوں کی ابتدا سے قبل کنبے والے محنتی کسانوں میں یہ رواج تھا کہ کھیتی باڑی سے جو کچھ وقت بچتا اس کو وہ پارچہ بانی کے کام میں صرف کیا کرتے تھے چنانچہ رابرٹ پیل نے چھٹ سازمی کی گھریلو تجارت شروع کی۔ وہ بابت داری سے عمدہ مال نیا کرتا تھا علاوہ اس کے کفایت شعار اور جھاکش تھا اس لئے اس کی تجارت کو فروغ ہوا۔ وہ بڑے بڑے کام اپنے ذمہ لینے لگا اور ان افراد میں سے تھا جنہوں نے پہلے پیل نئی ایجاد شدہ اوٹن

صاف کرنے کی سلین استعمال کی۔

بین 'پی' رابرٹ پیل کی توجہ خاص طور پر چھپٹ کی چھپائی کے جانب راغب ہوئی جس کی حیثیت اس وقت ایک غیر معروف فن کی تھی۔ مشن کی چھپوائی کو رواج دینے کی غرض سے ان سے کچھ عرصہ تک تجربات کئے۔ یہ تجربات پوشیدہ طور پر خود اس کے مکان میں ہوا کرتے تھے اور اس کے خاندان کی ایک عورت پارچہ کو استری کیا کرتی تھی۔ پیل جیسے خاندانوں میں اس وقت کھانے کے لئے جست کے ظروف استعمال کئے جاتے تھے ایک رکابی پر ایک نقش بنانے سے اُس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ اس سے ایک الٹا نقش لیا جاسکتا ہے اور اس کو رنگ لگا کر چھپٹ چھاپ سکتے ہیں۔ کھیت کے کنارے ایک جھونپڑی میں ایک عورت رہتی تھی جس کے پاس استری کی ایک مشین تھی۔ اس کی جھونپڑی میں جا کر پیل نے رکابی کے نقش کردہ حصہ پر رنگ جمایا اور اس پر کچھ چھپٹ رکھ کر مشین میں رکھ دیا جس سے چھپٹ پر خاص نقش اتر آیا۔ کہا جاتا ہے کہ چھپٹ کی سلین کے ذریعہ چھپوائی کا جو طریقہ رائج ہوا اس کی ابتدا اس طرح ہوئی۔ رابرٹ پیل نے اپنے تجربہ کو مکمل کیا اور اس نے پیل (PARSLAY) کے ایک نپہ پر پہلا نمونہ تیار کیا اور بھی وجہ ہے کہ آج تک وہ بلاکبرن کے قرب وجوار میں "پارسل پیل" کے نام سے مشہور ہے۔ مکمل کے ذریعہ چھپٹ کی چھپائی کا کام پیل کے ایک فرزند کے ہاتھوں جو مسرز پیل اینڈ کو نامی کارخانہ کا صدر تھا پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اس کامیابی سے اس کے حوصلے بڑھ گئے اور رابرٹ پیل نے ناشتکاری ترک کر کے بلاکبرن سے تقریباً دو میل کے فاصلہ پر قصبہ بروک لیٹو میں سکونت اختیار کی اور خود کو طباعت کے کام کے لئے وقف کر دیا۔ یہاں اس نے اُس کے بیٹوں کی مدد سے جو اس کی طرح جفاکش تھے کئی سال تک کامیابی کے ساتھ یہ کاروبار چلایا اور جس طرح بچے پڑھتے پڑھتے عقوان شباب کو پہنچتے ہیں اس کا کاروبار مختلف کارخانوں کی شکل میں ترقی کر گیا۔ ان میں سے ہر کارخانہ ہمعینی پیل پہل کام کرنا اور عوام الناس کی کثیر جماعتوں کے لئے روزی کمانے کا ذریعہ بن گیا۔

بین 'پی' رابرٹ پیل کے کردار کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کی ہستی یقیناً ایک غیر معمولی ہستی تھی اور وہ ہوشیار۔ تیز فہم اور دور بین بھی تھا۔ اس کے حالات بہت کم معلوم ہیں اور جو لوگ اس سے واقف تھے وہ بھی گزر چکے۔ اس کا بیٹا سر رابرٹ اپنے باپ کے متعلق اس طرح لکھتا ہے کہ "میرا باپ حقیقت میں ہمارے خاندان کا اصل بانی ہوگا اور قومی نقطہ نظر سے اس نے تجارتی دولت کی اہمیت کی سجدہ کی اور کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ تجارت میں انفرادی نفع کو قومی مفاد کے مقابلہ میں بہت کم اہمیت حاصل ہے۔" بین 'پی' سر رابرٹ پیل کو جو پہلا بیارونٹ اور اس نام کا دوسرا صنعت تھا اس کے باپ کی صنعت اور

جلد (۴) شمارہ (۵)

کاروبار ترکہ میں ملا ابتدا میں اس کی حالت ایک معمولی کاریگر سے کچھ بڑی ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کا باپ کو آئندہ مرفعہ حالی کی اساس قائم کر رہا تھا تاہم اس کو بھی ناکافی سرمایہ کی وجہ جو مشکلات رونما ہو گئے تھے ان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جس وقت رابرٹ کی عمر صرف بیس سال کی تھی اس نے سوئی پارچہ کی چھپائی کاروبار آغاز کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا جس کو وہ اس وقت تک اپنے باپ سے سیکھ چکا تھا۔ اس کا چچا جیمس ہاورتھ اور ولیم ایٹس ساکن بلاکرن اس کے کاروبار میں شریک ہو گئے اور سب نے جو سرمایہ جمع کیا اس کی مقدار صرف پانچ سو پونڈ تھی اس سرمایہ کا بڑا حصہ ولیم ایٹس کا فراہم کردہ تھا۔ ولیم ایٹس کا باپ بلاکرن کا ایک (House Holder) تھا جہاں اس کو کافی شہرت حاصل تھی اور لوگ بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے اپنے کاروبار کے ذریعہ روپیہ پس انداز کر کے اس نے سوئی پارچہ کی چھپائی کی سود مند تجارت کو ترقی دینے کے خیال سے جو اس وقت حالت طفولیت میں تھی اپنے بیٹے کو کافی رقم دے کر ارادہ کیا کہ بیٹے پیل اگرچہ کم عمر تھا تجارت کا عملی تجربہ حاصل کر لیا اس کے متعلق صحیح کہا گیا ہے کہ ”اگرچہ وہ کم عمر تھا لیکن ایک تجربہ کار دماغ رکھتا تھا“ شہر بیوری کے قریب جو اس وقت غیر مشہور تھا اور جہاں کاروبار ایک زمانہ سے (THE GROUND) کے نام سے مشہور تھا یہاں کی ایک تباہ شدہ غلہ کی گرنی کو معد اس کی لمبھہ اراضی کے رابرٹ نے بخوبی رقم کے معاوضہ میں خریدی اور چند چوبی سائبان نصب کر کے سٹاکس میں نہایت ادنیٰ پیمانہ پر سوئی پارچہ کی چھپائی کاروبار شروع کیا چند سال کے بعد اس میں سوت بانی کا کام بھی ہونے لگا۔ شہر کا جس کفایت شعاری سے زندگی بسر کیا کرتے تھے اس کا اندازہ ان کی ابتدائی زندگی کے ذیل کے واقعہ سے چل سکتا ہے۔ ولیم ایٹس معد اپنے اہل و عیال کے نہایت سادہ طریقہ پر زندگی بسر کیا کرتا تھا اور پیل پر جو تن تنہا تھا احسان جتانے کے لئے اس نے اس کو اپنے پاس قیام کرنے کی اجازت دی پیل اپنے قیام و طعام کے معاوضہ میں ہفتہ وار جو رقم دیا کرتا تھا وہ صرف دہ شلنگ تھی لیکن ایٹس نے پیل کو مجبور کیا کہ ہفتہ وار رقم میں ایک شلنگ کا اضافہ کر دیا جائے اس پر پیل کو پہلے پیل پس پیش ہوا اور شہر کا وہیں ناموافق ہو گئی لیکن آخر میں اس بات پر صلح ہو گئی کہ پیل پر ہفتہ پینس پیشگی ادا کیا کرے۔ ولیم ایٹس کی پہلی اولاد ان نامی ایک لڑکی تھی وہ بہت جلد نوجوان پیل کی چاہتی بن گئی تمام دن سخت محنت کر کے ”گروینڈ“ سے واپس ہونے کے بعد چھوٹی لڑکی کو اپنے گھٹنے پر بٹھا کر کیا کرتا تھا۔ ”خوبصورت چھوٹی نلی کیا تو میری بیوی بنے گی“ اس سوال پر نلی جس طرح عموں سے کہا کرتے ہیں خوشی سے جواب دیا کرتی تھی کہ ”ہاں میں تمہاری بیوی بنو گی“ جس پر پیل کہا کہ ”نلی میں تمہارے سوا اور کسی سے شادی نہ کروں گا“ اور حقیقت میں رابرٹ نے نلی سے بلوغ کو پہنچے شلک انتظار کیا جب خوبصورت لڑکی سن بلوغ کو پہنچ گئی تو

جلد ۱۰ شماره (۵)

رابرٹ کا اس سے شادی کرنے کا مصمم ارادہ ہو گیا اور دس سال بعد جو کاروباری گہری دلچسپی اور دن بدن بڑھتی ہوئی حرفہ حالی میں بسر ہوے رابرٹ پیل نے الن ایٹس سے شادی کی جس کا سن اس وقت سترہ سال کا تھا۔ اس طرح خوبصورت نلی جس کو اس کی ماں کا کراہیہ دار اور باپ کا شریک کار اپنے گھٹنوں پر کھلایا کرتا تھا ستر پیل اور آئندہ جیکلر انگلستان کے وزیر اعظم کی والدہ لیڈی پیل بنی۔ لیڈی پیل ایک معزز اور حسین عورت تھی اس کی دماغی قوت غیر معمولی تھی اور ہر شہید ضرورت کے موقع پر وہ اپنے شوہر کی شریک و مشیر رہا کرتی تھی۔ شادی کے بعد کئی سال تک اس نے اپنے شوہر کے منشی کی حیثیت سے کام کیا اور اس کے کاروباری خط و کتابت کا بہت سارا کام خود کیا کرتی تھی کیونکہ ستر پیل کی طبیعت لاپرواہ واقع ہوئی تھی اور خط بھی صاف نہ تھا۔ شوہر کو بیرنٹ کا خطاب ملکر صرف تین سال کا عرصہ ہوا تھا کہ ستر پیل نے جہاں فانی سے کوچ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ لندن کی وضع دارانہ زندگی جو اس کی خانگی یا گھر کی زندگی سے بالکل جداگانہ تھی اس کی صحت کے لئے مضرت ثابت ہوئی۔ ضعیف ایٹس کہا کرتا تھا کہ ”اگر رابرٹ ہماری نلی سے شادی نہ کرتا تو وہ اب تک زندہ رہتی“

بین کی، ایٹس پیل کہنی کا زمانہ کامل خوشحالی میں گذرا۔ رابرٹ پیل کا رخانہ کی روح رواں بنا ہوا تھا۔ اس کی جان تو زخمیت و جفا کشی کے ساتھ اس میں وہ غیر معمولی عملی قابلیت اور اعلیٰ درجے کے تجارتی معلومات موجود تھے جن کی اکثر سوئی پارچہ بافوں میں بڑی کمی تھی اس کی دماغی اور جسمانی قوت بہت زبردست تھی اور وہ بلا وقفہ کام کیا کرتا تھا۔ مختصر یہ کہ رابرٹ پیل کو سوئی پارچہ کی چھپوائی سے وہی نسبت تھی جو آرک ریٹ کو سوت بافی سے تھی یہی وجہ تھی کہ اس کو زبردست کامیابی نصیب ہوئی۔ اس کے کارخانہ کی تیار شدہ اشیاء کی عمدگی کی وجہ بازار میں ان کی طلب بڑھ گئی اور لنگانہ بازار میں کارخانہ کی خاصی شہرت ہو گئی۔ یورپی کو نفع پہنچانے کے علاوہ دونوں نے اپنی شرکت میں قرب و جوار میں وسیع پیمانہ پر کاروبار شروع کیا اور بیان کیا جاتا ہے کہ جہاں انہوں نے اپنے دستکاریوں کی خوبی کو انتہائے کمال تک پہنچانے کی کوشش کی اس کے ساتھ ساتھ مزدوروں کے آرام اور رفوہ حالی کے لئے ہر ممکن کوشش میں کوئی کسر باقی نہ رکھی دیگر ایام میں بھی وہ اپنے مزدوروں کے لئے اجرت کا کام عیاں کرنا سعی کیا کرتے تھے۔ (باقی)

مصحفی کا تذکرہ ہندی

(از عمر یافعی —)

(گزشتہ سہے پوسٹہ)

حاتم

(الف) حاتم شیخ ظہور الدین عرف شاہ حاتم ولد شیخ فتح الدین کہ بقولش تاریخ تولدش حرف ظہور باشد از خاک پاک شاہ جہاں آباد است۔ ہشتاد و سہ سال عمر دار۔ در ایام جوانی پایہی پیشہ بودہ و ہم شعر ریختہ بر کسے کار آوروہ در انوقت چندے رزم تخلص میکرد۔ از بیکہ اس خرابہ از قدر و انالں سمور بود۔ امیر زادہ لمسے والا تبار و نوینیان ذوی الاقدار اور پیش از پیش بہ تواضع و تعظیم پیش آمدہ بر مسند برابر خود جا میداوند۔ مناسب حال خود ہا ہر کیے از وافر میگزیدند مرد بزرگ و جہاں دیدہ و فرسودہ روزگار ہست۔ عمر با بعیش و طرب بودہ و سالہا بہ ناز و نعمت پرورش یافتہ حالاً چوں کس نہاند بہ سبب مصلحت وقت و ہولے زمانہ را مختلف دیدہ۔ متوکل و خانہ نشینی اختیار کردہ۔ از بزرگی گویان قدیم اس دیار یادگار است و نام نامیش از بس شہرت بسیار مذکور زبان صنار و کبار۔ طرز اولیش بہ شعر بطور مضنون و ناتیجی و ابرو و غیرہ شعرے ایہام بند است۔ و طرز آخریش بانداڑہ تازہ گویان حال بعض اشخاص نزدیک و دور شاہ مذکور را بہ سبب طوالت عمر پیش خود از رفتگمال شمردہ۔ حاتم ثانی قرار میدہند لہذا دریں شعر دیوانے کہ در زبان ریختہ گویان حال ترتیب داودہ نامش دیوان نامدہ گذاشتہ تارفع اشتباہ آہنا گرد و اختلاط زبان ریختہ سابق و حال و دعویٰ مبہم آل قوم را بقول بصدق نگرداند۔ در فارسی ہم دیوان مختصری بقدر جہاں جز بطور متاخرین بیاض فرمودہ۔ در یک ہزار و یکصد و نوود و ہفت در اہ مبارک رمضان رحلت کردہ فقیر تاریخ حلتش جنس یافتہ۔

کہ قدم در مقام فقر شد
چونکہ از صفحہ زمانہ سترد
ناگہ اس مصرعہ بگو شمع خورد
آہ صد حیف شاہ حاتم مرد

حاتم آل پیشو اسے اہل سخن
صرف عرش قضا بہ کزلک حک
سال تا رکش از خرد جسم
کہ بگو مصحفی چو پرندت

ایں چند شعر از انتخاب زادہ آل بزرگوار است۔

(ب) شیخ ظہور الدین حاتم کہ شاہ حاتم گفتہ می شد۔ مولدش شاہجہاں آباد است تیاج تولدش بقولش حرف
 ”ظہور می برآید۔ ہمیشہ عمدہ معاش بوده و اوقات را بخوبی گذرانیدہ مرد پاسبی پیشہ از ہندوستان زایان قدیم بودہ
 روزی پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دویم فروس آرام گاہ دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمد و اشعارش بر زبان
 خود بزرگ جاری گشتہ باد و سہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد بنام شعر مہندی را با بہام گوئی نہادہ۔ داد
 معنی یابی و تلاش مضمون تازہ میدادیم غرضکہ از شعرای متقدمین است در ایامیکہ فقیر در شاہجہاں آباد۔ طرح
 مشاعرہ انداختہ اکثر بعد مغرب در مشاعرہ قدم رنجہ می فرمود و در مجلس نشستہ زمانہ سابق خود را می ستودہ الحال کہ
 در ورہ مازبان ریختہ بسیار پاکیزگی و عمدگی رسیدہ مشارالہ ہم مرتبہ سخن تازہ گویان فہمیدہ دیوان قدیم خود را
 از طاق دل افکنده۔ دیوان جدید بزبان ریختہ گویان حال ترتیب دادہ و دیوان زادہ نامش گذاشتہ
 تا بہنیب طالت عمر بعض مردم دور دست را کہ اشتباہ حاتم دویم می افتاد بر طرف کردہ و بجز اشعار اہم جدا جدا
 از سرخی بر سر ہر غزل نوشتہ و ایں ایجاد دوست و ازینکہ در درازی عمر قدامت شعر از ہمہ پیشتر است
 نعمتہ سبحان حال وضع و شریف اورا اوستاد مسلم الثبوت می دانند بلکہ او خود را اسامی کسانیکہ از اول
 تا آخر استفادہ شعر از کردہ اند بر دوسہ ورق بہ طریق نہشت بر پشت سر لوح دیوان خود نوشتہ چنانکہ مظلوم
 کال گرد کہ حاتم ایں قدر شاگرد داشت و در انجملہ اسم مرزا رفیع سودا ہم کہ بہ اتفاق ہمہ یکے از سرآمد شعرائے
 ہندی گویان ایں دیار گذشتہ مسطور است و الحق کہ دروغ نیست قیاس استادیش ازین جا باید کرد۔
 دینزبان ہاں میر محمد تقی میر کہ شاعریت جاد و کاراکتر اورا در مشاعرہ با بطریق ظرافت وادہ انوار کفایت
 چوں دو بخرمودہ شعر فارسی ہم بطور صائب داشت لہذا پیش ازین در تذکرہ فارسی احوال او متعین تیاج عطرتش
 صورت تحریر یافتہ عمر قریب بصد رسیدہ بود و دوسہ سال است کہ در شاہجہاں آباد و دیعت حیات پیر
 خدائیش بیامزد از دوست۔

مضمون خط کو دیکھتے ہیں بہت ڈرے	جتنے مسوے تھے رہے طاق پر دھرے
پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر	سو کھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہر
تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں	دور ہو پہلو سے صحبت کے مرے قابل نہیں
خوشحال اُن کا جن کو ہوئی رخصتِ چمن	ہم جھانک جھانک خستہ دیوارہ کئے

تم تو بیٹھے ہوے پہ آفت ہو اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو
 بکیں اور داغ اسے حاتم کیا قیامت کرے جو دولت ہو

مجھے تو دیکھ کر کیا تک رہا ہے ترے ہاتھوں کلیجہ پک رہا ہے
 خدا کے واسطے اُس سے نہ بولو نشے کی لہریں کچھ بک رہا ہے

درد

(الف) خواجہ میر درد خلف شاہ ناصر کہ سلسلہ ایساں نقشبندیہ است و آل را مقابل نقشبندیہ مجددیہ نقشبندیہ ٹکدیہ ایجاد کردہ نام گذاشتند در ایام جوانی سپاہی پیشہ بود۔ ازاں باز کہ پابرہوریا سے درویشی نہادہ ہمیشہ در کتب سلوک و فقر و فنا و توحید و تصوف کو شہیدہ و چشم از غیر حق پوشیدہ و در زبان رنجیۃ بعد اہلہام گویان خیلہ و ادھفا دادہ و چنانچہ دیوان مختصر سے از ویادگار است و مقبول نظر فصحاءے روزگار۔ چوں بہ سبب فصل و کمالے کداشت در راہ پرخار فارسی ہم برعم دیگر رنجیۃ گویان قدم نہادہ از تصنیف اوست۔ علم الکتاب و واردات و مالہ درد، در جواب ملا عبدالرب شاہ ناصر و دیوان فارسی مختصر معہ رباعیات تادریں بزم دل افروز جانشین پوست تخت زندگانی بود اکثر شاگرداں و مریداں و معتقدان از ذات بابر کاتش استفادہ نامی گرفتند و ادراک صحبت کیمیا خاصیت اورا بسیار غنیمت می شمردند۔ فقیر ہم گاہ گاہے بغیر ضائع صحبتش را در یافتہ است الحق کہ دریں پیری شخصے بود باغ و بہار و وجود سے بود از بزرگان زمانہ یادگار۔ چند سال است و جائے خود را بہرادر خود محمد میر اثر تخلص گذاشتہ رفقہ از دوست

(ب) خواجہ میر درد تخلص خلف الصدق شاہ گلشن مصنف کتب نالہ غدلیب در عہد فردوس آرام گاہ پامی پیشہ بود آخر آخر ترک روزگار کردہ و سجادہ درویشی نشستہ در علم و فضل یکانہ روزگار است گاہے در تمامی عمر از شاہجاں آباد باوجود چندین تفرقہ کہ عالمی را از ویار مینو نشان آوارہ اطراف و جوانب ساخت پاسے بیرون نگذاشتہ چوں در علم و موسیقی ہم مہارت تمام داشت اکثر سے از استادان ایں فن بہیت بہیت حاضر مجلس گشتند۔ اگرچہ سلسلہ آل بزرگ نقشبندیہ ہست اما واردات درد کہ نسخہ ایست مختصر از تصنیف او برلے ہدایت مریدان خویش حرمت غذا را بطور سے کہ ہست گذاشتہ و خود کہ گاہ گاہے مرکب ایں امر شد گناہ آل

بروز خود گرفتہ طلب آفرش از این دلبہال خواستہ تا مرغ خوش زفر نہ سنج باغ ہستی بود در ہر ماہ تبلیغ دوم بر فراز پدر خود مجلس غماز ترتیب میداد آن روز ہمہ خورد و بزرگ شہر حاضر می شدند مضیان چابک دست و بین نوازان بے کاسہ ست داد قانون نوازی و نغمہ سازی می داند بعد سہ پاس روز رفتہ مجلس برخواست می شد۔ غرض کہ جامع جمع فنون غویہ بود در فقر و توکل و استغنا نظیر نہ داشت۔ ششم بیان بے پرواہیش ایں کہ روزے حضرت ظل سبحانی برائے زیارت ایشان آمدہ بودند بعد نشستن در مجلس عذر در دہ میان آوردہ اند کہ پادرازا سخت شاریہ از مشاہدہ ایں حالت متعزز شدہ و ایں قاعدہ را خلاف معمول دانستہ خود ہم بطرف بادشاہ پارادرازا ساخت علم الکتاب از تصنیف اوست بر صفحہ روزگار یادگار راست و شعر ہندیش از بس اشہرت بسیار مشہور ہر دایا اگرچہ شعر فارسی ہم دارد فقیر تاکہ در شاہ جہاں آباد بود بعد بلالے ناہے پیش آل بزرگ بے غرضانہ میرفت یک سالست کہ درد مہجوریش شفا یافتہ و ثنائی علی الاطلاق و اہل شتہ از کلام معجز نظام اوست۔

کہیں ہو اہو سوال و جواب آنکھوں میں یہ بے سبب نہیں ہم سے حجاب آنکھوں میں
سیر کردنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں زندگی گر کچھ رہی تو جوانی پھر کہاں

کچھ کام نہیں وہ بت خود کام کہیں ہو پر اس دل بے تاب کو آرام کہیں ہو

روندے ہے نقش پا کی طرح خلق یہاں مجھے اے عرفۂ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے
اے گل تو زخمت باندہ اٹھا دل میں آئیاں گلچیں تجھے نہ دیکھ سکے باغیاں مجھے

تجھی کو جو یہاں جلوہ فرمانہ دیکھا برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
تو ہی نہ اگر ملا کرے گا عاشق پھر جی کے کیا کرے گا

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں جان سے اپنی جو کوئی کہ گذر جاتے ہیں
موت کیا آگے فقیروں سے تجھے لینا ہے مرنے سے آگے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

تاقیاست نہیں ٹٹنے کے دل عالم سے درد ہم اپنی عوض چھوڑا تر جاتے ہیں

ہر دم بتوں کی صورت رکھتا ہے دل نظریں ہوتی ہے بت پرستی ابو خدا کے گھر میں
یہ رات شمع سے کہتا تھا درد پر وا نہ کہ حال دل کہوں گر جان کی اماں پاؤں

جی میں ہے سیر عدم کیجئے گا یک بیک خلق سے رم کیجئے گا
تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھوسکا میں چاہوں غیر کو سو یہ مجھ سے نہ ہو سکا
گو مالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا
سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا بس ہجوم یا بس جی گھبرا گیا

نہ ملیں گے اگر کہے گا تو تیری خاطر ہمیں معذرت ہے
درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم وہی رو رہا ہے اور وہی غم ہے
منا ہے تیری اگر ہے مست تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
نظر میرے دل پر پڑی درد کس کی جدھر دیکھتا ہوں وہی رو رہا ہے

درد درویش ہوں مری تعظیم لوگ کرتے ہیں کہہ کے یا اللہ

سوز

(الف)۔ میر سوز شاعر ریختہ گو است اس رباعی بطریق ندرت از دست
(ب)۔ محمد میر سوز تخلص کہ بہ طرز خود استاد است و وضع خواندن شعرش دیگر یا کم یاد گویند اول
میر تخلص میکرو چوں در آں ایام میر محمد تقی ہم شہرت بیدار داشت لہذا از ازل در گذشتہ بجائے میر سوز
قرن دادہ کمالات اس بزرگ اور اے کمال درویش و شاعری بسیار اند چنانچہ در تیر اندازی و سواری اسب
و نوشتن خط نستعلیق و شفیعا و نازک بندی و نزاکت فہمی شعر و آداب صحبت ملوک و سلاطین و ظرافت طبع

و فرزند روئی و تحصیل معاش و گفتن کلمتہ اخیر در حق دیگرے و با ایں ہمہ استغنائے مزاج کہ خاصہ سراسر
نظیر خود ندارد و گاہ گاہ ہے کہ با فقیر ملاقات میشود بسیار بہر بانگی می فراید و غائب و حاضر از فرغ فرات
ایں ہیچان خط و انی برداشته بے تکلف در ستایش دوستانہ می افزاید عمرش از ہفتاد تجاوز خواہد
حق تعالی باین شفقت بزرگانہ اش دیگر گاہ سلامت دارد از دست

اشک خوں آنکھوں میں آ کر جم گئے اور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے
کشور دل میں نہیں کوئی کہ آبا در ہے یوں آ جا رہے اسے تم نے بھلایا در ہے

رزق کا ضامن خدا شاہد کلام اللہ ہے تیر اپنی صورتوں سے روزِ حاجت میں
مقبروں میں دیکھتے ہیں اپنی ان آنکھوں سے رُوق یہ برادریہ پدریہ خویش یہ فرزند ہیں
تو بھی رعنائی سے ٹھوکر مار کر چلتے ہیں یار ۲ سو جتا اتنا نہیں ہم خاک کے پیوند ہیں

زندگانی میں کسے آرام حاصل ہووے گا اے آسودہ جہاں میں کونسا دل ہووے گا
تو ہم سے جو ہم شراب ہوگا عالم کا جگر کباب ہوگا
اہل ایمان سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا
صرفت العسر فی لہو و لعب ناکا کا نثر آ ناکا کا نثر آ ناکا
مجھے گر حق تعالیٰ عشق میں کچھ دست رس دیتا تو دل ان بیوناؤں کو کوئی میں اپنے بس دیتا
ستم ہے سوز گر وہ قتل کرتا اپنے ہاتھوں سے توجی دیتے ہوئے بھی صورت اسکی دیکھ نہیں دیتا

غم ہے یا انتظار ہے کیا ہے دل جواب بیقرار ہے کیا ہے
والے خلعت نہ سمجھے دنیا کو یہ خزاں یا بہار ہے کیا ہے
کچھ تو پہلو میں ہے خلش دیکھو دل ہے یا نوک خار ہے کیا ہے
کھینچ کر تیرا بیٹھے بس سوز ہے یا شکار ہے کیا ہے
جس کا تو آشنا ہوا ہوگا اُس نے کیا کیا ستم سہا ہوگا

تھر تھر آتا ہے اب تلک خورشید روبرو تیرے آگیا ہوگا

بیتیاں بتی ہیں اور اجڑے نگر آباد ہیں وے کہاں جن کے جدا ہونے سے ہم ناشاد ہیں

پرکار کی روش چلے ہم جتنے چل سکے
رونا بھی تھم گیا ترے غصہ کے خوف سے
منہ دیکھو آئینہ کا۔ تری تاب لا سکے
لخت دل مت نکل ابھی باہر
اس گردش فلک سے نہ باہر نکل سکے
تھی چشم ڈبڈبائی پر آنسو نہ دھل سکے
خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے
پیرہن آشک سے مرا غم ہے
سوز ہے یا کہ جان عالم ہے
شام سے تا صبح رونا صبح سے تا شام ہے

کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا مرے سوال کا منہ سے حجاب نکلے گا

دا سن تلک تو تیرے کہاں دسترس مجھے تیری گلی کی خاک بھی ہوں تو ہوں مجھے

سن تو رہیں یہ آہ وزاری کب تک (رباعی) بس ہاتھ نہ مل یہ بیکراری کب تک
آبی عاشق ہے تو اور آپنی معشوق پرے سے نکل یہ شرمساری کب تک

سودا

(الف) سودا کہ مرزا رفیع نام دارد۔ و ما بعد لمے شوق شعر ہند می شاگرد سلیمان علی خاں دوداؤ
و نیز پشاه حاتم رجوع داشت۔ شاہ مذکور بہمیں جہت در فخر یہ خود آسامی شاگرداں کہ نہرت
آں بر پشت سر لوح دیوان خود نوشتہ۔ اسمش نیز داخل ساختہ۔ اگرچہ مردکم علم بود اما دکاوت
و روانی طبعش از کلاش پیدا است۔ در زبان ریختہ علم کینائی ہا فراشتہ و ہمیشہ با امر صحبت

داشته قصاید غزلیہ جواب بعض قصاید غنی تصنیف نموده و ماسوائے اس در گفتن ہموما قدرت شاعری خود را نموده غرض ہمہ اتفاق بہ سبب شہرت بسیار و خوبی کلام اکستاد مسلم الشوئش میدانند و الحق کہ جنس بوده نامش در ہندوستان و در زبان بازاریاں و غزلیات دیوانش بہر اطراف و جوانب و ہر عاقل و اتمی را بر زبان باینہمہ شہرت کہ در ریختہ نصیبش بود آخر آخر خیال شعر فارسی ہم سر - - - بسر آورد۔ اگرچہ اس حرکت مناسب شانش بنو و خیر فرماہے فارسی خود نیز کہ در لکھنؤ گفتہ داخل دیوان ریختہ بقید ردیف ساختہ و اس ایجاد دوست فقیر خند شعر برے یادگار بطریق بدست از وی نوید۔

(ب) - شیر بٹہ بخندانی مرد میدان پہلوانی مرزا رفیع المتخلص بہ سودا سپر مرزا محمد شفیع کابلی کہ در عصر خویش سرآمد شعرای ریختہ گو گذشتہ بعضے اور ادریس فن بہ ملک الشعرائی پرستش میکنند بعضے بہ سبب دریافت اعلا صریح و توار و صفات در بعض اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دهند غرض ہرچہ بود در روانی طبع نظیر خود نہ داشت غزلہاے آبدار و قصیدہ ہائے سحرکار و ہجو و مثنویہاے متعددہ و غیر ہم نگاشتہ خاصہ خیالش بر صغیر روزگار یا دگار است دیوانش بفرنگ و صفایان رسیدہ دیگر اس شہرت در خواب ندیدہ۔ اگر در شمال ہند می اشعار غزل صائب و نقش گویم بجا است و اگر در علوے معانی ابیات قصیدہ خاقانی ریختہ اش خوانم رواست نقش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست حالہ کہ گوید تنبہش خواہد بود فقیر در عہد نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برے دیدن اس بزرگ بختش رسیدہ بود بہ پرورش سگان ریشم ریشم شوق تمام داشت و بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آہنا نیز قادر غرض کہ شخصے جامع الکملات بود ہر جا کہ میرفت عزت و حرمت تمام می یافت نواب مرحوم مفتور نیز وجود اورا در سرکار خود بسیار عنینت میدانستند و فاتش در لکھنؤ و مرقدش در امام بارگاہ آقا باقر روزے در ماہ محرم فقیر انجارتہ بود اتفاق زیارتش افتاد و نظر بر کتابہ فرشت کرد برال تایخ و فاتش گفتہ میر فتح الدین ماہر کہ ہدم و ہمیشہ او بود کندہ دید تایخ این است

خلد کو جب حضرت سودا گئے
فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دور کو پائے غدا
شاعران ہند کا سرور گیا

چوں تعینہ این تیغ خلاف قانون مورخاں بود در خیال فقیر گذشت کہ چنین شخص را چوں من تیغ گو
می بایست آخر ہماں روز از فیض تائید ربانی تیغ و فائز آں مرحوم و مغفور بے کم و کاست از خانہ
خیال سحر کار مولف بیرون تراویدہ غایت انباط و سرور کہ از موزونی این مصرع فصیح مادہ
تیغ کہ کالمان این فن را بہ دشواری دست و ہد خود در طبیعت خود را آفرین گفتہ آئے تیغ چنین شخص
چنین می باید

ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستان غلو
گردید فنش ز قضا خاک لکھنؤ
سودا کجا و آں سخن دلفریب او

مرزا رفیع آں کہ ز اشعار ہندیش
ناگہ چو در نوشت باط حیات را
تیغ خلش بدر آوردہ مصعفی
من کلامہ غزل سردیوان

چوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا
کھلتا ہے ابھی تل میں طلسمات جہاں کا
دنیا سے گزرتا سفر الیہ ہے کہاں کا

مقدور نہیں اُس کی تجلی کے بیان کا
پردے کو تعین کے در دل سوا تھا
ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہیرا

تو نے سودا کے تین قتل کیا کہتے ہیں یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں؟

بدلاترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے
ظالم ہماری نفس کو تشہیر ہے ضرور
عجب بیداد مجھ پر یہ مرا حیا د کرنا ہے
اچھا ہی تو فریفتہ ہوئے خدا کرے
آئندہ تا کوئی نہ کسی سے وفا کرے
دکھاتا ہے اُسے مجھ کو جسے آزاد کرتا ہے

سودا قمار عشق میں شیریں سے کو کہن
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہو عشق با
آدم کا جسم جب کہ غنا سے مل بنا
جو گذری مجھ پر اسے مت کہو ہوا سو ہوا
بازی اگرچہ پانہ سکا سر تو کھو سکا
اے رو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا
کچھ آگ بج رہی تھی سو عاشق کا دل بنا
ہلاکشان محبت پہ جو ہوا سو ہوا

لے کوئی لفظ تاجس کو کڑا پاٹ گیا ہو ۱۲

مبادا ہو کوئی ظالم نہ اگر بیاں گیسر
میرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سوا
جو عمل چاہئے کیجئے مرے دکھ دینے کا
وہ نہ کیجئے کہ کہے کوئی سزاوار نہ تھا

شاعران ہند کا تو گر پیغمبر نہیں
کیا جانئے کس کس سے نگہ اسکی لڑائی ہے
گو پیر ہوئی شاعری سودا کی جو ا نوا
ہے قسم تجھ کو فلک نے تو جہاں تک چاہے
جس روز کسی اور پر بیدار کرو گے
نہ پھول لے آرسی گریار سے تجھ کو محبت ہے
جب اپنے بند قبائلم نے جان کھول دیئے
گل پھینکے ہے عالم کی طرف بلکہ تر بھی
کیا ضد ہے خدا جانئے مجھ سا ضد و گرنہ
پر سخن کہنے میں لے سودا تجھے اعجاز ہے
جس کو چھل جا دیکھو تو اک پڑی ہے
تم سے نہ کہجئے گی یہ کہاں سمیت کڑی ہے
جلوہ حسن اُسے حسرت ویدار مجھے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے
بھرو سا کچھ نہیں اس کا یہ منہ دیکھئے کی الفت ہو
صبا نے باغ میں جا کل کے کان کھول دیئے
لے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کافی ہے تسلی کو مری ایک نظر بھی

بھر نظر تجھ کو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے
نہیں معلوم کیا اس سینہ میں جوں شمع جلتا ہے
مجھے تشنغ کیوں کرتا ہے ناصح یہ جو آنکھیں میں
خبر لے جلد سودا کی و گرنہ میں یہ دیکھوں ہوں
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے
دھواں نوک زباں سے بات کرتے ہی نکلتا ہے
بس ان خانہ خرابوں سے کسی کا کچھ بھی چلتا ہے
سرمانے اس کے بیٹھا ہاتھ سے تو ماتھ ملتا ہے

فعال

اشرف علی خاں فعال برادر رضاعی احمد شاہ بادشاہ در ابتدا سے عمر و موزنی
طبع بہ شیعہ مزار شیعہ در شاہجہاں آباد نام برینجہ گوئی بر آوردہ و آخر باہ عظیم آباد بخش معاشی می گدازند۔
تا آنکہ ہما نجا فضا کرد۔ گاہ گاہ شعر فارسی ہسم می گفت۔
(ب) اشرف علی خاں فعال عرف گو کہ خاں یعنی گو کہ احمد شاہ بادشاہ از دور و نزدیک

شعرا بصفائے تمام می گوید و نسبت شاگردی بہ ندیم می رساند چنانچہ خود گفته ۵
 ہر چہ اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں دودن کے بعد دیکھو استاد ہو گئے گا
 درایامے کہ سبب تفرقہ شاہ از شاہ جہاں آباد برآمدہ بہ طرف پورپ گذر انگشت و معرفت میر محمد
 کہ ہم مکتب ایشان بود بہ ملازمت نواب شجاع الدولہ بہادر رسید کیے از مقربان گردیدہ در جہاں نزدیکی
 روزے نواب وزیر دشتش را در عالم احتلاط بعلس نوشتند آب در دیدہ گرانید و بیچ گفت و آخر بر ہمیں
 حرکت آزرده شدہ بہ طرف عظیم آباد رفت و در سرکار راجہ شتاب راے بہ ندامت پیشگی آندہ اقتدار
 کلی بہ ہمرسانیدہ بود چند سال است کہ ہماںجا زندگانی را جواب دادہ از انتخاب دیوان اوست۔

مست قصد کر صبا تو دل داغدار کا	ظالم یہ ہے چراغ کسی کے مزار کا
کرتا ہے وصل میں در و دیوار پر طر	تجکو مزا بڑا ہے فغاں انتظار کا
عالم کو جلاتی ہے تری گرمی بازار	مرتے ہم اگر سبائیہ دیوار نہ ہوتا
رفقہ رفتہ بت خوش قدم آفت ہوگا	قدم آگے جو رکھے گا تو قیامت ہوگا
کیا سبب ہے کہ نہ آیا مرے نامہ کا جواب	خیر ہو یا رکی قاصد تو سلامت ہوگا
ایسی نگاہ کی کہ مرا جی نکل گیا	قضیہ مٹا، عذاب سے چھوٹے، خلل گیا

آنا ہمارے گھر میں تجھے عار ہو گیا	ایسا فغاں کے نام سے بنیرا ہو گیا
کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سنے نہیں	خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا
اُس کے وصال و ہجر میں یونہی گذر گئی	دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا
دل بستی قفس سے یہاں تک ہوئی مجھے	گو یا مرا جہن میں کبھی آسشیاں نہ تھا
تجکو روزی ہو مری جان دھائیں لینا	مجھکو ہر شب تری زلفوں کی بلایں لینا

لکھنا اے نامہ بردار دیوار پار پر۔ گذر جا کچھ الم دل امیدوار پر۔
 کیا تو شب فراق میں جیتا رہا فغاں؟ یہاں تک گماں نہ تھا تو یہ صبر و قرار پر۔

تو شہ راہ بھی ہسٹراں رکھتے ہیں
عاجز ہوں ترے ماتھے سے کیا کام کروں
تا حشر نہ کم ہو دے گی ظالم طیش دل
جاتا ہے فغاں تباہی ہم نفساں کل
ہو کر تیرے نفس سے میں آزاد کیا کروں
بے بال و پر ہوں اے مرے صیاد کیا کروں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک واند رکھ
ماور نہیں اگر تجھے آتا تو دیکھ لے
ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے تو ڈر کہیں
آنسو کہیں ڈھلک گئے نخت جگر کہیں

نہ دل چمن میں لگے ہے نہ کوہِ چسپاں
کوئی مکان بھی میرے لئے ہے دنیا میں

کیا تجھ سے خوش ہے دلِ ناشاد و زنگار
اتنا بھی تو نہیں کہ کرے یادِ رفتگان

تقویت ہے داغ سے میرے دل بیمار کو
اے فلاطون کیا مرض کہتے ہیں اس آزار کو

مجھ مبتلا کی چشم کہاں تک پر آب ہو
جم جم پلائے دوست تجھے اور جامے
اے دل خدا کرے ترا خانہ خراب ہو
تو مست رہ فغاں ترا دشمن خراب ہو

کہتے ہیں فصل گل تو چمن سے گذر گئی
شکوہ تو کیوں کر ہے مرے اشکِ سبز کا
تیرا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں (ق)
انصاف تو نہ چھوڑ مروت اگر گئی
اے عندلیب! تو نہ نفسِ بیج مر گئی
تیری کب آیتیں مرے لہو سے بھر گئی؟
وہ کیا ہوا تپاک وہ الفت کہ صر گئی
یوں بھی گذر گئی مری ووں بھی گذر گئی

ڈرتا ہوں محبت میں مرا نام نہ ہووے دنیا میں الہی کوئی بدنام نہ ہووے
 شمشیر کوئی تیز سی لینا مرے قاتل ایسی نہ لگانا کہ مرا کام نہ ہووے
 آتا ہے مری خاک پہ ہمراہ قسیباں پیسے اسے تربت میں بھی آرام نہ ہووے

صنم ناہر باں ہے اس قدر اے میرے بیکار مری قصیر کچھ ثابت نہیں و غضب کیا ہے
 صبا ہر ایک گل سے پوچھو گلشن میں تو جا کر گریباں چاک رہتا ہوں فغاں اس کا سبب کیا ہے

فاصلہ! تو نا امید بھرا کوئے یار سے خفت ہوئی مجھے دل امیدوار سے
 میں دیکھتا ہوں کیا کہ سر راہ ایک شخص (ق) کہنے لگا فغاں! انہیں شاکہ تو یار سے
 میں نے دیا جواب کہ سنتا ہے اے عزیز (۲) ہے دور مرتبہ مرا صبر دستہ راز سے

یہ فن کسے نہیں آیا کہ دل میں راہ کرے فغاں میں اُس کے تصدق ہوں جو نباہ کرے

وہ چاہے یا نہ چاہے فغاں آپ چاہیے اپنی طرف سے اے مرے صاحب بنا ہیے

بے طرح جوش گل نے لگائی چمن میں آگ ڈرتا ہوں آشیانے کو کافر جلا نہ دے
 تیرے ہی دل سے پوچھئے اس غم کو کہاں نکالے الفت بری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

اثر کرنی نہیں اُس بت کے دل میں آہ کیا کیجئے عجب حالت ہے میری اے مرے اللہ کیا کیجئے

یار اگر جفا کرے چاہیے دل و فاکرے یہ نہ کرے تو کیا کرے وہ نہ کرے تو کیا کرے

میں اپنے درد دل کہنے کے صدقے ترے سن سن کے پہ پہ رہنے کے صدقے

ترے فراق میں کیونکر یہ دردناک جیے مرے تو مر نہیں سکتا جیے تو خاک جیے

قائم

(الف) محمد قائم۔ قائم۔ متوطن موضع چاند پور۔ شاعر ریختہ گو است و شاگرد مرزا محمد رسیع۔ شہرت تمام دارد۔ عمر شش از شخصیت تجاوز خواهد بود۔ کم کم خیال شعر فارسی کرد و میکند چوں این تذکرہ را ماہیت بیافس ہم بہت لهذا انچہ از کلاش انتخاب افتادہ۔ حوالہ کاغذی نماید و آل این ست۔

(ب) قیام الدین علی عرف محمد قائم صاحب۔ قائم تخلص۔ اگرچہ طبعش قصیدہ چاند پور است اما توسل نسبت نوکری بادشاہی اکثر در شاہ جہاں آبادی بود۔ در آل روز نامہ در توپ خانہ ہم اسمی داشت و بہ مقضائے موزونی طبع و استعداد درست انچہ موزوں می کرد از نظر میرزا رفیع سودا میگذاشت و بہ خواجہ میرزا نیز اعتماد داشتہ بودہ است فقیر اوراد را یام و موسے بہ لباس درویشی در سرکار نواب محمد یار خاں کہ در آن روز نامہ تازہ وارد بود دیدہ در جنگلی کلام چہستی مصراع غزل و ربوہ قصیدہ و شتوی و غیرہ موافق رواج زمانہ دوش بہ دوش اتادہ را میرفت بلکہ در بعضی مقام ربحان می جست۔ در آن ایام باعث قصیدہ خواندن و نوکر شدن مولف در سرکار نواب موصوف این بزرگ شدہ بود۔ در عرصہ قلیل یہ سبب سزا و سبب نام شاعری رابطہ شد یہ بہر ساینده۔ کاغذ ہائے مودہ اشعار نواب را کہ برائے اصلاح پیش می آمدند از کم دماغی بہ دست مشورہ فقیری داد چنانچہ سہ ماہ بہ ہمیں طور بہ یک جا گذارند و شام و چاشت بیک سفر کردہ والد کہ یاد آن صحبت گذشتہ داغ ناکامی بر دل آرزو مند میگذازد و احوال بعد بہ ہم خوردن آبادی کثیر و صورت گرفتن کار فیض اند خاں رام پور والد بہ سرکار نواب احمد یار خاں پسر نواب موصوف دخیل شدہ چیزے موافق زمانہ تقرر داشت اما او فائز در آن بہ فراغت بسر نمی شد لہذا برائے راندن دیہات قدیم ملک دیومیہ و غیرہ قصیدہ مذکور در لکھنؤ مکرر گذارند و از راجہ ملکیت رے بہا و رشقہ جات و پروانہ جات بنام حامل آنجا درست کنائندہ بردہ بود کہ بعد رسیدن وطن و فائز شدن مطلب اطرش در رام پور رسید۔ و خبر وفاتش از شہر بہ شہر انتشار یافت۔ خدائش بیامزد و از دست مے پڑے کہے قاصد خط مرا اس بد زبان نے کیا کہا کیا کہا پھر کہہ بت نامہاں نے کیا کہا

لے غالباً دوش بدش اتادہ میرفت ۱۲۸۵ھ اس کے بعد پاؤصغہ جگہ چھڑی گئی ہے اور اس جگہ کی بجای میں مرغی سے از دست گیا ہے

نہ وعدہ اُس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں
پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

جو کو کہن تجھے قوت ہی آزمانا تھا
عوض پہاڑ کے شیریں سے دل اٹھانا تھا
معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا وہ کیا
پیامبر کے نہیں ساتھ آپ جانا تھا!

عیش و طرب کہاں ہے غم دل کدھر گیا
صدقے میں اس گذشت کے کیا کیا گز گیا

ہو اگر ایسے ہی مری شکل سے بیزار بہت
تم سلامت رہو بندے کے خریدار بہت
قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مرچکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

چاہیں ہیں یہ ہم بھی کہ رہے پاکِ محبت
پر جس میں یہ دوری ہو وہ کیا خاکِ محبت

یہاں سے اٹھ غیر کے گھر شب تو گیا کہتے ہیں
بارے اے نیک مروت اسے کیا کہتے ہیں

خوش رہ اے دل اگر قوتِ شاد نہیں
میں کہا: ”عہد کیا کیا تھا راستہ“
یہاں کی شادی پہ اہمیت دہنیں
ہنس کے کہنے لگا کہ ”یاد نہیں!“

آپ جو کچھ تیار کرتے ہیں
سی تو لینے دو جبِ ناصح کو
کبھی ہم اہمیت بار کرتے ہیں
اب کے ہم تار تار کرتے ہیں
چلئے قائم کہ رفتگاں اپنا
دیر سے انتظار کرتے ہیں

کہتا ہے آئینہ کہ ہے تجھ سا ہی لیکار
تاکیم یہ جی میں ہے کہ تعید سے کشمکش کی
باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کروں
اب کی جو میں ناز کروں بے وضو کروں

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی سرکار کی تو نظروں کو ہینچتا ہوں یہ
جو رپہر دوری یاراں واروئے غیر جو کچھ نہ دیکھتا تھا سوا بے دیکھتا ہوں یہ

ہنوز شوق دل لے قرار باقی ہے مجھے ہے آگ تو لیکن شرار باقی ہے
گیا تھا آج میں قائم کے دیکھنے کے لئے کوئی دم اور نفس کی شمار باقی ہے

یار ب کوئی اس چشم کا بیمار نہ ہووے دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہووے

کیا کیا عدم میں ہم پر ظلم و ستم نہ ہوں گے چرچے یہی رہیں گے اور ہائے ہم نہ ہوں گے

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یا نہ پھرے کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدانہ پھرے

شاید وہ بھول کر کبھی یہاں بھی قدم رکھے یکساں کرو زمین ہمارے مزار کی

وہ بھی کیا دن تھے کہ جی کو لاگ اُس کے ساتھ تھی میں تھا اور کوچہ تھا اُس کا اور اندھیری رات تھی

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بوا بھی ہے اک ڈھیر ہے یہاں راکھ کا اور آگ دہی ہے

شکوہ نے غیر سے نے یار کی بیزاری سے جو ہوا ہم پہ سو اس دل کی گرفتاری سے

قلم کی سرگزشت

از جناب محمد حمید اللہ صاحب بی۔ اے

خامہ فرسائی کرنے والوں کی روز افزوں کثرت سکھ دیکھتے خود آلہ خامہ فرسائی پر اب تک کچھ نہ لکھا جانا تعجب خیز ہے، مجھ جیسے ناکارے نے چند گفتگوں کی تلاش کے بعد جو پیش کیا ہے وہ خدا نہ کرے کہ آخری ثابت ہو۔ ”قلم“ ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی قطع کوٹنے کے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ عربوں میں سب سے پہلے جو لکھنے کا آلہ رائج ہوا وہ غالباً واسطی یا برو کے قلم کا کوئی ہم جنس تھا۔ یہ لفظ ترکی، فارسی اور اردو میں بھی مستعمل ہوتا ہے ترکی میں اس کا کوئی مرادف مجھے نہیں ملا، البتہ فارسی میں ”خامہ“ (تلفظ خامے) برتا جاتا ہے۔ معلوم نہیں یکس لفظ سے نکلا ہے۔ اردو میں قلم، ہولڈر وغیرہ تمام دوسری زبانوں کے الفاظ ہیں۔ البتہ سنسکرت لفظ ”لیکھنی“ بھی اردو میں برتا جاسکتا ہے جو لکھنے سے مشتق ہے (ملک ماخذ) جو مہریشی لفظ مزید تحقیق کا محتاج ہے۔ یورپی زبانوں میں سے انگریزی لفظ ”پین“ (PEN) ہے۔ یہ لاطینی لفظ ”پینا“ (PENNA) سے ماخوذ ہے۔

فرانسیسی میں ”پلیوم“ (PLUME)، المانی (جرمن) میں ”فیڈر“ (FEDER) کہتے ہیں اور ان تمام الفاظ کے معنی پرندے کے پر کے ہیں۔ مگر انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مقالہ نگار (PEN) کی رائے میں ”قدیم زمانے میں کتبہ حروف پیدا کرنے کے لئے جو آلات مستعمل تھے ان میں پروں کی سخت کھوکھلی چھڑی نہ تھی۔ سب سے قدیم آلات غالباً نوکدار سوا ہے جو دھات، ہڈی یا ہاتھی دانت کا ہوتا تھا۔ اور کسی درخت کی لکڑی سے بنائی ہوئی تختیوں پر جوچہ پر موم منڈھا ہوا ہوتا تھا، حروف گندہ کئے جاتے اس قسم کے قلم کو اسٹائل کہتے تھے (دیکھو آگسٹوٹکسٹری) تاہم مقالہ نگار کو بھی تسلیم ہے کہ بعض پودوں کے ڈنڈل نیز بیویا بانس کی چھڑیاں لکھنے کے کام آتی تھیں۔ اور وہی ”موجودہ قلموں کے حقیقی قدیم نمائندے“ ہیں ایسے قلموں کو چھیل کر نوکدار بناتے ہیں اور نوک یا زبان قلم کے درمیان میں ایک شکاف دیتے ہیں۔ نوک بنانے کو خط لگانا کہتے ہیں۔ انگریزی لفظ ہولڈر کا ماخذ ہولڈ ہے جس کے معنی گرفت اور پکڑنے کے ہیں۔ مزید الفاظ مثلاً ٹنکی، کڑی، گجراتی، بنگالی، یونانی، اطالوی وغیرہ کی تحقیقات اور فراہمی پر میرے بعد اس موضوع پر قلم اٹھانے والے صاحب میرے مضمونوں میں کہ میں نے بہت سی نجائش ان کے لئے باقی رکھ چھوڑی ہے خواہ اس کا باعث درد سہی سے بچا ہی کیوں نہ ہو۔

یہ معلوم نہیں کہ قدیم ترین تحریرات مثلاً ہیر و خلیفی وغیرہ کیونکر لکھی جاتی تھیں۔ موم منڈھی ہوئی تختیوں پر روم میں قبل مسیح ستوے سے لکھا جاتا تھا۔ پروں کے قلم بھی مروج ہوئے مگر ان کا زمانہ غالباً بہت بعد کا ہے کیونکہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے کہ پروں کے قلم کا خصوصی تذکرہ سینٹ اسیدور آف ساویہ (ST. SIDORE of Savile) کی تحریروں میں ملتا ہے۔ یہ ساتویں صدی کی ابتدا سے متعلق ہے۔ مگر یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس سے بہت پہلے بھی پر لکھنے میں مستعمل نہیں ہوتے تھے۔

عموماً قاز کے بازو کے پر قلم کے کام میں آتے ہیں اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے بموجب ۱۸۰۹ء میں جوسف براما (J. BRAMAH) نے پر کو تین تین چار چلٹا کرے کرنے کا ایک اہم بنا کر اپنے نام سے حق ایجاد کا تحفظ کرایا۔ وہ ہر ٹکڑے کو دو سے پانچ تک شکاف دیا کرتا تھا۔ مگر یہ شکاف قلم یا پر کی طرف ٹوک پر ہوتے تھے۔ اور بقدر ضرورت طویل بنائے جاتے تھے۔

اس کے بعد ہی پتی دلم قلم وجود میں آئے۔ ان میں پتی (رب) قلم میں لگائی جاتی اور ناکارہ ہونے پر بدلی جاسکتی تھی۔ ۱۸۱۶ء میں چارلس واٹ نے پروں اور قلموں کے متعلق ایک اور ایجاد کا تحفظ کرایا۔ یہ نہری قلموں کا پیش خیمہ تھا۔ مگر اس سے زیادہ اہم ترقی ۱۸۲۲ء میں ہوئی جب ہاکنس (J. HAWKINS) اور مارڈین (S. MARDEN) نے کانٹوں اور کچھوے کی پشت کا سخت غلافی مادہ قلم کی پتیوں میں استعمال کرنے کا حق محفوظ کرایا ان پتیوں کی نوک ہیرے یا لعل کے ریزوں یا کسی اور ایسی ہی سخت چیز سے دیرپا بنائی جاتی تھی۔ یا کچھوے کی کھال سے بنائی ہوئی پتی کی نوک پر سونے کی ایک ہلکی پرت چڑھا دی جاتی تھی۔

دھاتی قلم کو قدیم زمانے سے استعمال میں آنے لگے تھے جس کا ایک بچا کچھ نمونہ پامپی آئی کے کھنڈروں سے دستاب ہوا تھا اور اب ناپلی (NAPLES) کے عجائب خانے میں نمایاں کیا گیا ہے۔ مگر سچ پوچھئے تو انیسویں صدی کے وسط تک ان کا عام رواج نہ تھا اور ہوتا بھی کیونکر؟ لکھنے پڑھنے کا بھی تو عام رواج نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ برنگم ایک کل کار (میکانائٹ) اور چھلہ ساز (SPLITTING MANUFACTURE) نے جس کا نام سیامویل ہیرسن تھا ۱۸۲۷ء میں ایک فولادی قلم ڈاکٹر جوشیا پرست کے لئے تیار کیا۔ ۱۸۳۰ء میں لندن میں وائز نامی ایک شخص فولادی قلم بنا کر فروخت کرتا تھا۔ اس کی شکل معمولی پر کے قلموں کی سی تھی اور اس میں شکاف بھی تھا۔ اس کی قیمت پانچ شلنگ کے قریب تھی۔ لیکن چونکہ وہ سخت اور نامالام ہونے کے علاوہ غیر تشفی بخش تھا اس لئے اس کی زیادہ مانگ نہ تھی۔ ۱۸۳۷ء میں برنگم میں پیری کے قلم بکتے نظر آئے۔ اس پر جوشیا مارسن نے جو سیامویل ہیرسن کا شریک کار تھا۔

پیری سے اشتراک عمل کر کے اس میں بہت سی اصلاح و ارزانی پیدا کی اور پہلے ٹلی دار اور پھر تنگاف دار قلم بنائے۔ پیری نے جو دھاتی قلموں کے عام استعمال میں آنے کا بڑا باعث ہے، مشتمل میں ایک اور ایجا د محفوظ کرائی جس میں پتی ایک درمیانی سوراخ اور طرفی تنگافوں کے ذریعے بہت نرم کر دی گئی تھی۔ ۱۸۳۱ء میں جو سٹ گلاٹ نے یہ اصلاح کی کہ پتی کی نوک لانی کر دی۔

برسنگھم فولادی قلم سازی کا پہلا گھر ہے اور اب بھی اس کا اہم مرکز ہے۔

موجدوں نے فولاد کے علاوہ دوسری دھاتوں کے استعمال کی بھی تجویز کی۔ ان میں سے سونا، چاندی، جست، جرمین سلور، الومینیم، الیومینی کا نسا زیادہ عام ہیں۔ ڈاکٹر ڈالٹن کے پامن سنہری قلم کا ہونا بیان کیا جاتا ہے اس میں ہلکے سنہری خلاف کے سرے پر ریڈیم دھات لگائی گئی تھی۔ یہ ظاہر یہ ڈالٹن کی شہ کی ایجاد کے اصول پر تیار کیا گیا تھا اور اس قسم کا ایک قلم مشتمل ۱۸۷۱ء میں لارڈ ہارن شہر رشتا نے استعمال کیا تھا۔ سونا چونکہ ایک نہ گھسنے والی دھات ہے اس لئے اس سے مینی ہوئی پتیاں بہت پائدار ہوتی ہیں۔ مگر یہ دھات اتنی نرم ہوتی ہے کہ اس سے نوک نہیں بنائی جاسکتی۔ اسی وجہ سے اس میں ایک سخت تر دھات لگائی پڑتی ہے۔

باربار نئی سیاہی لئے بغیر قلم کو زیادہ سے زیادہ دیر تک مصروف رکھ سیکنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں اگر سیاہ درنگین منسلوں کو خارج بھی کریں تو خزانہ دار اور دیگر کش قلموں کی دو عام قسمیں ہو سکتی ہیں : ایک میں پتی ہی ایسی بنائی جاتی ہے جو زیادہ سیاہی رکھ سکے۔ دوسری قسم بہت زیادہ اہم ہے۔ اس میں قلم کا تنہ سیاہی کا خزانہ بنایا جاتا ہے۔ سیاہی تنے میں سے خود بخود پتی میں آتی رہتی ہے۔ ایسے قلم ہر جگہ لچکے جاسکتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا سے ایسے قلموں کو سیاہی دار ٹلی اور فٹنٹین پین کہتے آئے ہیں۔ مگر سچ پوچھئے تو اس کے ایک صدی بعد کے موجدوں نے ان کو ملنا شروع کیا۔ جو سٹ براما نے متعدد نمونوں کی ایجاد محفوظ کرائی۔ ان نمونوں میں سے ایک یہ تھا کہ سیاہی دان چاندی یا کسی اور دھات کے اتنے پستے درقوں یا ٹکڑوں سے بنایا جاتا تھا کہ اسے دباسکتے تھے، اور اس طرح سیاہی پتی میں پہنچائی جاتی تھی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ سیاہی دان میں ایک چھوٹا سا عمود یا ستونہ رکھا جاتا تھا جو پمپ کے اصول پر کام دیتا تھا۔ جدید قلموں میں سیاہی خود بخود پتی تک پہنچ جاتی تھی اور سیاہی دان میں ہوا جانے کا راستہ رکھنے کے باعث کڑی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تھی اور سیاہی کے خرچ ہونے سے جو غلا پیدا ہوتا تھا اس میں ہوا داخل ہو جاتی تھی۔

بعض خزانہ دار قلم سیاہی کش ہوتے ہیں۔ اور پمپ کو حرکت دینے سے خود بخود سیاہی قلم کے تنے

میں بھر جاتی ہے۔ یہ نسبتاً حال کی ایجاد تو نہیں البتہ اصلاح ہے۔

بعض قلموں میں توتی سرے سے نکال دی گئی ہے اور سیاہی ایک باریک نلی میں سے اترتی ہے جس کے اندر ایک مخروطی سوئی ہوتی ہے قلم کو کاغذ سے لگانے پر یہ سوئی اندر دیکر سیاہی کا راستہ چھوڑ دیتی ہے اور کاغذ پر سے قلم اٹھا لینے پر سوئی پھر ابھر کر باریک نلی کا راستہ بند کر دیتی ہے اور سیاہی کو ٹپکنے یا قطرے سے روک دیتی ہے۔ ایسے قلم اسٹیلو گراف کہلاتے ہیں۔

فونٹین پین ربرور گندھک کے مرکب کو سخت کر بناتے ہیں۔ جیسا کہ بک آف نالیج ص ۲۵ میں لکھا ہے حال ہی میں امریکہ میں شب چراغ قلم نکلے ہیں جن میں پتہ کے پاس ایک چھوٹا سا برقی مقعدہ (باب) ہوتا ہے اور اسی مناسبت سے برقی خزانہ یا بیٹری ہوتی ہے۔ اس میں روشنی صرف اس حصے پر پڑتی ہے جہاں لکھنا مقصود ہوتا ہے۔ (ماڈرن ریویو لکھتہ)۔

قلم کی بعض اورتھوں میں بلغم سنگ (SLATE) کا قلم اور سرے کا قلم یا پینسل اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی بہت سی ذیلی قسمیں ہیں خشک اور سیال رنگ کی مدد سے لکھنے والے قلموں کا ایک حد تک ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن کھرچے ہوئے حروف کی ایک اب بھی باقی ماندہ شکل سلیٹ کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ اس میں بلغم سنگ ذرہ بکزم پتھر پر اور حال میں مزید پانداری کے لئے کاغذی مٹھوں پر اس کا مسالہ لگا کر — آسانی مٹ سکے والے حروف کھرچے جاتے ہیں۔ یہاں قدیم پتھوں کی تحریروں کی طرف ایک اشارہ بے محل نہ ہوگا۔ جو ناظر وغیرہ کے پتھوں پر لکھی جاتی تھیں۔

مضمون بڑھانے کی خاطر ہم حروف نوشت آلے یعنی ٹائپ رائٹر اور مطبع یا پریس کا اس سلسلے میں ذکر نہ کر سکتے ہیں۔ حالیہ زمانے میں کلکاری کی ترقی سے حروف خود بخود اصل کر جیتے جاتے ہیں اور متعدد کام بہ آسانی یکجا طے ہو جاتے ہیں۔

اب آواز نوشت آلے یا قلم بھی عام ہو چکے ہیں۔ اس کے ذریعے سے آواز کا اتار چڑھاؤ وغیرہ اپنے آپ کو ایک خط منجھی میں (.....) تحریر کر دیتا ہے۔ سر دمالک میں بادل پر لکھنا اب مروج ہو چکا ہے۔ اس کا اشارہ بھی ضروری تھا۔

اس ضمن کے اختتام پر بالوں کے قلم یعنی برش کا تذکرہ شاید غیر متعلق نہ ہوگا۔ یہ رنگ آمیزی خصوصاً نقشہ کشی کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور گھری وغیرہ کے بالوں سے بنایا جاتا ہے۔

اپنے خیالات کو خواہ الفاظ اور عبارت میں یا نقش و نگار میں دوسروں کے لئے اور نیز خود اپنی آئندہ ضرورتوں کے لئے محفوظ کر لینا قلم کا فرض ہے۔ لکھنے کے ساتھ ہی ہم کو تحریر اور ساتھ ہی ساتھ پڑھنے کا بھی خیال کرنا چاہیے غیر معمولی (UNCONVENTIONAL) اشارات سے ہمیں زیادہ بحث نہیں۔ ان کو صرف خاص شخص ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس قسم کے مخفی خطوط کا ذکر زیادہ صحیح طور پر خط یا تحریر کی تاریخ میں آنا چاہیے۔

قلم کے ساتھ قلم سازی، قلم فروش، خوش خطی، تصنیف و تالیف یعنی نفس خامہ فرسائی، ٹائپ اور طباعت مع فروع سب قلم کے ذیلی متعلقہ پیشوں میں داخل ہو سکتے ہیں مگر ان کا تذکرہ بھرتی کے مضمون کے سوا اور کیا بھیجا جاسکتا ہے؟

افسوس ہے کہ اس ضمن میں بالکل جستہ نگاری پر انکار ناپڑتا ہے کسی وسیع تلاش اور جستجو کو کسی آئندہ موقع یا مضمون نگار کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں لفظ قلم تین چار جگہ وارد ہوا ہے سب سے اہم وہ آیتیں ہیں جن سے تین تار کا مسلمان بچوں کو پڑھنا شروع کرایا جاتا ہے اور جو سب سے پہلی وحی میں سرور کائنات صلعم پر نازل ہوئیں۔ وہ یہ ہیں :-

اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝

اس جامع اور حقیقت آمیز تذکرے کا ترجمہ یہ ہے کہ ”پڑھ اپنے خالق پروردگار کے نام سے جس نے انسان کو منجھ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اپنے بزرگ پروردگار کے نام سے جس نے قلم کے ذریعے سے تعلیم دی اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا“

ایک مشہور تفسیر میں اس کے متعلق یہ تعلیق کی گئی ہے کہ ”خدا نے اپنے بندوں کو نامعلوم باتیں معلوم کیں اور انہیں جہل کی تاریکی سے علم کی روشنی میں پہنچایا اور فن کتابت کی فضیلت سے آگاہ کیا کیونکہ اس میں جو عظیم منافع ہیں وہ غیر محدود ہیں۔ تمام علوم کی تدوین، حکومتوں کا گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا ان کے مقالات کا اور نثری سن اللہ کتابوں کا انضباط اسی کے ذریعے ممکن ہو سکا۔ اگر یہ فن نہ ہوتا تو دینی و دنیاوی امور میں استقامت پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ خدا کی عظیم ترین حکمت اور لطیف ترین تدبیر تھی کہ قلم اور خط انسان کو دے گئے۔“

حضرت ابن الزبیر قلم کے معنی ”علم النجہ“ کے لیتے ہیں۔

ایک اور جگہ یہ آیت ہے: ﴿لَقَدْ عَلَّمْنَاهُ فَاذْنًا وَمَا كَفَرَ ۚ وَلَقَدْ عَلَّمْنَاهُ فَاذْنًا وَمَا كَفَرَ ۚ﴾ یعنی قسم ہے نون اور قلم اور

اس چیز کی جسے لوگ لکھتے ہیں۔ لفظ ”نون“ کے مختلف معنی مراد لئے جاتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے میں ”نون“ سے مراد دولت ہے جیسا کہ حرفِ نون کی شکل دلالت کرتی ہے بعض لوگ اس کے معنی ”کرہ“ ارض کے لیتے ہیں۔ غرض حقیقت جو بھی ہو خدا جن چیزوں کی قسم کھاتا ہے ان میں شامل ہونے کی عزت قلم کو بھی حاصل ہے اور اس کا باعث اس کی وہ عظیم اہمیت ہے جو اسے انسانی تمدن میں حاصل رہی ہے۔

تیسری جگہ ایک ضمنی تذکرہ ہے کہ حضرت مریمؑ خدا کی تولیت حاصل کرنے کے متعلق بیت المقدس کے رہسوں میں جب اختلاف پیدا ہوا تو انہوں نے قلم سے قرعہ ڈالا تھا ”اِذْ يُلْقُونَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ“ یعنی جب وہ اپنے قلم یہ معلوم کرنے کے لئے ڈالنے لگے کہ کون مریمؑ کی کفالت کرے ”یہودی روایات کے بموجب سب عابدوں کے قلم پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگے لیکن حضرت زکریاؑ کا قلم بہاؤ کی مخالفت سمت میں اوپر جانے لگا اس طرح انہیں کو کفیل قرار دیا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب اس سے کم از کم اتنی بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کے زمانے سے پہلے بھی قلم رائج ہو چکا تھا اور اس سے توریت لکھی جاتی تھی۔

ایک اور جگہ سورہ لقمان میں یہ آیت شریفہ ہے کہ ”وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرٍ وَّ اَقْلَامٍ وَّ الْبَحْرِ مِثْلَهُ مِمَّنْ بَعَلَّوْا سُبْحَةَ الْحَمْدِ مَا فَعَلَتْ کَلِمَاتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَلِیْمٌ“ یعنی اگر زمین پر کے تمام درخت قلم ہو جائیں اور سمندر سیاہی کا کام دے اور اس کے بعد پھر سات سمندر ہوں تو بھی خدا کی نشانیاں ختم نہ ہوں۔ بے شبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

احادیث بھی اس کے متعلق متعدد ہیں چنانچہ یہ مشہور حدیث ہے کہ ”اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ اَلْکُتُبُ فَجَرَّحَ بِمَا هُوَ کَا بُنْ اِلَى الْاِلَیْہِ“ یعنی خدا نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا پھر اسے حکم دیا کہ لکھ۔ چنانچہ ابدالہر تک جو کچھ ہونے والا تھا اسے قلم نے لکھ دیا۔

جَعَلَ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ کَا بُنْ بھی ایک حدیث ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ قلم جو کچھ ہونے والا ہے اُسے لکھ کر سوکھ گیا یعنی تقدیر ہو چکی اب اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

ترمذی میں ایک حدیث زید بن ثابتؓ سے جو وحی نوسین کا معرکہ انجام دیتے تھے ”یَوْنُ مَرُوی ہے کہ خُضِعَ الْقَلَمُ عَلٰی اَذْنِکَ فَانْتَ اَدْرَکُہُ“ یعنی قلم اپنی کان پر رکھو۔ یہ لکھنے والے کو خوب یاد دلانا ہے۔ ایک حدیث ایک ترک غلطی کے شکار سے پرہیز نظر آتی ”بِسْمِ اللّٰهِ نَقَّطَ الْعِلْمَ بِاللَّوْنِ وَالْقَلَمُ“ یعنی خدا نے نون اور قلم کے ذریعے اپنی حکمت سے نظامِ عالم مکمل و مستحکم کیا۔

عربی اردو ترکی فارسی اشعار غالباً بہت سے ملیں گے۔ اس وقت صرف دو تین منقولوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

و رواقہ رقص کمثل اراقہ

قطف الخطا نیا لہ اقصى المدی

سود القوافل ما لم یجد سیرھا

الا اذا لعیت ہا بیض المدی

یعنی قلم کی تحریر بعض وقت سانپ کے زہر کا اثر رکھتی ہے اور اس کا اثر ہمیشہ ابد ہر تک باقی رہتا ہے۔ جب تک وہ چلتا نہیں اس کے پاؤں (روشنائی سے) سیاہ رہتے ہیں اور جب صاف نیلے تو چاقو سے پھیلا جاتا ہے۔

قلم گفت کہ من شاہ جهانم قلم کش ابدولت می رسانم
اگر بد بخت باشد من چہ دامن ولی یک بار بدولت میرسانم

ارباب قلم تربیت آموز اُمید

آداب ام ماہصل فیض قلم

قدر قلمی آکلا کہ اجلال غنیمی

نزدیک اظہید، بلیہ جای قسم

بہ فیض قلم اور فضیلت کہ ہمیشہ

ہم دولت ہم ملتہ مسؤل اہم

جہرای قلم دن دو کون بار معارف

باغ وطن و دولتہ باران کرم

اہل قلمک بیلیدر قدرینی زیر

اندیشہ لری عائدہ ابواب نعم

یعنی اہل قلم قوم کے معلم ہوتے ہیں اور کسی قوم کے ادبیات قلم ہی کے مرہون منت ہیں۔ قلم کی اتنی بڑی عزت ہے کہ خدا نے اس کی قسم کھائی ہے۔ سب جگہ قلم کا فیض ہے اور اس کی اتنی عزت ہے کہ سلطنت اور قوم دونوں اس کو اہمیت دیتے ہیں۔ قلم کی ہندی و تحریر سے ملک اور سلطنت کا باغ سیراب ہوتا ہے اہل قلم کی قدر و منزلت معلوم کرنی ضروری ہے کیونکہ اس کے افکار و خیالات سے دنیا بہرہ اندوز ہوتی ہے۔

انثار محبت

(از جناب شیر حسین صاحب قلیں متعلم جامعہ عثمانیہ)

(۱)

جان ایک غریب کسان کا لڑکا تھا۔ اس کی عمر بارہ سال کی تھی۔ اس کا جسم سبڈول اور قوی تھا آنکھیں بڑی اور کالی تھیں۔ وہ ایک ذہین اور ہوشیار طالب علم تھا۔ اور بورڈنگ ہاؤس میں سکونت پذیر تھا۔ چونکہ اسکول بند ہونے والا تھا۔ اس نے اس نے بورڈنگ کو خیر باد کہا اور اپنے مکان کو جو قریب کے قصبہ میں واقع تھا روانہ ہوا اور رات ایک سرے میں سبرک۔ علی الصبح جات اٹھا۔ اور منہ دھونے کی غرض سے باہر کے حوض پر آیا۔ اس انشائیں ایک گچی جو کسی امیر کی معلوم ہوتی تھی۔ سرے میں آکر کسی نیس میں سے میری اماؤٹس اور اس کی وہ سالہ بیٹی لارنا آئیں۔ یہ لوگ ابھی اچھی طرح دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ ایک سوار نے ڈون کی خبر دی جو چند آدمیوں ظلم کر رہے تھے۔ اس خبر سے سب کے دل لرز گئے اور ایک ہل چل مچ گئی۔ کیونکہ ڈون ایک قزاقوں کا گروہ تھا۔ اس قصبہ کے قرب و جوار کی پہاڑیاں اور ٹھائیاں ان کا ماویٰ و ملجأ تھیں۔ ان کا دست تپاول جیہ پر چھایا ہوا تھا ہر فرد ان کے نام سے کانپ اٹھتا۔ اور سچا رے مسافروں کی جان تو ہنٹیلی پر تھی۔

میری کی گچی منزل مقصود کے لئے تیار ہو چکی تھی وہ دوسرے راستہ سے جو زیادہ پر خوف نہ تھا جانولے تھے جان صاحب ملکر منہ اور سر دھونے ہی والا تھا کہ لارنا کا ادھر سے گزر ہوا۔ کیونکہ گچی وہیں قریب کھڑی تھی۔ لارنا کھڑی ہو گئی اور ہمدردی کے طور پر اس نے جان کے سر پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ جان اس سے مطلق بے خبر تھا۔ اس نے منہ پونچھا۔ پھر اس کی نظر معصوم لارنا پر پڑی جو مسکرا رہی تھی جان نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور بہت خوش ہوا۔ وقت تنگ تھا اس لئے آپس میں زیادہ بات چیت نہ ہو سکی۔ جان چاہتا تھا کہ لارنا کو کوئی نشانی دے۔ بیچاے غریب کے پاس کیا دے گا تھا جو دیتا۔ آخر اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا جس پر جان کندہ تھا۔ اُس نے چاقو دیتے ہوئے کہا "لارنا مجھے بھول نہ جانا یہ چاقو میری نشانی ہے۔ لیکن ہے کہ کسی آفت کے وقت کام آئے" لارنا کی نشانی آنکھیں مہ ہون منت ہونے کا ظہار کر رہی تھیں اور اس کا چہرہ دلی احسان کی جانی کر رہا تھا۔ جو قدرتنا اس اتفاقہ ملاقات سے پیدا ہوئے تھے۔ اُس نے بھی اپنی تمام طفلانہ ادائے نیاسیت کے ساتھ ایک رومال پیش کیا اور جان نے اس کا پیش کش قبول کیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ لیکن ان کے پاک دل ایک دوسرے کو گہری نظر محبت سے یکدم چھ تھے

گاڑی روانہ ہوئی لوگوں کوڑے نہایت تیزی سے بھاگ رہے تھے کہ مبادی راستہ میں کہیں شام نہ ہو جائے۔ جان اسے برابر دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ گھٹی ناہوار راستے کو طے کرتی ہوئی انکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے معصوم دل میں ایک خفیف متا در پیدا ہوا۔ انکھوں میں دوڑے بڑے گرم آنسو بھر گئے۔ یہ اولین زمینہ محبت تھا۔

خوشید اپنی ضیاء شاعروں کو سیٹھے آنکوش مغرب میں پنہان ہو چکا تھا۔ تار کی بڑھ رہی تھی۔ گھٹی کے گھوڑے ہو اسے باتیں کر رہے تھے۔ ان کی ٹاپوں کی آواز اطراف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر ایک گونج پیدا کر رہی تھی۔ قزاقوں کے سردار سرایہ ڈون نے آواز سنی اور گھٹی کو دیکھتے ہی غتاب کی طرح اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو لئے ہوئے تازہ شکار پر گرا اور عین دریائے بیچ گھیر لیا۔ میری اور لانا مارے ڈر کے ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ ڈاکوؤں نے میری کو گھسیٹ کر گود میں اٹھالیا۔ لیکن لانا برابر جان کے چافوکی مدد سے بچاؤ کرتی رہی۔ آخر کار وہ بھی سردار کے پاس لائی گئی۔ اُس نے لانا کو اپنے گھوڑے پر بٹھالیا۔ اور میری کے گلے سے موتیوں کا ہار چین لیا۔ جگر سوختہ ماں بیٹی لپٹ کر رونے لگے لیکن میری ڈون نے اسے اکیلا دھکیل دیا۔ اور وہ سب روانہ ہوئے۔

میری دریائے کنناہ پر ہی ہوئی تھی۔ اپنی حالت پر آنسو بہا رہی تھی۔ ایک بڑی سے لہرائی اور بیہوش میری کو آنکوش میں لیکر لانا سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

بہادر جان گھٹی کے پیچھے پیچھے پہاڑ کی چوٹی تک نکل آیا تھا اس نے سب کچھ دیکھا۔ وہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا اس نے ایک بڑا پتھر اٹھا کر نیچے پھینکا جہاں سے قزاقوں کی جماعت گزر رہی تھی جس کا اثر کچھ ہوا تو نہیں۔ اور وہ بیچارہ کر کیا سکتا تھا۔ مگر قزاق پریشان و ضرور ہوئے۔ اس نے قسم کھائی ”میں بڑا ہو کر ایک ڈون کو بھی زندہ نہ رہنے دوں گا۔ اور کچا جبا جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے مکان واپس ہوا۔ لیکن اس حالت میں کہ اس کے پر جوش دل میں خون انتقام موجیں مار رہا تھا۔

(۲۱)

اس واقعہ کو گذرے کئی سال ہو گئے۔ دنیا میں کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ جان جوان ہوا۔ بلکہ قوی خوشنود و جوان لیکن اس کا دل لانا کی محبت سے کبھی خالی نہ رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اسے یاد کر کے بھارتا۔ اس کا عہد طفلی انکھوں میں برابر گھومتا۔ اس کی آنکھیں مجبور اس کے گیسو عبیرین دام الفت کی طرح جان کو کھینچ رہے تھے۔ اس کا سیکرنا زنین جان کے دل میں حرف کا لہجہ کی طرح نقش تھا۔ اس کی زبان اس کی محبت کے گیت الاپتی۔ اور وہ بہت دیر تک اس کی خیالی تصویر سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ اس کی نظریں وہ نعت حسن تھی۔ سر پانا ز۔ اور اب وہ حسن کی دیکھا

کی طرح اس کی پرستش کرتا وہ دوشیزہ تھی جس کے ہر انداز میں وہ شباب کی رعنائیاں مضمر تھیں جو بہت جلد رونما ہو کر دنیا میں بے مثل نظیر حسن پیش کرنے والی ہیں۔ اسکا خیالی تصور اسے ورطہ حیرت میں ڈال دینا کہ آف اسکی کافر جوانی کس بلا کی ہوگی۔ اور وہ ہم جاتا۔ اگر لارٹا ان خوبیوں سے مبرا ہوتی تو جان اپنی چھری بہن الزبتھ سے کبھی کے شادی کر لیا ہوتا۔ مگر لارٹا اس کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ وہ اسکا سچا پرستار تھا۔ اس کا دیوانہ اور اس کی شمع حسن کا پروانہ اس کے تصور سے اس پر ایک کیفیت مستولی ہوتی۔ اور وہ جھومنے لگتا۔ گولارٹا کی جدائی کو چھ سات سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ تاہم وہ اس کی راہ محبت میں ایک اٹل پہاڑ تھا اور لارٹا کی موہنی مورت اس پر کھدی ہوئی تھی۔

وہ روزانہ حسب معمول ندی میں سے لکڑی کا شیتر اٹھا رہا تھا جس کو وہ اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ یہ ندی قزاقوں کے مکان کے قریب سے گذرتی تھی۔ جان نے تھوڑی دور تک اسے لاسنے کی کوشش کی لیکن وہ پھسلا۔ سنھلا مگر پانی کا سیل سیل بے پناہ کی طرح امنڈ رہا تھا۔ جس نے اسے بہا دیا۔ اس نے کوشش کی کہ کسی تھکرے قریب رکا ہے وہ لگیا مگر اس کے سامنے ایک بلند آبشار تھا جو ۲۰۰ فٹ کی بلندی سے نیچے گر رہا تھا۔ اس کے آنکھوں کے سامنے اندھیرا بھا گیا۔ اسے موت کا یقین ہو گیا۔ ایک ریلے نے اسے آبشار کے خونخوار منہ میں ڈال دیا جس نے اسے مچھلی کی طرح نیچے پھینکا۔ اور وہ بہنور میں چکر کھانے لگا۔ اس کی قسمت نے یاوری کی۔ اور بہنور نے اسے اٹھا کر کندہ پر اچھل دیا۔ وہ بیہوش تھا۔ ادھوا۔ اور اس کے سر سے خون جاری تھا۔

ایک گھنٹہ کے بعد اس نے اپنی آنکھ کھولی۔ اسے جنت کا خیال ہوا۔ پھر اس نے ایک دوشیزہ کو دیکھا جسے زانو پر اس کا سر تھا اور وہ اس کا زخم صاف کر رہی تھی اسے خیال ہوتا تھا کہ اس شخص کو اس نے کبھی دیکھا ہے۔ جان نے اسے حور تصور کیا وہ ششدر تھا۔ فوجوان لڑکی نے ایک درباہتسم کے ساتھ اس کا نام پوچھا جس پر جان نے اپنی نحیف آواز سے اپنا نام بتلایا۔ لڑکی نے عہد طفلی پر ایک اجمالی نظر ڈالی۔ اس لپکبادہ اور اس کا چہرہ کھل گیا۔ جان نے حیرت سے اس کا بھی نام پوچھا جس کے جواب پر اسے یقین نہ آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ لارٹا نے مصرعہ کو وہی چاقو اٹھالائی جس پر لفظ جان کندہ تھا اور اسے دکھایا۔

جس طرح ایک دیباہ ویران گھر میں دست و پا کرنے کے بعد رکھنے سے چمک پیدا کر کے اس ویرانہ کو آباد کر دیتا ہے جس طرح بلبل گلاب کو دوبارہ دیکھ کر پکڑ کر چاند کی دید سے خوش ہو کر رقص میں آتے ہیں۔ جس طرح شبنم زمرہ پھول کی آنکھوں میں گلدی پیدا کرتی ہے۔ ایک مرجھایا ہوا درخت نسیم کے جھونکے سے تازہ ہو جاتا ہے۔ ایک خاں رسیدہ چین ابر باران کے فیض سے سرسبز ہوتا ہے۔ اور اس میں پھر ایک نئی جان پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح

جان اور لارنا نے ایک دوسرے میں روح چھونک دی دونوں فرط محبت سے بھگیڑ ہوئے۔ ان کے دل بے لوث و پاک دل ملے اور ان کی آبادی قلب پھر معرپاش ہوئی گزشتہ عہد طفلی کی کیفیت عود کر رہی تھی پچھلی تجلیاں دوبارہ ان کے گوشہائے قلب میں شرارے کی طرح حضورِ فناں ہوئی۔ وہ اس اتفاقیہ ملاقات سے شاداں تھے۔ اسد وجہ کہ وہ ایک جان در قاب نظر آتے تھے۔

اس غیر توقع ملاقات کو زیادہ عرصہ نہ گزرے پایا تھا اور ان کا پیما نہ مسرت پورا البریز نہ ہونے پایا تھا کہ ایک قراق دکھائی دیا۔ لارنا جان کے بچاؤ کے لئے ایک راستہ تجا حراں نصیب جانے لگا۔ میری پیامی لارنا اگر کسی وقت مدد کی ضرورت ہو تو پہاڑی کے اوپر چکر اٹھا کر مجھے آگاہ کر دینا۔ میں تیرے لئے اپنا خون بہانے اور کٹ مرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہوں گا۔ چاہے آسمان کا پہاڑ کیوں نہ ہو کھل ہو چاہے آگ کا دریا سا منہ ہو لیکن تیرا جان اپنی جان نثار کرنے کے لئے ہرگز ہرگز دریغ نہ کرے گا۔ اچھا خدا حافظ اور اس نے اپنا راستہ اختیار کیا۔ لارنا کو جب تک جان نظر پڑا اس نے راہ میں آنکھیں بھی پائیں اور وہ پر غم ہو گئیں۔

(۳)

سرانہ ڈون بڑھا ہو چکا تھا۔ وہ لارنا کو اپنے ہی پاس رکھتا اور نہایت شفقت سے پیش آتا۔ ایڈمن ڈون (جو کہ اس کا مشیر خاص تھا) چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کرمن ڈون کی شادی لارنا کے ساتھ کر دے۔ اس نے بڑھے کو کرمن ڈون کا پیام دیا۔ اس نے لارنا کو طلب کیا اور پوچھا لارنا نے صاف انکار کر دیا کیونکہ کرمن ڈون ایک نا اہل جابر شرابی جوان تھا۔ سرانہ ڈون نے کہا میں لارنا کو پورا اختیار دیتا ہوں کہ وہ اپنا شوہر آپ منتخب کرے۔ اس پر جبر نہیں ہے لارنا اپنے شفیق سے پٹ گئی۔ اور کرمن ڈون اور ایڈمن ڈون اس نکلے سے جواب پر اپنا سامنے لے کر رہ گئے۔ اور کرمن ڈون موقع کا منشا بنی ہوا کہ کسی طرح سے لارنا اس کی بھی س جائے۔ سرانہ ڈون چراغ مسحری تھا۔ اس نے قبل از مرگ ایک وصیت نامہ لکھا کہ ”لارنا اپنے ماں کا وٹس میری کی جائداد ملکیت کی پوری پوری طور پر حقدار ہے۔ اور سب اسی کو ملنی چاہیے۔“ اور یہ وصیت نامہ دیکھ کر صبا رفتار قراق کے ہاتھ جس دھوم کے پاس لندن بھیج دیا تاکہ مبادا وصیت نامہ غصب کر لیا جائے۔ اور لارنا کا کہیں حق مارا نہ جائے۔

اس کے بعد اس نے اس کی ماں کی مالا جو اسے زبردستی چھین لیا تھا اسے واپس دیا اور اشک بار ہوا لارنا سے معافی چاہی۔ لارنا نے اسے معاف کر دیا۔ کیونکہ وہ اس کے ساتھ بالکل مٹی کی طرح سلک کر لیتا تھا۔

اور وہ پھر بیہوش ہو گیا ۔

کرمن ڈون نے جب بوٹھے سردار کی حالت سنی تو خوشی کے مارے پھولانہ سما یا اور تمام قزاقوں کو اپنی طرف لایا ۔ نکاح بالجمہ کی تیاری کرنے لگا ۔ اور نشہ شراب میں چور ہو گیا ۔

لارنا صورت حال کو تناؤ لگئی ۔ اب وہ بالکل بے بس تھی کیونکہ سوائے جان کے کوئی اس کا مددگار نہ تھا ۔ اور وہ اس طرح میدان محبت میں اس کا امتحان لے چنانچہ اس نے ایک عورت سے جو اس کو چاہتی تھی التبا کی کہ سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر کپڑا ہلائے اور جب جان آجائے تو اسے مطلع کرے ۔ اس عورت نے ایسا ہی کیا ۔

جان اپنے مکان کے باہر اپنی بھڑیں چارہا تھا اور ایک اداسی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا ۔ ناگاہ اس کی نظر پہاڑی پر پڑی اور وہ دوڑنا ہوا آہستہ پر سے کودا اور ایک جوش کے ساتھ اوپر چڑھ گیا ۔ اس عورت نے اسے جبریت شادی اور لارنا کی بے بسی سے آگاہ کر دیا ۔ وہ وہیں پاؤں مکان کی دیوار کے پاس جا بیٹھا ۔ قزاق شراب میں مست تھے ۔ لارنا نے اپنے کوہ کی کھڑکی میں سے جہاں وہ مقید تھی جان کو دیکھا اور آہستہ آواز دی ۔ جان کھڑکی کے پاس آیا اس نے اپنا سوار لارنا کے پیارے پیارے ہاتھوں پر رکھ دیا اور چومنے لگا ۔ بعد ازاں اس نے موٹی موٹی سلاخوں کو توڑنے کی کوشش کی ۔ اور انہیں خم کرنے میں کامیاب ہوا ۔ کہ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی جان چھپ کر بھاگا اور ایک مہوش قزاق کی بندوق اٹھالائی ۔ کرمن ڈون شراب میں ڈوبا ہوا آیا اور لارنا کو زبردستی گھسیٹ کر لے گیا ۔ مانگ نکاح ٹھہانے پر کسی طرح راضی ہی نہ ہوتا تھا ۔ لیکن کرمن نے اسے موت کی دھمکی دی ۔ اور وہ جان کے خوف سے راضی ہو گیا ۔

جان دوسری طرف سے آیا اور ایک بیہوش قزاق کو اٹھا کر نیچے پھینکا جہاں نکاح ہونے والا تھا ۔ موم بنیاں گل ہو گئیں اور آپس میں اندھوں کی طرح لڑائی چلنے لگی ۔ کیونکہ وہ بے حد شراب پیئے ہوئے تھے ۔ بہادر جان نے ایک جست لگائی ۔ اس نے لارنا کو اندھیرے میں اٹھایا ۔ چارہا پانچ کوٹھو کردوں اور گھونسوں سے ٹھیک کر کے لارنا کو لیکر بھاگ گیا قزاقوں میں اسی طرح جوتا چل رہا تھا ۔ اس لئے کامیاب جان اپنی دلیر اپنی ملکہ کو گود میں اٹھائے اپنے قصبہ پہنچ گیا ۔

(۴۱)

دوسرے دن صبح کو جان اور لارنا محو زام تھے ۔ اور ایک دوسرے پر محبت کی نظریں ڈال رہے تھے ۔ اتنے میں ایک شاہی گھئی آکر رکی ۔ جس میں ایک کاؤٹس جمیس دوم کی طرف سے پیغام لیکر آئی تھی کہ وصیت نامہ سے

ایک بڑی غلطی کا ازالہ ہوا اور لارنا کو لندن لے جانے والی تھی۔ لارنا نے جان سے اجازت چاہی اور جان نے بخوشی رخصت کیا۔

بھلا جان کو اب کہاں تاب تھی کہ بغیر لارنا کے رہ سکتا۔ لہذا وہ بھی چند روز کے بعد لندن روانہ ہوا۔ جمیس کے عہد کا مشہور واقعہ یعنی بیٹیزیم کی رسم عمل میں آنے والی تھی۔ اور لارنا بھی اس میں مدعو کی گئی تھی اسی روز تمام ہال کچا کھج بھر تھا۔

چند سانشی اس امر پر تلے ہوئے تھے کہ بچہ کو مار ڈالا جائے اور اس طرح سلطنت کو جمیس دوم کے بعد اس کا کوئی رشتہ دار سلطنت کا حقدار نہ ہو۔ سازشیوں کے قریب جان بھی بیٹھا تھا۔ اس نے سب سن لیا اور ایک شخص پیچھے بار نے ہی والا تھا کہ جان کی نظر پڑ گئی اور اس نے جست کر کے پیچھے چھین لیا اور دو تین کو اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس واقعہ سے تمام دربار میں کھلبلی مچ گئی۔ اور راز افشا ہو گیا۔ جمیس جان سے بہت خوش ہوا۔ اور لارنا نے اس کا تعارف کیا۔ جان نے محبت کے مارے بچہ کو اتنا کی گود سے لے لیا۔ یہ حرکت بہت بری تھی۔ اس لئے جمیس کو ناگوار گذرا۔ اور جان دوسرے روز مذمت سے بچنے کے لئے اپنے قصبہ چلا آیا۔ اسے جب کبھی یہ خیال آتا کہ لارنا اس قدر امیر لڑکی ہے اور وہ ایک غریب تو اس کے دل میں ایک درد سے پیدا ہوتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ لارنا کے ساتھ اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے وہ بے حد رنجیدہ تھا۔

وہ گھر ہو چکا۔ اس کی بہن الیزبتھ نے پیالہ میں دودھ دیا لیکن اس نے نفارت سے واپس کر دیا۔ لارنا کی محبت اور یہ نفرت الزبتھ کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکے لگی۔ اور وہ لارنا کا قصہ پاک کرنے کی تدبیر سوچنے لگی۔ لارنا با وفا لارنا نے اپنے مال اپنے جاہ و شہم کو ٹھکر دیا۔ اور وہ اپنے جان کے پہلو میں محبت کی زندگی بسر کرنے لندن سے گاڑی میں واپس آئی۔ جان غم کی تصویر بنا ہوا ایک لکڑی کے تختہ پر کھڑا تھا۔ لارنا اس کے قریب آئی لیکن جان اسی طرح بت بنا رہا۔ اس کے خیالات منتشر تھے۔ کیونکہ اسے کبھی چین نصیب نہ ہوا۔ لارنا نے کہنا شروع کیا "جان۔ میرے پیارے جان میں نے صرف تیری محبت کی خاطر جاہ واد کو چھوڑا تیری جوگن بیکرائی ہوں۔ اور چاہتی ہوں کہ تجھ سے شادی کر کے دن کاٹوں۔"

جان اس ایشاء عظیم کا شکریہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہشاش ہو کر لارنا سے چمٹ گیا۔ اور اسے اس کے متعدد بوسے لئے۔ اس کے بعد دونوں نے طے کیا کہ جلدی شادی قرار پائے۔

شادی کا اہتمام نہایت سادہ تھا اور تصنع نام کو نہ تھا لیکن یہ خوب صورت تہی زینت محض بی ہولی تھیں۔

الزبتہ نے فراقوں سے مدد لینے کا تہیہ کر لیا اور وہ فوراً گھوڑے پر بیٹھ کر پہاڑی پر گئی اور کمرس کو اطلاع دی کہ کمرس فوراً اگر جا پہنچا جہاں نکاح پڑ لیا جلد ہاتھ ۔ اس نے چھپ کر ایک فیکر بنا جو لارنا کے پہلو میں لگا اور وہ بیچنے لگی ۔ کمرس گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا ۔

حسرتیں کبھی تنہا نہیں آتیں بلکہ آفتوں کو بھی ساتھ لاتی ہیں ۔ آہ رے فلک لارنا نے تیرا کیا بکاڑا تھا جو تو اس کا دشمن بن گیا ۔ آہ اے دنیا مصوم لارنا کو تو نے کبھی اچھی طرح خوش نہ ہونے دیا بلکہ ہنساتے ہنساتے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ دیا ۔ آہ رے چرخ کج رفتار بے گناہ لارنا کے پیچھے تو اسقدر ہاتھ دھو کر کیوں پڑا تھا ۔ اس سے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی صرف یہ کہ وہ جان پر جان دینی تھی ۔ اس ۔ اس کا نام لے لے کر زندہ تھی ۔ صرف یہی کہ اس نے اپنے جان کے لئے راہ محبت میں اپنے کو فنا کر ڈالنے کی غرض سے اپنی ہستی کو قیمتی اپنے مال و جواہرات کو اس کے سامنے خاک سمجھتی تھی ۔ جان اس کا پیارا جان اس کی نظر میں بیش بہا ہیرا تھا اس کی نظر میں ایک دیتا تھا جس کی وہ پوجاری تھی ۔ محبت اگر گناہ ہے تو اے محبت تو ایک سم ہے ۔ جان تاں ۔ ایک فنی ہے زہر کا لود ۔ اور تو ٹھکرادینے کے قابل ہے ۔

لارنا بستر مرگ پر پڑی ہوئی ہے ۔ جان بازو بٹھا ہوا ہے ۔ اس کا کلیجہ بھٹ رہا ہے ۔ دل اشد ہا ہے ۔ اس کی غوٹیں نگھیں سنوں سے سرخ ہیں ۔ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا ۔

”پیارے ۔ لارنا ۔ لارنا ۔ آنکھیں کھولو اور اپنے جان کو دیکھو ۔ تم مجھ سے خفا ہو گئیں ۔ لارنا ۔“

جب صبا چلتی ہے تو اپنے نرم نرم جھوکوں سے پھول کھلا جاتی ہے ۔ بالکل اس طرح لارنا کے کانوں نے اپنے محبوب کی آواز سنی اور اس کا غنچہ دہن کھلنے لگا ۔ زبان نے حکم محبوب پر لبیک کہا اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنی شروع ہوئی ۔ وہ بڑبڑانے لگی ”ہاں ۔ میں جان ۔ پیارے جان ۔ کو خوشی سے ۔ قبول ۔“ کرتی ہوں ۔ جان ۔ یہ نکاح کے ایجاب و قبول کے آخری الفاظ تھے ۔ اور پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں سب کی توقع اس کی زلیست سے قریب قریب منقطع ہو چکی تھی اور جان کی بھی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا تھا ۔ وہ فرط تپش سے آگ ہو رہا تھا ۔ اسے اپنے چپن کی قسم یاد آئی ۔ اور وہ دیوانوں کی طرح چند رفتار کو لیکر قراقند بہر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑا ۔

الزبتہ اپنے فعل سے حد درجہ نادم ہو کر خود بھی معہ اور کسانوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ جان کی مدد کے لئے روانہ ہوئی ۔

جان نے تہیہ کر لیا تھا کہ قزاقوں کو حرف غلط کی طرح صفحہ درمکار سے مٹا دیگا۔ اس نے مصمم ارادہ کیا تھا کہ ”مرگیا یا مرگیا“ لہذا اس نے سید سے بند چانگ پر حملہ کیا اور توڑنے کی کوشش کی۔ الزبتھ بیوی بچ چکی تھی۔ لہذا اتنے بڑے زور و شور سے ہونے لگے۔ جان اوپر تک پہنچ گیا۔ اور اس نے کمرن کو دلچ کر دے مارا۔ وہ بھی سنبھل کر گر گیا۔ اور دونوں میں خوب کشتی ہونے لگی۔ جان پھر اسے پٹخا۔ اور موقع پاتے ہی کمرن نے اپنا چاقو نکال لیا۔ چاقو جان کے سینے کے قریب تک آگیا۔ اس نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔ مگر کمرن بھی کافی قوی تھا۔ اس لئے جان نے چاقو دالے ہاتھ کا اوپری بازو مڑوایا۔ اور اس کے ہاتھ سے چاقو گر پڑا۔ جان نے چاقو دلدل میں پھینک دیا۔ اور اس کے بعد کمرن کو دلدل کے نذر کیا۔ جان نے اس طرح بدلہ لیا۔ اور وہ اپنے گھر واپس آیا۔

دنیا ایک منٹ میں کہیں سے کہیں بدل جاتی ہے۔ لارنا کا کلامی زخم بھرا آیا۔ گویا وہ پیر زندہ ہو گئی تھی۔ تاکہ جان کی ہو کر رہے۔ جان کی خدمت کے لئے وہ جنت سے واپس گمردی گئی۔ لہذا تہیہ نے جان کو لارنا کی صحت یابی کا ثرہ سنایا۔ بھلا اسے کب یقین آتا تھا۔ اس کے نزدیک تو وہ مر چکی۔ الزبتھ نے اسٹوڈ سے لارنا کو بتلایا جو اپنے صحت یاب نگاہوں سے اس کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ جان کو فوراً سرست سے قریب تھا کہ اسے شادی مرگ ہو جائے۔ وہ اس سے جا ملت گیا۔ (ماخوذ از ڈرامہ لارنا ڈوٹن)

محرم سے بدتر عید

نہ فراغت ملی ہمیں غم سے عید بدتر ہوئی محرم سے
عید میں بھی جُدار ہے گر تم کون سے دن ملو گے پھر ہم سے

کس کے لئے مناؤں عید

دیکھ کر مجھ کو کون خوش ہوگا کس سے میں آج ملنے جاؤں عید
میرا خوش ہونے والا پاس نہیں پھر میں کس کے لئے مناؤں عید

(راز فاسمی عید آبادی)

مشاہدات

(از جناب ابوالفضل صاحب سر از چاندپوری)

(۱)

تنہیدِ نشاطِ نوجوانی دیکھی تمہیلِ سرورِ کامرانی دیکھی
ممنونِ کرمِ ہوں باغبانِ فطرت! جی بھر کے بہارِ زندگانی دیکھی

(۲)

تشریقِ جمالِ صبحِ عشرت دیکھی تنویرِ سوادِ شامِ راحت دیکھی
اک روز میں دو کرشمہ ہائے دلکشی! اے شاہِ گل تری کرامت دیکھی

(۳)

ہر نقش میں رنگِ شانِ قدرت دیکھا ہر رنگ میں جلوہٴ حقیقت دیکھا
واللہ! مرقعِ جہان میں میں نے نقاشِ ازل کا حسنِ صنعت دیکھا

(۴)

گلہائے نظرِ نوازِ خداں دیکھے فطرت کے ہزار رازِ عیاں دیکھے
فردوسِ جہاں میں ہر روشِ پر میں نے محمودِ نماِ ایازِ حیراں دیکھے

تقدیر

القضانی الاسلام
تالیف مولانا عبد السلام صاحب ندوی، دریائی مہی تقطیع ضخامت (۹۲) صفحات قیمت ۱۸

پتہ دار المصنفین اعظم گڑھ

ایک عرصہ سے دار المصنفین اپنی اعلیٰ علمی خدمات کے علاوہ اردو میں خالص اسلامی لٹریچر اور افادہ خاص و عام کے لائق مذہبی و دینی کتب فراہم کرنے کی جو گراں قدر کوشش کر رہا ہے وہ کسی طرح محتاج تعارف نہیں موجودہ زمانہ کے عام تعلیم یافتہوں کی عربی زبان سے نا آشنائی کے مد نظر اس کی کسی طرح توقع نہیں کیجا سکتی کہ مذہبی اور دینی علوم جن کی اس وقت تک بہترین سرمایہ دار عربی ہی ہے راست عربی سے حاصل کیے جائیں گے زمانہ حال نے یہ ضرورت شدید طور پر پیدا کر دی ہے کہ جہاں تک زیادہ ممکن ہو اس کے بلند پایہ دینی لٹریچر کو اردو میں منتقل کر لیا جائے تاکہ عام تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان اسلام اور اس کے احکام کو اپنی ہی مادری زبان میں مطالعہ کریں۔ القضا فی الاسلام، اسی مقصد کے تحت لکھی گئی ہے اس میں عدالت اور اس کے تمام تعلقات قاضی، مدعی، مدعا علیہ، گواہ، شہادت اور فصل مقدمات وغیرہ کے مالمہ و ماعلیہ پر اسلامی احکام و قوانین کی قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام کی روشنی میں بحث کی گئی ہے مسلمانوں نے اپنی ملک گیری و ملک داری کے زمانہ دراز میں عدالت گسٹری اور آڈری کی جو صورتیں مہیا کی تھیں وہ بڑی حد تک موجودہ امن کے زمانہ کے پر امن انتظام عدالت جیسی تھیں، فاضل مرتب نے جبکہ جگہ مختصر طور پر اسلامی عدل گسٹری کا موجودہ نصف شدہ مقابلہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر ایک عام شخص اسلام میں عدالت کے طور طریقوں کی نسبت بہت چاہی معلومات حاصل کر سکتا ہے اور یہی افادیت ہے جس کے باعث اس مضم کے رسائل اردو میں بہت زیادہ پندیدگی کی نظروں سے دیکھے جانے چاہئیں۔

عالم حیات از جناب نبی الحسن صاحب شمیم، اوسط تقطیع ضخامت (۷۲) صفحے قیمت ۹؛ مطبع عہد آفریں
الکسیر راؤ حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

جناب شمیم ایک جو شیلے اور نوعر شاعر ہیں اگرچہ وہ شاعری سے زیادہ اکتا علم و فضل میں شہرت رکھتے ہیں لیکن شاعر گوئی سے طبیعت کا قدرتی لگاؤ ہے کہ بے توجہی کے باوجود وہ پاکیزہ شعر کہتے ہیں جو بڑی فکر و توجہ کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں یہ محض طبیعت کی پانچ اور مزاج کی مناسبت ہے کہ شمیم صاحب کی شاعری بہت سی اچھی

صفات سے متصف ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ انہی حوالانی طبع قدیم و جدید ہر دو رنگ میں یکیاں ہے وہ غزلیں بھی لکھتے ہیں اور نظمیں بھی اور دونوں میں کامیابی کے بہت قریب ہیں۔ عالم حیات دونوں قسم کے کلام کا مجموعہ ہے۔ مصنف کی عرض حال کے علاوہ مولوی و حاج الدین صاحب کنتوری پکھارا اور گنگا باد انٹر میڈیٹ کالج نے مقدمہ لکھ کر شمیم صاحب کی شاعری کا تعارف کرایا ہے۔ شمیم صاحب کی غزلیں مضمون کے علاوہ لطافت زبان کے لحاظ سے بھی پاکیزہ ہیں اور اس خصوص میں ان کا مذاق سخن ستودہ اور پندیدہ ہے امید ہے کہ یہ مشق بڑھتے بڑھتے شمیم صاحب کو بہت جلد وسیع شہرت کا مالک بنا دے گی۔

چاند ماہوار مصور رسالہ۔ مدیر منشی کنھیا لال صاحب ام لے ال ال بی۔ ایڈوکیٹ۔ نصف کراؤن۔ تقطیع صفحات عموماً سو صفحات نہایت دیدہ زیب شکل و صورت سالانہ چندہ آٹھ روپے شش ماہی پانچ روپے۔ پتہ چندر لوک اڈمنسٹریٹو ڈالہ آباد۔

الہ آباد سے ایک ہندی رسالہ چاند کئی سال سے جاری ہے اور خاص و عام میں بڑی وسیع مقبولیت رکھتا ہے اس کی اشاعت کئی ہزار ہے اور شمالی ہند کے کم و بیش تمام ہندی تعلیم یافتہ اصحاب اس سے واقف ہیں اسی ادارے سے ایک اردو رسالہ اسی نام سے جنوری ۱۹۳۷ء سے جاری ہوا ہے۔ اردو چاند اپنے ہندی ہم نام کی طرح ادبی ذوق کی تکمیل کے ساتھ اصلاح معاشرت اور بالخصوص خواتین میں تعلیم کی اشاعت اور خورتوں کی سماجی پوزیشن کو بلند کرنے کا زبردست حامی ہے اس کے دو نمبر اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں دونوں متعدد تصویروں سے آراستہ اور طباعت کا بہترین نمونہ ہیں۔ مضامین گونا گوں نوعیتوں کے ہیں۔ دونوں نمبروں میں ایک ایک محققانہ تاریخی مقالہ ہے جو مصور بھی ہے۔ پہلے نمبر میں ٹیپو سلطان پر جو مقالہ ہے اس میں مصنفانہ تنقید اور تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کی اشاعت پر منشی کنھیا لال صاحب کو ہم مبارکباد دیتے ہیں۔

منشی صاحب اور ان کے رفقاء کا جس خلوص دل سے اردو کی خدمت پر آمادہ ہیں وہ دلی حیرت و کاستحق ہے۔ اردو کے ساتھ ان کا یہ التفات اس کی ترقی کی خالص نیک ہے۔ خدا کرے کہ چاند کی ٹھنڈی روشنی اردو کو ہندوستان کی عام زبان بنانے میں مدد معاون ثابت ہو۔

متعلم ماہی مصور رسالہ، مدیر حفیظ الدین صاحب مدرس مدرسہ و سلطانہ خلی گورہ چندہ سالانہ سے طلباء سے عال۔ دیدہ زیب طباعت کتابت تقطیع اوسط۔ پتہ دفتر متعلم پتھر گلی حیدر آباد

یہ مولوی خلیفہ الدیر صاحب کی کوشش سے حیدرآباد میں ایک مفید رسالہ جاری ہوا ہے اس کا مقصد کس طلبہ میں غیر درسی مطالعہ اور مفید و دلکش مضامین کے پڑھنے کا شوق پیدا کرنا ہے مضمون اکثر طالب العلموں کے ہیں۔ جھوٹے سلیس اور ستھرے طرز بیان میں لکھے گئے ہیں تقاریر بھی رسالہ کے مقصد کے مناسب طلبہ کی دلچسپی کی ہیں۔ مدارس تحانیہ و وسطانیہ کے طلباء اس رسالہ سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ سرشتہ تعلیمات جہاں اور رسالے اور اخبارات طلبائے مدارس کے لیے خریدتا ہے، ہر مدرسہ کے دارالمطالعہ کے لئے اس کا ایک ایک نسخہ بھی بہم پہنچا سکے۔ میر صاحب نے ایک اچھے کام کی ابتدا کی ہے خدا کرے کہ مستم حیدرآباد کے کم عمر بچوں کی ذہنی ترقی میں مدد و معاون ثابت ہو۔

جونیر سلف ٹیچنگ ٹرانسلیشن مولفہ مولوی سید مظفر الدین صاحب ندوی ام اے پروفیسر عربی و فارسی اسلامیہ کالج کلکتہ چھوٹی تقطیع مجلد ضخامت ۸۸ صفحات طے کا پتہ سید طاہر الد صاحب ندوی بی اے چوتھا باکی پور قیمت ۱۰

یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو وسطانی مدارس کے ایسے طلباء کو اردو سے انگریزی ترجمہ کھانے کے لیے لکھا گیا ہے جسکی ادبی زبان اردو ہے۔ لائق مولف نے انگریزی زبان کی گرامر کے مبادیات کی اردو میں تشریح کر کے جملوں کی ترکیب اور مثل جملوں کو اردو سے انگریزی میں منتقل کرنے کا عملی ڈھنگ پیش کیا ہے۔ اصول کی تشریح و تفہیم کے بعد سو مشقیں دی گئی ہیں جنکے مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی کتاب کے آخر میں لگادی گئی ہے۔ مدارس وسطانیہ کے طلبہ کے لئے ایک مفید کتاب ہے اور بڑی توجہ سے مرتب کی گئی ہے۔

دروس الادب جز اول مولفہ مولوی سید مظفر الدین صاحب ندوی ام اے پروفیسر عربی و فارسی اسلامیہ کالج کلکتہ چھوٹی تقطیع صفحات (۴۸) نسخہ ٹائپ مجلد قیمت ۱۰ طے کا پتہ مولوی خوند کار فیض الدین احمد صاحب ام اے یونیورسٹی لائبریری (۸۴) وینزلی اسٹریٹ کلکتہ قیمت ۱۰ یہ عربی زبان کی ابتدائی کتاب ہے جو بنگال کھوٹی مدارس کی تیسری اور انگریزی مدارس کی ساتویں جماعت کے لیے جن میں عربی کی تعلیم شروع ہوتی ہے لکھی گئی ہے۔ بنگال میں چونکہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اس لئے مولف نے اس کتاب میں عربی زبان کی تعلیم بھی انگریزی کے توسط سے پیش کی ہے

عربی کے حروف تہجی کی فہرست دینے کے بعد عربی کے اسما و افعال وغیرہ کے ساتھ ان کے انگریزی مرادف بھی لکھے گئے ہیں اور جہاں کہیں توضیح کے لیے عبارت لکھنی پڑی ہے وہ سب انگریزی ہی میں ہے۔ کتاب کے آخری باب میں نظم کے چند نمونے لکڑے بھی دئے ہیں۔ اس اصول اور طریقہ پر اس سلسلہ کو آگے بڑھایا اور میٹرک تک عربی انصاب تحریر کیا جائے تو یقیناً اہل بنگال میں عربی دیکھا اچھا ذوق پیدا ہوگا۔

رسید کتب

- حسب ذیل کتابوں پر آئندہ شماروں میں تنقید کی جائے گی۔
- ۱۔ دنیا کے بہترین افانے مترجمہ از مولوی منصور احمد صاحب شریک مدیر ہمایوں (لاہور)
 - ۲۔ منکران خدا سے خطاب - از مولوی سید علی اختر صاحب اختر
 - ۳۔ ارنسٹ - مترجمہ مولوی سید کلین کاظمی صاحب و مولوی عبد المنعم صاحب سعیدی بی اے
 - ۴۔ ہماری شاعری - از مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ام اے پروفیسر جامعہ کھنؤ
 - ۵۔ تاریخ السلف - از جناب منشی اجمیری
 - ۶۔ تاریخ سلاطین فاطمیہ - از جناب ایس ڈاکٹر حسین صاحب جعفر

اردو ریسرچ میں ایک اہم اضافہ گلشن گفتار

یہ شعر اے اردو کا ایک قدیم ترین گروہ جو خاکِ بھلِ نایاب تھا اور جس کی دریافت سے اردو کے اساتذہ قدیم کے حالاتِ صحت کے ساتھ معلوم کرنے میں بیش قیمت مدد ملے گی۔ مولوی سید محمد صاحب ام اے مولف ار باب شرارہ نے دوسرے تذکروں کے ساتھ تقابل و تطابق کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ ہر شاخ کے ذخیرے اور تمام قدیم تذکرہ نویسوں کی ملاقات بھی من و عنین نقل کر دی گئی ہیں جس سے ایک ہی جگہ قدیم اردو شاعروں کی نسبت تمام مکمل مواد مل جاتا ہے۔ قیمت ۱۲ قطع طبع کثافت دید و زیب۔

مکتبہ ابراہیم سیمہ اعین روڈ حیدر آباد دکن

کتاب ندوۃ العلماء لکھنؤ

اور
اس کی امداد

(انجنائب حکیم ڈاکٹر سعید علی بی اہیں "ایم بی ایس" ناظم ندوۃ العلماء)
"ندوۃ مسلمانوں کی واحد درس گاہ ہے جو اپنے بل پورستہ پر کام کر رہی ہے اور یہ شاید ملک کی ان چند درس گاہوں میں سے ہے جن کا مقصد علم کو علم کی خاطر حاصل کرنا ہے۔" اس لئے ندوۃ کی امداد حقیقی سمنوں میں علم کی امداد علم کی امداد اور مسلمانوں کی امداد ہے۔"

قومی اور مذہبی ضروریات میں قومی مدرسہ اور قومی جامعہ کے برابر لکھنؤ میں سے زاید قومی کتب خانہ کو اہمیت حاصل ہے اگر مسلمانوں کے مذہب، علوم و فنون و ادب کو محفوظ رکھنا ہے تو ضرور ہے کہ ایک وسیع کتب خانہ بہم پہنچایا جائے جس میں ہر علم و فن کے متعلق نادر اور بیش بہا تصانیف کا بہترین ذخیرہ موجود ہو۔ ندوۃ العلماء نے اس ضرورت کو آغاز قیام ہی کے وقت محسوس کیا اور ساتھ ہی ساتھ علی قدم اٹھانا شروع کیا۔ پانچ سو اُس نے اپنے مقصد کا ایک بڑا عظیم الشان کتب خانہ کا قیام قرار دیا اور سب سے پہلے ۱۳۳۵ھ میں علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنا کتب خانہ ندوۃ العلماء کے لئے وقف فرمایا۔ جزاء اللہ خیر الجواء اور ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۸۸۹ء میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں میں یہ تحریک پیش کی گئی اور جناب مولانا عبد الرحمن خان صاحب شاہجہاں پوری نے اپنا کتب خانہ جو تین ہزار قابل قدر ذخیرہ پر مشتمل تھا عنایت فرمایا، اس کے بعد اور بزرگوں نے وقتاً فوقتاً اکثر کتابیں مرحمت فرمائیں جس میں جناب نواب مالک محمد خان صاحب جس العلماء صفی الدولہ حاکم الملک یونس نواب سید محمد علی حسن خان صاحب طاہر ناظم ندوۃ العلماء جناب مولانا سید عبدالغنی منا بہاری ملازم ریاست حیدر آباد دکن جناب مولانا محمد علی لکھنوی مرحوم جناب نواب سکندر نواز جنگ صاحب بہادر دیشمہ جناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی مرحوم جناب مولوی سید نبی اللہ مرحوم بہر لکھنؤ جناب نواب قاری الملک بہادر مولوی مشتاق حسین مرحوم امروہہ جناب مولوی سید حسن شاہ سردار مرحوم جناب مولوی سید شرف الدین صاحب حج انیس کورٹ جناب مولوی سید مصطفیٰ خان صاحب (نیرۃ امیر الملک) لاجپور مولانا نواب سید محمد صدیق حسن خان بہادر مرحوم جناب ضی الدولہ نظام الملک مولانا نواب سید نور الحسن خان مرحوم جناب منشی اظہر علی صاحب دکیل میں کاکوری خلیفہ خان بہادر جناب منشی اظہر علی صاحب مرحوم جناب مولوی احمد زماں خان صاحب رئیس دائرہ زیری

مفت شایعہاں پور جناب سید عبدالغفار صاحب شیریں جناب مولانا محمد علی صاحب مونگیری سابق ناظم مدوۃ العلماء جناب مولوی صبغتہ اللہ صاحب بی۔ اے۔ اے۔ اور وہ جناب وزیر زادہ محمد عثمان بہادر الدین خاں صاحب ریاست جوگاندہ (کاٹھیا) جناب جنرل میر خان صاحب پیلہ درجنیہ جناب منیر صاحب کٹھن صاحب مدانت لکھنؤ، جناب مولوی آسن اللہ خان صاحب ثاقب (ملیکٹہ) جناب مولانا سید لطف اللہ صاحب خلف جناب مولانا محمد علی مرحوم مونگیری سابق ناظم مدوۃ العلماء وغیرہ وغیرہ کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

دارالمصنفین اعظم لکھنؤ۔ دائرۃ المعارف۔ دارالاشاعت شنبہ تالیف ترجمہ حیدر آباد دکن نے اپنے تمام مطبوعات عنایت کیں۔

جزاۃ اللہ خیر المصنفین

بزرگان ملت کی ان علم دوست کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مدوۃ العلماء کا کتب خانہ روز افزوں ترقی کر رہا ہے اور اس سے علمی استفادہ کے لئے علماء و مشائخ اور طلبہ صرف ہندوستان سے نہیں بلکہ مالک غیر سے تشریف لاتے ہیں۔ اس کتب خانہ کی خصوصیات ذیل ہیں۔

(۱) اکثر علوم و فنون کے متعلق وہ مستند و بلند پایہ تصانیف موجود ہیں جس پر اس فن کی بنیاد ہے اور جس سے اس فن کی تدریجی ترقی کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

(۲) مختلف علوم و فنون کی نادر و نایاب کتابیں موجود ہیں، بعض مصنفین کے قلم کے مسودے ہیں بعض کتابیں شاہی کتب خانوں میں رہ چکی ہیں، متعدد کتابیں مطلقاً اور مذہب میں ایک پنجی مہر آقا نہایت عمدہ مصنفت کا موجود ہے جو شاہجہاں کی وفات سے سات برس بعد لاہور میں تیار کیا گیا مدوۃ العلماء کے کتب خانہ میں صرف نادر و نایاب کتابوں کی تعداد پانچ سو ہے ان کے علاوہ مطبوعات کا شمار کم و بیش میں ہزار ہے اس عظیم الشان اور گراں قدر ذخیرہ میں جن علوم کا سرمایہ خاص طور پر جمع کیا گیا ہے ان میں سے یہاں تفسیر حدیث تاریخ اور ادب کا ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

بلا سناغ یہ کہا جاسکتا ہے موجودہ عربی مدارس اور اسلامی ممالک کے بہت سے دینی مدارس میں اس بہتر کتب خانہ موجود نہیں ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ مدوۃ العلماء کے پیش نظر نصاب العین کے لحاظ سے اس کا کتب خانہ اب بھی بہت ہی نامکمل ہے اور اس کے فہم دروہندوں کے لئے انحداف و ننگ ہر کہ وہ بھی تک اسلامی ادبیات کے ان جواہر پاروں سے خالی ہے جن پر ملت اسلامیہ تابد قیامت ناز کرتی رہے گی اس کی سے ایک طرف تو کتب خانہ کی جامعیت میں فرق آ رہا ہے دوسری طرف کتب خانہ مدوۃ العلماء کا وہ طویل القدر مقصد پورا نہیں ہوا جس کی مجسم شکل دارالعلوم ہے اور جس کا اہمیل یہ ہے کہ علماء کی ایسی جماعت پیدا کی جائے جو وسعت علم عمیق نظر اور صحت تنقید کے ساتھ قوت اجتہاد رکھنے میں اور اپنی دماغی کدو کاوش سے اسلامی علوم اور ادبیات

میں اندر نوزنگی پیدا کر سکیں، اس اہم کمپانی کا اندازہ جناب کو مطلوبہ کتابوں کی اس فہرست سے ہو سکتا ہے جو اس گزشتہ سال کے ساتھ منسلک ہے۔

اسلامی ہندوستان کی موجودہ عبرت انگیز ہستی کے باوجود اب بھی ان کے مکانات، مٹے ہوئے خانہ اولیٰ اور ان کے شرک پر بیٹھے والے کتب فروشوں کے ذخیرے میں وہ بیش بہا کتابیں موجود ہیں جن کی تلاش میں مغربی کتب خانوں کے کارپرداز یہاں آتے ہیں لیکن صد افسوس کہ ہمارے نامور سلاف کے دماغی کاوشوں کے یہ مایہ ناز نتائج ناقد رشناسی کے ہاتھوں ہمارے ملک سے نکل کر یورپ چلے جا رہے ہیں اور یہ انقلاب حکومت کے زمانہ سے جنگ سلسلہ وارجاری ہٹا اور باوجود اس کے کہ بہت سے کتب خانے غارت ہو گئے اور بہت سے قدیم خاندان کے ساتھ ان کے کتب خانے بھی مٹ گئے، بہت سی نادر کتابیں سرگردیں برساتیں گل گئیں، کٹر وں نے بیکار کردیں لیکن غنیمت ہے کہ اب بھی بہت سی کتابیں باقی ہیں جن سے ہمارے سلاف کی حیرت انگیز دماغی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے لہذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ہمدردان علوم اسلامیہ اس کی طرف توجہ فرمائیں اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اول یہ کہ جن لوگوں کے پاس اس قسم کے ذخیرے ہوں اور وہ ان کی حفاظت کا کماحقہ سامان نہ کر سکتے ہوں وہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کو عنایت فرمائیں

دوسری صورت یہ ہے کہ دوسرے کتب خانوں میں جو نادر قلمی کتابیں موجود ہیں ان کی نقیص حاصل کی جائیں لیکن ان نقیصوں کے حاصل کرنے کے لئے کثیر رقم کی حاجت ہے اور دستہ مند بعد فہرست کتابیں منتخب کی گئی ہیں ہمدردان قوم اور قدردانان علم سے درخواست ہے کہ وہ ان میں سے ایک کتاب کی نقل یا نقل کے پورے یا جزئی مصارف ندوۃ العلماء کو عنایت فرمائیں کہ دنیا میں اپنے سلاف کے زرخیز کارناموں کا تحفظ اور آخرت میں اس واجب العمل اسلامی خدمت کا ثواب حاصل فرمائیں۔

یہ بیش بہا کتابیں اگر اسلامی خالص کتب خانہ میں لگائیں تو وہ دست برد زمانہ سے یقیناً محفوظ ہو جائیں گی اور چونکہ اس اہل علم و قلم و قرائت مستفید ہوتے رہیں گے اس لئے صد قہریر کے اصول پر خدمت علم اور اشاعت مذہب کا ثواب برابر ملے گا۔ **وہی ذاتِ فلیتنامن الملتناضون**۔

فہرست کتب مطلوبہ

۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰
سند ابی حوان	سند ابن حنبل	سند ابن ابی شیبہ	صحیح ابن حبان	کتاب اشفاق الیوم	حاجان	تہذیب العرب	فی جلد ۱	جرت فی جلد ۱	امامہ	کتاب الفسطاط	کتاب الفسطاط	کتاب الفسطاط	کتاب الفسطاط	کتاب الفسطاط	کتاب الفسطاط	کتاب الفسطاط	کتاب الفسطاط	کتاب الفسطاط	کتاب الفسطاط
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰
۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰	۳۱	۳۲	۳۳	۳۴	۳۵	۳۶	۳۷	۳۸	۳۹
۴۰	۴۱	۴۲	۴۳	۴۴	۴۵	۴۶	۴۷	۴۸	۴۹	۵۰	۵۱	۵۲	۵۳	۵۴	۵۵	۵۶	۵۷	۵۸	۵۹
۶۰	۶۱	۶۲	۶۳	۶۴	۶۵	۶۶	۶۷	۶۸	۶۹	۷۰	۷۱	۷۲	۷۳	۷۴	۷۵	۷۶	۷۷	۷۸	۷۹
۸۰	۸۱	۸۲	۸۳	۸۴	۸۵	۸۶	۸۷	۸۸	۸۹	۹۰	۹۱	۹۲	۹۳	۹۴	۹۵	۹۶	۹۷	۹۸	۹۹

مجلہ مکتبہ خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ ایساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور دوسری کتابیں کم قیمت یا بدفعات نقد خرید فرمائینگے ان کے نام سالہ سال بھر کے لئے باقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ پینتیس روپے کی درستی دیگر کتابیں بدفعات یا کم قیمت نقد خرید کرینگے ان کی خدمتیں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ باقیمت حاضر ہوگا۔ کم قیمت خریدی ہوئے حضرات کے نام سالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ جو حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے ان کو ایک سیدھی جاگہ جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہئے کہ وہ اس رسید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب احوال رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ سیدھین منظم مجلہ مکتبہ کے پس مسجدیں رسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی اقسام مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبعة کتبہ ابراہیمیانہ روضہ حیات درآباد دکن

دارالاشاعت بیتہ برہمیداد و باہمی محدود آباد کن

کا

عبد علی و محمد
ماہوار علمی ادبی

مکمل

فلائی

جمہوریت اور سروری ام الائن

شکر

عمرینسی

سید محمد ام

مجلہ مکتبہ

یہ دارالاشاعت مکتبہ ابراہیمیلہ ماد باہمی محدو کو کا ماہوار رسالہ ہے۔
یہ علمی و ادبی رسالہ جس میں علم و ادب کے مختلف شعبوں کے متعلق مضامین
درج ہونگے حجم کم سے کم چار جز ہوگا۔

نظر احتیاط پرچہ بذریعہ شفیقٹ آف پوسٹنگ روانہ کیا جائے گا۔ اگر اتفاقاً وصول
نہو تو پہلی مہینے کی ۲۰ تاریخ تک بحوالہ نمبر خریداری اطلاع دی جائے۔

قیمت سالانہ (دو) مع محصول ڈاک منگی چھ ماہ کے لئے (سیاسی) فی پرچہ ۶۔
اشتہارات کانخ فی اشاعت پورے صفحہ کے لئے (دھ) نصف کیلئے (سے)

اور چوتھائی کے لئے ۴ ہے اگر زیادہ مدت کے لئے اشتہار دیا جائے تو اس نرخ میں ۱۲٪
۵ فیصدی تک کمی ہو سکے گی۔

ترسیل زر و مضامین اور جملہ خط و کتابت منظم محلہ مکتبہ۔ مکتبہ ابراہیمیلہ
امداد باہمی اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے کیجئے۔

مجلد مکتبہ

جناب خان فضل محمد خاں صاحب ناظم تعلیمات
مولوی محمد حسین صاحب نائب ناظم تعلیمات

تصاویر

جلد (۴) بابتہ ماہ اردی شہت ۱۳۳۹ھ فرم پانچ ۱۹۲۹ء نمبر (۶)

فہرست

شذرات	(مدیر)
۱ اسلام عقلیت کا عروج و زوال	از جناب میر الدین صاحب بی اے ال ال بی عثمانہ
۲ بان دکن (نواب کافی خان کا ایک وقیفہ)	عمر یافعی
۳ غزل	از جناب صفی اورنگ آبادی
۴ خود اعانتی	مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی اے عثمانہ
۵ وچھی مرثیہ گو کی حیثیت سے	نصیر الدین صاحب ششی م۔ آر۔ ایس۔ یف
۶ برسات	احمد علی اکبر صاحب راز قاسمی
۷ غزل	قشہ و آزاد انصاری
۸ دھن کا پتکا (ڈرامہ)	شیخ محمد صاحب
۹ تنقید	(دس، م)

شذرات

مشرقی قوموں اور اہل کائنات کی وضع کردہ موزوں کار کی رفتار کے ساتھ دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ گیا ہے۔ اب اپنی آخری عمر میں زراعت کی تیاری کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ سرسبز و سرخوردہ دنیا کی چند معمول ترین بہتوں میں سے ہیں۔ اپنی قوم کی فلاح کے لئے وہ اپنی دولت میں سے کچھ حصہ خرچ کرنے پر بھی آمادہ ہیں۔ اپنی زندگی کے مختلف مرحلوں سے گزارنے اور گونا گوں تجربوں کے حامل کرنے کے بعد ان کا اعتقاد اس پر آ رہا ہے کہ قوم کی فلاح، قوم کے نو نیاہلوں کی اصلاح اور صحیح رہبری پر منحصر ہے۔ اور یہ کام انھوں نے ایک حد تک اپنے ذمہ لیا ہے۔ وہ قوم کے نوجوان افراد کو تجارتی تعلیم سے بہرہ اندوز کرنے کے سامان وافر فراہم کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ کئی مدرسے بنانے والے ہیں۔ انکی مصروفیتوں کا مرکز کرنی کمال اکیس انسی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی ہیں۔ ان کے کام کا آغاز ہو رہا ہے۔ اپنی پوری تجویز کے علی جامہ پہنچنے تک وہ دو کروڑ پونڈ یا اس سے زیادہ بھی صرف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مشرقی زندگی کا یہ تغیر انکی قوم کے نو نیاہلوں کے لئے نیک فال ہے۔ چند ہندوستانی طلبہ مغربی ممالک میں فلم سازی کی صنعت سیکھنے کی غرض سے جا رہے ہیں۔ مشرقی قوم نے انگلستان کی اسوسی ایٹڈ سونڈ فلم انڈسٹری سے یہ سیکھا ہے کہ اس میں کچھ ہندوستانی طلباء کو اس صنعت کی تعلیم کے حصول میں ممکنہ سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اس کہانی میں طلباء آواز کے فلم کی صنعت کے تمام شعبوں میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کر سکیں گے۔ ہندوستان کے لئے اس کی سخت ضرورت تھی کہ وہ اس فن کو باضابطہ طور پر حاصل کرے۔ فلم کی اہمیت کے ہر روز نئے پہلو پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ نہ صرف تعلیم کا اچھا ذریعہ ہے، بلکہ اس کے واسطے سے ہندوستان کی معاشرت اور ہندی مناظر مغربی ممالک میں صحیح طور پر روشناس کئے جاسکیں گے۔ اس صنعت کو یہاں قائم ہوئے کچھ ہی سال ہوئے لیکن اب تک بعض اچھے نمائندہ پیدا ہو گئے ہیں جن میں مس ستیا دیوی وغیرہ نام نمایاں ہو رہے ہیں۔ قابل ذکر ہیں۔ یہیں یقین ہے کہ ہندوستانی فلم کو تمدن کی پیش کشی کا ذریعہ اسی طرح بنائیں گے جطرح سالہا سال سے ڈراما بنا ہوا ہے۔

مصر و دنیا کے ان چند ممالک میں سے ہے جہاں کی زبان عربی ہے۔ عربی زبان کی غیر معمولی وسعت تو مسلم ہے۔ یہی ایک خصوصیت اس زبان کی ایسی ہے، جو اس کو موجودہ دور کی وسیع ترین علمی زبانوں کے دوش بدوش چلنے کے قابل بنا رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت کا مظاہرہ شاید مصر سے زیادہ

شاذ اور صورت میں کہیں نہیں۔ خود عربان میں بھی نہیں بہ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عربی زبان کی یہ کامیابی مصریوں کی قابلیت اور ذہانت کی کچھ کم نمونہ نہیں جہاں کوئی زبان کیسی ہی لچکدار اور وسعت پذیر کیوں نہ ہو لیکن اس کی کار فرما ذہنیتیں، کند اور ناتائتہ ہوں۔ تو خدای رحیم کرے۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔ بہر حال عربی زبان میں طباعت کی وہ تمام سہولتیں موجود ہیں جن کے بغیر موجودہ زبانوں کی ترقی مشکل ہے۔ مصری صحافت اور طباعت عالم میں کافی توجہ کی مستحق بن گئی ہے۔ خدا کرے کہ اہل اردو بھی مرکزوں اور دائروں کے چکر سے نکل کر موجود مہذب دنیا کے حوالہ جذبہ افادیت سے مغلوب ہوں!

مغربی اثرات نے، بہت سی چیزوں کی طرح، عربی کو بھی فی الحال عبوریت میں ڈال دیا ہے۔ میٹر کی اصطلاحیں، نائٹوں کی لفظیات سب از سر نو مدون ہو رہے ہیں۔ ٹرے ٹرے علما اور پروفیسر اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ ابھی ابھی ایک سرگرم بحث اس کی چھٹری تھی کہ مصری سرج ڈاشینگ پر، بازاری عربی استعمال کی جائے یا فصیح زبان۔ خدا کا شکر ہے کہ فیصلہ آخر کے موافق ہوا۔

عبودیت کا ذکر کرتے ہوئے، ہمارا ذہن فوراً اس طرف متقل ہو گیا کہ اس درخشاں زمانے میں جبکہ انگریزی زبان ہندوستان کے لئے الہام بنی ہوئی ہے گذشتہ سو سال کے اندر کیوں کوئی پائدار ادبی کارنامہ، معین مصلح نظر لئے ہوئے پیدا نہیں ہوا۔ دیکھیں مصلح نظر سے ہماری مراد سولہ مقامی رنگ کے اور کچھ نہیں ہو سکتی ہماری قدیم شاعری کا ڈھرا ٹوٹ گیا۔ لیکن جدید شاعری میں صرف ایک آدبے نام کے سوا، کوئی نعمت از نظر نہیں آتا۔ شاعری کی طرح افسانہ نویسی میں بھی ہمارا کوئی معین مصلح نظر نہیں معلوم ہوتا۔ کبھی تو ہم مرثیہ قوم کو، تو اور فطری شاعری سمجھنے لگتے ہیں۔ کہیں ہمارے رسالوں میں خوش آہنگ الفاظ کے مجموعے، طبع و شاعری کے کہنم بالشان نمونوں کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اور کبھی ہمارے شاعر آئینے کے پیچھے عطلی کی طرح وہی بولتے ہیں، جوان پر مسلط ہے۔ یہ گونا گونی یقیناً بے وجہ نہیں۔ ادبیات کی حقیقی زمین ہمیشہ قوم اور معاشرت رہی۔ جب ہمارا قوم اور معاشرت خطرہ میں ہے تو ادبیات کے استحکام کا کیا ٹھکانا۔ بنیاد درست نہیں، مکان کی تعمیر کیونکر ہو سکتی۔ عجیب افراتفری ہے عجیب طرح کے حجابات ہمارے ذہنوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ ہم نہ اسلاف کو صاف طور پر دیکھ رہے ہیں اور نہ اخلاف ہی کے اعمال سے مطمئن ہیں جہاں اپنے اجداد کو اگلے وقتوں کے لوگ سمجھ رہے ہیں، وہیں ہم اپنی اولاد کے حصے زیادہ جدت طراز ہونے پر کچھ زیادہ خوش نہیں معلوم ہوتے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چل رہا ہے۔ معلوم ہو رہا ہے کہ ہماری ہرسل، دوسری سل سے اجنبی ہوتی جا رہی ہے۔ اور

ان سے ایک دوسرے کو صحیح روشنی میں دیکھنے کی قوتیں بڑی حد تک سلب ہو رہی ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ یہی محکوم قوم زندگی ہے!

دور کیوں جا رہے، ہم اپنے گھروں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ جس فضا میں ہم رہنا گوارا کرتے ہیں وہ ہماری عورتوں کے لئے تقدیر نہیں کی گئی ہے۔ ہم مردوں کی تعلیم کے لئے تو جان توڑ کر کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ہم میں عورتوں کی تعلیم عام ہے یا وسیع ہے یا کم سے کم مفید ہے۔

لڑکیوں کو بھی آج جو کچھ پڑھنا پڑتا ہے، اس کو کل بھولنا پڑتا ہے۔ عملاً انھیں اس علم کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس لئے انجام کار خواندہ اور ناخواندہ دونوں برابر ہیں۔ الاما شا، اللہ بیٹے ہم اسلام سے کوسے اور اولاد سے ناخوش تھے ہی فضا کا یہ اختلاف گویا ہمیں گھر سے بھی بیگانہ بنا رہا ہے۔ اب نہیں معلوم ہم کہاں کے ہو رہیں گے۔

اس کے موازنہ کے طور پر یہ حال ملاحظہ فرمائیے کہ بھوپال اور شوہر کے مطامح کے اختلافات زائل کرنے کی غرض سے انگلستان میں ایک جماعت کا افتتاح کیا گیا ہے۔ جس میں اراکین پارلیمینٹ کی بیویوں کو سیاسیات کا اجمالی نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔ تعلیم کا آغازنی الحال بونا راکلج میں ہوا ہے۔ اس مختصر یہ ہے کہ یہ بی بی میاں شوہر کی حقیقی شریک بن گئیں۔

مہاراجہ سر صدر اعظم بہادر جمیع القابہم کی زندگی بھی ایک گونہ زندہ دلی کے ثبوت سے کچھ کم نہیں لگتی۔ ایسے اہم فرانس کے ساتھ آپ کی ذات خود صفات کو جو ادبی ذوق حاصل ہے وہ آپ کی لائف کا ایک درخشاں باب ہوگا چنانچہ عید الفطر کی تقریب سعید پر اپنے مسلمان احباب کی ضیافت طبع اس طرح فرمائی

ختم شد ماہ صیام و عید شوال آمد
مقدم عیدت مبارک بخت باو شان آمد
ایں نویدشاد بانی شادنی الحال آمد
تا جہاں باشد بیک درجہانت باد کام

فقیر شاد صوفی غنی غفر

اسلام میں عقلیت

عروج و زوال

(۱۱)

فلسفہ عقلیت و مادیت

جناب مولوی میر حسن الدین صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ) دیکل نے ڈاکٹر سراقبال کی کتاب

(THE DEVELOPMENT OF METAPHYSICS IN PERSIA —) کا اردو میں

ترجمہ کیا ہے جس کا ایک باب (ایرانی ثنویت) ”مجلد عثمانیہ“ (جلد شمارہ) میں شائع ہو چکا ہے۔

(مجلد مکتبہ)

ایرانی ذہن اپنے جدید سیاسی ماحول سے تطابق پیدا کرتے ہی اپنی خلقی آزادی کا اثبات کرتا ہے اور اپنی نظر کو فطریات سے ہٹا کر باطن کی طرف پھیر دیتا ہے تاکہ وہ اُس مواد پر غور و فکر کرے جو اس نے اپنے سفر کے دوران میں خود اپنے اندر سے فراہم کیا ہے۔ یونانی فکر کے مطالعہ سے وہ روح جو مادیت میں تقریباً گم ہو گئی تھی پھر اپنے آپ کو صداقت کا حکم تصور کرنے لگتی ہے باطنیت اپنا علم بلند کر کے ہر قسم کے خارجی اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی قوم کی ذہنی تباہی میں اس قسم کا دور گویا عقلیت۔ ارتیابیت۔ تصوف اور الحاد کا عہد ہوتا ہے یہ ایسی صورتیں ہیں جن میں ذہن انسانی باطنیت کی ترقی پذیر قوت سے متاثر ہو کر ہر قسم کے خارجی معیاد صداقت کو مسترد کر دیتا ہے۔ پس ہم زیر بحث عہد میں بھی یہی حالت پاتے ہیں۔

خلافت اُمیہ کے زمانہ میں عل اتحاد جاری تھا اور نئے حالات زندگی سے مطابقت پیدا کی جا رہی تھی لیکن خاندان عباسیہ کے عروج اور یونانی فلسفہ کے مطالعہ کے بعد سے ایران کی عقلی قوت نے جواب تک محصور رہی پھر آزاد ہو کر فکر و عمل کے تمام شعبوں میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نئی عقلی قوت کی پہلی مثالیں جو یونانی

فلسفہ کے مطالعہ سے حامل ہوئی تھی، اسلامی توحید پر تنقیدی نظریں پڑنے لگیں۔ قبل اس کے کہ عقل خنک مناظروں کے ہنگاموں سے دور ہو کر اشیاء کا ایک مستحکم نظریہ تعمیر کرنے کے لئے کسی گوشہ غزلت کی تلاش کرتی علم الکلام مذہبی جوہش سے متاثر ہو کر فلسفہ کی زبان بولنے لگا۔ آٹھویں صدی کے نصف اول میں واصل ابن اعطا جو مشہور متکلم حسن بصری کا ایرانی شاگرد تھا، اعتزال (عقلیت) کا سنگ بنیاد رکھتا ہے۔ یہ ایسی دلچسپ تحریک تھی جس میں ایران کے بعض مکتبہ رس اور دقیق النظر ارباب فکر بھی مشغول ہو گئے لیکن بالآخر بغداد اور بصرہ کے فلسفیانہ مناظرات میں اس تحریک نے اپنی قوت کو زائل کر دیا۔ بصرہ کا مشہور شہر ایک تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے مختلف قوتوں جیسے یونانی فلسفہ، اریٹامیت، مسیحیت، بدھ مت، اور مانویہ کی بازی گاہ بن گیا جس سے ایک متحسب ذہن کو کافی روحانی غذا دستیاب ہو جاتی تھی۔ اسی سے اسلامی عقلیت کے ذہنی ماحول نے تشکیل پائی۔ مسلمانوں کی تاریخ کے جس حصہ کو اسپٹاشامی دور کہتا ہے وہ فلسفیانہ مکتبہ بنجیوں سے معرا ہے۔ ایرانی دور کے آغاز کے ساتھ یونانی فلسفہ کے مسلمان متعلمین نے صحیح مفہوم میں اپنے مذہب پر غور و فکر کرنا شروع کیا اور وہ مفسرین جو معتزلہ تھے بتدریج مابعد الطبیعات کی طرف رجوع ہو گئے ہم کو یہاں اسی سے بحث کرنا ہے۔ معتزلہ کے علم الکلام کی تاریخ کا سراغ لگانا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ ہمارے

لئے خلافت عباسیہ کے عہد میں اکثر لوگ غنی طور پر انوی خیالات رکھتے تھے۔ دیکھو ہرست“ لبرک ۱۸۱ صفحہ ۳۲۸۔ دیکھو المعتزلہ“ مرتبہ فیو آرنلڈ لبرک ۱۹۱ صفحہ ۲۰۰۔ اس مصنف نے ایک مناظرہ کا ذکر کیا ہے جو ابو الہذیل اور ثنویت کے پیرو صلیح کے مابین ہوا تھا۔ دیکھو میکڈونلڈ کی ”مسلمانوں کا علم الکلام“ صفحہ ۱۳۳

مکتبہ معتزلہ مختلف قومیت کے تھے ان میں سے اکثر یا تو پیدائشی طور پر ایرانی تھے یا توطن سے ایرانی بن گئے تھے۔ واصل ابن اعطا بھی جو اس فرقہ بانی کہا جاتا ہے ایرانی تھا (براؤن۔ تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۲۸۱) خان کیران کے کاخ کا سرانج عہد امیر کے کلامی مناظرات تک لگتا، اعتزال واصل ابن اعطا کی تحریک تھی۔ لیکن بقول پروفیسر براؤن کے (تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۲۸۳) یہ بالکل صحیح ہے کہ شیعہ اور قدرۃ عقائد اکثر دوش بدوش پائے جاتے تھے اور شیعوں کا جو نظریہ آج کل ایران میں مروج ہے وہ اکثر حیشتوں سے منقری ہے۔ اس کے برخلاف حسن الاشعری جو اعتزال کا زبردست مخالف ہے شیعوں کے نزدیک بہت ہی خطرناک سمجھا جاتا تھا اس میں اس قدر اضافہ کیا جائے کہ اعتزال کے بعض زبردست نامیدے مذہباً شیعہ تھے جیسے ابو الہذیل (المعتزلہ مرتبہ فیو آرنلڈ صفحہ ۲۰۰) اسکے برعکس الاشعری کے اکثر پیروئن ایرانی تھے (دیکھو ان کے آثار کے اقتباسات مرتبہ ہرن) اعلیٰ اشعری طریقہ فکر کو خالص سامی تحریک سے منسوب کرنا جائز نہیں معلوم ہے

پیش نظر مقصد کے لئے اس قدر کافی ہے کہ معتزلہ نے اسلام کے متعلق جو نقطہ نظر پیش کیا ہے اس کے مابعد اعلیٰ پہلو کو اجمالی طور پر بیان کر دیں لہذا تصور خدا اور نظریہ مادہ ہی عقلیت کے وہ پہلو ہیں جن پر ہم یہاں بحث کرنا چاہتے ہیں۔

معتزلہ دقیق جدلیات کے ذریعہ سے خدا کی وحدت کے جس تصور تک پہنچے تھے وہ ایسا اساسی نقطہ ہے جہاں ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور معتزلہ میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے ان کے نقطہ نظر سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خدا کی صفات ان ہی میں موجود ہیں بلکہ وہ خدا ہی کی ذات و ماہیت میں داخل ہیں اسی لئے معتزلہ صفات الہی کے علیحدہ وجود سے انکار کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ صفات مجرد ہستی ربانی کی بالکل عین ہیں۔ ابو الہذیل کہتا ہے کہ ”خدا ہمہ دان، قادر مطلق اور ذوی حیات ہے اور اس کے علم قوت اور حیات ہی پر اس کی ذات مشتمل ہے“ خدا کی وحدت خالص کی توضیح کے لئے یوسف البصیر نے حسب ذیل پانچ اصول پیش کئے ہیں۔

۱۔ سالمہ اور عارضہ کا مفروضہ

۲۔ خالق کا مفروضہ

۳۔ خدا کے احوال کا مفروضہ

۴۔ اُن صفات کا انکار جو خدا کے لئے موزوں نہیں ہیں۔

۵۔ تعدد صفات کے باوجود خدا کی وحدت۔

وحدت کے اس تصور کو مزید تغیرات میں سے گزرنا پڑا یہاں تک کہ معمر اور ابو حاشم کے ہاتوں میں آ کر اس کی صورت امکان مجرد کی سی ہو گئی جس کے متعلق کوئی بات متعین طور پر نہیں کہی جاسکتی وہ کہتا ہو کہ خدا کے علم کے متعلق کوئی بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ اس کو جس چیز کا علم ہو گا وہ خود اس کی ذات میں ہو گی اول الذکر اسے موضوع و مفروض کی عینیت لازم آتی ہے جو مہمل ہے اور دوسرا خیال خدا کی ذات میں ثنویت کو مستلزم ہے جو ناممکن ہے تاہم نظام کے شاگرد احمد اور فضل نے اس ثنویت کو تسلیم کر لیا اور اس بات کے قائل ہو گئے کہ ابتدائی خالق دو ہیں۔ خدا جو ہستی انہی ہے اور کلام الہی یعنی روح اللہ جو ہستی ممکن ہے۔ معمر نے

لے شہرستانی مرتبہ کیورٹین صفحہ ۳۲

لے ڈاکٹر فرانکل (EIMUTAZILITISCHER KALAM) صفحہ ۱۳

لے شہرستانی صفحہ ۴۸ دیکھو ایٹنر کی (DIE MUTAZILITEN I, 1872) صفحہ ۵۹

لے ابن خرم (مطبوعہ قاہرہ) جلد چہارم صفحہ ۱۹۰ دیکھو شہرستانی صفحہ ۴۲

دوسرا پہلو جو پیش کیا تھا اس میں صداقت کے عنصر کو الگ کر کے پوری طرح واضح کرنا ایران کے آنے والے صوفیانہ مفکرین کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض عقلی غیر شعوری طور پر وحدت الوجود کی سرحد تک پہنچ گئے تھے اور ایک لحاظ سے خدا کی انھوں نے جو تعریف کی ہے اور قانون مطلق کی خارجیت کو باطنیت میں منتقل کرنے کی جو مشرتکہ کو شش کی ہے اس سے وحدت الوجود کے لئے راستہ صاف ہو رہا تھا۔

لیکن عقلیت کے علمبرداروں نے خالص باعد الطبعی تعلیمات میں مادہ کی توجیہ سے اہم اضافہ کیا، اسی کو ان کے مخالفین اشاعہ نے کچھ رو بدیل کر کے ماہیت خدا سے متعلق اپنے خیالات سے مطابق کر لیا۔ نظام میں خاص دلچسپی کی خیر یہ ہے کہ اس نے اس خیال کو مسترد کر دیا کہ فطرت کی ترتیب و تنظیم میں بے ضابطگی ہے فطرت کی اس دلچسپی کی رہنمائی میں جانچنے ارادہ کی تعریف خالص سلبی نقطہ نظر سے کی۔ اگر عقلی شخص ارادہ کے تصور کو ترک کرنا نہیں چاہتے تھے تو ہم وہ انفرادی مظاہر فطرت کے استقلال و آزادی کی حمایت کے لئے مستحکم دلیل کے متلاشی تھے اور یہ دلیل ان کو خود مادہ میں مل گئی۔ نظام نے یہ تعلیم دی کہ مادہ لامحدود طور پر قابل تقسیم ہے اس نے جو ہر و عرض کے باہمی امتیاز کو بھی مٹا دیا۔ وجود ایک ایسی صفت سمجھی جاتی تھی جسے خدا مادہ کے اُن ذرات کو عطا کیا ہے جو پیشتر ہی سے موجود تھے بغیر اس صفت کے یہ ذرات ناقابل ادراک ہوتے ابن خرم کہتا ہے کہ محمد ابن عثمان جو معتزلہ کے شیوخ میں سے تھا اس بات کا قائل تھا کہ معدوم (یعنی ایسا سالمہ جو وجود سے پہلے کی حالت میں ہوا ہی ایک جسم ہے جو حالت عدم میں ہے لیکن صرف فرق یہ کہ وہ قبل الوجود حالت میں نہ محک رہتا ہے نہ غیر محک اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ خلق کیا گیا ہے لہذا جو ہر مجموعہ ہے رنگ، بو، ذائقہ جیسی صفات کا۔ اور یہ صفات بھی مادی صلاحیتوں کے سوا اور کچھ نہیں روح بھی مادہ کی ایک لطیف قسم ہے۔ اعمال علم محض ذہنی حرکات ہیں۔ تخلیق محض ان صلاحیتوں کو معرض ظہور میں لانا ہے جو پیشتر ہی سے موجود ہیں۔ کسی شے کی انفرادیت جبکی یہ تعریف کی گئی ہے کہ وہ

لیکن مسئلہ صفحہ ۵۹

لے اسٹیز (DIEMUTAZILITEH)

لے ۵۹ صفحہ ۵۹

لے شہرستانی مرتبہ کیورٹین صفحہ ۳۸

لے ابن خرم (مطبوعہ قاہرہ) جلد پنجم ص ۲۲ سے اسٹیز (DIEMUTAZILITEH) صفحہ ۸۰

چیز جس کے متعلق کسی بات کو محمول کیا جاسکے "خود اس شے کے تصور کا لازمی عنصر نہیں ہے۔ مجہولہ اشیا جس کو ہم کائنات سے تعبیر کرتے ہیں خارجی حیثیت رکھتا ہے یا یہ ایک قابل ادراک حقیقت ہے جو نفس ادراک سے علیحدہ موجود ہے۔ ان مابعد الطبعی دقیقہ سنجیوں کا تعلق علم کلام سے تھا۔ عقلین کے نزدیک خدا ایک وحدت مطلق ہے جس میں کسی طرح کی کثرت کو دخل نہیں اور وہ قابل ادراک تعدد دینے کائنات کے بغیر بھی موجود رہ سکتا ہے۔

خدا کی فعلیت اس بات پر مشتمل ہے کہ وہ سالمہ کو قابل ادراک بنا دے۔ سالمہ کے خواص خود اس کی ذات سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جو پتھر اوپر کی طرف پھینکا جاتا ہے وہ اپنے باطنی خواص کی وجہ سے نیچے گر جاتا ہے۔ الطائر بصری کہتا ہے کہ خدا نے رنگ و بو طول و عرض اور ذائقہ کو خلق نہیں کیا بلکہ یہ خود اجسام ہی کی فعلیتیں ہیں۔ خدا کو کائنات میں اشیا کی تعداد کا بھی علم نہیں ہے۔ بشیر ابن الموت نے تو لیا تعامل اجسام کے نظریہ سے اقام کے خواص کی توجیہ کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عقلین فلسفیانہ حیثیت مادیوں تھے اور علم الکلام کے نقطہ نظر سے البین۔

ان کے نزدیک جوہر اور سالمہ ایک دوسرے کے مثال تھے۔ وہ جوہر کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ یہ ایک سالمہ ہے جو مکان کو شامل ہوتا ہے اور اس میں شامل مکان ہونے کی صفت کے علاوہ بہت قوت اور وجود کی صفات بھی ہیں بس یہی اس کی ماہیت ہے۔ اسکی صورت مزیع ہے کیونکہ اگر اس کو مدور سمجھا جائے تو مختلف سالمات کی ترکیب ناممکن۔ تاہم سالمہ کی ماہیت کے متعلق سالمیت کے حایو میں بے حد اختلاف آرا ہے بعض کہتے ہیں کہ سب سالمات ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن ابو القاسم بلخی ان کو شامل مخالف بھی سمجھتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ دو اشیا ایک دوسرے کے مثال ہیں تو اس لازمی طور پر ہمارا یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ ان کے تمام صفات میں بھی مماثلت ہے۔ ابو القاسم سالمہ کی عدم فنا کے متعلق نظام سے مختلف الرے ہے وہ کہتا ہے کہ اس کا آغاز ایک زمانہ میں ہوا ہے لیکن وہ کلیتاً فنا نہیں ہو جاتا۔ بقول سے کسی شے کو وجود کی صفت کے سوا کوئی نئی صفت حاصل نہیں ہوتی اور تسلسل وجود

۱۰ شہرستانی صفحہ ۲۸ ۱۱ ابن خرم مطبوعہ قاہرہ جلد چہارم صفحہ ۱۹ تا ۱۹

۱۲ ابن خرم جلد چہارم صفحہ ۱۹

۱۳ شہرستانی صفحہ ۲۸

کوئی مزید صفت ہی نہیں ہے۔ فعلیت الہی نے سالمہ کو اور نیز اس کے تسلسل وجود کو خلق کیا ہے۔ تاہم ابوالقاسم تسلیم کرتا ہے کہ بعض سالمات ستم وجود کے لئے خلق نہیں کیے گئے ہوں گے۔ وہ سالمات کے دریا کسی مکان کے وجود سے بھی انکار کرتا ہے اور اسی ملک کے دیگر نمایندوں کے خلاف یہ تسلیم کرتا ہے کہ سالمہ عدم کی حالت میں جو ہر کی حیثیت سے نہیں رہ سکتا۔ اس کے خلاف کہنا تناقض حدود ہے۔ یہ کہنا کہ جو ہر حالت عدم میں بھی جو ہر کی حیثیت سے رہ سکتا ہے گویا اس بات کے برابر ہوگا کہ وجود عدم کی حالت میں بھی وجود کی حیثیت سے قائم رہ سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابوالقاسم اشاعرہ کے نقطہ نظر تک پہنچ جاتا ہے جنہوں نے عقلیئین کے نظریہ مادہ پر ایک مہلک ضرب لگائی تھی۔

(۲)

ہم عصری تحریکات فکر

اغترال کے نشوونما کے ساتھ ساتھ جیسا کہ قدرتی طور پر عقلی جدوجہد کے زمانہ میں ہوا کرتا ہے۔ ہم کو دوسرے میلانات فکر بھی نظر آتے ہیں جو اسلام کے فلسفیانہ اور مذہبی حلقوں میں رونما ہوئے۔ ہم ان پر ایک اجمالی نظر ڈالیں گے۔

۱۔ اریٹاسیت۔ اریٹاسیت کا میلان عقلیت کے خالص جدلیاتی طریقہ کا قدرتی نتیجہ تھا ابن کثیر اور ابجا خط جیسے لوگ بظاہر عقلیئین کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن وہ دراصل اریٹاسیتین یا مشکلیں تھے ابجا خط نے جو فطرت کی طرف مائل تھا کسی پیشہ ور متکلم کا نقطہ نظر اختیار نہیں کیا بلکہ اس کا نقطہ نظر بھی اُس زمانہ کے عام روشن خیال لوگوں کا تھا اس نے اپنے پیشروں کی ما بعد الطبعی باریکی بینیوں کے خلاف رد عمل کیا اور اس میں علم الکلام کے دائرہ کو ایسے جہل تک وسیع کرنے کی خواہش پائی جاتی ہے جو معتقدات مذہب پر غور و فکر کرانے کے ناقابل ہیں۔

۲۔ تصوف۔ اس کا تعلق اعلیٰ مبدا علم سے تھا اس کو سب سے پہلے ذوالنون نے منضبط کیا۔ اس میں اشاعرہ کی خشک عقلیت کے مقابلہ میں زیادہ گہرائی اور مدرست کی مخالفت پیدا ہوتی گئی۔ آئندہ باب میں ہم اس دھچپ تحریک پر بحث کریں گے۔

۳۔ نہ کا اچا یعنی اسماعیلیت جو بالتخصیص ایرانی تحریک تھی اور جس نے آزاد خیالی کو مٹانے کی بجائے اس سے مصالحت کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ یہ تحریک اس زمانہ کے کلامی مناقشات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی لیکن اس کو آزاد خیالی سے اساسی تعلق تھا۔ ان اسالیب کی شاہدیت سے جن کو اسماعیلی مبلغین اور اس مجلس کے اراکین نے اختیار کیا تھا جو اخوان الصفا کے نام سے مشہور تھی یہ پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں اداروں میں کوئی مخفی تعلق تھا۔ اس تحریک کے بانیوں کا خواہ کچھ ہی مقصد ہو تاہم عقلی مظاہر کی حیثیت سے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ فلسفیانہ و مذہبی آراء و افکار کی کثرت سے جو کہ فکری جدوجہد کا لازمی نتیجہ ہے ایسی قوتیں وجود میں آسکتی ہیں جو خود اس خطرناک کثرت کے خلاف کرتی ہوں۔ تاریخ فلسفہ یورپ کی اٹھارویں صدی میں نشے بھی اہمیت کا وہ کی تحقیق کا آغاز ایک اریٹائی نقطہ نظر سے کرتا ہے اور اس کا فلسفہ وحدت الوجود پر مبنی ہوتا ہے۔ شلارٹر افریخٹا عقل کے ایمان کو متاثر کرتا ہے۔ جا کوئی عقل سے بالاتر مبداء علم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن کائنات نام مابعد الطبعی تحقیقات کو ترک کر کے علم کو حسی ادراک تک محدود کر دیتا ہے اس کے برخلاف دی میٹر اور ٹیلیگل ایسے پاپا کی مذہد و اقتدار پر انحصار کرتے ہیں جو قطعاً معصوم سمجھا جاتا ہے۔ عقیدہ امامت کے علمبردار بھی دی میٹر کے ہم خیال ہیں لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ اسماعیلیوں نے ایک طرف تو اس عقیدہ کو اپنے مذہب کا رنگ بنیاد قرار دیا اور دوسری طرف آزاد دی فکر کو جائز رکھا۔

لہذا اسماعیلی تحریک اس مسلسل و مستمر جنگ کا ایک پہلو ہے جس کو ایسے ایرانیوں نے جن کو مذہبی آزادی حاصل تھی، اسلام کے مذہبی و سیاسی نصب العین کے خلاف برپا رکھا۔ فرقہ اسماعیلیہ ابتداءً شیعہ مذہب ہی کی ایک شاخ تھا لیکن عبداللہ ابن مہمون کے زمانہ میں جو غالباً مصر کے فاطمی خلفا کا مورث اعلیٰ تھا اس نے عالمگیر نوعیت حاصل کر لی۔ عبداللہ ابن مہمون نے اس زمانہ میں وفات پائی جبکہ آزاد خیالی کے زبردست دشمن الاشعری کی ولادت ہوئی۔ اس نے عجیب و غریب تدبیر سوچی اور مختلف رنگ کے

۱۔ بن خرم اپنی کتاب الملل والنحل میں ایران کے ان محمدانہ فرقہ بندیوں کو عربوں کے خلاف ایک مسلسل پیکار سمجھتا ہے اس پر

اس طریقہ سے ایرانیوں نے عربوں کی قوت کے استحصال کی کوشش کی۔ دیکھو فان کریمر کی (GESCHICHTE)

DER HERRSCHENDEN IDEEN DES ISLAM

صفحہ ۱۰۱ جس میں قرطبہ کے اس عرب مورخ کے خیالات کو تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔

خیالات کی آمیزش سے ایک منطقی نظام فلسفہ تعمیر کیا جو اپنی پراسرار نوعیت اور مبہم فضا غورثی فلسفہ کی وجہ سے ایرانی ذہن کے لئے بے حد مرغوب تھا۔ اس نے مجلس اخوان الصفا کے اراکین کی طرح عقیدہ امامت کے مقدس بھیس میں اُس زمانہ کے مرد و بھارت کو مرتب و منضبط کرنے کی کوشش کی۔ یونانی فلسفہ مسیحیت، تخلیقیت، تصوف، مانویت، ایرانی اتحاد اور سب سے بڑھ کر حلول کے تصور نے اسماعیلی نظام کی تشکیل میں حصہ لیا۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس مذہب کے مختلف پہلوؤں کو ”امام“ جو ہمیشہ حلول کرنے والی ایک عالمگیر عقل ہے اپنے زمانہ کے عقلی نشوونما کے لحاظ سے ایک متبدی پر تبدیج ظاہر کرتا ہے آزاد خیالی نے اس اندیشہ سے کہ کہیں وہ خود معدوم نہ ہو جائے۔ اسماعیلی تحریک میں ایک مستحکم بنیاد پر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور بدقسمتی سے یہ بنیاد اس کو ایسے تصور میں حائل ہوئی جو خود اُس کی ذات کے منافی ہے نہ جوں کبھی اپنا اثبات کرتی ہے اس لاوارث لڑکے کو اپنا متبی کر لیتی ہے اور ماضی حال و مستقبل کا علم فراہم کرنا چاہتی ہے۔

بدقسمتی سے اس تحریک کو اُس زمانہ کی ریاسات سے جو تعلق تھا اس کی وجہ سے اکثر علماء کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان کو مثلاً (میکڈونلڈ) اس میں صرف یہی نظر آتا ہے کہ ایران سے عربوں کی سیاسی قوت کو مٹانے کی یہ ایک زبردست سازش تھی۔ انھوں نے اسماعیلیہ مذہب پر جس کے پیروں میں بعض اچھے دماغ اور مخلص دل کے لوگ بھی تھے یہ الزام لگایا ہے کہ یہ سنگدل قاتلوں کی ایک جماعت تھی جو ہمیشہ اپنے شکار کی تاک میں رہتی تھی ان لوگوں کی سیرت کا اندازہ کرتے وقت ہم کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انھوں نے نہایت ہی وحشیانہ ظلم و تعدی سے مجبور ہو کر اس خون ریز تعصب کا انتقام لیا۔ مذہبی اعتراض کے لئے قتل و خون ناقابل اعتراض سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ کل سامی نسل میں یہ جائز قرار دیا گیا تھا۔ سولہویں صدی کے نصف آخر تک پاپائے روم اینٹ بار تھو لومبو کے وحشت ناک قتل کو بھی روار کھتا تھا یہ ایک بالکل جدید تصور ہے کہ ایسا قتل و خون خواہ وہ مذہبی جوش کے تحت ہی کیوں نہ سرزد ہوا ہو پھر بھی ایک جرم ہی اور انصاف کا اقتضایہ ہے کہ قدیم اقوام کو ہم اپنے معیار خطا و صواب سے نہ جانچیں۔ ایک زبردست مذہبی تحریک جس نے ایک عظیم الشان سلطنت کی عمارت کی بنیادوں کو ہلادیا ہوا اور جو ظلم و تعدی، کذب و بہتان، ملامت و سرزنش کے سخت امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر چکی ہو اور علم و حکمت کی صدیوں علمبردار رہی ہو وہ ایک سیاسی سازش کی کمزور بنیاد پر جس کی نوعیت بالکل متعا

و عارضی تھی کلیۃً انحصار نہیں کر سکتی۔ اسماعیلیت باوجودیکہ اس کی ابتدائی قوت مٹ چکی ہے پھر بھی وہ ہندوستان، ایران، وسط ایشیا، شام اور افریقہ کے کثیر التعداد افراد کے اخلاقی نصب العین پر چمک رہا ہے ایرانی فکر کے آخری منظر یعنی بابی مذہب کی نوعیت بھی دراصل اسماعیلی ہے۔

اب ہم اس فرقہ کے فلسفہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اس نے مابعد کے عقلیین سے الوہیت کا تصور مستعار لیا اور یہ تعلیم دی کہ خدایا انتہائی ہستی اعراض سے معرا ہے اس کی فطرت میں کسی محمول کو دخل نہیں۔ جب ہم اس پر قوت کی صفت کو محمول کرتے ہیں تو ہمارا مفہوم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ (خدا) قوت عطا کرنے والی ہستی ہے۔ جب ہم اس کو ازلیت سے متصف کرتے ہیں تو ہم اس چیز کی ازلیت کو ظاہر کرتے ہیں جس کو قرآن نے ”امر“ (کلام الہی) سے تعبیر کیا ہے جو ”خلق“ سے بالکل متماثر ہے۔ اس کی فطرت میں تمام مناقضات معدوم ہو جاتے ہیں اور اسی سے تمام تنخالیفات صادر ہوتے ہیں۔ پس انہوں نے خیال کیا کہ وہ مسئلہ جس نے زرتشت اور اس کے پیروں کو پریشان کر رکھا تھا اُن سے حل ہو گیا۔

اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ کثرت کیا ہے؟ اسماعیلیہ اس مابعد الطبعی اصول موضوعہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں کہ ”ایک سے صرف ایک ہی پیدا ہو سکتا ہے“ لیکن یہ ایک اس چیز سے بالکل مختلف نہیں ہے جس سے یہ پیدا ہوا ہے یہ دراصل ہستی اولیٰ ہی ہے جو متبدل ہو گئی ہے لہذا وحدت اولیٰ نے اپنے آپ کو عقل اول (عالمگیر عقل) میں متبدل کر دیا اور اپنی اس تبدیلی سے عالمگیر روح پیدا کیا اور اس روح نے اپنے اصلی مبدا سے کامل مانگت پیدا کرنے کے لئے حرکت کی ضرورت محسوس کی اور اسی وجہ سے ایک ایسا جسم درکار ہوا جس میں حرکت کی قوت ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے روح نے افلاک کو پیدا کیا جو اسکی ہدایت کے مطابق حرکت دوری میں ہیں اس نے عناصر کو بھی پیدا کیا جن کے باہمی امتزاج سے عالم مرنی نے تشکیل پائی۔ یہ گویا کثرت و تعدد کا ایک منظر ہے جس میں سے گزر کر روح اپنے اصلی ماخذ کی طرف واپس جاتی ہے۔ انفرادی روح کل کائنات کا خلاصہ ہے جو محض اس کی تربیت کے لئے وجود میں آئی ہے۔ عالمگیر روح وقتاً فوقتاً امام کی شخصیت میں حلول کر جاتی ہے اور امام روح کو اس کے تجربے و فہم کی مناسبت سے اُس کو روشن کر دیتا ہے اور کثرت و تعدد کے منظر تبدیل ہوتا ہے اس کی بہمنائی وحدت ازلی کے عالم کی طرف کرتا ہے۔ جب عالمگیر روح اپنی منزل مقصود کو پہنچ جاتی ہے یا اپنی ہستی کی طرف واپس آ جاتی ہے تو عمل انہدام شروع ہو جاتا ہے ”وہ ذرات جن سے

عالم تکمیل پاتا ہے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ نیکی کے ذرات حق (خدا) کی طرف جو وحدت کو
تمثل کرتا ہے اور بدی کے ذرات باطل (شیطان) کی طرف جو تعدد کو تمثل کرتا ہے چلے جاتے ہیں۔
یہ اسماعیلی طائفہ کا ایک اجمال ہے بقول شہرستانی کے یہ فلسفیانہ اور مانوی تصورات کا ایک مرکب ہے
ارتیابیت کی خوابیدہ روح کو بیدار کر کے انہوں نے مبتدیوں کو اس فلسفے کے جرعے نوش کرائے اور بالآخر
ان کو روحانی آزادی کے اُس زینہ تک لے گئے جہاں مذہبی رسوم مٹ جاتے ہیں اور حکیمانہ مذہب کا راسخ
دروغ یا فیوں کا ایک منضبط و مرتب مجموعہ نظر آتا ہے۔

اسماعیلیوں کا نظریہ اس امر کی سب سے پہلی کوشش تھی کہ مروجہ فلسفہ کو ایرانیوں کے اصلی تصو
کائنات سے غاکر اسلام کو اسکی روشنی میں پیش کیا جائے اور قرآن کی تفہیمی تفسیر کی جائے یہ وہ طریقہ تھا جس کو
تصوف نے بعد میں اختیار کیا۔ ان کے نزدیک زرتشتیوں کا اہرمن (شیطان) اشیاء خبیثہ کا خالق نہیں بلکہ یہ
ایسی قوت ہے جو وحدت ازل میں خلل انداز ہوتی ہے اور اُس کو کثرت و تعدد میں منقسم کر دیتی ہے۔
اس خیال میں کہ انتہائی ہستی کی ماہیت میں کسی تفریقی قوت کو فرض کرنا چاہئے تاکہ بحر بی کثرت و تعدد کی
توجیہ ہو سکے۔ مزید تغیرات ہوئے یہاں تک کہ چودھویں صدی میں عرو فی فرقہ (جو اسماعیلیہ ہی کی ایک
شاخ تھا) نمودار ہوا جس کے بعد اس خیال کی سرحد ایک طرف تو ہم عصری تصوف سے مل گئی اور دوسری
طرف مسیحی تبلیغ سے۔ عرو فیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ”کن“ ازل کا کلام الہی ہے یہ بذات خود تو غیر مخلوق
لیکن مزید تخلیق کا باعث ہوا ہے گویا یہ کلام خارجیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کلام کے بغیر الوہیت کی
حقیقت کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ الوہیت حواس یا ادراک کی دسترس سے ماوراء ہے۔ یہ کلام
رحم مریم میں آکر جنماتی صورت اختیار کر لیتا ہے تاکہ باپ کو آشکار کرے۔ کل کائنات کلام الہی کا
منظر ہے جس میں خدا پوشیدہ ہے۔ کائنات کی ہر ایک آواز خدا ہی کے اندر ہے ہر ایک ذرہ الہیت کا
گیت گاتا ہے۔ سب کچھ حیات ہے۔ جو لوگ اشیاء کی انتہائی حقیقت کو منکشف کرنا چاہتے ہیں ان کو
”اشم“ سے ”شمی“ کی تلاش کرنی چاہئے جس میں اس کی ذات ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی۔

۱۴۹ ورق ۱۱۳۹ الف

۱۵۵ الف

۱۴۹ ورق ۱۱۳۹ الف

۱۵۵ الف

۱۵۵ الف

اس نے فطرت انسانی کو نظر انداز کر دیا اور مذہب اسلام کی اصابت میں انتشار پیدا کر دیا اسی لئے اس پر رد عمل ہوا۔

اشاعرہ کی سرکردگی میں راسخ العقیدہ لوگوں نے جو رد عمل کیا اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جدلیاتی طریقے کو الہام ربانی کی سند کی حمایت کے لئے استعمال کیا جائے عقلیین کے مقابلہ میں یہ لوگ صفات باری کے قائل تھے اور آزادی ارادہ کے مسئلہ میں انھوں نے قدیم مکتب کی انتہائی جبریت اور عقلیین کی انتہائی فدائیت کے مابین ایک درمیانی راستہ اختیار کیا۔ ان کی یہ تعلیم ہے کہ قوت اعتدائی اور دیگر افعال انسانی کا خالق خدا ہے اور انسان میں یہ قوت ودیعت ہے کہ وہ افعال کے مختلف طریقے سے ایک دوسرے کے لیکن فخر الدین رازی نے ”کتاب“ کے تصور کو رد کر دیا اور اپنی تفسیر قرآن میں علی الاعلان جبر کا نظریہ پیش کیا۔ جس وقت رازی نے فلسفہ پر زبردست حملہ کیا تھا۔ طوسی اور قطب الدین نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔

ماتریدیہ ایک دوسرا فرقہ ہے جو عقلی علم الکلام کے خلاف پیدا ہو گیا تھا اس کا بانی ابو منصور ماتریدی ماترید کا باشندہ تھا جو سمرقند کے نواح میں واقع ہے اس فرقہ نے قدم عقلیین کا نقطہ نظر اختیار کر کے اشاعرہ کے خلاف یہ تعلیم دی کہ انسان کو اپنے افعال پر پورا اختیار حاصل ہے اور یہ کہ اس کی قوت اس کے افعال کی نوعیت پر اثر ڈالتی ہے۔ الاشعری کی دلچسپی خالص کلامی تھی لیکن یہ ممکن تھا کہ حقیقت کی انتہائی ماہیت کو نظر انداز کر کے عقل و الہام میں توافق پیدا کیا جاسکے۔ اسی لئے بالکلانی نے اپنی علم الکلامی تحقیقات میں چند ابعاد الطبعی قضایا کو استعمال کیا (جیسے جوہر ایک وحدت انفرادی صفت دوسری صفت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ خلا محال ہے) اور اس طریقہ سے اپنے مکتب کو بالعدلیہ بنیاد پر قائم کر دیا۔ ہمارا اصل مقصد اسی پر روشنی ڈالنا ہے۔ لہذا ہم اس سے بحث نہیں کریں گے کہ اس نے عقاید راسخ کی کس طرح حمایت کی (جیسے قرآن غیر مخلوق ہے۔ خدا کی رویت ممکن ہے بلکہ ہم ان کے کلامی مناقشات میں سے مابعد الطبعی تفکر کے عنصر کو علیحدہ کریں گے۔ اپنے زمانہ کے فلاسفہ خود انہی کے ہتھیار اور اسلحہ سے مقابلہ کرنے کے لئے ان کے لئے فلسفہ کا کیٹھنا گزیر تھا۔ لہذا ان کو بہ رخایا بلارضا ایک مخصوص نظریہ علم کو منو دینا پڑا۔

اشاعرہ کے نزدیک خدا انتہائی واجب الوجود ہستی ہے جو اپنی صفت کو اپنی ہی ہستی

میں رکھتا ہے اور اس کا وجود اور ماہیت ایک دوسرے کے مائل ہیں۔ اس استدلال کے علاوہ کہ حرکت ممکن ہے انھوں نے ہستی اولیٰ کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے حسب ذیل دلائل استعمال کئے (۱) ان کا یہ استدلال ہے کہ تمام اجسام جس حد تک کہ ان کے وجود کے مظاہر کا تعلق ہے کیا ہی

ہیں لیکن باوجود اس وحدت کے ان کی صفات ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متخالف ہیں لہذا ہم ایک انتہائی علت کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں تاکہ اجسام کے تجربی تخالف و تباین کی توجیہ ہو سکے (۲) ہر متنی ممکن کے لئے ایک علت کی ضرورت ہے تاکہ اس کے وجود کی توجیہ ہو سکے۔

کائنات ممکن ہے اس لئے اس کی ایک علت ہونی چاہئے اور یہ علت خدا ہے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل طریقہ سے یہ ثابت کیا کہ کائنات ممکن ہے۔ کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ یا تو جوہر ہے یا عرض یا صفت کا ممکن ہونا تو ایک بدیہی امر ہے اور جوہر کا ممکن ہونا اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی جوہر اعراض سے علیحدہ موجود نہیں رہ سکتا۔ عرض کا ممکن ہونا جوہر کے ممکن ہونے کو مستلزم ہے ورنہ جوہر کی ازلیت عرض کی ازلیت کو مستلزم ہوگی۔ اس استدلال کی نیت کا پوری طرح اندازہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشاعرہ کے نظریہ علم کو پہلے سمجھ لیا جائے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ شئے کیسے ہے انھوں نے ارسطو کے مقولات فکر پر تنقیدی نظر ڈالی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اجسام کی ذات میں کوئی خواص نہیں ہیں۔ اجسام کی صفات ثانویہ اور صفات اولیہ میں انھوں نے کوئی امتیاز نہیں کیا بلکہ ان سب کو ذہنی علانق میں تحویل کر دیا۔ صفت بھی ان کے نزدیک محض ایک عارضہ ہے جس کے بغیر جوہر موجود نہیں رہ سکتا۔ ان کے جوہر یا سالمہ کے لفظ میں خارجیت کا ایک مبہم سامفہوم پایا جاتا ہے۔ تخلیق ربانی کے تصور کی حمایت کرنے کی مقدس خواہش سے متاثر ہو کر انھوں نے جو تفہیم کی ہے وہ کائنات کو بار کلمے کی طرح منضبط ذہنیت میں تحویل کر دیتی ہے اس توجیہ وہ ارادہ الہیہ سے کرتے ہیں۔ علم انسانی کی تحقیق میں کانسٹ ”شئی بذات خود“ کے تصور تک پہنچنا مشکل جانتا ہے لیکن اشاعرہ نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور اپنے زمانہ کی لاادری حقیقت کے غلامانہ یہ دعویٰ کیا کہ اس نام نہاد پوشیدہ جوہر کا وجود محض اس حد تک ہے جس حد تک کہ ذہن سے اس کو کوئی نسبت ہو سکتی ہے۔ لہذا ان کی سالمیت لوٹنے سے قریب ہو جاتی ہے جس نے خارجی حقیقت کو

۱۔ (MARTIN SCHREINER) نے سیکڑ و لڈ شاعرہ کی مابعد الطبیعیہ کا دلچسپ بیان پیش کیا ہے ”مسلمانوں کا علم الکلام“ صفحہ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳۸۲۔ ۱۳۸۳۔ ۱۳۸۴۔ ۱۳۸۵۔ ۱۳۸۶۔ ۱۳۸۷۔ ۱۳۸۸۔ ۱۳۸۹۔ ۱۳۹۰۔ ۱۳۹۱۔ ۱۳۹۲۔ ۱۳۹۳۔ ۱۳۹۴۔ ۱۳۹۵۔ ۱۳۹۶۔ ۱۳۹۷۔ ۱۳۹۸۔ ۱۳۹۹۔ ۱۴۰۰۔ ۱۴۰۱۔ ۱۴۰۲۔ ۱۴۰۳۔ ۱۴۰۴۔ ۱۴۰۵۔ ۱۴۰۶۔ ۱۴۰۷۔ ۱۴۰۸۔ ۱۴۰۹۔ ۱۴۱۰۔ ۱۴۱۱۔ ۱۴۱۲۔ ۱۴۱۳۔ ۱۴۱۴۔ ۱۴۱۵۔ ۱۴۱۶۔ ۱۴۱۷۔ ۱۴۱۸۔ ۱۴۱۹۔ ۱۴۲۰۔ ۱۴۲۱۔ ۱۴۲۲۔ ۱۴۲۳۔ ۱۴۲۴۔ ۱۴۲۵۔ ۱۴۲۶۔ ۱۴۲۷۔ ۱۴۲۸۔ ۱۴۲۹۔ ۱۴۳۰۔ ۱۴۳۱۔ ۱۴۳۲۔ ۱۴۳۳۔ ۱۴۳۴۔ ۱۴۳۵۔ ۱۴۳۶۔ ۱۴۳۷۔ ۱۴۳۸۔ ۱۴۳۹۔ ۱۴۴۰۔ ۱۴۴۱۔ ۱۴۴۲۔ ۱۴۴۳۔ ۱۴۴۴۔ ۱۴۴۵۔ ۱۴۴۶۔ ۱۴۴۷۔ ۱۴۴۸۔ ۱۴۴۹۔ ۱۴۵۰۔ ۱۴۵۱۔ ۱۴۵۲۔ ۱۴۵۳۔ ۱۴۵۴۔ ۱۴۵۵۔ ۱۴۵۶۔ ۱۴۵۷۔ ۱۴۵۸۔ ۱۴۵۹۔ ۱۴۶۰۔ ۱۴۶۱۔ ۱۴۶۲۔ ۱۴۶۳۔ ۱۴۶۴۔ ۱۴۶۵۔ ۱۴۶۶۔ ۱۴۶۷۔ ۱۴۶۸۔ ۱۴۶۹۔ ۱۴۷۰۔ ۱۴۷۱۔ ۱۴۷۲۔ ۱۴۷۳۔ ۱۴۷۴۔ ۱۴۷۵۔ ۱۴۷۶۔ ۱۴۷۷۔ ۱۴۷۸۔ ۱۴۷۹۔ ۱۴۸۰۔ ۱۴۸۱۔ ۱۴۸۲۔ ۱۴۸۳۔ ۱۴۸۴۔ ۱۴۸۵۔ ۱۴۸۶۔ ۱۴۸۷۔ ۱۴۸۸۔ ۱۴۸۹۔ ۱۴۹۰۔ ۱۴۹۱۔ ۱۴۹۲۔ ۱۴۹۳۔ ۱۴۹۴۔ ۱۴۹۵۔ ۱۴۹۶۔ ۱۴۹۷۔ ۱۴۹۸۔ ۱۴۹۹۔ ۱۵۰۰۔ ۱۵۰۱۔ ۱۵۰۲۔ ۱۵۰۳۔ ۱۵۰۴۔ ۱۵۰۵۔ ۱۵۰۶۔ ۱۵۰۷۔ ۱۵۰۸۔ ۱۵

برقرار رکھنے کی خواہش کے باوجود اس کی تحویل کلیتہً تصوریّت میں کر دی۔ لیکن لوٹنے کی طرح وہ سالمات کو لامحدود ہستی اولیٰ کا باطنی عمل نہ سمجھ سکے۔ ان کو تو حید خالص سے بہت ہی شدید دھچپی تھی۔ مادہ کی انھوں نے جو تحلیل کی ہے اس کا لازمی نتیجہ ایسی مکمل تصوریّت ہے جیسی کہ بارگاہ نے پیش کی تھی لیکن شاید ان کی جبکی حقیقت سالماتی روایات کی قوت سے متحد ہو کر ان کو سالمہ کا فقط استعمال کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کے ذریعہ سے انھوں نے یہ کوشش کی تھی کہ تصوریّت کو حقیقت کے رنگ میں پیش کریں۔ سکھانہ علم الکلام کے اثرات سے وہ فلسفہ پر تنقیدی نظر ڈالنے پر مجبور تھے۔ اس تنقید نے ان میں فلسفیانہ مذاق پیدا کر دیا اور انھوں نے خود اپنی ایک مابعد الطبیعیات طبعاً تیار کر لی۔

لیکن اشاعرہ کی مابعد الطبیعیات کا بہت ہی اہم اور فلسفیانہ حیثیت سے بہت ہی سنی خیر پہلو وہ نقطہ نظر ہے جو انھوں نے قانون تعلیل کے متعلق اختیار کیا تھا۔ جس طرح انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ خدا باوجود غیر متبدل ہونے کے پھر بھی دکھائی دے سکتا ہے۔ عقلیّین کے خلاف علم مناظر و مرایا کے اصول کی تردید کی تھی اسی طرح امکان معجزات کو ثابت کرنے کے لئے وہ تعلیل کے تصور کو مسترد کر دیتے ہیں۔ راسخ العقیدہ لوگ معجزات اور نیز عالمگیر قانون تعلیل پر اعتقاد رکھتے تھے لیکن انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ معجزات کے ظہور کے وقت خدا اس قانون کے عمل کو معطل کر دیتا ہے۔ بہر صورت اشاعرہ اس مفروضہ سے شروع کر کے کہ علت و معلول کو ایک دوسرے کے قائل ہونا چاہئے۔ راسخ العقیدہ لوگوں کے ہم خیال نہ بن سکے۔ ان کی تعلیم یہ تھی کہ قوت کا تصور بے معنی ہے اور یہ کہ ہم کو صرف گریز یا ارتکات کے سوا جبکی ترتیب کو خدا تعین کرتا ہے اور کسی چیز کا علم نہیں۔

اگر ہم الغزالی (المتوفی ۵۰۵ھ) کے کلاموں کو نظر انداز کر دیں تو اشاعرہ کی مابعد الطبیعیات کا ذکر بالکل نامکمل رہ جائے گا۔ غزالی کے متعلق اکثر راسخ العقیدہ متکلمین کو غلط فہمی ہوئی ہے لیکن ان کا شمار ہمیشہ اسلام کی عظیم الشان شخصیتوں میں ہو گا۔ اس مسلک نے جبکی قابلیت نہایت (بقیہ حاشیہ گذشتہ) توحید و ہستی جیسی صفات کی طرح سالمات کے متلازم عمل و اثر سے کجائی ہے لہذا وہ خود اس صفت کے حامل نہیں ہو سکتے۔ حیات اور دیگر تجرّبی صفات کی طرح امتداد کا ہستی واقعہ بھی نقاط قوت کے اشتراک عمل کا نتیجہ ہے جنکو لامحدود ہستی اولیٰ کے باطنی عمل کا نقطہ آغاز سمجھنا چاہئے۔ ہونہ نام جلد دوم صفحہ ۵۱۶ شہ مولانا شبلی۔ علم الکلام، صفحہ ۶۲۶۔

زبردست تھی اپنے فلسفیانہ اسلوب میں ڈیکارٹ کی پیش منی کی تھی۔ ہیوم نے علیت کی گرہ کو بدلیا^۱ کی دھار سے کاٹ دیا تھا لیکن غزالی اس سے بھی پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفہ کا ایک باضابطہ رد لکھا اور راسخ العقیدہ لوگوں پر عقلیت کا جو رعب چھا گیا تھا اس کو کامل طور پر زایل کر دیا۔ انہی کا یہ خاص اثر تھا کہ لوگ شکلی عقاید کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعیات کا مطالعہ کرتے تھے اور اس ایک ایسا نظام تعلیم وجود میں آ گیا جس سے شہرستانی، الرازمی، اور الاشرافی جیسے مفکرین پیدا ہوئے۔ حسب ذیل عبارت سے واضح ہو جائے گا کہ بحیثیت ایک مفکر کے ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔

”میں اپنے بچپن ہی سے اشیاء پر بطور خود غور و فکر کرنے کی طرف مائل تھا۔ اس میلان کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے مذہب کے خلاف بغاوت کی اور ان تمام عقاید کی ابتدائی ماہیت زایل ہو گئی جو لڑکپن ہی سے میرے ذہن میں راسخ ہو گئے تھے۔ میں نے خیال کیا کہ ایسے عقاید جو محض سند پر مبنی ہوں یہودیوں، عیسائیوں اور دیگر مذاہب کے پیروین میں بھی پائے جاتے ہیں۔ حقیقی علم کا فرض ہے کہ تمام شکوک کی بیخ کنی کر دیے مثلاً یہ بالکل بدیہی ہے کہ دس تین اے بڑا عدد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف ثابت کرنا چاہے اور اس کی تائید میں ایک لاٹھی کو سانپ سے تو فیصل محیر العقول ضرور ہوگا۔ لیکن اس سے زیر بحث قضیہ کے متعلق ذرہ بھر بھی یقین پیدا نہ ہوگا۔“ اس کے بعد انہوں نے علم الیقین کے تمام دعویداروں کا انتہائی لیا اور بالآخر تصوف میں اس (علم الیقین) کو پایا۔

اشاعرہ جو توحید کے زبردست حامی تھے ماہیت جوہر کے اس تخیل کے ساتھ روح انسانی کی ماہیت پر محفوظ طریقے سے بحث نہیں کر سکتے تھے۔ صرف الغزالی نے سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ کو اٹھایا اور صحت کے ساتھ یہ بیان کرنا آج تک دشوار ہے کہ ماہیت خدا کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔ جبرمنی کے بونگر اور سولر کی طرح ان میں بھی صوفیانہ وحدت الوجود اور اشاعرہ کا عقیدہ شخصیت گھل مل گیا ہے۔ یہ ایسا امتزاج ہے کہ اس کی وجہ سے یہ تبتلانا نہایت دشوار ہے کہ یہ محض وحدت الوجود

۱۔ الغزالی کی تصنیف ”احیاء علوم الدین“ ڈیکارٹ کی ”دسکورس آن متھ“ سے ایسی عجیب و غریب مشابہت رکھتی ہے کہ اگر ڈیکارٹ کے زمانہ میں اس کا کوئی ترجمہ موجود نہ ہوتا تو ہر شخص اس پر فرقہ کا الزام لگانا دیکر ”بیان فلسفہ جلد دوم ص ۱۱۱“

کے قائل ہیں یا لٹویزے کی طرح شخصی وحدت الوجود کو مانتے ہیں۔ الفزالی کے خیال کے مطابق روح شہداء کا ادراک کرتی ہے۔ لیکن ادراک بہ حیثیت ایک عرض کے صرف ایسے جو ہر یا ذات میں قائم رہ سکتا ہے جو جسمانی صفات سے کلیتہً پاک ہو اپنی کتاب ”المفصول“ میں وہ تصریح کرتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے ماہیت روح کو ظاہر کرنے سے کیوں انکار کیا تھا وہ کہتے ہیں کہ آدمیوں کی دو قسمیں ہیں۔ عوام اور فطرن اول الذکر جو مادیت کو وجود کی ایک شرط سمجھتے ہیں وہ غیر مادی جو ہر کا تعلق کرنے سے قاصر ہیں اور آخر الذکر اپنی منطق کے ذریعہ سے روح کا ایسا تصور قائم کرتے ہیں جو خدا اور انفرادی روح کے باہمی فرق کو بالکل مٹا دیتا ہے۔ الفزالی نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی تحقیقات کا رخ وحدت الوجود کی طرف ہے اور اس وجہ سے روح کی انتہائی ماہیت کے بارے میں انھوں نے خاموشی اختیار کی۔

انکا شمار بھی عموماً اشاعرہ میں کیا جاتا ہے۔ گوانھوں نے یہ تسلیم کیا تھا کہ اشاعرہ کا طریقہ فکر عوام کے لئے بہتر ہے پھر بھی صحیح معنوں میں یہ اشاعرہ نہیں ہیں۔ مولانا شبلی (علم الکلام صفحہ ۶۹) کہتے ہیں کہ ”ان کا یہ خیال تھا کہ مذہب کار از آقا نہیں کیا جاسکتا اور اس وجہ سے انھوں نے اشاعرہ کے علم الکلام کی ترویج و اشاعت میں بہت بڑا حصہ لیا۔ لیکن اپنے شاگردوں کو یہ نصیحت کی کہ وہ ان کے نتائج فکر کو شائع نہ کریں“ اشاعرہ کے علم الکلام کی نسبت ایسا نقطہ نظر اختیار کرنا اور ہمیشہ فلسفیانہ زبان کا استعمال ہم میں ایک شبہ پیدا کر دیتا ہے۔ ابن جوزی، قاضی عیاض اور راسخ العقیدہ مکتب کے متکلمین نے ان کو علی الاعلان ٹھکڑا لقا دیا تھا اور عیاض نے تو یہاں تک حکم دیدیا کہ ان کی تمام فلسفہ و کلام کی تصانیف جو اسپن میں موجود تھیں ضائع کر دی جائیں۔

لہذا یہ ظاہر ہے کہ عقلیت کی منطق نے خدا کی شخصیت کے تصور کو منہدم کر دیا اور الوہیت کو ایک ناقابل تحدید کلیہ میں تحلیل کر دیا۔ لیکن عقلیت کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی تھی اس نے شخصیت کے عقیدہ کو تو برقرار رکھا لیکن فطرت کی خارجی حقیقت کے تصور کو مٹا دیا۔ نظام نے ”خارجیت“ سالمات کا نظریہ پیش کیا تھا اس کے باوجود عقلیئین کے ہاں سالہ ایک متقل اور خارجی حقیقت کھتا ہے اور اشاعرہ کے نزدیک اس کو ارادہ الہی کے ایک گزرتے ہوئے لمحہ کی حیثیت دی گئی جہاں مٹا

۱۔ الفزالی کے نظریہ روح پر سرسید احمد خاں کی تنقید ملاحظہ ہو الفزالی ص ۳ مطبوعہ آگرہ ۱۲
۲۔ ابن عربی جلد پنجم ص ۱۲۳ جہاں مصنف اس نظریہ کو بیان کر کے اس پر تنقید کی ہے۔ ۱۲۔

ایک تو فطرت کی حمایت میں علم الکلام کے تصور سے خدا کا ابطال کرنا چاہتا ہے اور دوسرا خدا کے مذہبی تصور کی تائید میں فطرت کو قربان کر دیتا ہے۔ لیکن ایک صوفی جو خدا کی محبت میں سرشار ہے اور اپنے زمانہ کے کلامی مناقشوں سے اپنے آپ کو الگ رکھتا ہے وہ ہستی کے دونوں پہلوؤں کی تائید کرتا، ان پر روحانی رنگ چڑھا دیتا اور کل کائنات کو خدا ہی کی جلوہ آرائی خیال کرتا ہے یہ ایسا اعلیٰ ترین تصور ہے جو اد پر کے تصورات کے متخالف اطراف کو ملا دیتا ہے۔ عقلیت جس کو صوفیانے ”پائے چوبین“ سے تعبیر کیا ہے وہ آخری مرتبہ انفرادی میں رونما ہوتی ہے جن کی بے چین روح نے عقلیت کے سنان ریگ زار میں ایک مدت تک بھٹکنے کے بعد جذبات انسانی کی گہرائیوں میں سکون پایا۔ ان کی ارتیابیت کا مطلع نظریہ تھا کہ ایک اعلیٰ مبدأ علم کی ضرورت کو ثابت کیا جائے نہ کہ محض اسلامی علم الکلام کے عقائد کی حمایت۔ یہی وجہ تھی کہ اس زمانہ کے تمام تفکری میلانات پر تصوف کو فتح حاصل ہوئی۔

انفرادی نے اپنے ملک فلسفہ میں جو کچھ اضافہ کیا ہے اس کا پتہ ان کی چھوٹی مسمیٰ کتاب ”مکلوۃ الانوار“ سے چل سکتا ہے جس میں وہ تفسیر ان کی اس آیت سے اللہ نور السموات والارض (خدا آسمان و زمین کا نور ہے) بحث کو شروع کر کے جبلی طور پر ایرانی تصور کی طرف رجوع ہو گئے جس کے زبردست شارح الاشرافی گزرے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی یہ تعلیم ہے کہ حقیقی وجود صرف نور ہی ہے اور عدم سے بڑھ کر کوئی ظلمت نہیں لیکن نور کی حقیقت یا اقتضا ظہور ہے ”نور ظہور کی صفت ہے متصف ہے“ جو ایک نسبت ہے۔ کائنات ظلمت سے خلق کی گئی ہے جس پر خدا نے خود اپنا نور ڈالا ہے اس کے مختلف حصے کم یا زیادہ مرئی اس لئے ہیں کہ ان پر کم یا زیادہ روشنی پڑی ہے جس طرح اجسام تاریک یا منور ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اسی طرح انسانوں میں بھی فرق و اختلاف ہے بعض ایسے لوگ ہیں جو دوسری انسانی ہمتیوں پر اپنی روشنی ڈالتے ہیں اور اسی لئے قرآن میں پیغمبر کو شمع منور کہا گیا ہے۔

مادی آنکھ ہستی مطلق یا نور حقیقی کے صرف خارجی منظر کو دیکھ سکتی ہے۔ انسان کے دل میں ایک باطنی آنکھ بھی ہے جو برخلاف مادی آنکھ کے اپنے آپ کو بھی اسی طرح دیکھ سکتی ہے جس طرح کہ

لے مکلوۃ الانوار ورق ۳۔ الف

لے اس خیال کی تائید میں انفرادی ایک حدیث پیش کرتے ہیں (مکلوۃ الانوار)

دوسری اشیاء کو یہ ایسی آنکھ ہے جو محدود سے آگے بڑھ کر مظاہر کا پردہ چاک کر دیتی ہے۔ یہ خیالات محض جراثیم تھے جو الاشراقی کے طائفہ اشراق یا ”حکمت اشراق“ میں نشوونما پا کر بار آور ہوئے۔ اشاعر کے طائفہ کا یہ ماحصل تھا۔

اس رد عمل کا ایک کلامی نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اُس آزاد خیالی کے نشوونما کو روک دیا جو مذہبِ اصابت کو منہدم کرنے کی طرف مائل تھا۔ ہم کو زیادہ تر اشاعرہ کے طریقہ فکر کے خالص عقلی نتائج سے سروکار ہے اور یہ خاص طور پر دو ہیں۔

دسویں صدی کے آغاز میں جبکہ اشاعرہ نے عقلیت کی عمارت کو کلئٹہ منہدم کر دیا تھا ہم کو ایک ایسے میلان کا پتہ چلتا ہے جس کو ہم ایجابیت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ البرونی (المتوفی ۴۴۰ھ) اور ابن ہشیم نے عمل اور رد عمل کے درمیان ایک وقفہ کو تسلیم کر کے جدید تجرئی نفسیات کی پیش بینی کی تھی۔ اور فوق اُس اشیاء کی ماہیت کی تحقیق سے دست بردار ہو گئے تھے انہوں نے مذہبی امور میں دانشمندانہ سکوت اختیار کیا تھا۔ الاشعری کے نزدیک ایسی چیزوں (فوق اُس) کا وجود تو ممکن تھا۔ لیکن ان کا منطقی جواز ناممکن تھا۔

لے البرونی نے آریہ تھا کے پیروں کی حسب ذیل تعلیم کو پس کر کے ان کی تشریح کی ہے۔ ہمارے لئے صرف انہی چیزوں کا جاننا کافی ہے جو آفتاب کی شعاعوں سے روشن ہو جاتی ہیں اس کے آگے جو کچھ بھی ہے خواہ اس کی وسعت کتنی ہی بڑی ہو۔ ہم اس فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جن چیزوں تک آفتاب کی شعاعیں نہیں پہنچتیں حواس ان کا ادراک نہیں کر سکتے۔ حواس جن چیزوں کا ادراک نہیں کر سکتے ہم ان کو جان بھی نہیں سکتے۔ اس سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ البرونی کا فلسفہ کیا تھا صرف مصادقات سے جن میں عقل ناطق ترتیب و تنظیم پیدا کرتی ہے، علم حاصل ہو سکتا ہے۔

لے اس کے علاوہ ابن ہشیم کے نزدیک صداقت صرف وہی ہے جو بطور مواد کے ادراک کرنے والے حواس کے آگے نہیں ہو اور اس کو فہم حاصل کرتی ہو۔ پس منطقی حیثیت سے صداقت ایک تنظیم یافتہ ادراک ہے۔

”دبور کی“ ”حلقہ اسلام“ صفحہ ۱۱۱

بان دکن

نواب درگاہ قلی خاں دکن کا

ایک اُردو قصیدہ

شیخ عبدالحمد مولف ”شاہ جہاں نامہ“ رقم طراز ہے کہ غرہ جادی الآخر (۱۰۴۸) ہجری کو علی مردان خاں نے شاہ صفی کی ناقدر دانی کے باعث قندھار سے ترک ملازمت کر کے خاندان قلی خاں کے ہاتھ عہدداشت ملازمت روانہ کی تھی دربار شاہ جہانی سے خاندان قلی خاں کو خلعت اور ایک ہزار روپیہ نقد مرحمت ہونے کے علاوہ ان کے ساتھ جو بارہ آدمی رومی تھے انھیں بھی چار ہزار روپیہ مرحمت ہوئے اور علی مردان خاں کو خلعت مختہ پالکی، علاج، براق طلا سے عت بخشی گئی۔ ۵۱ رجب سنہ مذکور کو علی مردان خاں نے لاہور میں شرف بریابی حاصل کیا۔ بارگاہ شاہ جہانی نے صوبہ داری کشمیر سے ممتاز فرمایا۔ خاندان قلی خاں بھی انھیں کے ہمراہ ہدایت آبرو کے ساتھ بسر کرتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد علی مردان خاں نے ان کے بیٹے درگاہ قلی خاں کو دربار شاہ جہانی سے منصب و جاگیر سرفراز کرانے کے علاوہ اپنے دولت کدہ کی میر سامانی کی خدمت بھی سپرد کر دی۔ علی مردان خاں کے انتقال کے بعد منصب داران متعینہ اوزنگ زیب کے ہمراہ یہ دکن آ گئے۔ پھر ہندوستان جانے کے بعد انتقال ہو گیا۔ ان کے بیٹے نوروز قلی خاں بیجا پور میں قلعہ دار تھے جہاں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کے بیٹے خاندان قلی خاں منصب و جاگیر رکھنے کے سوا منصب داران حراست اوزنگ آباد کے منظم تھے شاہ عالم (غلہ نزل) کے عہد میں نگیر کی وقائع نگاری اور اس کے حالات کی فوجداری خدمت بھی تھی اب یہ خاندان بواے آصفی میں آجاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی عنوان کی تخت نواب درگاہ قلی خاں کا حال بھی خال سے پہلے ان کے خاندان کی اصل معلوم کر لینا ضروری ہے ترک مانان ”بور بور“ قبیلے سے خاندان قلی خاں کا خاندان ملتا ہے جو ان کا خاندان سیاہ خیمہ فواجی شہد مقدس سے متعلق ہے۔

خاندان قلی خاں اول سے لے کر خاندان قلی خاں دوم تک مسلسل سلسلہ صاف ہو گیا۔ خاندان قلی خاں کے بیٹے نواب درگاہ قلی خاں دوم ہیں ان کے دولہ کے ایک لاکھ قلی خاں، موتہن الدولہ، سالار جنگ، جاگیردار، برادر و خستہ بنیاد، دوسرے وصی قلی خاں مخاطب بہ درگاہ قلی خاں، جاگیردار برادر و خستہ بنیاد اور ایک دختر بلند اختر جو محمد صندر خاں خیور جنگ بن شیر جنگ کی حرم محترمہ انھیں سے نواب محمد ارسلان اولیٰ کا بیٹا بنیاد سلسلہ منسلک ہوتا ہے، حضرت آصف جاہ اول کے عہد میں نظام آباد (اورنگ آباد) کی تعمیر خاندان قلی خاں دوم ہی کے اہتمام سے سرانجام کو پہنچی۔ ۲۹ رجب ۱۱۲۲ ہجری کو جب کہ خاندان قلی خاں انگیر میں تھے یہیں نواب درگاہ قلی خاں (دوم) کی ولادت ہوئی اپنی تاریخ ولادت خود ہی کی ہے۔

شہ سال ولادتش زروئے الہام درگاہ قلی خاندان والا

حضرت آصف جاہ اول نے انھیں چودہ سال کی عمر ہی میں جاگیر و منصب سے سرفراز فرما کر بیس سال کی عمر میں جمہوری رکاب سعادت کی عزت بخشی اور وقت بوقت غایات شاہی سے سرفراز فرمایا۔ درگاہ قلی خاں (دوم) بھی اپنے دم واپس تک برابر حق نمک ادا کرتے رہے نواب ناصر جنگ "شہید" کے زمانہ میں بھی انھوں نے اعلیٰ خدمات کا امتیاز حاصل کیا اور نواب امیر الممالک صلابت جنگ نے توپا عروج کو پہنچایا تھا کہ شش ہزاری منصب خطاب موتہن الدولہ کے علاوہ اورنگ آباد کی صوبہ داری سے سرفراز فرمادیا اور جب نواب آصف جاہ ثانی کا دور دورہ شروع ہوا تو ترقی مداح میں اور چار چٹا لگ گئے، ہفت ہزاری منصب ماہی و مراتب خطاب موتہن الملک سے سرفراز ہوئے۔

درگاہ قلی خاں نام، درگاہ تخلص، سالار جنگ موتہن الدولہ، موتہن الملک خاندان خطاب، علم و فضل کے لئے حضرت آصف جاہ کی تربیت کافی دلیل چودہ سال تک صوبہ داری کی خدمت کو انجام دینے کے بعد غورہ رجب ۱۱۲۹ھ کو مغزول ہو گئے۔ ہر ذی حجب سنہ مذکور کو اورنگ آباد سے نکل کر نظام آباد آئے جہاں ان کی جاگیر عی، بحالی صوبہ داری کے اسباب ہو ہی رہے تھے کہ ۱۸ جمادی الاول ۱۱۳۰ھ کو مرض سرام سے انتقال ہو گیا، نظام آباد سے لاش اورنگ آباد لا کر اپنے والد کے مقبرہ (جانب جنوب بلدہ) میں دفن کی گئی۔ دفن کے وقت ایک عجیب حشر برپا تھا، میر غلام علی ارتشد اورنگ آبادی کا تاریخی مصرع ہے کہ :-

اہل عالم سینہ چاک از نام سالار جنگ اور "خدایش بیامزد" بھی ایک تاریخی فقرہ،

کسی شاعر نے ایک ہی مصرع میں تاریخ صوری و معنوی لکھی ہے عجمیک ہزار و یکصد و ہشتاد سال
مرزا افضل بیگ قاضی اورنگ آبادی اپنے تذکرہ تحفۃ الشعراء (۱۱۶۵) قلمی میں لکھتے ہیں
ان کے والد ماجد نے اپنی تمام عمر حضرت آصف جاہ اول کی خدمت گزاری میں بسر کر دی نظام
کی سراجس کا عرف ”اجنڈہ“ ہے ان ہی کے اعتماد کے بھروسہ پر تیار ہوئی اس کے دروازہ پر :-
رب اجعل هذا بلداً امناً تاریخ کندہ ہے۔ ایک دن حضرت آصف جاہ اول نے دریافت فرمایا
”لفظ ”خاندان“ جو تمہارے نام پر ہے یہ کس خاندان کا ہے؟“
درگاہ قلی خاں نے عرض کی :-

”خاندان اہل بیت“

اس پر نواب آصف جاہ نے ارشاد فرمایا کہ :-

”پھر تو تم ”شیعہ“ ہوں گے؟“

چونکہ درگاہ قلی خاں بڑے دانشمند اور مدبر تھے۔ انہوں نے پھر عرض کی کہ :-

”بندہ ہراتی الاصل ہے اور یہاں کے رہنے والے اکثر سنی ہیں۔“ (اقتباسی ترجمہ)

نواب درگاہ قلی خاں (دوم تعمیر عمارت و آبادی قصبات و دیہات کے بڑے شائق تھے اکثر
عمارت آپ ہی کی یا دوکار ہیں اورنگ آباد میں جنوبی جانب ”باغ دل کشا“ مشہور ہے ۱۱۶۹ء میں
ایک کٹادہ حوض بنوایا تھا جس کی تاریخ بھی خود ہی کہی ہے :-

درجہاں اہر پند گشتم کو کبو ایں جنس جو خضے ندیدم ایسج سو

فیض عالمش بہت جاری صبح و شام می برد ہر تشنہ لب مشک و سبو

خواستم سال بنا آمد ندا

می دہد ساقی کوثر آبرو

اور ”لکھ“ میں باغ دل کشا کی سیرابی کے ہنر کھدوائی تھی، نہر کی تاریخ مولانا آزاد بلگرامی نے کہی ہے

خاندوراں میر عالی جاہ مورد عاطفت ربانی

نہر آب حیات جاری کرد خضر آں راکت نگہبانی

کامیاب زلال احسانش مردم شہری و بیابانی

کرو ایں نہسر رارواں درباغ تازہ شد آب دزنگ بتانی
 کند حوض وسیع دربتان کہ توان گفت کوثر ثمانی
 ایں عمل است ساز خاص بیافت از متبول جناب سبحانی
 سال تایخ او طلب کردم گفت دل بہ نہر خاندورانی

نواب درگاہ قلی خاں دوم کی شہر شاعری کے متعلق شفیق اوزنگ آبادی کا بیان معصری کے علاوہ ایک بڑی حیثیت بھی رکھتا ہے چنانچہ وہ اپنے تذکرہ مکمل رخا (۱۱۱۱) قلمی میں لکھتے ہیں کہ جناب آزاد مدظلہ العالی کی سفارش پر دو سال سے بندہ کو زناقت کی غرت حاصل ہے اور ایسا امتیاز قرب کہ جس کا تصور اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا رات میں دو بجے تک حاضری رہتی تھی ہر مہینہ اپنے باغ دل کشا میں دو تین عام مجلس بھی کرتے جن میں بڑے لائق وقابل لوگوں کو دعوت دیجاتی تھی اور ہر روز ایک مجلس خاص دولت کدہ پر ہوا کرتی یہ مجلس کیا ہویتیں گویا اچھی خاصی تربیت گاہیں ہوتی تھیں، ایک دن حضرت آزاد نے خواجہ حافظ کی غزل یہ۔

صبا بہ لطف بگو آں غزال رخسار پر طرح دے کر خود بھی غزل کہی تھی سہ (آزاد)
 صبا پیام رساں آں بہار رخسار کہ داد بوئے تو سر مائیہ جنوں مارا
 نواب نے بھی غزل فرمائی اور یہ مطلع بدیہی پڑھا ہے

صبا پیام رساں آں جنوں تمنا را بہار آمد و سر بہر کرد صحرارا
 مولف بھی اُس وقت حاضر تھا نواب کے ارشاد پر فکر کی اور یہ مطلع موزوں ہوا۔
 فروز جلوہ اوسیل گریہ مارا طلوع ماہ کند پیش آب دربارا

نواب بے حد مخطوط ہوئے اور بڑی تعریف کی۔ (مفہومی ترجمہ)

ان کے بعض لطائف و ظرائف بھی مشہور ہیں۔ شفیق بعض کی نقل کرتے ہیں

(۱) مولوی شاہ علی صاحب اوزنگ آبادی کے صاحبزادے کی شادی کی مجلس میں شہر کے تمام امرا اور شاخ شریک تھے، اس مجلس میں مولانا آزاد بلگرامی، نواب اسحق الدولہ، مولوی شاہ محمود صاحب بھی تھے۔ جب دستور دہن کی جانب سے قاضی صاحب کے سامنے وکیل و گواہ مجلس میں آئے

خواجہ دکھونامی بنات فروش لوہن کی جانب سے وکالت کر رہے تھے، نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ :-

”ہیں آج معلوم ہوا کہ آپ بنات فروش ہیں؟“

حاضرین مجلس اس لطیفہ سے بہت ہی محظوظ ہوئے کیونکہ بنات پارچہ ریشم کو بھی کہتے ہیں اور ”نبت“ کی جمع بھی ہے۔

(۲) ایک دن مولوی شاہ علی صاحب نے نواب صاحب سے کہا کہ ہم غیروں کے لیے فقط ”دنیا“ کی دعا کرتے ہیں مگر آپ کے لئے تو ”دین و دنیا“ دونوں کی دعا چاہتے ہیں، دینی دعا کا محل مسجد اور دنیوی دعا کا مقام بیت الخلا، کیوں کہ یہ مقام قضاے حاجت ہے نواب صاحب نے فرمایا کہ ”آپ مسجد میں کتنی مرتبہ جاتے ہیں؟“

”شاہ صاحب نے کہا کہ پانچ وقت!“

(دن) ”اور بیت الخلا میں کتنی بار؟“

(ش) ”ایک یا دو مرتبہ!“

تو پھر نواب صاحب نے فرمایا کہ :-

”میں جناب الہی میں دعا کرتا ہوں کہ حضرت کو عیش ہو تاکہ آپ بار بار بیت الخلا جائیں اور دنیا کی دعا بہت کریں“

شاہ صاحب اور حاضرین قہقہہ مار کر منہنے لگے۔

(۳) چند نو ملازمین کی درخواستیں نواب صاحب کے ملاحظہ میں پیش ہوئیں نواب صاحب ہر شخص کو سامنے بلا کر اس کی حیثیت کے مطابق تنخواہ مقرر کر کے دستخط فرماتے تھے ان میں دو لڑکے کم سن بھی تھے، نواب صاحب نے ایک درخواست پر ”بیاموزہ“ لکھ دیا اور دوسرے کی درخواست پر لفظ ”دیگر“ یہ دونوں لڑکے کچھمی ناراین (شفیق) پیش کار کے پاس گئے۔ شفیق نے ان دونوں درخواستوں کے منٹے لکھوائے اور نواب صاحب کے ملاحظہ میں دونوں کو پیش کیا نواب صاحب نے شفیق سے فرمایا :- کل یہ دونوں منظور ہو چکے۔“

شفیق نے عرض کی کہ جس کی فرد پر ”بیاموزہ“ تحریر تھا وہ آج سیکھ کر آیا ہے۔ اور صبا دگر فرد پر

”دیگر“ ہے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ”دیگر“ سے وقت مراد ہے۔ یا کوئی دوسرا شخص؟
نواب صاحب نے شفیق کی اس تقریر پر سکرا دیا۔ اور دونوں کو نوکر رکھ لیا۔

(۷) درگاہ قلی خاں (دوم) حضرت آصف جاہ اول کے سفر دلی میں ہم رکاب سعادت تھے۔ دربار میں
نادر شاہ نے محمد شاہ سے کہا کہ ہم ”کل جائیں گے“

درگاہ قلی خاں (دوم) نے آہستہ سے حضرت آصف جاہ کے کان میں کہا کہ ”انا در کا المعدوم“
حضرت آصف جاہ ان کے اس لطیفہ نادر سے بہت خوش ہوئے۔

نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کی شاعری کے سلسلہ میں تحفۃ الشعراء بے نظیر، خزانۃ عارف
گل رعنا، تذکرہ تناسخ شعراء دکن، پیش نظر ہے لیکن ان تذکروں میں تحفۃ الشعراء گل رعنا اور تذکرہ تناسخ
ان کی اردو شاعری کا کبھی لکھا گیا ہے اور ان میں بھی ایک ”تذکرہ تناسخ“ ایسا تذکرہ ہے جس میں اردو
کے دو شعر مل سکتے ہیں۔ شفیق سے بڑی حیرت ہے کہ وہ گل رعنا میں باوجود یہ لکھنے کے کہ۔

”ہندی زبان میں مرثیہ خوب کہتے تھے“ اپنے مشہور تذکرہ اردو گو ”چہستان شعراء“ میں

ان کا ذکر نہیں کرتے درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کے حالات ان تذکروں سے جو جمع ہو سکتے تھے وہ
خلاصہ اس میں آگئے ہیں ان کا ایک سفر نامہ میری نظر سے مدت ہوئی کہ گذرا تھا انوس ہے کہ
اب پیش نظر نہیں ورنہ ممکن تھا کہ اس کے مطالعہ سے کچھ مدد مل جاتی۔ ان کی فارسی شاعری کی عظمت
توان تذکروں سے معلوم ہو جاتی ہے مگر ان کی اردو شاعری کا درجہ بغیر کسی نمونہ کے معلوم کرنا ذرا
مشکل ہے صرف اس وقت تک یہی ایک قصیدہ ملا ہے جس سے ان کی اردو شاعری کی نسبت
رائے قائم کرنی پڑے گی اردو شاعری پر غور کرنے سے پہلے ان کی فارسی شاعری پر ایک سرسری
نظر ڈال لینی چاہئے اور اس سے بھی پہلے مولف ”بے نظیر“ (۱۱۷۲) کا ایک تواردی لطیفہ بھی دیکھیے
خالی نہیں جو درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کے حال میں لکھا ہے کہ:-

آزاد بگرامی نے یہ نقل بیاں کی کہ ان کے قیام سندھ کے زمانہ میں ایک شخص کی شادی ہوئی
جس کی انھوں نے تالیخ کہی تھی:-

”مبارک باشد و باشد مبارک“

تالیخ مصرع ہے جب آزاد سندھ سے ہندوستان آئے اور پھر سندھ میں حج کی غرض سے

سورت پہنچے تو یہاں محمد حسین بنجد کو بھی ایک شادی کی تقریب میں یہی مادہ تیاج لایا تھا جسے محمد نے آزاد کو سنایا، سورت سے حج کو جانے کے لئے آزاد دکن چلے اور اوزنگ آباد آئے۔ نواب درگاہ قلی خا (دوم) درگاہ کی یہاں ایک رات شعر کی مجلس تھی۔ جس میں شعر لے اپنے مختلف کلام کے نمونے سنائے ان میں درگاہ قلی خا درگاہ نے ایک تولد کی تیاج سنائی جس کا مصرع بھی یہی تھا اور مولود کا نام مبارک علی یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک ہی مصرع کا تین شاعروں میں توارد ہو گیا ایک سندھ میں دوسرا گجرات میں تیسرا دکن میں، لیکن مولود کا نام ”مبارک علی“ ہونے کی وجہ سے تیاج میں زیادہ لطف پیدا ہو گیا (خلاصہ ترجمہ)

۱۶۷۱ء میں حضرت آصف جاہ اول نے وزارت خاں اوزنگ آباد کی کو دوبارہ خدمت دیوانی سر فراز فرمایا تو یاران مجلس وزارت خانی نے درگاہ قلی خاں درگاہ سے آزماہی تیاج لکھوائی، انھوں نے تیاج کے چاروں مصرع تیاج وار لکھ دیے

بامصانج فضل یزدانی
بزرگوں کی گرفت دیوانی

شد بکلم تو بزم نورانی
از برای صلاح خلق اللہ

لیکن چوتھے مصرع میں ایک عدد کی زیادتی ہو جاتی ہے فارسی کا رنگ تغزل بہت صاف ہے دیکھئے بعض اشعار میں کیسی جستگی اور شنگلی پائی جاتی ہے

بہ خوش آید آں دل دار افا ہے چنیں باشد
خدا اگر راست آرد دولت و جا ہے چنیں باشد

ہلاک کشتن مجنوں ہزار سال گذشت
رید تیز نگاہت بدل مشک شد

ہنوز در کفنش بوے سوختن باقیست
ہزار بجیہ بگردند و دوختن باقیست

نگاہش دیدہ صہبا آفریند
قدش دیدند، طوبی آفریند

دل را فرقت آں نامساں ساخت پیارہ
نمود از ہم جدا جزائے قرآنی کہ من دام

کریم شاد ہر طاقت
اے صبر با چہ کار کردی

حکم آصف این غزل آمازہ کرد کار بار کار نسر مای کند

شرک محض است گمان من و تو من و تو نیست میان من و تو

رباعی

نور روز کہ روز سجد عشرت افزا است مولا ہے جہاں تخت خلافت آراست
از مقدم گل نما مذاکر حسنراں سالے کہ نیکو است از بہار شہدایت

تذکرہ تمنائیں اردو کے دو شعر ”در مرثیہ گوید کہہ کر لکھے ہیں
پکھراج غم سے زرد، زمرہ ہی زہر نوش موتی کے دل میں چھید ہی نیلم یاہ پوش
اس دکھ سے آتش دل یا قوت ہو خوش مر جاں لہو و لعل بدخشاں لہو لہو

علی نقی خاں بہادر، المخاطب یا والدولہ یا اور تخلص نے (۱۲۰۵) ہجری میں محبوب شاہ محبوب کے ہاتھ سے شعراے اردو اور فارسی کے کلام کی ایک ”بیاض“ لکھوائی تھی۔ اسی بیاض میں نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کا قصیدہ بھی ہے اس کے سوا اور ان کے اردو کلام کا مجھے کہیں پتہ نہیں لگا، اردو شاعری کا تو بارہویں صدی کا نصف آخر شمالی ہند میں خصوصیت کے ساتھ مرزا اسودا کی قصیدہ گوئی کی وجہ سے ایک درخشاں باب قرار پاتا ہے نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ کے اس قصیدہ کے طرز بیان اور زبان سے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ایک دکنی شاعر کی شاعری شمالی ہند کی اردو شاعری سے کیسے ٹکرا رہی ہے؟ قصیدہ میں قصیدہ گوئی کے آداب کے ساتھ بیان کی روانی اور زبان کی صفائی انصاف پسندوں سے داد لیے بغیر نہیں رہ سکتی قصیدہ کے یہ دو مصرعے تو ایسے ہیں کہ گویا کسی نے سانچے میں ڈھال دیئے :-

(۱) بقر کو جوع شتر، آدمی کو جوع بستر

(۲) خدا نے سیف دیا اور رسول نے خنجر

دوسرے مصرع کا پہلا مصرع یہ ہے کہ
 سوائے اس کے کہو کون شاہ مرداں ہے؟
 اسی مضمون کو نواب درگاہ قلی خاں (دوم) درگاہ نے فارسی میں بھی ادا کیا ہے۔
 سوائے حیدر کرار شاہ مرداں کیست کہ ذوالفقار باو داد حق، بنی خستہ
 قصیدہ کل تر تالکس شعر کا ہے جس میں تین مطلعے ہیں۔ قصیدہ کی پیداوار کوئی جنگی بہم معلوم
 ہوتی ہے۔ میں نے اپنی امکانی کوشش کی کہ اس بہم کا حال معلوم ہو جائے لیکن صاف طور پر کچھ
 معلوم نہ ہو سکا میرا گمان غالب یہ ہے کہ حضرت آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد تخت و تاج کے لیے جو
 خانہ جنگیاں ہوتی رہیں ان میں کسی کسی جنگ کی یہ یادگار ضرور ہے۔ (عمر بانی)

قصیدہ

پڑی ہو آ کے گلے ناگہاں بلاے سفر
 زبان خامہ ہو اُس کے بیان میں عاجز
 اسیر پنجہ تغذیب، صامت و ناطق
 نہیں ہو تختہ بازار پر اناج کی جنس
 گیتوں کہ جنس ہو نایاب مثل آدم خوب
 مگر خمیرہ کیا ہو وے ماش خوروں نے
 ہوا ہی قحط سے دیکھو دو باجرا عالم
 نظر بچا کے سکتے نہ وہیں قرب و جوار
 سفر نہیں ہو سفر بل سفر سے ہی بدتر
 ہو جس کا شمع کلفت حساب صد و فقر
 غرق لُجہ تحریب ہو گا سب لشکر
 نہ غلہ بلکہ سمی نقد و جنس ہو شہر
 مثال ہن بھی نہیں دیکھتے ہیں اب تو
 ہو دال ان کی رکاکت پہ بالکمال ہنر
 نہیں ہو ہمت اک جو کسی میں بل کثر
 فقیر و سال و محتاج۔ نوکر و چاکر

جوار رحمت حق میں ہوئے ہیں کل غبار
 غنی، فقیر سبھی مبتلا، رنج، رنج
 نکل گیا ہی غریبوں کا اب پتھیں سب
 خراب حال ہوا ہی دو اب بجا سب
 ہوا ہی تلی والسی دکا تیل گھی کی عوض
 نہ دیکھی خواب میں ہرگز کسی نے ترکاری
 ہوا ہی قحط سے سب ذی حیات کو ہوکا
 غرض کہ سخت مصیبت میں سب وضع و ثمر
 تمام روز کمر بستہ سب غنی و دنی
 علاوہ گو لہ توپ و تفنگ زہورک
 ہوا ہی حیف عجب زور خس قائم جنگ
 رئیس وقت ہی قائم نفیر درہمہ وقت
 ہوئی ہی خلق پہ کیا شاولیٰ مرجعیت غیر
 اسی تردد و افکار میں لگی تھی نیند
 کھڑا ہے آکے سرھانے پہ پیر نورانی
 کہا: کمال غنائت کیا ہی فکر تجھے؟
 شہ سریر کرامت، امیر، کل ایسر
 کہیں جوار جوار از رجوع رجوع بقر
 دھیان ہوش نہیں ہو کسی میں مضطر
 تلاش دال اڑاتے ہیں ڈرتے گھر گھر
 زبون (دوختہ و مجروح لنگ اور لاغر
 بجائے روغن بادام ہیکاتیل کرے
 چنے کا ساگ کبھو اور کرڑھ کبھو گاجر
 بقر کو جمع شتر آدمی کو رجوع بقر
 غنی، فقیر سبھی آسیراج میں مضطر
 ہی زیر بار دو اب غریب شام و سحر
 صدائے بان سے سب کان ہو گئے ہیں کہ
 نہ فتح ہو نہ ہزیمت چو بازی ششدر
 بسان طوطی بے نطق و طائر بے پر
 ہزار حیف میجا صفت ہی تابع حسد
 کہ ناگہ خواب میں دیکھا قریب وقت سحر
 لطیف غصہ و خوش منظر و حبستہ سیر
 ہی تیرے کام کا حامی امام جن و بشر
 ولی حضرت مولیٰ وصیٰ پیغمبر

امام جن و ملک تاجدار ملک و ملک کہا ہے "لحمک لحمی" جسے شہید ہو
اگرچہ حدِ بشر میں ہو منقبت اُس کی ہو اے مشرقِ خاطر سے مطلعِ دیگر
جنابِ اقدس حیدر ہے وصف سے برتر

بیانِ وصف سے عاجز لبِ دہانِ بشر

نہیں سنا ہے مخالف مگر حدیثِ صحیح بنی مدینہ علم و علی ہے اُس کا در
نہ ہر کسی نے قدمِ دوش پر بنی کے رکھا نہ ہر کدام کو مولدِ ہوا حسد اکا گھر
شریک کون ہے روزِ مباہلہ میں دیکھا کہا ہے انکم حق میں کس کے خیر بشر
کہا ہو کس کو بنی وقتِ جنگ کے گزار کیا ہے کس نے کہو فتح (خندِ حقِ غیر)
ہو کس کے حق میں نزولِ حدیثِ قدسی ہو آفتاب سے نادِ علی منور تر
رفیق کون تھا مسراج میں نہ رکھ پڑ سنا ہے قصہ شیر و برنج و آگِ شتر
سوے اس کے کہو کون شاہِ مرداں ہے خدا نے سیف دیا اور رسول نے دختر
خدا رسول کی سو گند کھا کے کہتا ہوں بجز خدا و رسول اُس سے کون ہے برتر
ہوا ہے پھر کے میرے مشرقِ طبیعت طلوعِ مطلعِ شفاف روشن و انور

ہزارِ شکر بہ امدادِ ساقی کوثر

جمالِ شاہِ مقصود پر پڑی ہے نظر

ہوئی ہے طرحِ اقامت پہ شکلِ خاطر خواہ ہوئی ہو دفعِ یکایک بھی بلائے سفر
گرے نظر سے دو نامون (و) جنگلِ دھواں سپاہِ دشمن و عمارتِ ہوا ہے نو بصر

دعوتِ انجمنِ پاک و چھاروہ معصوم خدا ہمیشہ رکھے شہر میں بہ نسیج و ظفر
 ہزار مرتبہ بہتر ہے بادشاہوں سے مکینہ بندہ درگاہِ صاحبِ قمبر
 مراد بندہ درگاہِ زود ہے کہ کرے
 ابو تراب کی تربت کی خاک کحلِ بصر

غل

(از جناب صفی اورنگ آبادی)

خیال آپ کا جب ذرا آگیا تڑپنے میں ہم کو مزا آگیا
 انھیں ہم سے ملنے کی فرصت کہاں گیا ایک تو دوسرا آگیا
 نہ آنا ہی ان کا بہت ٹھیک ہی خیال دل مستلا آگیا
 خدا کی قسم کھا کے وہ چپ ہوئے خدا کی قسم ہے مزا آگیا
 کوئی جھوٹ کی حد بھی بے اثر نہ ہوئے ابھی کی ابھی میں گیا ہوں آگیا
 مرنے لے میں نے کو تھی ایک بات کہ اتنے میں وہ بے وفاء آگیا
 نہ ہم دوسرے ہیں نہ وہ دوسرے زمانہ مگر دوسرا آگیا
 ابھی اذکر تھا جس کا "یادش بخیر" وہی آگیا، آگیا، آگیا
 سمجھتا ہوں سب کچھ - مگر دوستو یہ دل ہی - جدھر آگیا آگیا
 صفی کو بھی اچھا سمجھنے لگے زمانہ اب ایسا بڑا آگیا

خود اعانتی

(از جناب مرزا ناصر علی بیگ صاحب بی۔ اے)

(مُسلسل)

سربراہ پیل نے جملہ جدید اختراعات اور کاروبار کے جدید طریقوں کی قدر کی۔ مثال کے طور پر ہم پیل کے اس طرز عمل کا ذکر کر سکتے ہیں جو اس نے چھینٹ کی چھپائی میں (1840-1850) کے ایجاد کی غرض سے اختیار کیا تھا یہ کام ایک لٹی (1850) کے استعمال سے مکمل کو پہنچایا گیا کیونکہ پارچہ کے جن حصوں کو سفید رکھنا مقصود ہوتا تھا ان پر یہ لٹی لگادی جاتی تھی اس لٹی کا متعلق لندن کا ایک سیاح تھا جس نے اس کو مسٹر پیل کے ماتحتوں تھوڑی سی قیمت میں فروخت کر ڈالا اس طریقے کو مکمل کرنے اور علی طور پر کارآمد بنانے کے لئے ایک یا دو سال کے تجربہ کی ضرورت تھی لیکن کام کی نفاست اور تیار شدہ نمونہ کی انتہائی خوبی نے بیوری کے کارخانہ کو فوراً ملک کے تمام چھینٹ چھاپنے والے کارخانوں میں افضل واعلیٰ بنا دیا۔ خاندان کے دیگر ارکان بھی لنکاشائر میں مختلف مقامات پر جدید کارخانے قائم کیے یہ کارخانے صرف مالکوں ہی کے لیے تو فیرو دولت کا باعث ثابت نہیں ہوئے بلکہ ان سے کپاس کے تاجروں کے سامنے ایک نظیر قائم ہو گئی اور لنکاشائر کے اکثر کامیاب طباع اور صناعتوں کی ان کے ذریعہ تعلیم بھی ہو گئی۔ شعبہ صنعت کے دیگر نامی گرامی بانیوں میں پاتا بہ مینے کی مشن کے موجد ولیم لی اور جالی بننے کی مشن کے موجد جان ہیت کوٹ قابل ذکر ہیں یہ لوگ زبردست صنعتی قابلیت اور حوصلے والے تھے جن کی کوشش سے ناٹھنگم اور اس کے متصلہ اضلاع کی مزدور پیشہ آبادی کے لیے روزگار کا ایک چھانٹا ذریعہ پیدا ہو گیا۔ پاتا بہ مینے کی ایجاد سے متعلق جو واقعات محفوظ ہیں وہ اگرچہ موجد کے نام کے متعلق کوئی شبہ نہیں بالکل نشر بلکہ کئی لحاظ سے متفاد ہیں موجد کا نام ولیم لی ہے جسکی ولادت 1812ء میں ناٹھنگم سے تقریباً سات میل کے فاصلہ پر قصبہ وڈبرو میں ہوئی بعض روایات یہ ہیں کہ وہ ایک چھوٹی سی جائیداد کا وارث تھا لیکن بعضوں کا خیال ہے کہ وہ ایک غریب طالب علم تھا اور ابتدا ہی سے اس کو مفلسی کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لی 1849ء میں جامعہ کیمبرج کے گرائٹ کالج میں ایک نادر طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اور بعد میں سنٹ جانس کالج میں چلا گیا۔ اور 1852ء میں بی اے کی

ڈگری حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ایم اے کی تعلیم ۱۸۶۷ء میں شروع کی۔ لیکن اس واقعہ کے نسبت یونیورسٹی کے یادداشت (Records) میں بعض اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ خلاف قانون شادی کرنے کی وجہ وہ جامعہ سے خارج کر دیا گیا تھا لیکن یہ غلط ہے کیونکہ کسی وقت وہ رفیق جامعہ (Fellow) نہیں رہا۔

پاتا بہ کی مشن کی ایجاد کے موقع پر لی ناٹھنگم کے قریب کالورٹن نامی گرجا میں یہ حیثیت منصرم نائب پادری کا رگزار تھا اور بعض مضیفین کا بیان ہے کہ اس ایجاد کی ابتدا ناکام محبت سے ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ لی قصہ کی ایک جوان عورت پر عاشق ہو گیا تھا اور جب کبھی لی کو اس کے پاس جانے کا اتفاق ہوتا اس وقت اس کی معشوقہ عاشق کی گفتگو کی نسبت پاتا بہ کی صنعت اور شگردوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ کیا کرتی تھی۔ باور کیا جاتا ہے کہ اس ادنیٰ واقعہ سے اس کے ذہن میں دستی پاتا بہ بانی میں تبدیلی پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ اس نے ایک ایسی کل ایجاد کرنے کا مصمم ارادہ کیا جو دستی صنعت پر غالب آکر اس کو ایک غیر سود مند پیشہ بنا دے۔ تین سال کے لئے اس نے خود کو اس کل کی تکمیل کے واسطے وقف کر دیا اور اس نئی دھن میں ہر بات کو ترک کر دیا۔ جب کامیابی کی کچھ توقع نظر آئی تو اس نے ملازمت ترک کر کے خود کو مشن کی پاتا بہ بانی کے فن کے لیے وقف کر دیا۔ یہ واقعات ہن سن کی بیان کردہ روایت کا ترجمہ یا خلاصہ ہیں جس کو ہن سن نے ایک ضعیف العمر پاتا بہ باف سے سنا تھا جس نے ناٹھنگم کے کالسنس ای شفا خانہ میں ۲۰ سال کی عمر میں انتقال کیا اور ملکہ این کے عہد میں شہر میں یہ حیثیت کار آموز کام کرتا تھا اس واقعہ کو ڈیزنگ اور بلا کرنے بھی بطور روایت بیان کیا ہے۔

پاتا بہ کی مشن کی ایجاد کے اصلی واقعات خواہ کچھ ہی ہوں اس کے موجد کی غیر معمولی مکانیکی قابلیت کے متعلق کوئی شبہ نہیں۔ ایک دیہاتی پادری کا جس کی زندگی کا زیادہ حصہ کتب بینی میں گذرا ایک نازک اور پیچیدہ حرکت والی کل ایجاد کرنا اور جالی کی بافت کے فن کو ترقی دینا حقیقت میں ایک ایسا حیرت انگیز کارنامہ تھا جو کلوں کی ایجاد کی تاریخ میں عظیم النظیر کہا جاسکتا ہے اس کوشش سے ولیم لی کی قدر بہت بڑھ گئی کیونکہ اس وقت دستی فنون حالت طفولیت میں تھے اور صنعتی کاموں میں کلوں کی ایجاد کے مسئلہ پر اس وقت تک بہت کم توجہ ہوئی تھی۔ لی کو ہر ممکنہ کوشش سے اپنی مشن کے اجراء کو ٹھیک کرنے اور موجودہ دشواریوں پر غالب آنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ لی کے اوزار

وجہ سے اس کے نمائندوں کے ساتھ لا پرواہی کا برتاو کیا گیا اور اس طرح پیشہ ور موجد اس واقعہ کے چند روز بعد ہی انتہائی مفلسی اور مصیبت کی حالت میں بہ مقام پیرس راہی ملک عدم ہوا۔

ولیم لی کا بھائی معہ سات کاریگروں کے اپنی کلوں کو لیکر خفیہ طور پر فرانس سے ناہنگم بھاگ آیا۔ جمیس لی ناہنگم واپس آیا تو تھاروٹن کا ایشن نامی ایک پسندار جس کو ولیم لی نے اپنے انگلستان سے روانہ ہونے سے قبل کل کے ذریعہ پاتا بہ بننے کا کام کھانچا تھا اس کا شریک کار بننا اور دونوں کی شرکت میں کاریگروں اور کلوں کا ذریعہ تھاروٹن میں پاتا بہ باقی بسا کام آغاز کیا گیا اور بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ موقع محل بھی اس کام کے لیے نہایت موزوں تھا کیونکہ شروڈ کے قرب و جوار کے اضلاع میں چھڑ والے بھٹروں سے انھیں ایک لمبے ریشے والی اون دستیاب ہوتی تھی کہا جاتا ہے کہ ایشن نے سب سے کلوں کے ڈھلچھے تیار کیے جس سے اس فن میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہو گیا۔ انگلستان کے مختلف حصوں میں جس قدر کلیں زیر استعمال تھیں انہی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوا اور بالآخر کل کی پاتا بہانی قومی صنعت کی ایک ضروری شاخ بن گئی۔

منجملہ دیگر تبدیلیوں کے پاتا بہ کی مشن میں ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی کہ تور (lace) کی صنعت میں بھی اس سے وسیع پیمانے پر کام لیا جاسکتا تھا فراسٹ اور ٹاس نامی دو کاریگر ششہ ۱۸۷۰ء میں مشن میں اضافہ کردہ تبدیلیوں کے ذریعہ Point net کے بنانے میں مشغول تھے اور تقریباً تیس سال کے عرصہ میں صنعت کی اس شاخ کو اس قدر جلد ترقی ہوئی کہ پندرہ سو Point net frame آلات استعمال ہونے لگے اور پندرہ ہزار سے زائد آدمی برسرِ روزگار ہو گئے۔ خشک و ضحاری کے تغیر اور دیگر وجوہات کے سبب ناہنگم کی تور کی صنعت کو فوراً زوال ہو گیا اور جان ہیت کو سٹ کی جالی بننے کی۔

Bobbin net machine ایجاد ہونے تک صنعت زوال کی حالت میں رہی۔ لیکن ہیت کو سٹ کی ایجاد سے وہ دوبارہ ٹھوس بنیاد پر قائم ہو گئی۔

جان ہیت کو سٹ ڈفیلڈ (ڈرلی شائر) کے ایک معمولی اور مغز کان کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو ۱۸۳۰ء میں بہ مقام ڈفیلڈ پیدا ہوا۔ جب تک وہ مدرسہ میں تعلیم پاتا رہا اس نے جلد ترقی کی لیکن اس کا باپ اس کو موبرو کے ایک سانچے بنانے والے کے پاس بیٹھنے کا آموز رکھوا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ جلد مدرسہ سے نکال لیا گیا۔ چالاکی سے وہ بہت جلد اوزاروں کا استعمال لیکر گیا اور پاتا بہ کی

مشن کے پرزوں اور تانے کی پیچیدہ مشن کے متعلق مفصل معلومات حاصل کر لیے۔ فرصت کے وقت وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ مشن میں جدید اصلاحات کس طرح کیے جائیں اس کے دوست مسٹر نیرنی کا بیان ہے کہ سولہ سال کی عمر میں جان کے ذہن میں ایک ایسی مشن ایجاد کرنے کا خیال پیدا ہوا جس سے کہنگم یا فرانس کی دستی قور کی مانند قور تیار ہو سکے۔ پہلی عملی اصلاح جس میں اسے کامیابی حاصل ہوئی وہ تانے کی مشن میں تھی کیونکہ عمدہ اوزار کے ذریعہ قور کی شکل کے دستانے (MITTS) ایجاد کرنے میں اس کو کامیابی ہوئی اور اسی کامیابی نے اس کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ مشن کی گوٹہ سازی کی تعلیم جاری رکھے۔ پتا یہ کی مشن میں تبدیلی کیجا کر اس سے (POINT-NET) قور کی صنعت کا کام لیا جاتا تھا لیکن یہ کام طلبہ میں ثابت نہیں ہوا اس لئے ناہنگم کے کئی چالاک دستکار اور صنعت ایک نئی طرز کی مشن ایجاد کرنے کی فکر میں مسلسل کئی سال تک لگے رہے ان میں سے بعض تو حالت مفلسی میں فوت ہو گئے اور بعض دیوانے ہو گئے اس طرح سب کو تحقیق میں ناکامی ہوئی اور تانے کی قدیم مشن ہی حسب حال قائم رہی۔

اکیس سال کی عمر میں ہیت کوٹ ناہنگم پہونچا جہاں اس کو فوراً ملازمت مل گئی اور تانے کے ڈھانچے اور موزے سازی کے کام سے اعلیٰ اجرت ملنے لگی اور اس کی قابلیت ہوشیاری اوضاع و اطوار اور پاکیزہ اصول کی وجہ اس کی بڑی وقعت ہونے لگی اب اس نے اس مضمون کا مطالعہ بھی شروع کر دیا جس کی جانب اس کا دماغ پہلے ہی متوجہ ہو چکا تھا اور اس طرح ایک جدید کل ایجاد کرنے کی کوشش شروع کی پہلے اس نے کیوں کی جہاں رانی کے فن کا مطالعہ کیا جس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک مشن کے ذریعہ اس کام کو انجام دیا جائے یہ سخت جانفشانی کا کام تھا جس کے لیے کافی استقلال ہمارت اور قابلیت درکار تھی۔ ہیت کوٹ کے استاد الیٹ کا بیان ہے کہ ہیت کوٹ کی طبیعت اس وقت جدت متحمل اور نفس کش واقع ہوئی تھی اور وہ کم سخن بھی تھا۔ نا کامیابیوں اور غلطیوں سے وہ کبھی ہراساں نہ ہوا مشن کی تکمیل کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیے اس کو کامل یقین تھا کہ اس کی محنت کبھی رایگاں نہ جاوے گی بلکہ ضرور چمکانے لگے گی۔

(BOBBIN-NET MACHINE) جیسی پیچیدہ کل کی ایجاد کا حال خطبہ بیان

یا ضبط تحریر میں نہیں آ سکتا۔ حقیقت میں وہ قور بنانے کا ایک بیگانگی آئندہ خاص میں قور سازوں کی نگاہ کی حرکت کا کام پرزوں سے لیا گیا تھا دستی ساخت کی جہاں کے ایک ٹکڑے کو پھاڑنے سے ہیت کوٹ

کو معلوم ہو گیا کہ دھاگوں کو طول اور عرض میں جایا جاسکتا ہے اس نے اپنے تجربات اس طرح شروع کئے کہ معمولی ڈوریاں ایک فٹم کے تانے کے ڈھانچے پر لمبے تان دیئے اور معمولی مدد پہلے کے ذریعہ بانے کے تاروں کو ان میں سے نکال کر دوسری طرف کے مدد پہلے میں داخل کئے پھر باز دسے ان تاروں کو مڑ کر حرکت دینے سے تانے پھر متعلقہ ریوں میں واپس جا گرتے تھے اور اس طرح کل کی سی بافت ہوتی تھی اب ہیت کوٹ کو ایک ایسی کل کی ایجاد کی ضرورت داعی ہوئی جس سے یہ سب کام پورا ہو سکے۔ نیز اس کی تکمیل کے لئے بڑی دماغی محنت کی ضرورت تھی کئی روز بعد اس نے کہا کہ ”چوڑے (عریض) تاروں کو منقسمہ مقام پر مڑنا ایک ایسی واحد اور زبردست دشواری ہے کہ اس وقت اس کی تکمیل مجھ سے بالکل ناممکن ہے“ اس کے بعد اس نے پتلے دھانی (Disis) فراہم کرنا شروع کیا جن کو وہ دھاگوں کے آگے پیچھے کرنے کی غرض سے بطور سوئیوں کے استعمال کرنا چاہتا تھا ان (Disis) کو تانے کے بعد ہر جانب لے (Carried) میں جاکر موزوں مشن سے انھیں حرکت دی گئی جس سے فوراً تیار ی میں دھانے ایک طرف سے دوسری طرف جا پڑتے تھے۔ بالآخر ہیت کوٹ اپنے اصول کو قابلیت اور ہتیار کی سے کارآمد بنانے میں کامیاب ہوا اور ۲۴ سال کی عمر میں اس کو مشن کا حق ایجاد حاصل ہو گیا۔

اس مشن کی ایجاد کے زمانہ میں اس کی بیوی کو شوہر کے برابر فکر و امن گیر رہا کرتی تھی کیونکہ جس وقت ہیت کوٹ مشن کو مکمل کرنے میں مصروف تھا اس کے مشکلات سے وہ بخوبی واقف تھی کئی سال کی محنت کے بعد ہیت کوٹ کو ان مشکلات پر قابو حاصل ہوا۔ دوران ایجاد میں ایک روزیاں بیوی میں جو گفتگو ہوئی وہ درج ذیل ہے:-

”فکر مند بیوی نے کہا“ کیا مشن چل سکتی ہے؟ اس پر شوہر نے مایوس اور غلین لہجہ میں جواب دیا کہ ”مشن نہیں چل سکتی۔ مجھے پھر اس کو توڑنا پڑے گا“ اپنے مقصد میں ناکام ہونے کے باوجود بھی ہیت کوٹ کو کامیابی کی توقع تھی اور وہ نہایت بٹاش رہا کرتا تھا لیکن اس کی غریب بیوی اپنے جذبات کو روک نہ سکی بلکہ روپا کرتی تھی۔ بیوی کو صرف چند ہی ہفتے اور انتظار کرنا پڑا کیونکہ ایک عرصہ دراز کی کوشش کے بعد ہیت کوٹ کو وہ کامیابی نصیب ہوئی جس کا کہ وہ مستحق تھا اس نے اپنی مشن کی تیار شدہ۔

Baldwin's method کا پہلا نمونہ اڑے فخر سے بیوی کو دکھایا اس وقت اس کو جو مسرت حاصل ہوئی اس کا اندازہ ناممکن ہے۔

دیگر مفید ایجادات کی طرح جن میں کہ اکثر ہوا کرتا ہے ہیت کوٹ کے حق ایجاد کے نسبت لوگ معترض ہوئے۔ حق ایجاد کے مفروضہ عدم جواز کی بنا پر جھار لہ سازوں نے (BOBBIN NET) مشن کو اختیار کر کے موجد کو مقابلہ کا چیلنج دیا۔ لیکن ہیت کوٹ کی مشن میں خاصی اصلاح ہونے سے جن لوگوں کو حق ایجاد دیا گیا تھا وہ واپس لے لیا گیا اور جب یہ لوگ اپنی کوشش میں ناکام رہے اور باہمی تنازع کی وجہ عدالت میں رجوع ہوئے تو عدالت نے ہیت کوٹ کے حقوق تسلیم کیے۔ ہر صناعت نے دوسرے کے مقابلہ میں اپنے حق ایجاد کی مداخلت کی تالش کی اس پر جوری نے مدعی علیہ کے موافق فیصلہ کیا اور منصف نے بتلایا کہ ہر دو متدعو یہ کھلوں سے ہیت کوٹ کے حق ایجاد کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ ہر مقدمہ میں سر جان کو پلے جو (جو بعد میں لارڈ لنڈ ہرسٹ کے نام سے موسوم ہوئے) اور جو مٹر ہیت کوٹ کی جاس سے وکیل مقرر ہوئے تھے ایجاد زیر بحث کے جملہ تفصیلی واقعات سے وقفیت حاصل کرنے کی غرض سے۔

Bobbins net machine کو چلانا سیکھا۔ خلاصہً پڑھنے کے بعد انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ مقدمہ کی اصلیت ان کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن مقدمہ چونکہ ان کی رائے میں تھا ہم تھا اسلئے انھوں نے ہتھم جا کر مشن کے خلاف مواضع کا ارادہ ظاہر کیا اور جب انھوں نے مشن کا معائنہ کر کے اس کی ساخت وغیرہ کو اچھی طرح سمجھ لیا تو کہا کہ ”میں تمہاری جانب سے حتی الامکان جواب دہی کروں گا چنانچہ وہ اسی شب میل میں سوار ہو کر ناہنگم پہونچے۔ لائق وکیل نے کل کا معائنہ نہ کیا اور جب تک خود اپنے ہاتھوں سے Bobbins net کا ایک ٹکڑا تیار نہ کیا اور مشن کے تمام پرزوں اور اسکی ساخت کے اصول سے پوری طرح وقفیت حاصل نہ کی وہاں سے واپس نہ ہو جو وقت مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو لائق وکیل نے عدالت کے رد و پرو نہایت آسانی اور عمدگی سے Bobbins net کا ایک نمونہ تیار کر دکھایا اور اس ایجاد کی اصلیت کو اس خوش اسلوبی اور عمدگی سے بیان کیا کہ منصف جوری اور تمام تاشائی محو حیرت ہو گئے نیز جس کامل دیانت داری اور راستبازی اس نے مقدمہ میں بحث کی اس کا عدالت کے فیصلہ پر خوب اثر پڑا۔

وجہی

مرثیہ گو کی حیثیت سے

از جناب نعیر الدین ہاشمی صاحب۔ ام۔ آر۔ لے۔ اس۔ اف۔ آر۔ اس لے (لندن)
 ہاشمی صاحب دکن میں اردو کے مصنف اور مضمون نگار کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ کچھ ہی روز ہو گئے
 آپ لندن سے واپس ہوئے ہیں جہاں اردو مخطوطات کے مطالعہ کے لیے گئے ہوئے تھے وجہی کی مشنوی
 ”قطب مشرقی“ پر ایک طویل مضمون اس سے پہلے ڈاکٹر سید غلام محی الدین تادری کا مکتبہ میں شائع ہو چکا ہے
 ہاشمی صاحب کو اس کے کچھ مرثیے بھی دستیاب ہوئے ہیں جس سے متعلق یہ مختصر مگر ایک حد تک مفید مضمون
 مکتبہ کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ (مکتبہ)

ہاشمی صاحب کی شخصیت اب قلع تعارف نہیں ہی اس کی تعانیف میں سب سے پہلے سب کس کا پتہ چلا جس پر
 رسالہ اردو میں مولوی عبدالحق صاحب نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد یورپ کے ذخیرہ سے ثنوی
 ”قطب مشرقی“ دستیاب ہوئی اس کے نام اور مصنف کے متعلق بلوم مارٹ مصنف کیٹلاگ نے کوئی صراحت
 نہیں کی تھی اس کے متعلق میں نے رسالہ معارف میں صراحت کی ہے میرے دوست ڈاکٹر سید غلام محی الدین صاحب تادری نے تفصیل سے اس پر مضمون لکھا ہے جو مکتبہ میں شائع ہوا ہے۔
 وجہی کا نام اس کا سنہ پیدائش اور وفات سب تاریکی میں ہیں ہم کو نہیں معلوم اس کا کیا نام تھا؟
 وہ کب پیدا ہوا؟ اور کب فوت ہوا؟ مگر تعانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں
 موجود تھا اور شاعر کی حیثیت سے نامور ہو چکا تھا۔ محمد ظلی (سنہ ۱۰۷۰ تا سنہ ۱۰۸۰) کے عہد میں اپنی مشنوی
 قطب مشرقی کی سنہ ۱۰۸۰ میں مکمل کی۔ اس میں اس نے ابراہیم قطب شاہ کی اس طرح مدح کی ہے جس سے
 صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان کے زمانہ میں موجود تھا اور اپنی ثنوی کی ابتدا کردی تھی۔

اور قطب کی مدح کراختیار	جو رہے یو قیامت ملک یادگار
ابراہیم قطب شاہ را جہ دہراج	شہنشاہ ہے شاہ شاہاں میں آج
مدل بخش ہو رد اس تلے اچھے	سدا خلق سب شاد اس تلے اچھے

جتنے پادشاہاں ہیں سینا (ر) کے بھکاری ہیں سب اس کے دربار کے
 سلماں تے فائل ہے اس بخت بل پڑے دیو جن سب ہیں اس حکم تل
 اسی شاہ عادل کے قصہ تے ڈر لبہ لگن کوں پون سپٹ پر
 تنابل ہے اس عدل کے فن منے کہ بجلیاں کھڑیاں کا پتیاں پن منے
 وجہی کی دوسری تصنیف سب کس سنہ ۱۰۸۵ء میں مرتب ہوئی ہے اس سے واضح ہو سکتا ہے وہ
 سنہ ۱۰۸۵ء تک نہ صرف زندہ تھا بلکہ تصنیف کر سکتا تھا اگرچہ خیال ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۰۸۵ء کا شاعر سنہ ۱۰۸۵ء
 تک کس طرح زندہ رہا مگر یہ کوئی طویل عمر نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر سنہ ۱۰۸۵ء میں اس کو پچیس سال کا فرض کیا
 جائے تو سنہ ۱۰۸۵ء میں (۸۲) سال کی عمر ہوگی جو ناقابل یقین نہیں ہو سکتی اس کے علاوہ بعض دیگر شہادتوں
 اس کی تائید ہوتی ہے کہ دونوں کا مصنف ایک ہی وجہی ہے۔

(الف) قطب شتری کا وجہی غوامی کا ہمعصر تھا جس کے ثبوت میں اشعار ذیل پیش کیے جاتے ہیں
 اگر غوطے لک برس غواص کہاے تو یک گوہر اس دھات امولکے پائے
 یوموتی نہیں دو جو غواص پائیں یوموتی نہیں دو جو کس بات آئیں
 (ب) سنہ ۱۰۸۵ء میں ایک وجہی دکنی شاعر زندہ تھا جس نے سلطان عبدالقطب شاہ کے
 فرزند کی تاریخ تولد لکھی تھی ”آقاب از آقاب آمد پدید“ اس کے بعد غوامی کی تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے۔
 (تاریخ نظام الدین احمد مخطوطہ انڈیا آفس)

اس سے واضح ہے کہ سنہ ۱۰۸۵ء میں وجہی جو دکنی شاعر تھا زندہ تھا اور نہ صرف زندہ تھا بلکہ نظم بھی
 لہا کرتا تھا اور اس کو سلطان کا تقرب حاصل تھا اور وہ غوامی سے کسی بات میں فوقیت رکھتا تھا کیونکہ نظام الدین
 اگرچہ غوامی کا بڑا مداح اور اس کے کمال کا معترف ہے لیکن وجہی کا ذکر مقدم کرنا ضروری تصور کرتا ہے۔ یہ
 تقریباً نا ممکن ہے اسی قدر قریب زمانہ میں ایک ہی شخص کے دو شاعر ایک ہی مقام میں موجود ہوں اور پھر وہ
 مکانا فن مشہور اور معروف ہونے کے علاوہ بادشاہ کا تقرب بھی رکھتے ہوں۔ دربار شاہی میں بار بار ہوا
 شکہ قطب شتری اور سب کس کا مصنف ایک ہی شخص کو قرار دینا ضروری ہے۔

وجہی کب فوت ہوا؟ یہ بھی معلوم نہیں مگر سنہ ۱۰۸۵ء میں موجود نہیں تھا اس کو مرے عرصہ گزر چکا تھا کیونکہ
 جی نے اپنی مثنوی ”بہرام و گل اندام“ میں اس طرح ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے اس کو مرے عرصہ ہو گیا

جیسا کہ بیان کیا گیا وجہی ابراہیم قطب شاہ کے عہد کا شاعر ہے غالباً اس نے کم عمری سے شاعری شروع کر دی تھی۔ کیونکہ قطب فترتی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کہنہ مشق شاعر ہے۔

وجہی کے زمانہ میں گولکنڈہ میں ہر طرف علمی فضا تھی شعرا و شاعری کا چرچا تھا کئی ایک مشہور شعرا مثلاً محمود فیروز۔ احمد وغیرہ کے کارنامے موجود تھے مگر وجہی نے خاص وقت اور اقبال حاصل کر لیا تھا۔ اور اس کا اغراض قدر بلند تھا کہ وہ سلطان قلی کو بہ حیثیت ہمہ پیش کرتا ہے اور اپنے ہم عصروں کو تحارر سے دیکھتا ہے اس کی نظر میں کسی شاعر کی کوئی وقعت نہیں ہے وہ اپنے غرت و مرتبہ اپنی قابلیت و لیاقت اپنے شعروں کی کسی کو مد مقابل تصور نہیں کرتا دوسرے شعرا اس کے مقابل ہیچ ہیں۔

وجہی جس طرح شعر گوئی میں یکٹائے زمانہ تھا اسی طرح شرنوئیسی کا ملکہ رکھتا تھا سب اس کی میں تباہ اگرچہ اس زمانہ (۱۵۸۸ء) میں غواصی کا طوطی بول رہا تھا اور وہ دربار قطب شاہی میں ملک الشعرا کے درجہ تک پہنچ چکا تھا وجہی کی وہ غرت نہیں تھی جو سلطان قلی کے دربار میں تھی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ملا نظام الدین احمد اپنی تاریخ میں غواصی کی تو بڑی تعریف و توصیف کرتا ہے اور وجہی کا ذکر یوں ہی کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے..... وجہی کو غواصی کے مقابل شکست ہو چکی تھی مگر وہ دربار سے ممنوع نہیں ہوا تھا قصائد اور تاریخیں کہہ کر پیش کرتا تھا۔

وجہی بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کی تصنیف سے نظم و نثر دونوں کے نمونے موجود ہیں۔ اس کے قصائد کا پتہ چلتا ہے گو وہ اب ناپید ہیں۔

ہم آج وجہی کو بہ حیثیت مرثیہ گو پیش کرتے اور مرثیہ کا نمونہ ہدیہ ناطقین کرتے ہیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کے علمی کارناموں سے ہم ناواقف نہیں ہیں انکی علمی قدردانی اور علم پروری کی زندہ یادگاریں تحریری صورت میں صدائے موجود ہیں جنکی صراحت و حجب الہیہ چونکہ دونو سلطنتوں کا شاہی مذہب امامیہ تھا اس لیے ان کے یہاں مجالس غرا کا خاص دستور تھا اور عام طور پر مرثیہ گوئی ہوتی تھی اس ماحول کا نتیجہ تھا کہ اکثر نامور شعرا ضرور مرثیہ کہا کرتے تھے اور پھر کئی ایک شعرا نے خاص مرثیہ گوئی کو اپنا پیشہ کر لیا سوائے مرثیہ کے کچھ کہا ہی نہیں کرتے۔

عادل شاہی عہد کے مرثیہ گو یوں میں تھے اور مرزا خاص طور پر قابل ذکر ہیں اسی طرح قطب شاہی شعرا میں شاہی۔ کاظم اور مرزا کا نام یادگار ہے گا ان خاص مرثیہ گو یوں علاوہ دیگر شعرا بھی مرثیہ

کہا کرتے چنانچہ قطب شاہی شعرا سے احمد و جہی اور غواصی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کے مرثیے آج موجود ہیں۔ معلوم ہوتا ہے زمانہ سلف میں اکثر بیاضوں میں ان مرثیوں کو جمع کرتے تھے تاکہ مجالس غزایں ان کو سنایا جائے اس قسم کے متعدد بیاض ہمارے نظر سے گذرے ہیں ان میں سے دو ڈبیراویزی کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں ایک میں تو تقریباً کل ہاشم علی برہان پوری کے مرثیے ہیں اور دوسری میں انہی شعرا کے مرثیے جمع کیے گئے ہیں۔ ان پر ہمارے مکرم دوست مسٹر زور روشنی ڈال چکے ہیں۔ ایک اور بیاض کنگ کالج کیمبرج کے کتب خانہ میں ہے جس میں پچیس شعرا کے مرثیے ہیں ان میں رضا۔ ندیم۔ روحی۔ نظر۔ قادر۔ رمضان احمد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ہمارے خاندانی کتب خانوں میں متعدد بیاضوں کا پتہ چلا ہے جن پر کبھی روشنی ڈالی جائے گی ان میں سے آج کل ایک بیاض ہمارے پیش نظر ہے یہ مولوی صفی الدین صاحب مرحوم کے کتب خانہ کی جو اس میں تقریباً (۳۵) شعرا کے (۱۱۲) مرثیے ہیں اس میں وجہی غواصی۔ عبدالقطب شاہ۔ علی عادل شاہ مرزا (گولنڈہ) مرزا (بیجا پور) شاہی۔ قادر۔ احمد وغیرہ مشہور ہیں اس پر کبھی تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ اس بیاض میں وجہی کا ایک مرثیہ دس شعر کا موجود ہے اس کے متعلق ملاحظہ کے پہلے اہل مرثیہ پیش کیا جاتا ہے۔

مرثیہ حضرت حسین

ابنوخین سوں جہر و غریزاں	حسین کا غم سرگرد غریزاں
عیش لگن ہو رہت ہلایا	بنا جو اول ہوا ہے غم کا
کریا حسین پر ادھی سما یا	قضا میں جوں جوں لکھیا الہی
یو غم حسین کا جنم دھولا یا	نبیاں دلیاں کے ابنوخانوں کہے
یو غم نے سلگا دھرک لگایا	دلاں میں دو لگی چہوہ تے چکیاں
مگر قضا تھا سو حق دکھایا	یو کیا بلا تھا یو کیا جفا تھا
پیا۔ بے غم کے سو بہر پیلا یا	محب دلاں کوں اجل کا ساتی
فلک شہاں پر ستم خدایا	یو کیا اندیشہ اندیش کتیا
کہ دین کا یو دیوا جنگا یا	حسین پر یاراں درود بھیجو

تمارے وجہی کوں یا اماں

نہیں متن بن یو اس کوں سایا

یہ کوئی طویل مرثیہ نہیں ہے اور نہ اس میں مبالغہ اور قوت بیان کا اظہار کیا گیا ہے جھوٹے قصے
تواری کی تعریف گھوڑے کا وصف - صبح کا سما - بگل دھوپ کا منظر کچھ نہیں ہے اُس وقت کی روزمرہ
زبان میں غم حسین کا اظہار مقصود ہے۔ دوستوں کو مخاطب کرنا ہے اے دوستو حسین کا غم کرو آنکھوں
سے آنسوں بہاؤ۔ یہی سب سے پہلا غم ہے قسمت میں جو جو لکھا وہی ہوتا ہے اور تم تو کیا غم حسین نے
انبیا اور اولیا کو بھی رو لایا ہے۔ غم نے دلوں کو زخمی کر دیا اور جگر میں آگ لگا دی۔ یہ بلا یہ قسم یہ جفا
خدا کو دکھانی تھی دکھائی۔ ساتی اہل نے غم کے پیالے پلائے انوس فلک نے شہنشاہ ہی پر ظلم و ستم دکھایا
دوستو حسین پر سلام کہو درود بھیجو جو دین کا ستون ہے۔ آخر پر دعا کرتا ہے کہ وجہی کو آپ کے سوا
کوئی سہارا نہیں ہے۔

اس سے بہتر اس سے جامع اس سے واضح اس سے صاف کوئی مرثیہ نہیں ہو سکتا جس طرح سادہ
الفاظ میں وجہی نے غم حسین کو بیان کیا ہے وہ تعریف کا محتاج نہیں ہے۔

وجہی کی شاعری کا نمونہ قطب مشرقی اور شرفیو سی کا کمال سب کس سے بخوبی واضح ہوتا ہے
اگرچہ ہمارے پاس مرثیوں کا کوئی کافی ذخیرہ نہیں ہے جس سے وجہی کی مرثیہ گوئی پر اظہار خیال کیا جاسکے
مگر یہ بلا خوف کہا جاسکتا ہے وہ مرثیہ بھی کہا کرتا اور اچھے مرثیے لکھ سکتا تھا ممکن ہے دوسری بیاضوں
سے اس کے مزید مرثیے دستیاب ہوں۔ ایسی صورت میں ہم مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

برسات

(از جناب احمد علی اکبر صاحب سرائی قاسمی)

ناطق مطلق - ذی روح - غیر ذی روح تمام مخلوقات کی زندگی کا دلد و مدار پانی پر ہے۔ موسم گرما میں پانی کی سخت ضرورت ہوتی ہے گویا تشنگی گرمی کا لوازمہ ہے۔ جتنی گرمی بڑھے گی اتنا ہی پانی کا غلبہ زیادہ ہوگا۔

انسان اشرف المخلوقات ہے اس نے گرمی اور مہس سے محفوظ رہنے کے لئے کئی ذریعے پیدا کر لئے جنگل کی ننھی ننھی آزاد خوشبودار گھاس کو ڈوروں کے ٹکڑے میں مقید کر کے خس خانے بنائے۔ پانی کی صورت بگاڑ کر برف ایجاد کی۔ میوؤں کی ہمتی خاکر کے شربت تیار کیا اور جو غریب تھے انھوں نے بھی حسب مقدار گرمی سے بچنے کے تھوڑے بہت سے اسباب فراہم کر دیئے لیکن پیاسی زمین تپتے پہاڑ۔ سوکھے درخت بے زبان جانور اور دیگر مخلوق کی اتر حالت مخلوق سے دیکھی نہ جاسکتی تھی اس لیے گرمی کے بعد برسات کا موسم رکھا گیا۔

تشہ کامی کا دور دورہ ختم ہو چکا۔ سیرابی کا زمانہ آگیا۔ گرمی لگتی۔ برسات آگئی۔ بادل گرے۔ بجلیاں چلیں۔ تمام آسمان پر گھٹنگور گھٹنگور کا قلعہ ہو گیا۔ موروں کی بن آئی۔ بن میں بولنے لگے۔ کوئلے دن بھر سے۔ اپنی کوک سے دلوں میں ہوک پیدا کرنے لگی پانی کی بوند پڑتے ہی پروانوں کے دلوں میں محبت کی آگ بھڑک اٹھی۔ چرخوں اور برقی لیمپوں پر جان قربان کرنے لگے۔ میڈکوں نے اپنے جلے جلاگا منہ کر کے خوشی کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ سپید ورمی پوش نگلے باقاعدہ صفیں جاکر فرما کر دے بہار لینے برسات کی سلامی کے لیے حاضر ہو گئے۔ چوڑی چمکی زمین اور بھاری بھر کم پہاڑوں پر سبز نخل کا فرش چھ گیا۔ درختوں نے پانی نہا نہا کر دھانی جوڑے پہن لئے۔ جب سارا عالم ہریلا ہو گیا اور بنری کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تو مکانات کی چھتوں اور پانی کی سطح پر کانی بن کر جم گئی۔ والنگان برسات کی یہ سرگرمیاں دیکھ کر گرمی کی گرم بازاری سرد پڑ گئی اور جب کچھ زور نہ چلا سکا تو غریب آفتاب نے خفت اور شرمندگی مٹانے کے لیے ابر کی چادر سے منہ ڈھک لیا۔

۴۸ غزل

(از جناب مودود احمد صاحب تشنہ)

لطف آغوشش یار کو دیکھو
چاندنی کی بہار کو دیکھو
گل کے پہلو میں خار کو دیکھو
غیر کے ساتھ یار کو دیکھو
دل سے کیا کام ہے نہیں معلوم؟
ہنگہ شرم سار کو دیکھو
ایک دم عیش عمر بھر ہے عیش
زندگی کی بہار کو دیکھو
وعدہ پوچھا جو وصل کا تو کہا
”ابھی روز شمار کو دیکھو“
دیکھتے دیکھتے گذرتی ہے
عمرنا پادار کو دیکھو

تشنہ - گر چاہتے ہو لطف سخن
داغ کے ”یا دھکار“ کو دیکھو

افکار آزاد

چمن ہو، بہاریں ہیں گلباریاں ہیں
گھٹا ہے، پھواریں ہیں، مینواریاں ہیں
ستم کو شیاں ہیں جھاکاریاں ہیں
یہ کس کے ٹٹاٹٹے کی تیاریاں ہیں؟
وہ آنکھیں نہیں خاص سرشاریاں ہیں
وہ نظریں نہیں - عام میاں باریاں ہیں
بتو! تم خدا جانے کیسے خدا ہو
کہ ستاریاں ہیں نہ غفاریاں ہیں
جواب کوئی پرساں نہیں ہو تو کیا خم
خود دوست ہے اور غم خواریاں ہیں
بس اب حال اہل و خاکچہ نہ بوجھو
کہ ذکر و وفا ہی سے بے زاریاں ہیں
حیات جہاں منقطع ہونہ جائے
تری تیغ ہے اور خوں باریاں ہیں
اگر تم خداوند عالم نہیں ہو
تو عالم میں کس کی پرستاریاں ہیں
اب آنکھیں نہیں جاگتی تو نہ جاگیں
کہ اب روح ہے اور بیداریاں ہیں
محبت کے پیرو! محبت کے شکوے؟
محبت کے تیرے غدا ریاں ہیں

جو آزاد قطع ہر امید کر دو

تو پھر صبر میں کون شواریاں ہیں

حکیم آزاد انصاری

دھن کا چکا

ڈراما معہ کاہٹ

(از جناب شیدائ محمد صاحب)

جناب شیدائ محمد صاحب کو انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے میں ایک خاص طبقہ ہے۔ ”ایمرسن“ جیسے بلند انشا پرداز کے بعض مضامین کا صاف و سلیس ترجمہ کر کے ملک میں خاصی شہرت حاصل کر لی ہے آپ کا طبع میلان زیادہ تر خائفانہ اندازوں پر ہے یہ ڈراما بالکل طبع زاد ہے جو ایک واقعہ کے اثر کے طور پر لکھا گیا، اس کو وہ خود اسٹیج پر لانے کی تیاری میں ہیں ڈراما خود کہہ رہا ہے نہ انھیں بڑی کامیابی ہوگی۔ ڈرامے کے تین باب ہیں اور کاہٹ کے بھی تین اس کے حقوق طبع محفوظ ہیں اور کسی کو اسٹیج پر بھی کرنے کی اجازت نہیں۔ ”جملہ مکتبہ“ کا ایک عرصہ سے ان پر تقاضا تھا جس کو وہ اس ڈرامے کے ذریعہ پورا کر رہے ہیں اس کی داہم کیا دیں خود قارئین پڑھنے کے بعد داد دینے پر مجبور ہوں گے ! (جملہ مکتبہ)

باب پہلا

سین پہلا - منقشام اتا مبول

جمیل (تنہا اپنے کمرے میں گارٹ ہے)

اک قیامت کی مصیبت عشق کی منزل میں ہے
بول! لاحق کا ہو گا اور باطل کو شکست
میں ادھر نخل میں ہوں اور وہ ادھر نخل میں ہے
سخت لیکن آزمائش اب حق و باطل میں ہے
آرزو تیری ہی تیرا ہی تصور دل میں ہے
آ کہ میری جاں بڑی آفت بڑی نخل میں ہے
اس نگاہ ناز کی پیہم خلش جو دل میں ہے
زندگی کا بھی خراشید اسی کے ساتھ ہے
آہ محبت - تو نے اپنے مطلوبوں پر کیا کیا ظلم نہیں کیے اور کیا کیا ستم ان پر نہیں توڑے
مجنون کو صحرایاں میں مارے مارے پھرایا تو فرما دو تیرے سے اڑایا۔ رام کو سیتا سے چھڑایا تو نل کو
دمن کے لیے کنویں جھکا یا آہ۔ آہ۔ میرا گناہ یہی ہے کہ میں زبیدہ کو محبت کرتا ہوں اور اس کی
الفت کا دم بھرتا ہوں۔ یہ اگر جرم ہو سکتا ہے تو ایسا جرم نہیں جس کی وجہ سے میں اپنے والد کے گھر سے

اس بے بسی کے ساتھ نکالا جاؤں۔ آوارہ و بے خانماں پھر یا جاؤں مگر
 کون سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری
 زبیدؔ۔ پیارے جمیل۔ میں نے سنا ہے کہ چچا جان تم سے ناراض ہو گئے اور تم کو گھر سے نکل جانے کا
 حکم دیا ہے۔

جمیل۔ ہاں پیاری شاہزادی۔

زبیدؔ۔ اس کی وجہ؟

جمیل۔ اس کی وجہ؟ اس کی وجہ تو یہ ہے۔۔۔۔۔ نہیں میں نہیں کہہ سکتا۔

زبیدؔ۔ نہیں تم کو ضرور کہنا ہو گا کہ جو کچھ واقعہ تم میں اور چچا جان میں گزرا وہ مجھ سے بیان کرنا
 ہو گا۔ تم اور میں جدا نہیں چھپانے کا یہ موقعہ نہیں۔ تم اپنے وعدہ کو بھول گئے کہ کوئی بات تم مجھ سے
 نہ چھپاؤ گے۔

جمیل۔ ہاں شاہزادی مجھے یاد ہے مگر اس سے اب کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

زبیدؔ۔ دیکھو جمیل اچھا نہ ہو گا۔ تم مجھے اس گفتگو سے بہت پریشان و سرگردان کر رہے ہو مگر تباؤ کہ
 واقعہ کیا ہے۔

خدا کے واسطے کہہ دو معاملہ کیا ہے۔ نصیب دشمنانِ آخریہ ماجر کیا ہے۔

جمیل۔ شاہزادی آج ہم ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ چونکہ عشق کے مجرم ہیں اس لئے یہ مورد
 سزا ہوتے ہیں۔ والد کو معلوم ہو گیا کہ ہم دونوں میں محبت ہے۔ ہماری محبت ان کی نظر میں پیشِ خیرہ ہے
 اس لئے مجھے حکم ہوا ہے کہ گھر سے چلا جاؤں۔

زبیدؔ۔ یہ کس لئے؟

جمیل۔ یہ اس لئے کہ آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں اور میں شاہی خاندان سے نہیں
 اس لئے ان کے خیال میں ہماری شادی بے جوڑ ہے۔

زبیدؔ۔ کیوں بے جوڑ؟ کیا تم ایک امیر خاندان کے نہیں؟ کیا تمہارے باپ کا ملک کے اعلیٰ اہل
 میں شمار نہیں۔

جمیل۔ مگر وہ آپ کا بیاہ کسی شاہی خاندان کے ممبر سے کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے بھی سنا ہو گا کہ

انہوں نے والی پاشا کو آپ کے لئے انتخاب کیا ہے۔
 زبید لا۔ نہیں یہ ہرگز نہ ہوگا پیارے جمیل میں تمہارے ہمراہ چلوں گی اور اپنے ننگ و ناموس کو
 الوداع کہوں گی۔

مصیبت نہ فرقت کی میں سہہ سکوں کی جہاں تم رہو گے وہاں میں رہوں گی
 جھیل۔ افسوس شاہزادی۔ میں آپ کو کہاں لے چلوں؟ میں خود نہیں جانتا کہ میں کہاں جاؤنگا
 اور کہاں ہوں گا خود گرفتار مصیبت ہوں اب آپ کو بھی گرفتار مصیبت کر دوں۔ یہ مجھے گوارا نہیں
 یہی میرے لئے کچھ کم نہیں کہ آپ جیسی شاہزادی اپنی غایت سے میری غرت افزائی فرمائیں یہی
 میرے لئے باعث افتخار ہے۔ جب کہیں کچھ ٹھکانا ہو جائے گا تو فرقت کا مداوا ہو جائے گا۔ میں
 آؤنگا اور آپ کو لیجاؤں گا۔

زبید لا۔ پیارے جمیل میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اپنے ساتھ لے چلو
 زندگی کیونکر کہنے کی ہجر میں یارب مری دور کب ہوگی مصیبت اور آفت کی گھڑی
 ایک تھی امید سو وہ بھی گذر کر گئی نا امیدی قلب مضطر پر مسلط ہو گئی

اے فلک کب تک ہمیں تو یوں ستائے جائے گا

اور کب تک ہم غریبوں کو رلائے جائے گا

پیارے جمیل! مجھ سے ہجر کی مصیبت کبھی نہ سبے جائے گی۔ یہ بندی اسی غم میں اپنی جان سے
 چلی جائے گی۔ اچھا تم کہاں جاؤ گے۔

جھیل۔ میرا ارادہ لہستان جانے اور وہاں قسمت آزمائی کرنے کا ہے۔

زبید لا۔ جاؤ مگر یہ یاد رکھو کہ میں بھی وہاں پہنچوں گی اور تمہارا سراغ لگاؤں گی (گناہ بیدہ کا)

درد مند آپ کا اچھا نہ ہوا	درد کا اس کے مداوانہ ہوا
کس جگہ نام یہ رسوا نہ ہوا	کس جگہ عام یہ چرچا نہ ہوا
اف کبھی ہم نے مصیبت پہنہ کی	بسکی میں کبھی شکوہ نہ ہوا

(آنا میل کے باپ خالدا کا)

خالدا (جمیل کو ایک منٹ تک گھور کر دیکھ کے) ابھی تم نہیں گئے۔ جاؤ اور میرے گھر کو ہمیشہ

کے لئے اپنی بدبخت مہتی سے پاک کر دو۔
 زبیدہ - چچا جان یہ تو فرمائیے کہ یہ ظلم کس لئے ہو رہا ہے۔
 خالد - شہزادی تم ابھی لڑکی اور دنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف ہو۔ جمیل میں تم پھر
 اکیلا رہتا ہوں کہ جاؤ۔

جمیل - ابا جان بسلام - شہزادی خدا حافظ
 شہزادی زبیدہ - پیارے جمیل! خدا حافظ۔ انشاء اللہ ہم پھر ملیں گے۔
 زبیدہ - چچا جان آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس دل میں سوائے ایک شخص کے دوسرے کا
 گزر نہیں ہو سکتا۔ کسی کا اس معاملہ میں مجھ پر اثر نہیں ہو سکتا۔ آپ خوب سمجھ لیجئے کہ میں جان بیکاری
 مگر جمیل کا خیال کبھی نہ چھوڑوں گی۔

خالد - (غصے سے) شہزادی میں تمہاری اس لالچنی گفتگو کو سننا نہیں چاہتا۔
 زبیدہ - آہ آہ جمیل! میری زندگی کے آفتاب - میرے دل کے مالک - تم گئے۔ اور مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔
 کس سے راز دل بیان کروں۔ کس طرح ضبطِ فغاں کروں۔ کہاں جاؤں اور کیا کروں۔
 کہ داد میں بستاند دہد جزائے فراق
 کیوں مجھ کو اکیلا چھوڑ گئے
 قیمت میں مری کیا چھوڑ گئے
 جو آسرا تھا باقی نہ رہا
 کیوں مجھ کو سسکتا چھوڑ گئے
 وہ لطف ادا باقی نہ رہا
 پر لطف محبت کس سے کروں
 کیوں تم مجھے شدید اچھوڑ گئے
 کجا روم چہ کنم حال دل کر اگویم
 کیوں مجھ کو اکیلا چھوڑ گئے
 اک اشک کا دریا چھوڑ گئے
 جینے کا مزا باقی نہ رہا
 وہ لطف ادا باقی نہ رہا
 شوخی و شرارت کس سے کروں
 وہ پیار کی الفت کس سے کروں
 آہ - آہ - پیارے جمیل - (جاننا زبیدہ کا)

باب پہلا (سین دوسرا)

(ایک جنگل)

(نارمن و عمران و ربیعہ اور ان کے ملازمین)

عمران (بڑھا یہودی) بہادر سردار۔ کس قصور اور کس جرم میں ہم بے گناہوں کو آپ زبردستی کھینچ لئے جا رہے ہیں۔ لہذا ہم پر رحم کیجئے اور چھوڑ دیجئے۔

جلدل جانی ہے ظالم کو سزا ظلم کرنے سے نہیں کچھ فائدہ
ظلم کا انجام کب اچھا ہوا ظلم سے سرسبز کوئی کب رہا

نارمن۔ تو خود اپنے گریبان میں سر ڈال کر دیکھ کہ تو نے عیسائیوں پر کتنے ظلم نہیں کئے۔ کتنے گھر تو نے عدالتی دگریوں سے تباہ و برباد نہیں کئے۔ کتنوں کو تو نے بے خانہاں نہیں کیا۔ کتنوں کو تو نے زندان نہیں بھیجا۔ کیا وہ تیرے سستائے ہوئے نہیں؟ کیا وہ تیرے سستائے ہوئے نہیں؟ ان مظلوم کا بدلہ اگر کج میں تجھ سے لے رہا ہوں تو کیا بڑا کر رہا ہوں بلکہ اپنی قوم اور اپنے مذہب کا بھلا کر رہا ہوں۔ اور اپنے لئے ثواب کما رہا ہوں۔ پھر کہتا ہوں کہ تیری رہائی کی شرط ایک لاکھ دینار ہیں ایک لاکھ دینار یہاں ہاں یہاں اس جنگل میں مجھے گن مے اور فی النار ہو جا۔

عمران۔ اے بیت المقدس کے پاک پروردگار۔ ایک لاکھ دینار! ایک لاکھ دینار تو درکنار ایک لاکھ دینار بھی میں نہیں رکھتا۔ ایک غریب یہودی کے پاس اتنی کثیر رقم کہاں سے آئی۔ بھلا ایک مفلس و تلاش یہودی اس قدر رقم ادا بھی کر سکتا ہے! اے عیسائی سردار۔ رحم رحم! غریب عمران پر رحم! مفلس و پریشان پر رحم! ایک بے سرو سامان پر رحم! میں اس قدر تاوان نہیں ادا کر سکتا۔

نارمن۔ بس بس تو کس کو سکھاتا ہے۔ کیا میں تجھے نہیں جانتا۔ تو کون ہے۔ وہی عمران! جس کے گھر میں بڑی بڑی تجوریاں اور بڑے بڑے صندوق۔ خانوں میں پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں کیا تو وہی اسرائیلی نہیں جس کے قرضدار آج امیر نجدان و امیر ہستان ہیں؟ میں نے ایک لاکھ دینار بہت کم لئے۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو ایک لاکھ دینار بلا کسی شک و وہم کے دھروے ورنہ تیری ایک ایک ٹی کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دوں گا اور اپنے عیسائی بھائیوں کا بدلہ لوں گا۔ پھر اس وقت پتہ چلے گا اور کف افسوس ملنے سے فائدہ نہ ہو گا۔ دیکھ عمران ایک لاکھ دینار زیادہ نہیں۔

عمران۔ اے ہارون و موسیٰ کے خلا میری مدد کیجیو۔ ایک غریب پڑے یہودی کی مدد کیجیو۔ ایک لاکھ دینار! ایک ہزار نہیں دو ہزار نہیں! ایک لاکھ دینار یہ میری باط سے باہر ہے۔ عیسائی سردار رحم رحم! اپنے یسوع مسیح کے لئے رحم! (پادوں پر گر پڑتا ہے)

نارمن۔ (ٹھوکر مار کر) دور ہٹ۔ مجھے اپنے نجس ہاتھ نہ لگا۔ ایک آخری موقع تجھے اور دیتا ہوں جو کچھ فیصلہ ہو کر لے۔ چیل کوڑوں کو اپنی بوٹیاں کہلائے گا۔ یا ایک لاکھ دینار دے گا۔
 عمران۔ بہادر سردار پچیس ہزار دینار مجھ سے لے لیجئے۔ میں ابھی آپ کو خط لکھ دیتا ہوں
 نارمن۔ نہیں میں تجھ سے ایک لاکھ دینار یہیں نقد لوں گا۔ نامہ و پیام میں نہیں جانتا۔ اپنے آدمی کو رقم کے لئے بھیج۔ وہ آئے تک تو یہیں ہے گا۔ اگر میرے ساتھ کچھ مکر و فریب کرے گا تو یا درکھ تیرا سر بھٹے کی طرح اڑے گا۔

عمران۔ اچھا میں خط لکھتا ہوں۔ میری بیٹی ربیعہ بھی ان کے ہمراہ چلی جائے گی۔
 نارمن۔ یہ ہماری شرط نہیں ہے۔ ربیعہ کو میں نے خاص اپنے لئے رکھ لیا ہے۔
 عمران (حیرت سے) ربیعہ کو میری پیاری بیٹی کو اپنے لئے رکھ لیا ہے نہیں نارمن ایسا نہ کر۔ میری پیاری بیٹی کی میں نے اپنی جان سے بڑھ کر نگہداشت کی ہے اس کی ماں مرنے کے بعد بڑی ہی مصیبتیں جھیل کر اس کو پالا پوسا اور اس کی پرداخت کی ہے۔ غیر محرم نے اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ اس کو چھوڑ دے۔

نارمن۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تو خود جانتا ہے کہ ہم لوگ اپنے قبضے میں آئی ہوئی چیز کو کبھی ہاتھ نہیں دیتے۔
 عمران۔ نارمن لکھ لاکھ کے اوپر اور پچیس ہزار دینار لے لے۔ مگر میری بیٹی کو مجھے بخش دے۔
 نارمن۔ کیا سٹری اور سودا می تو نہیں ہو گیا۔ یہی کیا کم ہے کہ ایک لاکھ کے مساو فائدہ میں اپنی جان سلا لے جا رہا ہے سب بیٹی کی طرف سے کیوں غم کھا رہا ہے۔ لے بس اب جلد خط لکھ۔
 عمران۔ مجھ سے دو لاکھ دینار لے لے۔ میری بیٹی کو چھوڑ دے۔

نارمن۔ نہیں۔

عمران۔ تین لاکھ۔

نارمن۔ نہیں۔

عمران۔ دس لاکھ۔

نارمن۔ نہیں۔

عمران۔ پچاس لاکھ۔

نارمن - نہیں۔

عمران - بس تو مجھے بھی لے لے۔ اور میری بوٹیاں چیل کوؤں کو دیدے۔

نارمن - تو تو اپنی جان بچانا نہیں چاہتا۔

عمران - ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔

نارمن - کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں۔ تیرا ایا ہی ارادہ ہے تو مجھے بھی کچھ پس پیش نہیں۔ جب ایک ایک ٹکڑا کاٹا اور چیل کوؤں کو تیرے ہی سامنے کھلایا جائے گا تو سب حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

عمران - جاتی ہے اگر جان تو پروا نہیں مجھ کو۔ بیٹی سے مری جان زیادہ نہیں مجھ کو۔
اولاد سے بچھڑوں یہ گوارا نہیں مجھ کو۔ بیٹی کوئی ملنے کی دوبارہ نہیں مجھ کو۔

سر میرا اڑا دے کہ مجھے زندہ جلا دے

جو دل میں ترے آئے وہ منظور ہے کر لے

نارمن - دیکھ یہی بات۔

عمران - ہاں ہاں ظالم کتے یہی بات۔ لے یہ میرا جسم حاضر ہے۔ مگر یاد رکھ عمران مجھ بھی جائیگا تو روح کی اپنی بیٹی کے لئے بے قرار رہے گی اور تجھ کو بھی بے قرار رکھے گی۔

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن اجابت از در حق بہر استقبال می آید

اے بنی اسرائیل کے خدا۔ اپنے بکس بندے کی مدد کیجیو۔ عمران ایک شقی القلب کے

پنچے میں گزرا ہے۔ ایک جلا دینا ہی اس کی بیٹی کی عصمت دری کو آمادہ و تیار ہے۔ اے

بیت المقدس کے مالک تو ہی ہم بکیوں کا بچانے والا اور تو ہی ہم بکیوں کی فریاد سننے والا

بچا اس مودی کے پنچہ ظلم سے بچا۔ (عمران کا بیہوش ہو کر گزرا)

نارمن - (اپنے سپاہیوں سے) اس یہودی کتے کو اٹھاؤ اور اس کے کپڑے اتار دو اور اس کی بوٹیاں کاٹ کے اڑا دو۔

(سپاہی عمران کو اٹھاتے اور اس کے کپڑے اتارتے ہیں عمران ہوش میں آتا اور ان کے ہاتھوں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے)

ربیعہ (نارمن کے قدموں پر گر کے) اے عیسائی سردار رحم کیجئے۔ میرے غریب باپ پر رحم کیجئے۔
 ہماری تمام دولت لے لیجئے اور ہمیں چھوڑ دیجئے
 نارمن (ربیعہ کو گود میں اٹھا کے) آمیری پیاری آ۔ اور نارمن کے کھولتے ہوئے خون کو اپنے
 بوسے سے ٹھنڈا کر (بوسہ لیتا ہے)
 ربیعہ (جھجھار کے) چھوڑا وہ ظالم سردار مجھے چھوڑ۔ (جمیل ایک دم آتا ہے)
 جمیل۔ او ظالم۔ کیوں تو اس لڑکی پر ناجائز حملہ کر رہا ہے (گھونٹ لگا کے) بس چھوڑ اور
 مجھ سے مقابلہ کر۔

نارمن۔ ارے تو کون اس معاملہ میں دخل دینے والا؟
 جمیل۔ میں ہوں مظلوموں کی مدد کرنے اور تیرا سر کھولنے والا۔
 نارمن (تکوار کھینچ کر) تو لے یہ میرا وار۔
 جمیل (دار کو بچا کر) لے اب میرے پستول کا فائر۔ (خیر کرنا)
 رگولی کا نارمن کے شانے پر گلتا۔ نارمن کا درد سے تڑپنا۔ ربیعہ کا جمیل کے قدموں کے سامنے دوڑنا
 ہونا۔ پردے کا آہستہ آہستہ گرنا۔

باب پہلا۔ سین تیسرا

[باغ۔ زبیدہ کا گانا۔ سہیلیوں کے ساتھ]

زبیدہ (خبر سنانے پر) ہنس پڑی۔ کیا خبر مجھ کو نہ رہی
 کیا مجھ پر یہ ٹوٹ پڑا تن من کی خبر مجھ کو نہ رہی
 اب ضبط کی طاقت تابکجا ہو لگا لگا نا سخت ہوا
 ہوں یاد میں تیری صبح و ساقن من کی خبر مجھ کو نہ رہی
 کیا لوٹ پڑی ہے گھر میں میرے طالب میں بہت بیکار
 سودا ہے تمہارا سر میں میرے تن من کی خبر مجھ کو نہ رہی
 آہ نگار۔ اس جدائی سے میری جان لبوں پر آگئی ہے۔ زندگی اگر اسی طرح گزرتے
 تو امید نہیں کہ جان اس کا لبد خاکی میں اور بسر کرے آہ معلوم نہیں وہ غریب الوطن کہاں او
 کس مصیبت میں مارا مارا پھر رہا ہو گا۔ کون مجھے اس کی خبر لائے گا۔
 نکاسر۔ شہزادی آپ اپنی جان کو اس طرح ہلکان نہ کیجئے! اور خدا را ان فکروں میں

پڑ کے خود کو حیران اور دوسروں کو پریشان نہ کیجئے۔ آپ نے خود کہا تھا کہ وہ لہستان گئے ہیں۔ اور یقین ہے کہ وہ وہیں گئے ہیں۔

زبیدہ۔ ماں ماں وہ لہستان جانے کے متعلق کہہ رہے تھے ہماری خالہ بھی وہیں رہتی ہیں۔ سنتی ہوں کہ چچا جان بھی نئے شاہ کی تخت نشینی کی تقریب میں سلطان کی طرف سے بھیجے جانے والے ہیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ چلنے کے لئے کہوں گی مگر شاید وہ مجھے لیجانا پسند نہ کریں۔ نگار۔ آپ انھیں مجبور کیجئے تو وہ مان جائیگے کیونکہ انھوں نے آج تک آپ کی کسی بات کو سوائے ایک بات کے نہیں مانا ہے۔

زبیدہ۔ کسی کے پاؤں کی آہٹ آ رہی ہے۔ اے لو خود چچا جان آ گئے۔

(آنا خالہ کا جانا سہیلیوں کا)

خالد۔ شہزادی میں آج شام کو لہستان شاہ کی تخت نشینی کی تقریب میں روانہ ہوں گا۔ زبیدہ۔ چچا جان میں بھی آپ کے ہمراہ چلتی ہوں۔ خالدا۔ کس لئے۔

شاہزادی۔ یہاں میری طبیعت نہیں لگ رہی ہے۔ خالہ جان سے مل کر بہت روز ہوئے۔ انھیں بھی جی دیکھنے کو چاہتا ہے۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلئے۔

خالدا۔ تم یہیں رہتیں تو اچھا تھا۔

شاہزادی۔ نہیں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔

خالدا۔ اچھا تو چلنے کی تیاری کرو۔ (جانا خالہ کا آنا سہیلیوں کا۔ گانا زبیدہ کا)

دل میں تری لو لگی ہوئی ہے	صورت بھی نظر میں پھر رہی ہے
دنیا کا نہیں ہے حال یکساں	شادی ہے کبھی کبھی غشی ہے
آوارہ وطن لے حند ایا	بس آرزو دل میں اب یہی ہے
ہجوری یار میں ہلر رہی	دماز و رنیت بے کسی ہے

کاماٹ۔ سین جو تھا
رستم اور اس کا ملازم جمن

رستم۔ بس کچھ تلی دل کا سامان ہیں تو شاعروں کے بلند خیالات ہیں۔ جواہرات کی کان ہیں تو ان کے عالی افکارات ہیں۔ فلاکت اور ناداری میں وہ ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور اپنے زین خیالات سے دنیا کی بھلائی کرتے ہیں۔ بس میں بھی شاعر بنوں گا اور اشعار لکھوں گا۔

جھمن۔ حضور شاعری اور بلند خیالات اور عالی افکارات سے پیٹ کا ایندھن بھر جاتا تو دنیا کا ان شاعری اور صرف شاعری پر ہی چلنے لگتا۔ بچے سے لیکر بوڑھے تک غریب سے لے کر امیر تک داغ کی مش سے اشعار ڈھال ڈھال کر نکالتے اور دن عید اور رات شب رات مناتے۔ میر بچپن میں ایک شاعر تھے اپنے فن کے بڑے ماہر تھے مگر دنیا کی نشیب و فراز سمجھنے میں ان کا ٹٹو نہیں چلتا تھا۔ ایک ایک دن ان کے گھر میں جو لہا نہیں سلگتا تھا رات دن سولے شاعری کے کوئی کام نہ تھا۔ ہونق ہونے میں ان کے کوئی کلام نہ تھا۔ شاعری کا کلمہ پڑھتے تھے اور لیلی و معنوں اور گل و بلبل کی حکایت نئے نئے طریقے سے گھڑتے تھے اللہ بخشے بڑے مزے کے آدمی تھے آپ ہی شعر لکھتے اور آپ ہی سر دھنتے تھے۔ جو کوئی شعر اچھا موزوں ہو جاتا پھرنا چوں کوں اچھلوں کا مضمون ہو جاتا۔ ایک وقت کا واقعہ سنئے اور لوٹ لوٹ کر ہنسنے۔ حضرت تہمد باند سے جو سے اشعار کے خیالات میں محو کہیں جا رہے تھے مگر شعر کی دھن میں منزل مقصود غریب ہو گئی تھی۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ حضرت کو عقل چھو نہ گئی تھی۔ اتفاق سے تہمد جو پہلے ہی ڈھیلی بنی ہوئی تھی تو نذر سے پھل کے زمین پر گر گئی مگر ان کے کانوں کا بھی خبر نہ ہوئی لوگ جو راستہ چل رہے تھے وہ حیران کہ یا الہی یہ شخص کیا بے جا ہے جو ننگا جا رہا ہو۔ اتنے میں ایک شعر جو کچھ مرضی کے موافق بن گیا تو حضرت کا دل اچھل گیا۔ ایک دم راستہ پر ہی لگے۔ اچھلنے کو دئے سانچی اس بے حیائی پر مرد تو لگے بگڑنے اور عورتیں لگیں کو سننے اور ہتھ مارنے پھر تو یکایک آپ شاعری کے خواب خرگوش سے بیدار اور اپنی حالت پر شر مار ہوئے تہمد باندہ کرا متہ لیا۔ (آنا رستم کے دوست طند رکا)

قلندر۔ کیا ہو رہا ہے۔

جھمن۔ ایک شاعر کا ذکر ہو رہا ہے۔ ہمارے میاں کی فضول خریچوں سے جو کچھ دگت ہوئی ہے وہ بے لبت ہوئی ہے۔ قرضداروں کی خاطر گھر سے باہر نکلتا سہل ہو گیا ہے جکی چو

پریشان دل اور دماغ مضطرب ہو گیا ہے۔ اب حضور کا ارادہ اشعار لکھنے کا ہو رہا ہے۔
 قلندر۔ ارے یار یہ کیا تھیں خط سوجھا ہے۔ شاعری اور مدح اُن کے شغل میں
 پڑنے سے آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ کوڑی کی آمدنی نہیں۔ واہ وا کی تقریظوں کے سوا اور
 کچھ کتنا کہانی نہیں واہ واسنتے جاؤ اور گھر میں بھوکوں مٹے جاؤ۔ ایک برس پہلے ایک جگہ
 مشاعرہ ہوا تھا۔ بندہ بھی اس میں گیا تھا طرح مصرع تھا۔ کہاں ملاپ میں وہ بات ہو گئی
 ہم نے اس میں نئے نئے قافیے اور نئے نئے مضامین باندھے گرواہ رے شاعری کی نخواست
 رات کو آکر گھر میں بھوکے سوئے۔ غزل کے کچھ اشعار یاد ہیں۔ سنو
 رسد ہم فرمائے۔

قلندر۔ قدر دانی عالم بالا معلوم شد۔ خیر نا ہوں اور اپنا منفر پکاتا ہوں۔ گروہی جا ہے
 گدھے کو زعفران کی کیا قدر دیکھنا کیا لا جواب مطلع کہا ہے۔
 تباؤ عند یہ کیا ایسی چھیڑ چھاڑ میں ہے رقیب روسیہ پوشیدہ کیوں کوڑ میں ہے
 جھمن۔ جب یہ مشاعرہ کی غزل ہے تو مشاعرہ کی جیسی اودہم بھی چاہئے۔ اس لئے بہ آواز
 بلند واہ وا واہ کا نعرہ لگاتا ہوں برانہ انئے واہ وا واہ۔ رقیب کو کوڑ میں لیمائے پھینکا
 اب یہ بھڑواہیں مر گیا تو پروا نہیں۔ ایک ساریل کا ٹانگہ نکل گیا تو راستہ صاف ہو گیا
 میں ہوتا تو کوڑ کی جگہ بھڑے کو بھاڑ میں ہی جھونک دیتا۔

قلندر۔ دوسرا شعر ہے۔
 رسید اس کو چپ کی تو اس کو اک چاٹا گزرتی یار کی ہر محنت مار دھاڑ میں ہے
 جھمن۔ پھر مشاعرہ کی تعریف واہ وا۔ واہ پھر فرمائے۔
 رسید اس کو چپ کی تو اس کو اک چاٹا گزرتی یار کی ہر محنت مار دھاڑ میں ہے
 واہ وا واہ وا (خود کو شاباشی دیتا ہے)

رسید اس کو چپ کی تو اس کو اک چاٹا۔ کیوں حضور۔ معشوق کوئی پہلوان کسٹم ہے
 جب ہی اتنا طاقتور ہے کہ بیچارے کو مار دھاڑ کے سوا کچھ کام نہیں۔ چوہے کی مرن بلی کا میل
 شاید اسی موقع پر کسی مسخرے نے کہا ہے۔

رستم۔ کیوں بے تو بہت بڑھ چلا۔ پہلوان اور رستم کی بھینتی ہمیں پرکس رہا ہے۔
 جھمن۔ سرکار میں نے کیا برا کہا۔ گزرتی یار کی ہر خطہ مار دھاڑ میں ہے۔ اس سے کوئی
 اور دوسرا مطلب نکلتا ہو تو مجھے پانچ جوتے مارے اور وہ بھی بازار کے بھاؤ سے۔
 قلندر۔ ہاں بہی۔ تیرا شعر سننا۔ بھیڑ بھاڑ کا قافیہ باندھا ہے اور بالکل انوکھے پیرائے
 سے باندھا ہے۔

جھمن۔ جی ہاں اپنے ہنہ میاں مٹھو بننا اسی کو کہتے ہیں
 قلندر۔ سنو بہی کس قدر اچھا شعر کہا ہے۔

انار ایک تو بیمار سو ہے ضرب مثل خدا ہی خیر کرے یار بھیڑ بھاڑ میں ہے
 جھمن۔ شاعرہ کی تعریف۔ واہ واہ۔ پھر فرمائے۔

انار ایک تو بیمار سو ہے ضرب مثل خدا ہی خیر کرے یار بھیڑ بھاڑ میں ہے
 واہ واہ واہ۔ ایک نہیں دو نہیں بلکہ ایک دم سو کے نرغے سے نکلتا بڑی آفت ہوئی
 ہے جس پر آپ کو خدا ہی خیر کرے بولنے کی ضرورت ہو گئی ہے۔ یہ آپ ہی کی ہمت ہے
 کہ سو نفوس کو دیکھ کے گھبرا گئے۔ اچی اگر میں ہوتا تو ان سوؤں کا قلیہ کر دیتا اور کبھی
 خدا ہی خیر کرے کا ٹھنڈا لفظ زبان سے نہ نکالتا مگر آپ کیا کرینگے۔ تمام شاعر ایسے ہی
 ٹھنڈے کیلے ہوتے ہیں۔

قلندر (جھمن کو ایک چپت رسید کر کے)

نہیں ہے ماتھ میں پیہ وگرنہ جاتے ہم بڑا مزہ گرمی کا نلگری پہاڑ میں ہے
 جھمن شاباش۔ خوب کہا

نہیں ہے ماتھ میں پیہ وگرنہ جاتے ہم بڑا مزہ گرمی کا نلگری پہاڑ میں ہے
 شاعرہ کی تعریف۔ واہ واہ۔ حضور یہ تو میرے دل کی بات کہی۔ میرا رونا ہی جیسے
 پیسے ہی کے واسطے تھا۔ تمام شاعر پیسے ہی کا رونا زندگی بھر روتے روتے لیٹ گئے۔ خالی
 ماتھ آئے اور خالی پیٹ گئے۔ اس کے اوپر والا شعر تو برف کے جیٹھا ٹھنڈا تھا۔ یہ شعر گرم ہکا
 ہے اس کے لئے نلگری کے برف کی ضرورت ہے۔ (باہر سے کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے)

(باقی)

تنقیدیں

خمکہ۔ مرتبہ جناب قاضی محمد غوث صاحب فضا حیدر آبادی چھوٹی تقطیع ضخامت (۲۹۹) صفحہ سید عبدالقادر صاحب ناشر داتا جرتب چارمینار اور مکتبہ ابراہیمیشین روڈ حیدر آباد دکن سے دیاں میں مل سکتی ہے۔

جدید اردو شاعری کے بڑے نقیبوں میں منشی درگا سہائے صاحب سرور انجمنانی بڑی ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ مبدع فیاض سے انھیں بڑی حساس طبیعت اور شاعرانہ دل و دماغ عطا ہوا تھا۔ طبیعت کی تیز حس اور دروند مندی نے انکے کلام میں وہ سوز و گداز پیدا کر دیا ہے جو شاعری کی جان ہے۔ ان کا کلام پُرکھر ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ بلاشبہ قدرت نے انھیں شاعری کے لئے پیدا کیا تھا اپنی ۲۷ برس کی مختصر سی پر مصائب زندگی میں انھوں نے اپنا مقصد حیات پورا کر دیا اور جو کلام ان سے نکلا ہے وہ اپنی اسلی خصوصیات کے اعتبار سے جدید اردو شاعری کا ایک بہترین جز ہے۔ انکی شاعری انکی حیات کی بالخصوص اور اپنے عہد کی بالعموم زندگی کی صحیح ترجمان ہے اور اس کے ساتھ تڑپ اور تاثیر سے بھی بھری ہوئی ہے۔ ان ہی چیزوں نے شاعر اور اس کی شاعری دونوں کو لاثانی بنا دیا ہے۔

سرور کا کلام ان کی زندگی ہی میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا اور گرم دیش سائے ہندوستان میں مقبول ہو چکا تھا۔ وہ جام بھرور کے نام سے مجموعہ کلام شائع کر رہے تھے کہ انکا انتقال ہو گیا اور یہ دیوان کئی دن بعد شائع ہوا۔ اس کے علاوہ زمانہ پریس سے بھی ایک چھوٹا سا مجموعہ شائع ہوا لیکن ان کا تمام کلام یکجا جمع نہ ہو سکا۔ قاضی محمد غوث صاحب نے بڑی تلاش اور جستجو سے کم و بیش پورا کلام خمکہ سرور کے نام سے شائع کر کے اردو ادیب کی لائق ستائش کوشش کی ہے۔ اس مجموعہ میں مصنف کا ایک مضمون نشر بھی شامل ہے۔ نشر میں غالباً یہی ایک ٹکڑا اسکا یادگار باقی رہا ہے۔ خمکہ سرور میں کلام کی ترتیب حمد باری تعالیٰ، تلاش حقیقت، مظاہر قدرت، باؤ حسرت وغیرہ ابواب میں کی گئی ہے۔ اگر اس کی بجائے تاریخی ترتیب کلام میں کیا جاتا تو متعلین سرور کے لئے انکی شاعری کا ارتقا اور خیالات وغیرہ میں وقتاً فوقتاً تبدیلی، ترقی اور توسیع معلوم کرنے میں بڑی ہوسٹ اور مرتب کی سعی زیادہ مشکور ہوتی۔ موجودہ ترتیب سے کلام ضحیک طور پر تقسیم نہیں ہوا ہے اور

بہت کم ایسی تقسیم کلام کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ مرتب نے چار صفحوں پر شاعر کے حالات لکھے ہیں اور سرور کی نسبت دیگر دو رد قیدیم کے ایک ممتاز مجلہ کی جدید صحیح ترجمانی کے مبہم عنوان سے کسی اور کے قلم کی رائے پیش کی ہے۔ مولوی سید سجاد صاحب مددگار پر وفیر اردو و کلیہ جامعہ عثمانیہ اور جوش صاحب طبع آبادی سے بھی تعارف اور تمہید لکھوائی گئی ہے۔ ان چند سطری تعارف و تمہید میں بھی کلام سرور کی نسبت ایک دو غلطی رائے درج ہے مگر ایک میں نکتہ آفرینی ہے تو دوسرے میں نکتہ چینی۔ حیدر آباد میں طباعت کی جو مشکلات ہیں وہ اس کتاب سے بخوبی ظاہر ہوتی ہیں۔ اگرچہ کلام کا بیشتر حصہ صحیح ہو لیکن طباعت بڑی بھونڈی ہے۔

آرٹ مترجمہ مولوی سید مکین کاظمی صاحب و مولوی عبدالمنعم صاحب سعیدی بی۔ اے
چھوٹی قطیع ضخامت ۱۱۰۹ صفحات قیمت دھم مکتبہ ابراہیمیہ کلکتہ رڈ حیدر آباد دکن
مل سکتی ہے۔

انگریزی ادب میں آسکر وائلڈ کا جو بلند پایہ ہے اس سے انگریزی ادب کے متعلین آگاہ ہیں۔ آرٹ اس کے مشہور ڈراما ”دی امپارٹنس آف بی انگ آرٹ“ کا ترجمہ ہے۔ اردو ادب میں انگریز کے ایسے شہ کاروں کو منتقل کرنے کی جقدر ضرورت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کاظمی سعیدی صاحبان کی یہ کوشش مستحق حوصلہ افزائی ہے۔ ادب عالیہ کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا جس قدر مفید ہے اسی قدر مشکل اور محنت شکن کام بھی ہے۔ باریک بینی سے اصل اور ترجمہ کا مقابلہ کیا جائے تو ضرور ایسے مواقع ملینگے جہاں ترجمہ اصل سے بہت دور ہو گیا ہے مگر پہلی کوشش میں اسے زیادہ بہتری کی امید بھی نہیں کرنی چاہیے۔ مترجم نے بھی دفع دخل معذرت کے طور پر تقریباً کے عنوان پر یہ معذرت کر دی ہے ”ہمیں اپنی بے بضاعتی پر افسوس ہے کہ ہم ترجمہ میں اصل کی سی خوبی نہ پیدا کر سکے اور بعض جگہ بدحواسیاں بھی کر دیں“، متن سے پہلے مولوی سلطان حیدر صاحب جوش کا پیش لفظ جوش صاحب طبع آبادی کا تاثر، نسو و جن صاحب ذوقی کا تعارف اور انیس منتخب صاحب کا اعلان اور مکین صاحب مترجم کی تقریب سستزا دیں جن میں آسکر وائلڈ، آرٹ اور مترجمین کو رونمائی کر دیا گیا ہے۔

الروضۃ البہیہ از جناب ایس ذاکر حسین جعفر صاحب درمیانی لمبی قطیع ضخامت ۱۱۲۸ صفحات قیمت ۳۴

ملنے کا پتہ مطبع قادری جبل پور صوبہ متوسطہ۔

یہ سلاطین فاطمیہ مصر کی مدافعتہ تاریخ ہے۔ مشہور مورخ ابن العزازی نے اپنی کتاب تاریخ مغرب میں ان سلاطین کی نسبت جو اعتراض کئے ہیں، اس رسالہ میں ان کا جواب دیا گیا ہے اور آخر میں مسلمانوں کے فرقہ بواہر کے آغاز و ارتقاء پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک مفید کتاب ہے۔ تاریخ اسلام کے اس جزو پر اردو میں سلیس تاریخوں کی کمی جس شدت سے محسوس ہو رہی ہے شکر ہے کہ جناب ذاکر حسین صاحب نے اس کو دور کرنے کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ اگر موصوف جدید اصول تاریخ نویسی کی روشنی میں قدیم اور معتبر تواریخ سے جن کی عربی زبان میں کمی نہیں، مواد لیکر جامع کتاب مرتب کریں تو یہ اردو کی بڑی خدمت ہوگی۔ بواہر کے متعلق بھی اردو میں بہت کم تاریخی مواد ملتا ہے۔ اس کتاب میں جو حالات ان کے درج کئے گئے ہیں وہ ابتدائی تعارف پر بہت مفید ہیں۔

مدیر جناب فیاض حسین صاحب نسیم ضخامت، ۲۸ صفحات عام رسائی قطع سالانہ ہونہار (ماہولہ) چندہ سے، صدر بازار دہلی اس کا پتہ ہے۔

ہونہار جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کے فائدے کے لئے جاری کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قصے، دلچسپ لطیف، نصیحت آمیز مضامین جن میں اکثر کمسن مضمون نگاروں کے ہیں، اس رسالے میں درج ہوتے ہیں۔ ننھے قارئین کے لحاظ سے خط بھی کھلا اور صاف رکھا گیا ہے۔ تصویریں بھی دلچسپ مگر عام ہیں۔ رسالے کے شروع میں معاونین خصوصی، کی ایک لمبی چوڑی فہرست دی ہے جس میں ہندوستان کے تمام مشاہیر ادیب اور اشراف پر دازوں کے نام گنا دئے گئے ہیں۔ اگر یہ سب سال میں دو دو مضمون بھی رسالے کے لئے لکھ دیں تو یہ رسالہ ہندوستان میں ایک ہی ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی کم توقع ہے کہ یہ سب حضرات بچوں کے کام کے مضمون لکھ سکتے ہیں۔ بہر حال ہونہار جس کے اس وقت دو نمبر ہمارے پیش نظر ہیں تیسری چوتھی جماعت کے طلباء کے لئے قابل مطالعہ رسالہ ہے۔

اگر آپ افسانے پڑھتے ہیں تو

دَارُالاشَاعَت مکتبہ ابراہیمیہ

کی
نئی کتاب

کردار اور افسانہ

مولفہ مولوی عبدالقادر سروری ام اے ال ال بی مصنف دنیا کے افسانہ ضرور مطالعہ
کیجئے اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ افسانہ میں کیر کڑوں کو کس طرح پیش کیا جاتا ہے
اور ماہر افسانہ نویس کس طرح فطرت انسانی کے غوامض و دقائق کے مطالعہ سے
افسانوی کردار میں کیا جان تازہ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے پڑھنے سے آپ اچھے اور
برے افسانے میں امتیاز کر سکیں گے اور ایک سرسری نظر سے ہر افسانے کی
نسبت صحیح رائے دینے لگیں گے۔ قیمت دس روپے پندرہ تقطیع ضخامت (۲۳۲) صفحے

ملنے کا پتہ
مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن

مجلہ مکتبہ کی سالانہ عکس

مجلہ کی نوی جلد کے آغاز کی تقریریں

مئی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو رہی ہے۔

ہندوستان اور یورپ کے بعض بہترین افسانہ نگاروں کے شاہکاروں اور ان کے کمال افسانہ نگاروں کی تصویروں پر مشتمل ہے

اس میں (۱) بوکاشیو (۲) جو کائی (۳) نینگ گیو با تاز - (۴) ہرمن بھر (۵) عبد الرحمن خٹائی (۶) رشتہ متبغ عبا (۷) ام اسلم کے بہترین مختصر قصے شائع ہو رہے ہیں

اس میں تقریباً تمام افسانے ایسے ہیں جو اردو میں پہلی دفعہ منتقل ہو رہے ہیں (۱) سحر طرار (۲) دوزخ حرام (۳) خدا کی باتیں خدا ہی جانے (۴) محبت بنام شرافت (۵) ہنگامہ رخصت (۶) الفت کا انجھام (۷) اسکی خوبصورت بیوی (۸) فاتح -

انھیں اولین موقع پر پڑھ کر ان سے لطف اٹھا سکیں گے۔

مستقل خریداروں کی خدمت میں یہ اشاعت معمولی چندہ میں حاضر ہوگی۔

اور نئے خریداروں کے لئے اس کی قیمت بارہ آنے (۱۲)۔

قاعدہ فارسی

ہندوستان میں مشرقی زبانوں کی تعلیم ابھی تک قدیم طریق پر ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمانہ تعلیم کی طوالت کو دیکھ کر نوجوان عموماً ان سے محروم رہتے ہیں عربی میں تو ڈاکٹر گٹھڑ کی ایک دو کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں مگر کتابوں کو مدارس میں مروج کیا گیا تھا لیکن فارسی میں بھی اس طرف قدم نہ اٹھایا گیا تھا۔ قاعدہ زیر نظر کو جدید اصول تعلیم کے مطابق مرتب کیا گیا ہے جس کے پڑھنے میں طلبہ کے ذہن پر فضول بوجھ بھی نہیں پڑتا اور وہ فارسی زبان میں گفتگو وغیرہ بھی کر سکتے ہیں بہارے خیال میں یہ قاعدہ مدارس کیلئے نہایت مفید

(ریاست ہٹی)

یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جس کو انجمن مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی محدود نے مدارس کیلئے راست طریقہ تعلیم پر ابوالمحسن صاحب مشین سے تیار کر لیا ہے۔ متین صاحب کا نام اردو صحافت کیلئے نیا نہیں ہے۔ وہ سرشتہ تعلیم حیدر آباد دکن کے ایک تجربہ کار مدرس ہیں جنہیں فارسی زبان سے خاص دلچسپی ہو نیکی علاوہ متعدد فارسی مقالوں وغیرہ کے ترجمہ کرانیکا اتفاق ہوا ہے۔ اس قاعدہ کی اہم خصوصیات یہ ہیں: —

الفاظ اور خیالات کی تعبیر و توضیح کیلئے تنو سے زیادہ تصاویر دی گئی ہیں اور طلبہ کو دونوں عہد کی زبانوں سے مانوس کرنے کے لئے فارسی جدید کے ساتھ فارسی قدیم کا بھی امتزاج کیا گیا ہے۔ مکالموں کی

طرز میں جہاں جہاں سلیس جملے استعمال کئے گئے ہیں ان میں زیادہ تر روزمرہ فارسی جدید کو استعمال کیا گیا ہے ہماری رائے میں اگر یہ قاعدہ بذریعہ ہلکے چھپوایا جاتا تو اسکی خوبی اور رونق میں اضافہ ہو جاتا ہے ہمیں امید ہے کہ مؤلف کے تیار کردہ سلسلوں سے طلبہ کا بہت زیادہ فائدہ ہوگا اور فارسی کے اس پرانے نصاب کے پڑھنے پڑھانے سے طلبہ اور اساتذہ کی طبیعتیں جو کٹا گئی ہیں اس جدید سلسلے کے رواج پانے کے باعث ان میں شوق و دلچسپی پیدا ہوگئی۔

(حیدر آباد پٹنہ)

یہ کتاب جناب ابوالحسن صاحب متین کی ایک گراں قدر تالیف ہے اس میں ایسے طریق اور اسلوب بیان کئے گئے ہیں کہ بچے نسبتاً کم وقت میں معمولی محنت و توجہ سے فارسی سیکھ سکتے ہیں۔ اس میں گو کتاب مختصر ہے مگر بہ نہایت مفید یہیں اس کتاب کے پیش کردہ اسلوب اور طریقے بہت پسند آئے ہیں۔

ضخامت (۶۴) صفحے طباعت کتابت پاکیزہ قیمت (۶) (منادی دہلی)

مکتبہ ابراہیم اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

اردو شہ پارے

مولفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔ اے پی۔ بیچ ڈی۔ (لندن)

نگار لکھنؤ کی رائے

ہر زبان کی ترقی کے تین دور ہو کر تے ہیں پہلا دور تراجم کا۔ دوسرا تالیفات کا تیسرا تصانیف کا۔ اس میں کلام نہیں کہ اردو زبان پہلے دور سے گزر کر دوسرے دور میں آگئی ہے اور اگر ہم سرزمینِ دکن کی علم پرور فضا کے کارناموں پر نگاہ ڈالیں تو کہا جاسکتا ہے کہ شاید اس نے تیسرے دور میں بھی قدم رکھ دیا ہے۔

اس دوران میں اردو کی جو خدمت اپنی بیش بہا تصانیف و تالیفات سے فرزان دکن نے کی ہے۔ وہ ایسی معمولی نہیں ہے کہ کو کوئی شخص اس سے نظر انداز کر دے۔ یقیناً حیدر آباد اس وقت حالتِ ہفت (RENAISSANCE) میں ہے اور اس کے مختلف پچھلے مناظر ہیں کہ ایک طرف عثمانیہ یونیورسٹی نشتر علم میں نمایاں حصہ لے رہی ہے اور دوسری طرف وہاں کے طلبہ علمائے ملک و زبان کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری جو حال میں لسانیات کی تحقیقات سے فارغ ہو کر ولایت سے واپس آئے ہیں معروف و مقتدر جو انان دکن میں سے ہیں اور اردو شہ پاروں کی پہلی جلد انھیں کی تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس میں اردو ادب کے آغاز سے دلی کے اب تک جتنے مشہور و نامور نگار ہوئے ہیں ان کے حالات اور ان کے کلام نظم و نثر کے بہترین نمونے دئے ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے بار میں اردو ادب کی ابتدائی حالت پر نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں سچا پور تیسرے میں گوگلنڈہ اور چوتھے میں عہدِ مغلیہ کے اردو ادب سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد شہ پاروں کا انتخاب ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے بعض نہایت بیش قیمت معلومات پر عمل میں اس میں علی عادل شاہ سید شاہ راجا، ابو الحسن تانا شاہ، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، مغھری اور اس نشاطی کی تصویبات بھی شامل ہیں۔ کتاب ولایتی کچھ درے کاغذ پر مجلد شائع کی گئی ہے اور صوری و معنوی دونوں حیثیت سے عہدِ حاضر کی بہترین تالیفات میں جگہ پانیکے قابل ہے۔

صفحہ ۱۷۴ (۱۷۴) اعلیٰ درجہ کا کاغذ، کتابت، طباعت، قیمت (۱ روپے)
مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن۔

مجلہ مکتبہ خریداری میں مزید سہولت



جو حضرات مکتبہ ابراہیمیہ سے ایک سال میں چالیس روپے کے مطبوعات مکتبہ ایساٹھ روپے کی عام مذاق کی اور دوسری کتابیں کمشت یا بدفعات نقد خرید فرمائیں گے ان کے نام سالہ سال بھر کے لئے باقیمت جاری ہو سکے گا اور وہ حضرات بھی جو چھ ماہ میں پچیس روپے کے مطبوعات مکتبہ یہنیتس پو کی درستی دیگر کتابیں بدفعات یا کمشت نقد خرید کر نیگے ان کی ختمیں چھ ماہ کی مدت کیلئے مجلہ مکتبہ باقیمت حاضر ہوگا۔ کمشت خریدنیوالے حضرات کے نام سالہ فوراً جاری کر دیا جائے گا۔ حضرات بدفعات کتابیں خریدیں گے ان کو ایک سید دی جائیگی جس میں خریدی ہوئی کتابوں کی مجموعی قیمت درج ہوگی۔ خریدار صاحبین کو چاہیئے کہ وہ اس سید کو اپنے پاس محفوظ رکھیں جس وقت حسب احوال رقم معینہ کی تکمیل ہو جائے وہ سید یہ نام مجلہ مکتبہ سے پس مسجدیں رسالہ کے نام جاری کر دیا جائے گا۔ رسیدیں دوسروں کے نام منتقل بھی ہو سکتی ہیں اس طرح سے کئی آفیسر مل کر بھی اس رعایت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مطبوعه مکتب ابراهیمیة طیشن روهیت در آواز دکن

۱۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ
 ۲۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ
 ۳۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ
 ۴۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ
 ۵۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ
 ۶۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ
 ۷۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ
 ۸۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ
 ۹۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ
 ۱۰۔ اگر کسی نے ایک شخص کو دیکھا تو اس کو دیکھ کر کہہ دے کہ

